قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ
فتاویٰ عباد الرحمٰن
جلد سوم
مفتی عبد الرحمٰن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس
دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد - فیز ۲ ڈی ایچ اے کراچی

قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ

# فتاویٰ عباد الرحمٰن

## جلد سوم

مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس

دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد۔ فیز ۲ ڈی ایچ اے، کراچی

ناشر: مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل صاحب رئیس دارالافتاء والتحقیق ابوبکر صدیق مسجد فیز ۲ ڈی ایچ اے

مطبع: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32630051

مسائل معلوم کرنے کے لئے مفتی صاحب سے مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کر سکتے ہیں براہ کرم نماز اور آرام کے اوقات کا خیال رکھیں۔

برائے رابطہ فون نمبر: 02135804388

موبائل: 03132775126 0333-2251145

☆ ملنے کے پتے ☆

ناشر: مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل (مندرجہ بالا تینوں نمبرز)

ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32638114

دارالاشاعت اردو بازار کراچی فون نمبر: 32631861

اسلامی کتب خانہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قرآن محل اردو بازار ڈیرہ اسماعیل خان

مولوی سیف الرحمٰن عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان فون نمبر: 03139341266

مکتبہ جاویدیہ میانوالی شہر

مکتبہ رشیدیہ ۳ شیش محل روڈ لاہور فون نمبر: 04237364516

مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ فون نمبر: 0812662263

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
| --- | --- | --- |

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
| --- | --- | --- |

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| 140 | ﴿فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد کا ثبوت احادیث سے﴾ | 222 |
| 141 | ﴿نماز کی رکعات میں شک کا حکم﴾ | 224 |
| 142 | ﴿گاڑی آنے کے خیال سے نماز توڑنے کا حکم﴾ | 226 |
| 143 | ﴿ٹرین نکل جانے کے خوف سے نماز توڑنا جائز ہے﴾ | 227 |
| 144 | ﴿سائیکل چوری ہونے کی صورت میں نماز توڑنا﴾ | 227 |
| 145 | ﴿بغیر عذر کے گھر میں فرض نماز پڑھنا گناہ ہے﴾ | 228 |
| 146 | ﴿عورت کا پنج وقتہ نماز و جمعہ اور عیدین کیلئے مسجد یا عیدگاہ جانا منع ہے﴾ | 229 |
| 147 | ﴿بٹوہ یا موبائل فون میں محفوظ تصاویر کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم﴾ | 231 |
| 148 | ﴿شیشے میں نظر آنے والی صورت عکس ہے تصویر نہیں﴾ | 231 |
| 149 | ﴿جیب میں پوشیدہ تصاویر کے ساتھ نماز پڑھنے کی گنجائش ہے﴾ | 232 |
| 150 | ﴿دوران نماز ٹوپی سر سے گر جائے تو کیا کرے؟﴾ | 233 |
| 151 | ﴿ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم﴾ | 234 |
| 152 | ﴿نماز میں شناختی کارڈ گرنے اور اسکے اٹھانے کا حکم﴾ | 234 |
| 153 | ﴿دوران نماز قطرہ آنے کے وسوسہ سے وضو اور نماز کا اعادہ ضروری نہیں﴾ | 235 |
| 154 | ﴿نماز میں بجتے ہوئے موبائل فون کو بند کرنے کا حکم﴾ | 236 |
| 155 | ﴿مساجد میں ہیٹر کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے﴾ | 237 |
| 156 | ﴿کبڑا شخص رکوع کس طرح ادا کرے؟﴾ | 238 |
| 157 | ﴿سنتوں اور عیدین کے بعد دعا مانگنے کے حکم میں فرق﴾ | 239 |

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
| --- | --- | --- |

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| 320 | ﴿میت کے لئے قبر کھودتے وقت زمین سے ہڈیاں نکل آئیں﴾............ | 391 |
| 321 | ﴿قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا حکم﴾............ | 392 |
| 322 | ﴿قبرستان کے درختوں کو کاٹنے اور استعمال کرنے کا شرعی حکم﴾............ | 393 |
| 323 | ﴿قبرستان کے پتھروں کا حکم﴾............ | 393 |
| 324 | ﴿اجتماعی قبر کا حکم﴾............ | 394 |
| 325 | ﴿قبروں پر چلنا ان سے تکیہ لگانا اور بیٹھنا جائز نہیں﴾............ | 394 |
| 326 | ﴿قبر خراب ہو جائے تو دوبارہ صحیح کرنے کا طریقہ﴾............ | 395 |
| 327 | ﴿قبر کو پختہ کرنا ممنوع ہے﴾............ | 395 |
| 328 | ﴿زیارت قبور کا طریقہ﴾............ | 396 |
| 329 | ﴿عورت زیارت قبور کیلئے جاسکتی ہے یا نہیں؟﴾............ | 397 |
| 330 | ﴿شب براءت میں عورتوں کا قبر پر جانے کا حکم﴾............ | 398 |
| 331 | ﴿قبر پر شاخ اور پودا لگانے کا حکم﴾............ | 399 |
| 332 | ﴿قبر پر پانی چھڑکنے کا حکم﴾............ | 400 |
| 333 | ﴿پرانے قبرستان کی زمین پر تعمیر کرنے کا حکم﴾............ | 401 |
| 334 | ﴿قبر کو چونا لگانے کا حکم﴾............ | 401 |
| 335 | ﴿دعا میں ہاتھ اٹھانے اور تدفین کے بعد قبر پر پڑھنا﴾............ | 402 |
| 336 | ﴿قبر کی اونچائی زمین سے تقریباً ایک بالشت ہونی چاہیے﴾............ | 403 |
| 337 | ﴿تدفین کے بعد تین دن تک روزانہ صبح قبر پر جانے کا حکم﴾............ | 403 |
| 338 | ﴿پرانی قبر میں نئی میت کو دفنانے اور قبر کو پختہ کرنے کا حکم﴾............ | 405 |

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| 339 | ﴿قبرستان کا سبزہ وغیرہ کاٹنا جائز نہیں﴾ | 405 |
| 340 | ﴿باب التعزیۃ والحداد﴾ | 406 |
| 340 | ﴿سوگ اور تعزیت کا بیان﴾ | 406 |
| 341 | ﴿تعزیت کا شرعی حکم﴾ | 406 |
| 342 | ﴿تعزیت کا حکم تدفین میت سے قبل﴾ | 407 |
| 343 | ﴿عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کے انتقال پر سوگ منانے کا حکم﴾ | 408 |
| 344 | ﴿تین دن بعد تعزیت کا حکم﴾ | 408 |
| 345 | ﴿غیر مسلم کی عیادت اور تعزیت جائز ہے﴾ | 409 |
| 346 | ﴿میت کی تعزیت کے وقت دعا کا حکم﴾ | 410 |
| 347 | ﴿تعزیت کے وقت دعائیہ کلمات پڑھنے کا حکم﴾ | 410 |
| 348 | ﴿میت کے گھر کھانے کا حکم﴾ | 411 |
| 349 | ﴿موت کے بعد قبر کی زندگی برحق ہے﴾ | 412 |
| 350 | ﴿کتاب الزکوٰۃ﴾ | 421 |
| 350 | ﴿زکوٰۃ کے مسائل﴾ | 421 |
| 351 | ﴿زکوٰۃ کی واجب مقدار کا ثبوت﴾ | 421 |
| 352 | ﴿جو چیز ملکیت میں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں﴾ | 422 |
| 353 | ﴿ادائیگی زکوٰۃ کی ایک خاص صورت کا بیان﴾ | 423 |
| 354 | ﴿مستحق مسافر کا کرایہ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی﴾ | 425 |
| 355 | ﴿تجارت کی نیت سے زیر تعمیر عمارت میں زکوٰۃ کا حکم﴾ | 425 |

نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
| --- | --- | --- |

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|

نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| 467 | ﴿مال تجارت کے قرضوں پر زکوٰۃ کا حکم﴾ | 535 |
| 468 | ﴿میراث کے مشترکہ مال سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم﴾ | 536 |
| 469 | ﴿زکوٰۃ کی نیت سے قرضہ معاف کر دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی﴾ | 537 |
| 470 | ﴿زکوٰۃ کی مد میں کرایہ معاف کر دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی﴾ | 537 |
| 471 | ﴿دوسرے شہر میں اقرباء کیلئے زکوٰۃ بھیجنا بلا کراہت جائز ہے﴾ | 538 |
| 472 | ﴿زکوٰۃ کی رقم ضائع ہونے سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی﴾ | 539 |
| 473 | ﴿قرضۂ حسنہ پر زکوٰۃ کا مسئلہ﴾ | 540 |
| 474 | ﴿رقم وصول ہونے پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کی ایک صورت﴾ | 540 |
| 475 | ﴿حج کے لئے جمع کردہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم﴾ | 541 |
| 476 | ﴿کرائے کے مکان پر زکوٰۃ کا مسئلہ﴾ | 543 |
| 477 | ﴿قرض مال سے زکوٰۃ دینے کا حکم﴾ | 543 |
| 478 | ﴿سات تولہ سے کم سونا اور کچھ نقدی پر زکوٰۃ کا حکم﴾ | 544 |
| 479 | ﴿ادائیگی زکوٰۃ میں شک ہو تو غالب گمان کا اعتبار ہوگا﴾ | 545 |
| 480 | ﴿مقدار فرض سے زیادہ زکوٰۃ ادا کی تو اگلے سال کی زکوٰۃ میں حساب کر سکتا ہے﴾ | 545 |
| 481 | ﴿مال مستفاد میں زکاۃ کا حکم﴾ | 546 |
| 482 | ﴿جواہرات میں زکوٰۃ کا حکم﴾ | 547 |
| 483 | ﴿زکوٰۃ کے وجوب کا تعلق سال کے شروع و آخر میں صاحب نصاب بننے سے ہے﴾ | 547 |
| 484 | ﴿زیورات میں ہر سال زکوٰۃ فرض ہے﴾ | 548 |
| 485 | ﴿وصیت نہ کی ہو تو ورثاء پر مورث کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں﴾ | 549 |

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|
| 550 | ﴿قرض محیط للمال ہو تو زکوۃ ساقط ہو جاتی ہے﴾ | 486 |
| 551 | ﴿کتاب بطور زکوۃ دینے کی ایک صورت﴾ | 487 |
| 552 | ﴿اندازے سے زکوۃ ادا کرنے کا حکم﴾ | 488 |
| 552 | ﴿فیکٹری کے خام مال اور تیار شدہ مال دونوں پر زکوۃ واجب ہے﴾ | 489 |

## ﴿فصل فی صلوٰۃ المریض والمسافر والمعذور﴾

## ﴿مریض، مسافر اور معذور کی نماز سے متعلق مسائل﴾

### ﴿پیشانی پر زخم ہو تو سجدے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری پیشانی پر پھوڑا نکلا ہے تو کیا اس عذر کیوجہ سے میرے لئے اشارے سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؟

﴿جواب﴾ آپکو چاہیے کہ آپ صرف ناک لگا کر سجدہ کیا کریں، صورت مذکورہ میں بیان کردہ عذر کیوجہ سے اگر آپ نے اشارے سے نماز پڑھی تو وہ نماز صحیح نہیں ہوگی۔

لمافی الجوھرۃ النیرۃ(ص ۱۰۲ طبع میر محمد)

ولو کانت بجبھتہ قروح لایستطیع السجود علیھا لم یجزہ الایماء وعلیہ ان یسجد علی انفہ لایجزیہ غیر ذلک.

ولمافی الفتاوی العالمگیریۃ (۱/۱۳۶،طبع رشیدیہ)

وان کان بجبھتہ جرح لایستطیع السجود علیہ لم یجزہ الایماء وعلیہ ان یسجد علی انفہ وان لم یسجد علی انفہ رأزمالم تجزصلاتہ کذافی الذخیرۃ.

| الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: سعید احمد |
|---|---|
| ۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ | فتوی نمبر: ۹۶۸ |

### ﴿زخم کھلنے یا وضو ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص مریض ہو یا زخمی ہو اور کھڑے ہونے سے مرض بڑھ جانے کا یا زخم کھل جانے کا اندیشہ ہو، تو کیا اس عذر کی بنا پر اس سے قیام ساقط ہوگا اور بیٹھ کر نماز پڑھنا اس کے لئے صحیح ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: ایک متعلم

﴿جواب﴾ نمازی قیام پر قدرت نہ رکھتا ہو یا بڑی تکلیف کیساتھ کھڑا ہو سکے، اسی طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی صورت میں بیماری بڑھنے کا زخم کھلنے کا یا وضو ٹوٹنے کا اندیشہ اگر ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔

لما فی التنویر مع الدر والرد: (۲/۹۵،۹۶،طبع سعید)

(من تعذر علیہ القیام لمرض حقیقی ـــ(او) حکمی بان (خاف زیادتہ او بطء برء ہ بقیام .

او دوران رأسه او وجد لقيامه الما شديدا) صلى قاعدا.

وفي الشامي :(قوله خاف) اى غلب على ظنه بتجربة سابقة او اخبار طبيب مسلم حاذق

لما في العالمگيريه :(۱/۱۵۰ طبع قديمی )

اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد ـــ وكذا اذا خاف زيادة المرض او ابطأ البرء بالقيام او دوران الرأس كذا في التبيين.

لما في حلبي كبيري :(۲۲۱ طبع نعمانيه )

وان عجز المريض عن القيام عجزا حقيقيا او حكميا كما اذا قدر حقيقة لكن يخاف بسببه زيادة مرض او بطوء برء او يجد الماشديدا يصلى قاعدا يركع ويسجد "لحديث عمران بن حصين لخرجه الجماعة الامسلما قال كانت بى بواسير فسالت النبى ﷺ عن الصلوة فقال صل قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلى جنب زاد النسائي فان لم تستطع فمستلقيا لايكلف الله نفسا الا وسعها و هكذا في حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح ايضا.

ولما في البزازية:(۱/۶۲، طبع قديمی)

ان صلى في منزله قدر على القيام وان خرج الى الجماعة لا، يصلى في بيته في الاصح وقال الامام الاوزجندى يخرج ولكن يتحرم قائما ثم يقعد ثم يقوم اذا جاز الركوع ويركع من القيام، كل من لا يقدر على اداء ركن الا بحدث يسقط عنه ذلك الركن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ    واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ

۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ    فتویٰ نمبر: ۳۶۴۷

## ﴿بیماری کیوجہ سے سنن مؤکدہ کوترک کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیماری کی وجہ سے سنن مؤکدہ کا ترک کرنا شرعا کیسا ہے ؟    مستفتی: محمد ولی اللہ ڈیروی

﴿جواب﴾ مرض شدید ہو اور نماز کی ادائیگی میں تکلیف ہوتی ہو تو سنن مؤکدہ کو ترک کرنے سے گناہ گار نہیں ہوگا ویسے بلا عذر سنن مؤکدہ کو ترک کرنا بہت برا ہے۔

لما في بدائع الصنائع:(۱/۲۸۴ مطبوعه ایچ ایم سعید )

وقد واظب النبى ﷺ عليها ولم يترك شيئا منها الا مرة او مرتين لعذر هذا تفسير السنة.

ولما في التاتارخانيه:(۱/۲۶۸ مطبوعه قديمی)

وفي النوازل اذا ترك السنن ان تركها بعذر فهو معذور وان تركها بغير عذر لا يكون معذورا فيها ويسال الله تعالىٰ يوم القيامة عن تركها.

ولما فی الشامیة:(۱/۲۲۰ مطبوعه امدادیه ملتان)

من ترک سنتی لم ینل شفاعتی .وفی التحریر ان تارکها یستوجب التضلیل واللوم والمراد: الترک بلا عذر علی سبیل الاصرار کما فی شرح التحریر لابن امیر حاج.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الأحد

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:

## ﴿سفر میں سنتوں کی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفر میں سنتوں کی حیثیت کیا ہے اگر آدمی مکہ مکرمہ میں سفر کی حالت میں رہے تو طواف میں مشغول رہے یا سنتوں کا اہتمام کرے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: حاجی نصیر صاحب

﴿جواب﴾ حالت سفر میں سنتوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے ایک جماعت جن میں حضرت ابن عمرؓ بھی شامل ہیں ان کے ترک کی قائل ہے جبکہ امام شافعیؒ اور جمہور ائمہ وعلماء ان کے پڑھنے اور استحباب کے قائل ہیں، حنفیہ کے نزدیک بھی اگر گنجائش ہو تو سنن رواتب کے ادا کرنے میں فضیلت ہے اور ترک کر دینے میں کوئی حرج نہیں، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن میں لکھتے ہے کہ علماء کے اس اختلاف سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ سنتوں کی آکدیت سفر میں ختم ہو جاتی ہے یعنی غیر مؤکدہ کے حکم میں آجاتی ہیں، البتہ فجر کی سنتیں اس سے مستثنیٰ ہیں انکی آکدیت سفر میں بھی باقی رہتی ہے۔

لہٰذا مکہ مکرمہ کے اندر حج کے موقع پر حالت سفر میں آدمی کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ طواف میں مشغول رہے کیونکہ طواف کے مواقع بار بار میسر نہیں ہوتے۔

لمافی اعلاء السنن:(۷/۲۱۵،طبع دار الکتب العلمیة)

قلت: والاظهر عندی مانقله الترمذی عن الاکثر ولکن التاکید لایبقی فی السفر للراتبة مطلقا غیر سنة الفجر: کمایفیده اختلاف العلماء فی فعلها وترکها واختلاف الآثار عن النبی ﷺ فلتبقی الرواتب فی السفر غیر مؤکدة ولاتلتحق بالتطوع المطلق کمازعمه ابن القیم وسیاتی کلامنامعه وامارکعتاالفجر مؤکدة سفرا وحضرا جمیعاکما سیاتی.

ولمافی الهندیة: (۱/۱۳۹،طبع رشیدیه)

وبعضهم جوزوللمسافر ترک السنن والمختار انه لایأتی بهافی حال الخوف ویأتی بهافی حال القرار والامن هکذافی الوجیزی.

ولما فی التنویر مع الدر :(۲/ ۱۱۲ مطبع سعید)

یأتی المسافر ان کان فی حال امن وقرار والا بأن کان فی خوف وفرار لا یأتی بہا ھو المختار لانہ ترک لعذر .تجنیس .قیل الاسنۃ الفجر.

الجواب صحیح :عبد الرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :اسرار عزیز دیروی

۶ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتوی نمبر :۷۳۶

﴿رکوع اور سجدہ پر غیر قادر آدمی کا کرسی پر نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کرسی پر نماز پڑھنے کا رجحان زیادہ ہو رہا ہے اب تو ہر مسجد میں کرسیاں نظر آرہی ہیں کرسی کیوجہ سے صف بھی سیدھی نہیں رہتی خصوصا جو لوگ رکوع وسجدہ کرسی پر بیٹھ کر ادا کرتے ہیں لیکن رکعت کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ براہ کرم اس مسئلہ کو واضح فرمائیں۔ مستفتی :نصیر احمد

﴿جواب﴾ قیام سجدہ اور رکوع نماز کے ارکان میں سے ہیں بلا عذر کسی ایک رکن کو چھوڑنا یا اس کی ہیئت کو تبدیل کرنا ہرگز جائز نہیں .ہے اس سے نماز نہیں ہوتی البتہ معذور کیلئے گنجائش ہے عذر کی کیفیت مختلف ہوتی ہے اور بقدر عذر شریعت میں اس کیلئے گنجائش بھی مختلف ہوتی ہے، یعنی جو جتنا معذور ہے شریعت میں اسکے لئے ویسی ہی رعایت ہوتی ہے۔

لہٰذا جو شخص قیام پر قادر نہیں تو اس کیلئے نماز بیٹھ کر پڑھنے کی رعایت ہے اور جو صرف سجدہ پر قادر نہیں تو اس کے ذمہ سے قیام بھی ساقط ہو جاتا ہے اس لئے کہ قیام دراصل سجدہ کیلئے وسیلہ ہے ایسے شخص کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے اگر چہ کھڑے ہو کر قیام کی حالت میں اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کی بھی گنجائش ہے اور ایسا شخص جو قیام پر قادر نہیں سجدہ اصل ہیئت کیساتھ زمین پر کر سکتا ہے لیکن کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے میں اسے زیادہ آسانی ہوتی ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے اس کو چاہیے کہ رکوع وسجدہ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے ادا نہ کرے زمین پر سجدہ کا اہتمام کرے اس لیئے کہ کرسی پر بیٹھ کر سجدہ کرنا سجدہ کی اصل ہیئت کو بلا عذر ترک کرنا ہے البتہ زمین پر بیٹھنے میں دشواری ہو یا اصل ہیت کیساتھ زمین پر سجدہ کرنے پر قادر نہیں تو یہ شخص معذور کے حکم میں ہے اور کرسی استعمال کرنا ایسے شخص کیلئے جائز ہے

بلا شبہ صف کو سیدھا رکھنے کی بڑی اہمیت ہے لیکن معذور کیلئے اگر کرسی کے استعمال کی واقعی شرعا اجازت ملے تو امید ہے کہ صف کے درمیان اس خلل کے آنے سے بھی مواخذہ نہ ہوگا تاہم

ایسے شخص کو چاہیے کہ صف کی ایک طرف میں کرسی رکھیں۔

لمافی القدوری:(ص۵۰،طبع قدیمی)

فان قدر علی القیام ولم یقدر علی الرکوع والسجود لم یلزمه القیام وجاز ان یصلی قاعدایومیٔ ایماءً.

ولمافی العالمگیریة:(۱/۱۳۶طبع رشیدیه)

وکذالوعجز عن الرکوع والسجود وقدرعلی القیام فالمستحب ان یصلی قاعدابایماء، وان صلی قائمابایماء جازعندناهکذافی فتاوی قاضیخان.

ولمافی الدرالمختار:(۲/۹۷طبع سعید)

(وان تعذرا)لیس تعذرهماشرطابل تعذرالسجود کاف (لاالقیام اوماقاعدا)وهوافضل من الایماء قائمالقربه من الارض.

وفی الشامی:(بل تعذرالسجود کاف)نقله فی البحرعن البدائع وغیرهاوفی الذخیرة رجل بحلقه خراج ان سجدسال وهو قادر علی الرکوع والقیام والقرائة یصلی قاعدایومی ولوصلی قائمابرکوع وقعدواومابالسجود اجزاه والاول هوالافضل لان القیام والرکوع لم یشرعاقربة بنفسهمابل لیکوناوسیلتین الی السجود.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:سعیداحمد

۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:

## ﴿کرسی پرنماز پڑھنے والا بیٹھ کرنماز پڑھے تاکہ صف سے آگے نہ نکلے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام کہ یہ مسئلہ تو واضح ہے کہ جوآدمی زمین پرسجدہ کرنے پر قادرنہ ہو،اوراسکوزمین پربیٹھ کرنماز پڑھنے میں تکلیف ہوتواس کیلئے کرسی پراشارے سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔اب مسئلہ یہ ہے کہ اگریہ شخص جس کیلئے کرسی پرنماز پڑھنے کی گنجائش ہے ،قیام اوررکوع کھڑے ہوکرکرے اورباقی نمازکرسی پربیٹھ کرپوراکرے توکیایہ طریقہ افضل ہے یا پوری کی پوری نمازکرسی پربیٹھ کراشارے سے پڑھنا؟　　　　مستفتی:ایک مسلم

﴿جواب﴾ جوآدمی زمین پرسجدہ کرنے پرقدرت نہ رکھتا ہو،اورزمین پربیٹھنے میں بھی تکلیف ہو،توایسے شخص کیلئے کرسی پراشارے سے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے،اگرچہ وہ قیام اور رکوع پرکھڑے ہوکرقدرت رکھتا ہو،یعنی قیام اوررکوع کھڑے ہوکرکرنا اسکے ذمہ سے ساقط ہوجاتے ہیں،لہذا یہ شخص باقی نمازکرسی پراورقیام وررکوع کھڑے ہوکراگراداکریگاتویہ اگرچہ جائز

ہے، لیکن تجاوز عن الصف یعنی صف سے آگے بڑھنے کی صورت پیش آئیگی، جو کہ خلاف اُولیٰ اور مکروہ ہے، لہذا ایسے شخص کو چاہیے کہ جماعت میں وہ پوری کی پوری نماز کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے پڑھ لے۔

لما فی المشکوٰۃ:(ص، ۹۸،۹۷، کتاب الصلوٰۃ، باب: تسویۃ الصف، طبع: سعید)

"عن النعمان بن بشیر رضی الله عنه قال: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یسوی صفوفنا حتی کانما یسوی بها القداح حتی رأی انا قد عقلنا عنه ثم خرج یوماً فقام حتی کاد أن یکبر فرأی رجلا بادیاً صدره من الصف فقال عباد الله لتسون صفوفکم أو لیخالفن الله بین وجوهکم ".(رواه مسلم)

"وعن انس رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم سوّوا صفوفکم فان تسویة الصفوف من اقامة الصلوٰة".(متفق علیه)

"وعن ابن عمر رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم أقیموا الصف حاذوا بین المناکب وسدوا الخلل ولینوا بأیدی لخوانکم ولا تذرو فرجات الشیطان ومن وصل صفا وصله الله ومن قطعه قطعه الله".(رواه ابوداؤد)

ولما فی التنویر مع الدر:(۱/۴۴۴، ۴۴۵، طبع: سعید)

ومنها القیام فی فرض لقادر علیه وعلی السجود، فلو قدر علیه دون السجود ندب ایماء ه قاعدا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۴۸

## ﴿کرسی پر نماز پڑھنے کی جائز و ناجائز صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں، کہ ایک شخص قیام نہیں کرسکتا لیکن سجدہ کرنے پر قادر ہے، کیا یہ شخص اشارے سے کرسی پر نماز پڑھ سکتا ہے؟ اسی طرح وہ شخص جو زمین پر سجدہ کرنے پر قادر نہیں، باقی قیام وغیرہ سب کچھ کرسکتا ہے، کیا وہ کرسی پر نماز پڑھ سکتا ہے؟ بینوا توجروا

مستفتی: عبدالمعز، ابوبکر صدیق مسجد

﴿جواب﴾ جو شخص زمین پر سجدہ کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اس کیلئے ضروری ہے کہ زمین پر ہی سجدہ کرے، کرسی پر یا زمین پر اشارہ سے اسکی نماز نہیں ہوگی، البتہ زمین پر سجدہ کرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتا تو اشارہ سے سجدہ کرنے کی گنجائش ہے، اور ایسا شخص اگر چہ قیام پر قدرت رکھتا

ہو، قیام اسکے ذمہ فرض نہیں رہتا، وہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، قیام اسکے ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے، تاہم اسکے لئے اصل حکم تو یہ ہے کہ بجائے کرسی کے زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے رکوع، سجدہ کرے، ہاں زمین پر بیٹھنے میں بھی اگر سخت دشواری ہو تو کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے، معمولی سے عذر کو بہانہ بنا کر کرسی پر نماز پڑھنا آجکل ایک عام سا رواج بنتا جارہا ہے، یہ بہت غلط ہورہا ہے، نماز کی ظاہری مسنون ہیئت زمین پر سجود وقعود وغیرہ کا باطنی کیفیت یعنی تواضع وتضرع پر گہرا اثر ہے، کرسی پرنشست کی ہیئت اس صفت کے منافی ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو کرسی پر نماز پڑھنے سے گریز کیا جائے۔

لما فی فتاوی تاتارخانیه:(۹۲/۲ طبع:قدیمی کتب خانه)

الاصل من هذا الباب ان المريض اذا قدر على الصلاة قائما بركوع وسجود فانه يصلى المكتوبة قائما بركوع وسجود فلا يجزيه غير ذالك،وان عجز القيام وقدر على القعود فانه يصلى قاعدا بركوع وسجود ولا يجزيه غير ذالك،فان عجز عن الركوع والسجود وقدر على القعود فانه يصلى قاعدا بايماء، ويجعل السجود اخفض من الركوع فان عجز عن القعود صلى مستلقيا على ظهره.كذا فى البدائع(۱۰۲/۱ طبع سعيد)

ولما فی تنویر مع الدر:(۵۶۹/۱، طبع: سعید)

ولا قادر على ركوع وسجود بعاجز عنهما لبناء القوى على الضعيف.وفى الشامى تحت( قوله بعاجز عنهما)اى بمن يؤمى بهما قائما أوقاعدا ،بخلاف ما لو امكناه قاعدا فيصح كما سيأتى ،قال ط والعبرة للعجز عن السجود ،حتى لو عجز عنه وقدر على الركوع أومأ.

ولما فی فتاوی تاتار خانیة:(۹۲/۲، طبع: قدیمی کتب خانه)

وكذا لو عجز عن القعود مستويا وقدر على القعود متكئا يقعد متكئا لا يجزيه غير ذالك___فان كان يقدر على القيام ولا يقدر على السجود أومى ايماء وهو قاعد___قالا انه بالخيار ان شاء صلى قائما بايماء وان شاء صلى قاعدا بايماء، وهو الافضل عندنا وفى الخانية والمستحب ان يصلى قاعدا بايماء

ولما فی التنویر مع الدر:(۴۴۴/۱، ۴۴۵، طبع: سعید)

ومنها القيام فى فرض لقادر عليه وعلى السجود ،فلو قدر عليه دون السجود ندب ايمائه قاعدا

ولما فی الشامی:(۴۴۵/۱، طبع: سعید)

(قوله القادر عليه)فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر أو حكما كما لو حصل له به ألم شديد أو خاف زيادة المرض___(قوله فلو قدر عليه)اى على القيام وحده أو مع الركوع كما فى المنية ندب ايماء قاعدا،اى لقربه من السجود،وجاز ايمائه قائما كما فى البحر___ولذا ان القيام وسيلة الى السجود للخرور والسجود أصل لأنه شرع عبادة

بلا قيام كسجدة التلاوة، والقيام لم يشرع عبادة وحده، حتى لو سجد لغير الله تعالى يكفر بخلاف القيام، واذا عجز عن الاصل سقطت الوسيلة كالوضوء مع الصلوة والسعي مع الجمعة. كذا في حلبي كبير، ص ۲۶۲ طبع نعمانيه

ولما في الهندية: (۱/۱۳۶، طبع: رشيديه)

واذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد كذا في الهداية ۔۔۔ ولو كان قادرا على بعض القيام دون تمامه يؤمر بأن يقوم قدر ما يقدر حتى اذا كان قادرا على ان يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقراءة أو كان قادرا على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائما ويقرأ قدر ما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز ۔۔۔ ثم اذا صلى المريض قاعدا كيف يقعد الاصح ان يقعد كيف يتيسر عليه ۔۔۔ واذا لم يقدر على القعود مستويا وقدر متكئا أو مستندا الى حائط أو انسان يجب أن يصلي متكئا أو مستندا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر لکی مروت

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۵۱۰

## ﴿کمزوری کی وجہ سے مسجد تک نہ جاسکے تو گھر میں نماز پڑھنے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جب گھر میں نماز پڑھے تو قیام پر قدرت رکھتا ہے، لیکن جماعت کیلئے گھر سے نکلے تو قیام پر قادر نہیں ہوتا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس شخص کیلئے گھر میں نماز پڑھنا اولیٰ ہے یا جماعت میں جانا۔

﴿جواب﴾ گھر سے مسجد تک چلنے کیوجہ سے اتنی کمزوری اگر ہو جاتی ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنے کی قوت نہیں رہتی تو گھر میں کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے۔

لما في العالمگيريه: (۱/۱۵۰ طبع: قديمي)

المريض اذا صلى في بيته يستطيع القيام واذا خرج لا يستطيع اختلف المشائخ رحمهم الله تعالى فيه المختار انه يصلي في بيته قائما وبه يفتي هكذا في المضمرات.

ولما في خلاصة الفتاوى: (۱/۱۹۷ طبع: رشيديه)

فلو ان المريض اذا صلى في بيته يستطيع القيام واذا خرج الى الجماعة لا يستطيع القيام يصلي في بيته قائما قال شمس الائمة الاوزجندي: يخرج الى الجماعة لكن يكبر قائما ثم يقعد ثم يقوم عند الركوع والاول اصح وبه يفتي.

ولما في البزازية: (۱/۶۲ طبع: قديمي)

ان صلى في منزله قدر على القيام، وان خرج الى الجماعة لا، يصلي في بيته في الاصح، وقال الامام الاوزجندي يخرج ولكن يتحرم قائما ثم يقعد ثم يقوم اذا جاء الركو

ع ويركع من القيام ، كل من لا يقدر على اداء ركن الا بحدث يسقط عنه ذلك الركن .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ روحانی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۰۶

## ﴿قیام پورا نہ کر سکے تو دوران قیام بیٹھ جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اس پر قادر ہے کہ کچھ دیر کے لئے نماز میں کھڑا ہو جائے، لیکن اس پر قادر نہیں ہے کہ نماز کو کھڑے کھڑے پورا کر دے تو کیا وہ اس طرح کر سکتا ہے، کہ بعض قراءۃ کھڑے ہو کر کرے اور دیگر بعض بیٹھ کر کرے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یہ شخص نماز کو قیاماً شروع کرنے کی اگر قدرت رکھتا ہے، تو نماز کو قیاماً شروع کر دے اور ضعف لاحق ہونے پر باقی ماندہ نماز بیٹھ کر ادا کرے۔

لمافی العالمگیریہ: (۱/۱۵۰، طبع: قدیمی)

ولو كان قادرا على بعض القيام دون تمامه يومر بان يقوم قدر ما يقدر حتى اذا كان قادرا على ان يكبر قائما ولايقدر على القيام للقراءة او كان قادرا على القيام لبعض القراءة دون تمامها يومر بان يكبر قائما ويقرأ قدر ما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز.

ولما فی التنویر مع الدر والرد: (۲/۹۷، طبع: سعید)

وان قدر على بعض القيام قام )لزوما بقدر ما يقدر ولو قدر آية وتكبيرة على المذهب ، لان البعض معتبر بالكل .قوله لان البعض معتبر بالكل )اى ان حكم البعض كحكم الكل ،بمعنى ان من قدر على كل القيام يلزمه ،فكذا من قدر على بعضه.

ولما فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: (۲۲۱، طبع: قدیمی)

والا بان قدر على بعض القيام (قام بقدر ما يمكنه )بلا زيادة مشقة :ولو بالتحريمة ، وقراءة آية ــــــ قوله (قام بقدر ما يمكنه ) لان البعض معتبر بالكل .

ولما فی حلبی کبیر: (۲۲۹، طبع: قدیمی ، نعمانیہ)

ولو قدر على بعض القيام لا كله لزمه ذلك القدر حتى لو كان لايقدر الا على قدر التحريمة لزمه ان يتحرم قائما ثم يقعد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ روحانی

۹ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۵۹۱

## ﴿جس آدمی کے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو کیا وہ اکیلے نماز پڑھے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی ہے جو منفرداً تو

کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتا ہے لیکن اگر باجماعت نماز پڑھے تو اس کے لیے کھڑا ہونا مشکل ہے تو ایسی صورت میں وہ منفرداً نماز پڑھے یا جماعت کے ساتھ پڑھے وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ ایسے شخص کے لیے اگرچہ گھر میں اکیلے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ امام کے ساتھ باجماعت نماز پڑھے، قیام کی حالت میں نماز شروع کرے اور جب دشواری محسوس کرے تو بیٹھ جائے پھر رکوع کے لیے کھڑا ہو۔ بہر حال جب کھڑا ہونا اس کے لیے مشکل ہو تو اس کے ذمے نہیں رہتا۔

لما فی الدر المختار:(۳۶/۱ طبع سعید)

ولو اضعفه عن القيام الخروج لجماعة صلى في بيته قائماً ،به يفتى خلافاً للأشباه (قوله به يفتى )وجهه ان القيام فرض بخلاف الجماعة ،وبه قال مالكؒ والشافعيؒ خلافاً لأحمدؒ بناء على ان الجماعة فرض عنده ،وقيل يصلي مع الامام قاعداً عندنا لانه عاجز ذلك ذكره في المحيط ،وصححه الزاهدي في شرح المنية ولم قول ثالث مشى عليه في المنية ،وهو انه يشرع مع الامام قائماً ثم يقعد فاذا جاء وقت الركوع يقوم ويركع اى ان قدر، وما مشى عليه الشارح تبعاً للنهر جعله في الخلاصة اصح وبه يفتى.

ولما في السعاية:(۱۱/۲ اسهيل اكيڈمی)

واختار صاحب المنية في هذه المسئلة يشرع قائماً ثم يقعد فاذا حان وقت الركوع يقوم ويركع ،قال شارحها هذا انما هو اذا قدر على هذا القدر من القيام واما اذا لم يقدر عليه ايضاً ما مر وحاصل المرام ان القيام انما يفترض في صلوة الفرض للقادر عليه وعلى السجود من غير ابتلاء البلية التي هي اشد من تركه فاحفظ هذا التفصيل.

ولما في البحر الرائق:(۲۹۲/۲ طبع سعيد )

ومنها ما في الخلاصة وغيرها لو كان بحال لو صلى منفرداً يقدر على القيام ولو صلى مع الامام لا يقدر فانه يخرج الى الجماعة ويصلي قاعداً وهو الاصح كما في المجتبى لانه عاجز عن القيام عند الاداء وهو المعتبرة وصحح في الخلاصة انه يصلي في بيته قائماً قال وبه يفتى ،واختار في منية المصلي القول الثالث وهو انه يشرع قائماً ثم يقعد فاذا جاء وقت الركوع يقوم ويركع .

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۵ شعبان ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:

## ﴿رکوع اور سجدہ پر غیر قادر آدمی کی نماز﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ایسا مریض ہے

کہ مرض کی وجہ سے نہ وہ سجدہ کر سکتا ہے اور نہ رکوع کر سکتا ہے لیکن کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر نماز پڑھنے پر قادر ہے تو اب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے یا کھڑے ہو کر؟ مستفتی: سیف الاعظم

﴿جواب﴾ ایسا آدمی بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھے البتہ اگر کھڑے ہو کر اشارے سے نماز پڑھے تب بھی نماز درست ہے لیکن بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے۔

لمافی الهندية: (۱۳۶/۱، طبع رشیدیه)

وكذا لو عجز عن الركوع و السجود و قدر على القيام فالمستحب ان يصلي قاعداً بايماء، وان صلى قائما بايماء جاز عندنا هكذا في فتاوىٰ قاضيخان.

ولمافی الشامی: (۵۶۷/۲، طبع امدادیه)

رجل بحلقه خراج ان سجد سال وهو قادر على الركوع والقيام والقرأة يصلي قاعداً يومي ولو صلى قائما بركوع وقعد و أوما بالسجود اجزأه والأول أفضل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۳۰ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۷۷

## ﴿نمازی سجدہ اگر زمین پر نہ کر سکے تو قیام اسکے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص قیام پر قادر ہے، لیکن رکوع اور سجدہ پر قادر نہیں ہے تو اس کے لئے اولیٰ کیا ہے کہ یہ کھڑے ہو کر نماز اشارے سے ادا کرے یا بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ اس صورت میں کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا صحیح ہوگا؟

﴿جواب﴾ نمازی سجدہ اگر زمین پر نہ کر سکے تو قیام بھی اس کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے، ایسے نمازی کیلئے حکم یہ ہے، کہ وہ زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرے اگر چہ قیام ورکوع اصل ہیئت کیساتھ ادا کرنے کی بھی گنجائش ہے، لیکن زمین پر بیٹھ کر اشارے سے پڑھنا زیادہ اولیٰ ہے۔ اور کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے پڑھنے کی گنجائش صرف اس صورت میں ہے اگر وہ زمین پر نہ بیٹھ سکتا ہو یا زمین پر بیٹھ کر بڑی تکلیف کیساتھ نماز پڑھتا ہو، محض سہولت کیلئے کرسی استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الشامی: (۹۷/۲، طبع رشیدیه)

(وان تعذر ا)ليس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود كاف (قوله بل تعذر السجود كاف) نقله في البحر عن البدائع وغيرها، وفي الذخيرة: رجل بحلقه خراج ان سجد

سال وهو قادر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعدا يؤمي ،ولو صلى قائما بركوع وقعد وأومأ بالسجود اجزأه ،والاول افضل ،لان القيام والركوع لم يشرع قربة بنفسها، بل ليكونا وسيلتين الى السجود.

ولما في فتاوى قاضيخان :(۱/۱۵۳،طبع قديمى)

وكذا لو عجز عن الركوع والسجود وقدر على القيام يصلي قاعدا بايماء ،لان القيام وسيلة الى السجود ،فاذا سقط المقصود سقطت الوسيلة ،وان صلى قائما بايماء جاز عندنا والمستحب ان يصلي قاعدا بايماء.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته :(۲/۸۲۴،طبع رشيديه كوئٹه)

وان قدر المريض على القيام ،ولم يقدر على الركوع والسجود ،لم يلزمه القيام ،وجاز ان يصلي قاعدا يؤمي برأسه ايماء ،والافضل الايماء قاعدا ،لانه اشبه بالسجود ،لكون رأسه اخفض الى الارض.

ولما في حاشية الطحطاوى :(۲۳۱،طبع قديمى)

قوله في:(صلى قاعدا بالايماء )او قائما به :والاول افضل لانه اشبه بالسجود لكونه اقرب الى الارض وهو المقصود كذا في التبيين.

واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ — الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ: ۳۶۴۹ — ۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

## ﴿اگر کوئی قبلہ رخ ہونے سے عاجز ہو تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب جو لوگ استقبال قبلہ سے عاجز ہیں ان کے لیے کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ایسا مریض جو مرض کی وجہ سے قبلہ رخ ہونے سے عاجز ہے اور اس کے پاس کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہیں ہے جو اسے قبلہ رخ کرے تو ایسے مریض کا قبلہ وہی جہت ہوگی جس پر وہ قادر ہے، اسی طرح وہ لوگ جو دشمن یا مال کے خوف سے قبلہ رخ نہیں ہو سکتے تو ان کا قبلہ بھی قدرت والی جہت ہوگی۔

(لمافی التنویر والدر ۱/۴۳۲طبع سعید)

(وقبلة العاجز عنها )وان وجد موجها عند الامام أو خوف مال ،وكذا كل من سقط عنه الاركان (جهة قدرته)مضطجعا بايماء لخوف رؤية عدو ولم يعد ،لان الطاعة بحسب الطاقة.

قال الشامي:(قوله عند الامام )لان القادر بقدرة الغير عاجز عنده ،لان العبد يكلف بقدرة نفسه لا بقدرة غيره خلافاً لهما ،فيلزمه عندهما التوجه ان وجد موجها ،وبقولهما

جزم في المنية والمنح والدرر والفتح بلا حكاية خلاف.

(ولما في الحلبي الكبيري ص ۱۹۲ طبع نعمانية)

وان كان المصلي مريضا لا يقدر معه على التوجه الى القبلة وليس معه احد يوجهه اليها او كان صحيحاً يقدر على التوجه الا انه يخاف ان توجه من عدو او سبع ياتيه من جهة اخرى فيضره في ماله او بدنه — يصلي الى اى جهة قدر على التوجه اليها من غير حصول ضرر عليه لان التكليف بقدر الوسع والحرج مدفوع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۷ شعبان ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:

## ﴿دوران سفر قصر پڑھنا ہی واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ سفر کے دوران پوری نماز پڑھنا افضل ہے یا قصر کر کے پڑھنا ضروری ہے؟　　　مستفتی: ایک مسلم

﴿جواب﴾ دوران سفر قصر نماز پڑھنا ہی واجب ہے پوری پڑھنا جائز نہیں، اگر غلطی سے کسی نے سفر کی نماز پوری پڑھ لی تو اس کا اعادہ واجب ہے۔

لما في صحيح المسلم كتاب صلوة المسافر وقصرها ۲۴۱/۱ طبع قديمي

عن يعلى بن امية قال قلت لعمر بن خطاب ليس عليكم جناح ان تقصروا من الصلوة ان خفتم ان يفتنكم الذين كفروا فقد امن الناس فقال عجبت مما عجبت منه فسألت رسول الله ﷺ عن ذلك فقال صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته.

ولما في الشامي ۱۲۳/۲ طبع سعيد كراچى

صلى الفرض الرباعي ركعتين وجابا لقول ابن عباس ان الله فرض على لسان نبيكم صلاة المقيم اربعا والمسافر ركعتين ولذا عدل المصنف عن قولهم قصر لان الركعتين ليستا قصرا حقيقة عندنا بل هم تمام فرضه والاكمال ليس رخصة في حقه بل اساءة.

ولما في فتاوى الهنديه ۱۳۹/۱ طبع رشيديه كوئته

وفرض المسافر في الرباعية ركعتان كذافي الهداية والقصر واجب عندنا كذا في الخلاصة فان صلى اربعا وقعد في الثانية قدر التشهد اجزأته والاخريان نافلة ويصير مسيئا لتاخير السلام وان لم يقعد في الثانية قدرها بطلت كذا في الهداية.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفرلہ ولوالدیہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۷۰۹

## ﴿ثبوت قصر وتفسیر صلوٰۃ وسطیٰ﴾

کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ:

﴿سوال﴾ (۱) کیا قرآن پاک میں قصر نماز کا ذکر آیا ہے؟ اگر آیا ہے تو حوالہ عنایت کریں، (۲) صلاۃ وسطیٰ سے مراد صلاۃ عصر ہے یا صلاۃ فجر؟

مستفتی: ڈاکٹر فاروق ابوبکر مسجد ڈیفنس

﴿جواب﴾ (۱) واضح رہے کہ قرآن کریم میں ہر حکم شرعی کا بیان ہونا کوئی ضروری نہیں ہے شریعت کے بہت سارے احکام ایسے ہیں جن کا قرآن کریم میں صراحتاً کوئی ذکر نہیں ہے تاہم قرآن کریم میں قصر نماز کا حکم صاف طور پر آیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا O (رکوع: ۱۵، آیت ۱۰۱)

جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ نہیں کہ کچھ کم کرو نماز میں سے یعنی جو نماز حضر میں چار رکعت کی ہو اس کی دو رکعت پڑھو۔

قال الامام الحافظ عماد الدین ابن کثیر الدمشقی فی تفسیرہ:(۳۴۷/۲)

یقول تعالیٰ: (واذاضربتم فی الارض) أی سافرتم فی البلاد ــــ وقوله (فلیس علیکم جناح أن تقصروا من الصلوٰۃ) أی تخففوا فیها اما من کمیتها بأن تجعل الرباعیة ثنائية کما فهمه الجمهور من هذه الآیة واستدلوابها علی قصر الصلوٰۃ فی السفر علی اختلافهم فی ذلک......عن ابن عباس قال: صلینا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم بین مکة والمدینة و نحن آمنون لانخاف بینهما رکعتین رکعتین۔وهکذا رواہ الترمذی والنسائی جمیعاعن قتیبة...... عن ابن عباس أن النبی صلی الله علیه وسلم خرج من المدینة الی مکة لایخاف الارب العلمین فصلی رکعتین ثم قال: الترمذی صحیح، وقال البخاری: حدثنا ابو معمر ــــ حدثنا یحیی بن أبی اسحاق، قال: سمعت انسا یقول: خرجنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم من المدینة الیٰ مکة فکان یصلی رکعتین رکعتین حتی رجعنا الیٰ المدینة قلت اقمتم بمکة شیئا؟ قال: أقمنا بها عشرا...... فهذه الاحادیث دالة صریحاان القصر لیس من شرطه وجود الخوف وکذاقال العلامة الآلوسیؒ فی تفسیر (فلیس علیکم جناح) وقد أخذ بعضهم بظاهر هذا الشرط فقصر القصر علی الخوف...... والذی علیه الائمة أن القصر مشروع فی الأمن أیضا...... عن ابن عباس قال:((صلینا مع رسول الله صلی الله علیه واٰله وسلم بین مکة والمدینة ونحن آمنون لانخاف شیئا رکعتین) تفسیر روح المعانی:(۱۲۷/۵ مطبع رشیدیه)

(۲) صلاۃ وسطیٰ (درمیان والی نماز) یوں تو ہر نماز درمیان والی بن سکتی ہے لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے عصر کی نماز مراد ہے چونکہ یہ دن اور رات کے بیچ میں ہے اور اس کی تاکید احادیث میں زیادہ آئی ہے اس لئے کہ اس وقت دنیا کے مشاغل زیادہ ہوتے ہیں اور عبادت کے لئے وقت کو فارغ کرنا نفس پر بڑا شاق گزرتا ہے۔

لما قال الامام الحافظ عماد الدين ابن كثير:

في تفسير (والصلوٰة الوسطى) وقد اختلف السلف والخلف فيها اى صلاة هي؟ فقيل: انها هي الصبح حكاه مالك في الموطأ وقيل: انها صلاة الظهر وقيل: انها صلاة العصر. قال الترمذي والبغوي رحمهما الله: وهو قول أكثر علماء الصحابة وغيرهم. وقال القاضي الماوردي: هو قول جمهور التابعين وقال الحافظ ابو عمر بن عبدالبر: هو قول أكثر أهل الأثر وقال ابو محمد بن عطية في تفسيره وهو قول جمهور الناس وقال الحافظ ابو محمد عبدالمؤمن بن خلف الدمياطي في كتابه المسمى بكشف المغطى في تبيين الصلاة الوسطى وقد نص فيه: انها العصر. وحكاه عن عمر وعلي وابن مسعود وأبي ايوب وعبدالله بن عمرو وسمرة بن جندب وأبي هريرة وأبي سعيد وحفصة وأم حبيبة وأم سلمة وابن عباس وعائشة على الصحيح عنهم وبه قال عبيدة وابراهيم النخعي...... وهو مذهب احمد بن حنبل قال القاضي الماوردي والشافعي قال ابن المنذر: وهو الصحيح عن أبي حنيفة وأبي يوسف، و محمد واختاره ابن حبيب المالكيؒ.......... وخصت بالذكر لأنها تقع في وقت اشتغال الناس لاسيما العرب. تفسير روح المعاني: (۲/۵۵۱)

وقال العلامة القاضي ثناء الله العثماني پاني پتي في تفسيره (والصلوٰة الوسطى) عطف الخاص على العام لمزيد الاهتمام والوسطى تانيث الاوسط. قال البغويؒ اختلف العلماء من الصحابة فمن بعد هم في الصلوٰة الوسطى..... وقال الأكثرون وهو أرجح الأقوال أنها صلاة العصر رواه جماعة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو قول علي وابن مسعود وأبي أيوب وأبي هريرة وعائشة وبه قال ابراهيم النخعي وقتادة والحسن وهو مذهب أبي حنيفة وأحمد لحديث على أن النبي صلى الله عليه وسلم ......رواه مسلم. تفسير مظهري: (۱/۳۳۵)

واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی | الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۱ | ۴ صفر الخیر ۱۴۲۷ھ

**﴿پندرہ یا زیادہ ایام کی تشکیل ایک ہی شہر میں ہو تو اتمام واجب ہے﴾**

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئٹہ شہر میں ایک

جماعت کی تشکیل ہوئی ہے وہ لوگ نمازوں کا قصر کرتے ہیں اگر اتمام کا کہا جائے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ کسی بھی وقت ہمیں رائیونڈ والے واپس بلا سکتے ہیں۔لہذا ان لوگوں کا قصر صحیح ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ کسی ایک شہر میں 15 یا زیادہ ایام کی اقامت کی نیت کرنے سے مسافر آدمی مقیم ہو جاتا ہے لھذا کوئٹہ شہر میں 15 یا زیادہ دنوں کی تشکیل اس جماعت کی اگر ہوئی ہے، تو کوئٹہ شہر ان کے لئے وطن اقامت ہے جب تک دوبارہ وہاں سے سفر پر نہیں نکلیں گے پوری نماز پڑھنا ضروری ہوگا۔ باقی یہ بات جو مشہور ہے کہ رائیونڈ مرکز والے جماعتوں کو کبھی بھی بلا سکتے ہیں اس لئے انکی اقامت معتبر نہیں ہے، یہ حکم تب ہوتا اگر رائیونڈ کی بزرگوں کے طرف سے اس طرح کی ہدایت ہوتی۔ ہماری معلومات کے مطابق ایسی کوئی ہدایت نہیں ہوتی بلکہ انکی طرف سے یہی حتمی فیصلہ ہوتا ہے کہ دی ہوئی تشکیل پوری کرنے کے بعد واپسی کریں۔ تشکیل کے ایام مکمل کئے بغیر واپسی کی نہ ہدایت ہوتی اور نہ اجازت۔ اور احتمال اگر چہ ہوتا ہے، لیکن جماعت کے کام کی نوعیت ایسی نہیں ہے جس میں جہاد وقتال کیطرح امیر کی طرف سے رخ تبدیل کرنے یا واپسی کا حکم آنے کا غالب احتمال ہو۔

لما فی الهندية :(۱۳۹/۱ طبع: رشيدية)

ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة او قرية خمسة عشر يوما أو اكثر.

ولما فى الفقه الحنفى:( ۲۹۶/۱ طبع: دار الكلم)

ومن دخل بلدا فنوى الاقامة فيه نصف شهرا او اكثر اتم الصلاة الرباعية ولا يزال يتم حتى يرتحل عنه بانشاء سفر منه.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

ار جب ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۲۴۸۳

## ﴿بیس دن اگر مختلف آبادیوں میں رہنے کی نیت ہو تو نمازوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری تشکیل رائیونڈ سے بیس (۲۰) دن کے لئے پشاور کی ایک آبادی میں ہوئی لیکن مکمل بیس دن ایک ہی آبادی میں نہیں گزارے بلکہ کچھ دن اس آبادی میں اور کچھ دن ساتھ والی آبادی میں اور یہ آبادیاں آپس

میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں کیا ایسی صورت میں ہم مقیم شمار ہونگے یا مسافر ہماری نمازوں کا کیا حکم ہے؟ براہ کرم جواب دیکر مشکور وممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مسافر جب کسی ایک آبادی میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کی نیت کرے تو وہ مقیم شمار ہوتا ہے اور اس کے ذمہ نماز کا پورا پڑھنا ضروری ہے لیکن ایک آبادی میں رہنے کی نیت اگر نہ ہو تو وہ بدستور مسافر ہی شمار ہوگا اور اس کے ذمہ نمازوں کا قصر کرنا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ کی نیت ایک ہی آبادی میں رہائش کی نہیں ہے بلکہ مختلف آبادیوں میں رہنے کی ہے اور یہ آبادیاں آپس میں ایک دوسرے سے فاصلہ پر اور جدا جدا ہیں گو انکے درمیان فاصلہ کم ہی کیوں نہ ہو آپ مسافر شمار ہونگے اور نمازوں میں قصر کریں گے، اور اگر یہ آبادیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں تو ایسی صورت میں یہ ایک ہی قریہ شمار ہونگی اور آپ مقیم ہونگے آپکے ذمہ نمازوں کا پورا پڑھنا ہوگا۔

لما فی بدائع الصنائع :(۱/۹۷-۹۸،طبع سعید)

واما بیان ما یصیر المسافر به مقیما فالمسافر یصیر مقیما بوجود الاقامة والاقامة تثبت باربعة اشیاء احدها صریح نیة الاقامة وهو ان ینوی الاقامة خمسة عشر یوما فی مکان واحد صالح للاقامة فلا بد من اربعة اشیاء نیة الاقامة ونیة مدة الاقامة واتحاد المکان وصلاحیته للاقامة— واما اتحاد المکان فالشرط نیة مدة الاقامة فی مکان واحد لان الاقامة قرار والانتقال یضاده ولا بد من الانتقال فی مکانین —الخ وان کانا مصرین نحو مکة ومنی او الکوفة والحیرة او قریتین او احدهما مصر والآخر قریة لا یصیر مقیما لانهما مکانان متباینان حقیقة وحکما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۱۴ شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:

## ﴿قیام معلوم نہ ہو کہ کب تک ہوگا تو قصر پڑھنا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم ڈرائیور ہیں، گاڑی کے مالک نے ہمارے لئے مختلف شہروں میں رہائش کے لئے کوارٹرز کا انتظام کیا ہوا ہے ہم جب کسی شہر میں جاتے ہیں تو ان ہی کوارٹرز میں رہائش اختیار کرتے ہیں تو دوران رہائش نمازوں کا اتمام کریں یا قصر؟، اور سنت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ

اب اس شہر میں جانا ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

﴿۲﴾ (ب) آپ لوگوں کی اپنی آبادی اور اس شہر کی طرف آپ لوگوں کی منتقلی ہوتی ہے ۱۲۰ کلومیٹر ہے ... اپنی آبادی سے نکلتے ہی آپ مسافر قرار پاتے ہیں۔ جو شہر میں آ کر آپ لوگوں کو علم ہو کہ یہیں ہے کہ اس شہر میں کتنے دن کے لئے رہنا ہے تو اس صورت میں بھی آپ لوگ مسافر ہیں اگر چہ شہر میں پندرہ دن سے زیادہ بھی رہنے کا اتفاق ہو جائے۔ البتہ پہلے سے کاروں کے مالک کے ذریعہ قیام کی مدت سے آپ لوگوں کو علم ہو کہ پندرہ یا زیادہ دنوں کے لئے اس شہر میں رہنا ہے تو ایسی صورت میں یہ آبادی وطن اقامت شمار ہو گی اور پوری نماز پڑھنا ضروری ہوگا۔ سنتوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ فجر کی سنتوں کو پڑھ لیا کریں اس لئے کہ فجر کی سنتوں کی تاکید زیادہ آئی ہے اور باقی سنتوں کا موقع ہو تو پڑھنا چاہئے اور موقع نہ ہو مثلاً سفر جاری ہے منزل تک پہنچنے کے لئے جلدی ہے یا شہر میں کام جلدی نمٹانے کے لئے سنت چھوڑنے کی ضرورت ہو تو چھوڑ دیا کریں البتہ چار رکعات والی فرض نمازوں کو دو رکعت پڑھنا ضروری ہے، فرض کا حکم سنتوں کی طرح نہیں ہے کہ موقع ہو تو پوری پڑھ لیں اور موقع نہ ہو تو صرف دو پڑھ لیں۔ مسافر کے لئے فرض نمازوں میں قصر کرنا لازمی ہے۔

لما في الهندية: (۱/۱۴۱ طبع رشيدية)

وكل من كان تبعا لغيره يلزمه طاعته يصير مقيما بإقامته ومسافرا بنيته ..... الأصل أن من يمكنه الإقامة باختياره يصير مقيما بنية نفسه ومن لا يمكنه الإقامة باختياره لا يصير مقيما بنية نفسه حتى إن المرأة إذا كانت مع زوجها في السفر ..... والأجير مع مستأجره والجندي مع أميره فهؤلاء لا يصيرون مقيمين بنية أنفسهم.

ولما في الدر المختار مع التنوير: (۲/۱۳۱ طبع سعيد كراتشي)

(ويأتي) المسافر (بالسنن) إن كان (في حال أمن وقرار وإلا) بأن كان في خوف وفرار (لا) يأتي بها هو المختار.

ولما في إعلاء السنن: (۷/۱۵۳ طبع دار الكتب العلمية)

قلت: والأظهر عندي ما نقله الترمذي عن الأكثر ولكن التأكد لا يبقى في السفر للرواتب مطلقا غير سنة الفجر كما يفيده اختلاف العلماء في فعلها وتركها واختلاف الآثار عن النبي صلى الله عليه وسلم فتبقى الرواتب في السفر سنة غير مؤكدة ولا

تلحق بالتطوع المطلق سواء ما كانتا الفجر مؤكدة سفرا وحضرا جميعاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۸۰

## ﴿سمندری سفر کے دوران قصر نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ماہی گیر سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے حکومت سے بیس دن کی اجازت لیکر نکلتے ہیں، لیکن انکی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر پانچ، چھ دن میں مچھلیوں کی مطلوبہ مقدار حاصل ہوگئی تو واپس آجائیں گے اور کبھی ایسا ہوتا بھی ہے اور بیس دن کی اجازت احتیاطاً لی جاتی ہے اور سمندر میں ایک جگہ نہیں بلکہ مختلف جگہوں پر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور یہ انکا دائمی کاروبار ہے تو کیا انکا یہ سفر سفرِ شرعی شمار ہوگا یا نہیں؟ اور وہ لوگ قصر نماز پڑھیں گے یا پوری؟　　　مستفتی: عبداللہ صاحب

﴿جواب﴾ ماہی گیر جب سمندر میں مسافت سفر کے ارادہ سے نکلیں یعنی سمندر میں اتنا سفر کرنے کا ارادہ ہو جتنا کشتی ہوا کے معتدل ہونے کی صورت میں تین دن میں مسافت طے کرتی ہے تو یہ لوگ قصر نماز ہی پڑھیں گے اگرچہ مہینوں کی مدت سمندر میں رہیں کیونکہ سمندر میں اقامت کا کوئی اعتبار نہیں۔

لما في الهندية: (۱/۱۳۸-۱۳۹، طبع رشيديه)

والمعتبر في البحر ثلاثة أيام في ريح مستوية غير غالبة ولا ساكنة — (ونية الاقامة انما تؤثر بخمس شرائط ترك السير حتى لو نوى الاقامة وهو يسير لم يصح وصلاحية الموضع حتى لو نوى الاقامة في بر أو بحر أو جزيرة لم يصح).

ولما في الدر المختار: (۲/۱۲۵، طبع سعيد)

أو ينوى اقامة نصف شهر بموضع واحد صالح لها من مصر أو قرية أو صحراء دارنا وهو من أهل الأخبية فيقصر ان نوى الاقامة في اقل منه أى نصف شهر او نوى فيه لكن في غير صالح كبحر أو جزيرة. قال العلامة ابن عابدين: قوله كبحر قال في المجتبى والملاح مسافر الا عند الحسن وسفينته أيضاً ليست بوطن.

ولما في خلاصة الفتاوىٰ: (۱/۱۹۹، طبع رشيديه)

وفي شرح الطحاوي ولو نوى الاقامة في مفازة او في بحر او سفينة او في جزيرة من جزائر البحر لا يكون مقيماً، ولو نوى الاقامة في موضعين

خمسة عشر يوما لا يصير مقيما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۱۳۹

## ﴿کشتی میں کھڑا ہونا مشکل ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم مچھلی پکڑنے کے لیے سمندر میں نکلتے ہیں اور اس میں نماز کا وقت بھی آتا ہے تو اس صورت میں ہم کس طریقہ سے نماز پڑھیں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر؟ کیونکہ اکثر اوقات کشتی میں کھڑا ہونا مشکل ہوتا ہے۔

﴿جواب﴾ کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مشکل ہو تو بیٹھ کر پڑھنے کی گنجائش ہے۔

لما في الدر المختار: (۱۰۱/۲، طبع سعيد)

(صلى الفرض في فلك) جار (قاعدا بلا عذر صح) لغلبة العجز (وأساء) وقالا: لا يصح الا بعذر وهو الأظهر.

وفي الشامية: (قوله جار) أي سائر احترازا عن المربوط (قوله قاعدا) أي يركع ويسجد لا موطئا اتفاقا بحر (قوله لغلبة العجز) أي لأن دوران الرأس فيها غالب، والغالب كالمتحقق فأقيم مقامه.

ولما في حاشية الطحطاوي: (ص۴۰۹، طبع قديمي)

فصل الصلاة في السفينة صلاة الفرض والواجب فيها وهي جارية حالة كونه قاعدا بلا عذر صحيحة عند ابي حنيفة لكن بالركوع والسجود لا بالأيماء لأن الغالب في القيام دوران الرأس والغالب كالمتحقق لكن القيام فيها والخروج أفضل ان أمكنه لأنه أبعد عن شبهة الخلاف وأسكن لقلبه وقالا لا تصح جالسا الا من عذر وهو الأظهر لحديث ابن عمرؓ أن النبي صلى الله عليه وسلم سئل عن الصلاة في السفينة فقال: صل فيها قائما الا أن تخاف الغرق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ

۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۰۹

## ﴿ایک دو دن کسی شہر میں رہنے سے آدمی مقیم نہیں بنتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین چچازاد بھائی گاؤں سے اسی ۸۰ کلومیٹر دور شہر میں پڑھتے ہیں رہائش کیلئے کرایہ پر گھر لیا ہے ایک مہینہ ہماری

خدمت کیلئے ہم تینوں میں سے ایک کی والدہ ہمارے ساتھ ہوتی ہیں جسکی والدہ جس مہینے ہمارے ساتھ ہوتی ہیں، اسکا والد اسی مہینے میں ہفتہ دو ہفتہ میں ایک دن ہمارے ہاں آتے ہیں تو کیا ہمارے ہاں آکر وہ سفر کی نماز پڑھیں گے یا قصر کی؟ مستفتی: طاہرامین

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ تینوں میں سے جس کے بھی والد صاحب ایک دو دن کے لئے آپ کے پاس آئیں تو وہ مسافر کیطرح نماز پڑھیں گے جب تک کے پندرہ دن یا اس سے زیادہ آپ کے ہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہ کریں۔

لما فی تنویر الابصار:(۱۲۱/۲،طبع سعید)

من خرج من عمارة موضع اقامته قاصداً مسيرة ثلثة ايام ولياليها بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة صلى الفرض الرباعي ركعتين ولو عاصيا حتى يدخل موضع مقامه او ينوى اقامة نصف شهر بموضع صالح لهافيقصران نوى الاقامة فى اقل منه اى فى نصف شهراونوى فيه لكن فى غير صالح.

ولما فی الهندية:(۱۳۹/۱،طبع رشيديه)

وان نوى الاقامة اقل من خمسة عشريوما قصر هكذافى الهداية ولوبقى فى المصر على عزم انه اذاقضى حاجته يخرج ولم ينوالاقامة خمسة عشريوماقصر كذافى التهذيب.

ولما فی البحر الرائق:(۱۳۱/۲،طبع سعید)

قوله حتى يدخل مصره او ينوى الاقامة نصف شهر ببلد او قرية) متعلق بقوله قصر اى قصر الى غاية دخول المصر اونية الاقامة فى موضع صالح للمدة المذكورة فلا يقصر..... (قوله وقصر ان نوى اقل منها اولم ينواوبقى سنين اى اقل من نصف شهر وقد مناتقريره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۶ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۲۴۳

## ﴿وطن سے عارضی انتقال کی وجہ سے اس کی وطنیت باطل نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کا کراچی میں گھر تھا جو قبضہ ہو گیا۔ اب وہ بندہ لاہور میں رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی کیس وغیرہ کے سلسلہ میں کراچی میں آنا پڑتا ہے۔ اگر وہ پندرہ دن سے کم کی نیت سے کراچی آجائے تو کیا قصر کریگا یا اتمام؟ یعنی کراچی اب وطن اصلی رہا یا نہیں؟ برائے مہربانی دلائل کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ وطن اصلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ بچوں سمیت رہائش اختیار کرنے سے وہ

جگہ وطن اصلی نہیں بنتا اور اس سے اپنا وطن اصلی باطل نہیں ہوتا ۔البتہ لاہور میں بچوں سمیت مستقل رہائش اختیار کی ہو اور کراچی کی وطنیت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہو تو ایسی صورت میں کراچی وطن اصلی نہیں رہیگا ۔مکان واپس قبضہ میں آنے کی صورت میں اگر کراچی لوٹ آنے کا ارادہ ہے تو کراچی اب بھی وطن اصلی ہے اور اس میں نماز مکمل پڑھنے کا حکم ہے خواہ ایک ہی دن کیلئے آنے کا اتفاق ہو اور اگر مستقل چھوڑ دیا ہے تو کیس وغیرہ کی ضرورت سے کراچی آنے کی صورت میں سفر کی نماز پڑھے گا۔البتہ پندرہ یا زیادہ دن کیلئے جب بھی کراچی آئیگا تو کراچی وطن اقامت شمار ہوگا اور وہ پوری نماز پڑھے گا۔

لمافی الشامی:۱۳۲،۱۳۱،۲/۱(طبع ایچ،ایم سعید)

(الوطن الاصلی)هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه( يبطل بمثله)اذالم يبق له بالاول اهل ، فلو بقي لم يبطل بل يتم فيهما(لا غيره)يبطل (وطن الاقامة بمثله و)بالوطن( الاصلی و)بانشاء (السفر)والاصل ان الشئی يبطل بمثله وبمافوقه لابمادونه( قوله اذالم يبق له بالاول اهل )ای وان بقي له فيه عقار قال في النهر،ولو نقل اهله ومتاعه وله دور في البلد لاتبقى وطناله وقيل تبقى كذافي المحيط وغيره.

لمافی الهندیه:۱۴۲/۱(طبع رشیدیه کوئٹه)

يبطل الوطن الاصلی بالوطن الاصلی اذاانتقل عن الاول بأهله وأمااذالم ينتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة اخرى فلايبطل وطنه الاول ويتم فيهما ولا يبطل الوطن الاصلی بانشاء السفر وبوطن الاقامةووطن الاقامة يبطل بوطن الاقامةوبانشاء السفر وبالوطن الاصلی هكذافي التبيين،ولو انتقل باهله ومتاعه الى بلد وبقي له دور وعقار في الاول قيل بقي الاول وطنا له واليه اشار محمدؒ في الكتاب كذافي الزاهدي.

لمافی البحر:۱۳۶/۲(طبع ایچ،ایم سعید)

(قوله ويبطل الوطن الاصلی بمثله لاالسفر ووطن الاقامة بمثله والسفر والاصلی) لان الشئی يبطل بماهو مثله لابماهو دونه فلايصلح مبطلا له ـ والوطن الاصلی هو وطن الانسان في بلدته او بلدة اخرى اتخذهادارا وتوطن بهامع اهله وولده وطن وليس قصده الارتحال عنهابل التعيش بهاوهذا الوطن يبطل بمثله لا غيروهو ان يتوطن في بلدة اخرى وينتقل الاهل اليهافيخرج الاول من ان يكون وطنااصليا لودخله مسافرالايتم.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ  واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ  فتویٰ نمبر:۳۹۱۱

﴿مسافر امام اگر بھول کر ظہر کی چار رکعات پڑھا دے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر امام نے اگر بھول کر ظہر کی چار رکعات پڑھا دیں تو اس صورت میں امام اور مقتدیوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟ اور اگر نماز نہیں ہوئی تو انکو اطلاع دینے کی کیا صورت ہے جبکہ امام اس علاقے سے بہت دور ہے نیز اس واقعے کو ایک سال سے زائد عرصہ گزر گیا ہے اب معلوم نہیں کہ کس نے نماز پڑھی تھی اور کس نے نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر مسافر امام نے بھول کر ظہر کی چار رکعات پڑھا دی تھیں اور دوسری رکعت پر قعدہ بھی کیا تھا اور آخر میں سجدہ سہو بھی کیا تھا تو مسافر امام کی نماز ہوگئی ورنہ واجب الاعادہ ہے اور مسافر امام کے حق میں آخری دو رکعتیں نفل ہیں جبکہ مقیم مقتدیوں کی پوری نماز فرض ہے، لہٰذا جو مقیم ایسے امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے تو انکی نماز نہیں ہوئی، اور چونکہ مقیم مقتدیوں کی نماز نہیں ہوئی لہٰذا جہاں تک ممکن ہو انکو اطلاع کرنی چاہیے اور اطلاع کے لیے جانا ضروری نہیں ہے کسی بھی طریقے سے اطلاع پہنچا دی جائے لیکن اطلاع پہنچانا اس صورت میں ہے جبکہ مقتدی معلوم ہوں ورنہ اطلاع دینا لازمی نہیں، اب صورت مسئولہ میں اگر مسجد محلہ کی ہے تو مقتدی لوگ معلوم ہیں، البتہ اڈے وغیرہ کی مسجد ہے تو نمازی لوگ مختلف ہوتے ہیں ایسی صورت میں کثرت سے توبہ واستغفار ہی کرسکتا ہے۔

لمافی التنویر:(۱۲۸/۲ طبع سعید)

فلو أتم مسافر ان قعد فی الاولیٰ تم فرضہ وأساء وما زاد نفل وان لم یقعد بطل فرضہ۔

ولما فی الشامی:(۱۳۰/۲ طبع سعید)

(قولہ لم یصر مقیما)فلو أتم المقیمون صلاتھم معہ فسدت لأنہ اقتداء المفترض بالمتنفل۔

ولمافی التنویر مع الدر والرد:(۵۹۱،۵۹۲/۱ طبع سعید)

(واذا ظہر حدث امامہ بطلت فیلزم اعادتہا کما یلزم الامام اخبار القوم اذا أمہم وھو محدث أو جنب بالقدر الممکن)بلسانہ أو(بکتاب أو رسول علی الأصح)لو معینین والا لا یلزمہ بحر عن المعراج(قولہ لو معینین):أی معلومین وقال ح:وان تعین بعضھم لزمہ اخبارہ(قولہ والا) أی وان لم یکونوا معینین کلھم أو بعضھم لا یلزمہ۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتوی نمبر:۲۹۶۰

## ﴿سفر میں سنت مؤکدہ کی تاکید باقی رہتی ہے یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالت سفر میں سنت مؤکدہ کا کیا حکم ہے؟ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ اور سفر مین ان کی تاکید باقی رہتی ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سفر میں سنت مؤکدہ غیر مؤکدہ کے درجہ میں ہو جاتی ہیں یعنی تاکید نہیں رہتی لیکن سنت کے درجہ سے کم مطلق نوافل کے درجہ میں بھی نہیں آجاتی البتہ فجر کی سنت سفر میں بھی سنت مؤکدہ ہی رہتی ہیں، اسلئے فجر کی دو رکعت سنت سفر میں بھی پڑھنا ضروری ہے۔

باقی سنتوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ موقع ہو مثلاً کہیں عارضی قیام ہو یا گاڑی میں پڑھنے کی جگہ ہے اداء کرنے کی صورت میں دشواری نہیں اور دوسروں کیلئے بھی باعث بوجھ نہیں ہے تو اداء کرنی چاہئے اور اس کے خلاف صورت میں مثلاً اس کیلئے سفر کو روکنا ہے، یا دیگر مسافروں کیلئے باعث بوجھ بن رہا ہے، گاڑی میں آنے جانے کا راستہ روکا ہے تو ایسی صورت میں سنتوں کو چھوڑنا بہتر ہے۔

لمافی اعلاء السنن :(۲۱۵/۷،طبع دارالکتب العلمیۃبیروت)

قلت:والأظهر عندی مانقله الترمذی عن الأكثرولكن التاكيد لا يبقى فی السفر للراتبة مطلقاغير سنة الفجر كمايفيده اختلاف العلماء فی فعلها وتركهاواختلاف الأثارعن النبی صلی الله عليه وسلم فيبقى الرواتب فی السفر سنة غير مؤكدة ولا تلتحق بالتطوع المطلق كمازعم ابن القيم،وسياتی كلامنامعه وأماركعتا الفجرمؤكدة سفرأوحضرأجميعا.

ولمافی الشامی:(۱۳۱/۲،طبع سعید)

(ويأتی)المسافر (بالسنن)ان كان (فی حال أمن وقرار والا)بأن كان فی خوف وفرار(لا)يأتی بهاهوالمختار وقيل الأفضل الترك ترخيصا،وقيل الفعل تقربا،وقال الهندوانی :الفعل حال النزول والترك حال السير وقيل يصلی سنة الفجرخاصة،وقيل سنة المغرب ايضا،قال فی شرح المنية والأعدل ما قال الهندوانی.

ولما فی حلبی كبيری:(ص۲۹۶،طبع نعمانيه)

لا قصر فی السنن وتكلموا فی الأفضل قيل الترك ترخيصا،قيل الفعل تقربا وقال الهندوانی: الفعل افضل حالة النزول والترك فی حالة السير وهذاهوالأعدل،وكذافی البحر:(۱۳۰/۲)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب :محمد عمران چارسدہ

۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

فتویٰ نمبر :۲۹۷۱

## ﴿مسافر اگر دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسافر نے قصر پڑھنے کے بجائے پوری نماز پڑھی تو اب اس نماز کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: اکرام الدین لانڈھی

﴿جواب﴾ مسافر نے اگر سفر میں چار رکعات والی نماز بھولے سے دو رکعات کے بجائے چار رکعات پڑھی اور قعدہ اولیٰ بھی کیا ہو تو پہلی دو رکعات فرض کی ہوئی اور آخری دو رکعات نفل شمار ہوں گی، لیکن تاخیر سلام کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوا اگر سجدۂ سہو نہ کیا ہو تو نماز واجب الاعادہ ہے، لیکن اگر قعدہ اولیٰ میں نہ بیٹھا ہو یا قصداً چار رکعات پڑھی ہوں تو اس پر توبہ واستغفار کے علاوہ دو رکعت نماز کا اعادہ بھی واجب ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۱۲۸/۲ طبع سعید)

(فلو أتمّ مسافر أن قعد في) القعدة (الأولى تمّ فرضه و) لكنه (أساء) لو عامداً لتأخير السلام.

وفي الرد: فانه ذكر أنه اذا صلّى خامسة بعد القعود الأخير يضمّ اليها سادسة ويسجد للسهو لتركه السلام.

ولما فی ردالمحتار:(۱۳۵/۲ طبع سعید)

(قوله سفراً أو حضراً) أي فلو فاتته صلاة السفر وقضاها في الحضر يقضيها مقصورة كما لو أداها وكذا فائتة الحضر تقضى في السفر تامّة.

ولما فی فتح القدیر:(۳۱/۲، طبع رشیدیه)

(وان صلّى أربعاً وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته الأوليان عن الفرض والأخريان له نافلة) اعتباراً بالفجر ويصير مسيئاً لتأخير السلام (وان لم يقعد في الثانية قدرها بطلت) لاختلاط النافلة بها قبل اكمال أركانها.

ولمافی فتاوی قاضی خان:(۱۵۰/۱ طبع قدیمی)

مسافر صلّى الظهر ركعتين فقام الى الثالثة ناسياً بعدما قعد قدر التشهد ثم تذكر ذلك في قيام الثالثة أو في ركوعها فانه يعود ويقعد وان تذكر بعد ما قيد الثالثة بالسجدة يتم صلاته أربعاً وكانت الثالثة والرابعة له سنة الظهر، وان لم يكن قعد على الركعتين ان تذكر في قيام الثالثة يعود وان لم يعد حتى قيدها بالسجدة فسدت صلاته.

واللہ اعلم بالصواب: عابد اللہ چترالی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۸۸۴

۱۸ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ

## ﴿مقیم امام کے پیچھے مسافر کی اقتداء﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسافر شخص نے مقیم امام کی اقتداء میں چار رکعت ادا کرنے کی نیت کی لیکن امام کے ساتھ دو رکعت پڑھ کر قصداً سلام پھیر دیا، اب بعد میں اس کو خیال آیا کہ میری نماز تو فاسد ہو چکی ہے، پوچھنا آپ سے یہ ہے کہ یہ شخص اپنی نماز کا اعادہ کرنا چاہے تو دو رکعت پڑھے گا یا چار رکعت کا اعادہ کرے؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مسافر کیلئے شریعت میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ کسی مقیم امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا چاہے تو ایسی صورت میں قصر نہیں کر سکتا بلکہ پوری نماز پڑھے گا اسی طرح صورت مسئولہ میں مسافر کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ چار رکعت پوری پڑھتا لیکن اس نے قصداً سلام پھیر کر اسکو فاسد کر دیا، اور اب جب یہ بعد میں اعادہ کرے گا تو قصر کا حکم دوبارہ لوٹ آئے گا اور صرف دو رکعت پڑھے گا۔

لمافی الدرالمختار:(۱۳۰/۲،باب المسافر،طبع سعید)

واما اقتداء المسافر بالمقیم فیصح فی الوقت ویتم لابعده فیمایتغیر.

وفی الشامیة:تحت قوله:ای سواء بقی الوقت او خرج قبل اتمامها لتغیرفرضه بالتبعیة لاتصال المغیر بالسبب وهوالوقت ولو فسده صلی رکعتین لزوال المغیر.

ولمافی الهندیة:(۱۴۲/۱،باب المسافر،مکتبه رشیدیه)

وان اقتدی مسافر بمقیم اتم اربعاوان فسده یصلی رکعتین.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد امین چارسدوی

۲۰محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۷۶۹

## ﴿مسافر مقیم کے پیچھے اپنی قضا نماز پڑھ سکتا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے کہ اگر مقیم امام اپنی قضاء نماز ادا کر رہا ہو پھر مسافر نے اپنی سفری قضاء نماز ادا کرنے کیلئے اس امام کی اقتداء کر لی تو کیا یہ اقتداء کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ مستفتی:ایک طالب علم

﴿جواب﴾ امام اور مقتدی کی نماز ایک ہو یا امام کی نماز قوی اور مقتدی کی ضعیف ہو تو اقتداء صحیح ہے اس کے خلاف صحیح نہیں ہے، یعنی امام ایک وقت کی مثلاً عصر کی نماز پڑھ رہا ہے اور مقتدی

دوسرے وقت کی، مثلاً ظہر کی نیت کر رہا ہے، یا مقتدی کی نماز فرض اور امام کی سنت، نفل وغیرہ، یا امام وقتی پڑھ رہا ہے اور مقتدی قضاء نماز کی نیت کر کے اقتداء کر رہا ہے تو اقتداء صحیح نہیں ہے، اسی طرح امام مقیم کی نماز ظہر رہ گئی تھی اور مسافر آدمی کی بھی ظہر رہ گئی تھی تو اقتداء صحیح نہیں ہے اگر چہ نماز ایک ہے لیکن اس صورت میں مسافر کی دو رکعت ہی متعین ہیں اور دو رکعت کے بعد والا قعدہ اس کے حق میں فرض ہے اور امام کے حق میں واجب ہے تو قعدہ میں مقتدی کی نماز فاسد ہو جاتی ہے لاقتداء القوی بالضعیف، البتہ دونوں کی مغرب کی نماز اگر قضا ہو گئی یا فجر کی تو اقتداء صحیح ہے اس لئے کہ نماز ایک ہے اور اقتداء القوی بالضعیف بھی لازم نہیں آ رہا، اور وقت کے اندر چار رکعت والی نماز مثلاً ظہر میں مسافر آدمی مقیم امام کی اقتداء کر سکتا ہے اس لئے کہ ایسی صورت میں مقتدی اگر چہ مسافر ہے لیکن مقیم امام کی اقتداء کرنے کی وجہ سے اب چاروں رکعات اسکی فرض شمار ہوتی ہیں، اور اب آخری قعدہ ہی فرض ہے درمیان والا قعدہ مقتدی کا بھی اس صورت میں فرض نہیں ہے۔

لما فی الحلبی الکبیری: (ص ۲۵۳، السادس: القعدة الاخیرة، طبع نعمانیة)

والثانیة من مسائل المسافر اذا اقتدا بالمقیم فی صلاة فائتة رباعیة لایصح اقتداؤه به لأن القعدة الاولی فرض فی حق المسافر دون المقیم فیکون اقتداؤه به حینئذ اقتداء المفترض بالمتنفل وهو غیر جائز عندنا.

لما فی الدر المختار مع رد المحتار: (۱۳۰/۲، باب صلاة المسافر طبع سعید)

واما اقتداء المسافر بالمقیم فیصح فی الوقت ویتم لابعده فیما یتغیر لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل فی حق القعدة.

(قوله: لابعده) ای لایصح اقتداؤه بعد خروج الوقت لعدم تغیره لانقضاء السبب وهذا اذا کانت فائتة فی حق الامام والمأموم.

وبعد سطور تحت (قوله: فیما یتغیر) متعلق بیصح المقدر فی قوله لابعده، واحترز به عن الاقتداء بعد الوقت فی الصلاة التی لاتتغیر فی السفر کالثنائیة والثلاثیة فانه یصح، وفی البحر هذا القید مفهوم من قوله صح وأتم بل لاحاجة الیه أصلا لأن السفر مؤثر فی الرباعی فقط.

لما فی الرد: (۵۷۹/۱، کتاب الصلاة، طبع سعید)

(قوله ومفترض فرضا آخر) سواء تغایر الفرضان اسما أو صفة، کمصلی ظهر أمس بمصلی ظهر الیوم، بخلاف ما اذا فاتتهم صلاة واحدة من یوم واحد فانه یجوز.

وایضا فی الرد:(۱۳۰/۲،باب صلاۃ المسافر، طبع سعید)

وتصیر القعدۃ الاولی واجبۃ فی حق المقتدی المسافر ایضا حتی لو ترکہا الامام ولو عامدا وتابعہ المسافر لاتفسد صلاتہ علی ماعلیہ الفتوی۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ — واللہ اعلم بالصواب: جابر ... عفی عنہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۰۰۳۶

﴿مسافر پوری نماز پڑھادے تو نماز واجب الاعادہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مقیم شخص نے مسافر امام کی اقتداء کی، اور مسافر امام نے قصر کے بجائے پوری نماز پڑھائی اور اس کے ساتھ مقتدیوں نے بھی پوری نماز پڑھ لی تو مقیم مقتدیوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟۔ مستفتی: ایک حکم

﴿جواب﴾ مسافر شخص نے پوری نماز اگر پڑھائی ہے تو اس شخص سمیت سب پر اس نماز کا اعادہ ضروری ہے۔

لما فی الشامی:(۱۳۰/۲، باب صلوۃ المسافر،طبع سعید)۔

(قولہ لم یصر متیما)فلو اتم المقیمون صلاتہم معہ فسدت لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل۔

ولما فی منحۃ الخالق حاشیۃ البحر: طبع سعید۔

حتی لو اتم المقیمون صلاتہم معہ فسدت صلاتہم لانہ اقتداء المفترض بالمتنفل ولا یصح۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۶۳۱

﴿مسافر امام کی اقتداء میں نماز پڑھنے والا مقیم اپنی بقیہ نماز میں قراءت نہیں کریگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر امام کی اقتداء میں نماز پڑھنے والا مقیم اپنی نماز کی بقیہ دو رکعتوں میں قرأت کریگا یا نہیں؟ بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ ''یقراء کالمسبوق'' اور بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ وہ لاحق کے حکم میں ہے صحیح مسئلہ کی طرف راہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ مستفتی: عتیق الرحمٰن غلامال

﴿جواب﴾ مسافر امام کی اقتداء میں نماز پڑھنے والا مقیم لاحق کے حکم میں ہے مفتی بہ قول

کے مطابق وہ ان رکعتوں میں قرأت نہیں کریگا۔

لما فی الدر المختار:(۱۲۹/۲،طبع سعید)

وصح اقتداء المقیم بالمسافر فی الوقت وبعد ، فاذا قام المقیم الی الاتمام لایقرء ولا یسجد للسهو فی الاصح۔

ولما فی حاشیة الطحطاوی:(ص:۲۲۸،طبع قدیمی)

ولایقرء المؤتم المقیم فیما یتمه بعد فراغ امامه المسافر فی الاصح لانه ادرك مع الامام اول صلاته وفرض القراءة قد تادی بخلاف المسبوق۔

ولما فی فتاوی قاضی خان:(۱۵۱/۱ طبع قدیمی)

جماعة المقیمین صلوا خلف مسافر لاقراءة علیهم فیما یقضون کذاذکر الکرخی رحمه الله۔الخ

ولما فی الحلبی الکبیری:(ص:۴۶۷، طبع: نعمانیة کوئٹه)

ولو اقتدی المقیم بالمسافر صح سواء کان فی الوقت او خارجه لعدم المانع فاذا صلی المسافر رکعتین یسلم ویقوم المقیم فیتم صلوته بغیر قرأة فی الاصح۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک خوشابی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۳۰۸۰

## ﴿دوران سفر بغیر جماعت کے پوری پڑھی جانے والی نمازوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق میں کہ میں کراچی کا رہائشی ہوں، میں سیر وتفریح کے لئے لاہور گیا، لیکن میرا وہاں پندرہ دن کے قیام کا ارادہ نہیں تھا، شک میں تھا کہ دس دن بعد واپسی کروں یا کم وبیش بہرحال اسطرح کئی دن گزر گئے اس دوران بغیر جماعت پوری نماز بھی پڑھی ہے تو کیا حکم ہے؟ — مستفتی: محمد مصطفیٰ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ برابر مسافر تھے، آپکے ذمہ سفر کی نماز یعنی قصر کرنا ضروری تھا اس دوران جو نمازیں انفرادی طور پر آپنے پڑھی ہیں ایسی تمام نمازوں کا اب اعادہ ضروری ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی بھی مانگیں سفر شروع کرنے کے بعد کسی آبادی میں جب تک پندرہ دن کی اقامت کا پختہ عزم نہ ہو انسان برابر مسافر رہتا ہے۔

لما فی الدر المختار:(۱۲۶/۲،طبع سعید)

(او دخل بلدة ولم ینوها) ای مدة الاقامة (بل ترقب السفر) غدا او بعده (ولو بقی) علی ذلك (سنین)...... وفیه ایضا (فلو اتم مسافر ان قعد فی) القعدة (الاولی تم فرضه و) لکنه

(اساء) لو عامدا للتأخير السلام وترك واجب القصر وواجب تكبيرة افتتاح النفل وخلط النفل بالفرض وهذا لا يحل كما حرره القهستاني بعد أن فسر اساء باثم واستحق النار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۱۲ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۲۲۸۷

## ﴿مقیم امام کی اقتداء میں مسافر کی نماز فاسد ہو جائے تو صرف دو رکعتوں کا اعادہ کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقیم امام کی اقتدا میں مسافر کی نماز فاسد ہوگئی اسطرح کہ تیسری رکعت میں شامل ہوا اور امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دیا تو اب اعادہ کتنی رکعتوں کا کرے گا؟

مستفتی: سہیل احمد

﴿جواب﴾ مسافر کی نماز اگر مقیم کی اقتدا میں فاسد ہوگئی تو دوبارہ دو رکعتیں ہی پڑھنا ضروری ہے اس لئے کہ مسافر کے لئے چار رکعتیں پڑھنا ضروری تھا امام کی متابعت کی وجہ سے، اب چونکہ امام کی متابعت نہ رہی اس لئے اپنی سفر کی نماز یعنی دو رکعتیں ہی پڑھنا ضروری ہے۔

لما فی الدر المختار: (۱۳۰/۲ طبع سعید)

واما اقتداء المسافر بالمقيم فيصح في الوقت ويتم لا بعده فيما يتغير لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل في حق القعدة لو اقتدى في الأوليين أو القراءة لو في الاخريين.

وفي الشامية: (قوله فيصح في الوقت ويتم): اى سواء بقي الوقت اوخرج قبل اتمامها لتغير فرضه بالتبعية لاتصال المغير بالسبب وهو الوقت ولو افسد صلى ركعتين لزوال المغير.

ولما في الهندية: (۱۴۲/۱ طبع رشيديه)

وان اقتدى مسافر بمقيم أتم اربعا وان أفسد يصلي ركعتين بخلاف ما لو اقتدى به بنية النفل ثم افسد حيث يلزم الأربع كذا في التبيين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم: محمد سجاد کشمیری

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۲۰۴۴

## ﴿امام مسافر ہے یا مقیم شروع میں معلوم ہونا ضروری نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر اسٹیشنوں پر ہم جس امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں اس کا پتہ نہیں ہوتا کہ وہ مقیم ہے یا مسافر تو اس صورت

میں ہم اقتداء کی نیت کس طرح کریں؟ مذکورہ صورت میں اگر ہم چار رکعت کی نیت کرلیں اور امام صاحب مسافر ہوں یعنی دو رکعت پر سلام پھیر دیں تو ہماری نماز واقتداء درست ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نیت دل کے ارادے کا نام ہے، آپ نے دل میں مثلاً ظہر یا عصر کی نماز حاضر امام کی اقتداء میں ادا کرنے کا ارادہ کیا تو اتنا کافی ہے، رکعتوں کی تعداد کا خیال کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، اور بالفرض امام کو بھی مسافر سمجھتے ہوئے آپ نے دو رکعت کا ارادہ کیا خواہ زبان سے بھی بول دیا اور بعد میں پتہ چلا کہ امام صاحب تو مقیم ہیں تو ایسی صورت میں آپکو عملاً چار رکعات پڑھنی ہوں گی، اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ مقتدی کو معلوم ہونا ضروری ہے کہ امام صاحب مسافر ہیں یا مقیم، اگرچہ شروع میں معلوم نہ ہوسکے لیکن اخیر میں معلوم ہونا ضروری ہے، تاکہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے خلاف نہ ہو۔

لما فی الشامی :(۴۱۵/۱ ،طبع سعید )

والمعتبر فیها عمل القلب اللازم للارادة فلا عبرة للذكر باللسان ان خالف القلب لانه كلام لانية ،(قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهلا اجزأكما فی الزاهد قهستانی .

ولما فی الفتاوی الهندیه :الفصل الرابع فی النیة ،(۶۵/۱ ،طبع رشیدیه )

النیة ارادة الدخول فی الصلاة ،والشرط ان یعلم بقلبه ای صلاة یصلی وادناها ما لو سئل لامكنه ان یجیب علی البدیهة .

ولما البحر الرائق :(۲۸۲/۱ ،طبع رشیدیه )

قوله :والمقتدی ینوی المتابعة ایضا)....واشار بقوله (ایضا) الی انه لا بد للمقتدی ثلاث نیات :اصل الصلاة ونیة التعیین ونیة الاقتداء

ولما فی الشامی :(۱۸/۱ ،طبع سعید )

ولا بد من التعیین عند النیة لفرض ....(دون )تعیین (عدد ركعات ) لحصولها ضمنا فلا یضر الخطاء فی عددها .

ولما فی البحر الرائق :(۱۳۵/۲ ،طبع سعید )

(قوله وبعكسه صح فیهما )وهو اقتداء المقیم بالمسافر فهو صحیح فی الوقت وبعده لان صلاة المسافر فی الحالین واحدة والقعدة فرض فی حقه غیر فرض فی حق المقتدی وبناء الضعیف علی القوی جائز وقد ام النبی ﷺ وهو مسافر أهل مكة وقال أتموا صلاتكم فانا قوم سفر وهو جمع سافر ،كركب جمع راكب ویستحب ان یقول ذلك بعد السلام كل مسافر صلی بمقیم لاحتمال ان خلفه من لا یعرف حاله ولا

يتيسر له الاجتماع بالامام قبل ذهابه فيحكم حينئذ بفساد صلاة نفسه بناء على ظن اقامة الامام ثم افساده بسلامه على رأس الركعتين وهذا محمل ما في الفتاوى اذا اقتدى بالامام لا يدرى أمسافر هو ام مقيم لا يصح لان العلم بحال الامام شرط الاداء بجماعة لا انه شرط الابتداء، لما في المبسوط رجل صلى الظهر بالقوم بقرية او مصر ركعتين وهم لا يدرون أمسافر هو أم مقيم فصلاتهم فاسدة سواء كانوا مقيمين ام مسافرين لان الظاهر من حال من في موضع الاقامة انه مقيم والبناء على الظاهر واجب حتى يتبين خلافه فان سألوه فأخبرهم انه مسافر جازت صلاتهم وفي القنية: وان كان خارج المصر لا تفسد ويجوز الاخذ بالظاهر في مثله، وانما كان قول الامام ذلك مستحبا لانه لم يتعين معرفا صحة سلامه لهم فانه ينبغي ان يتموا ثم يسألوه لتحصل المعرفة.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　والله اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۱۰ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۵۱۹

## ﴿مسافر کا جاری جماعت میں شامل ہونا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفر کے دوران بس کا عملہ مسافروں کو عشاء کی نماز پڑھنے کیلئے بس کسی ہوٹل کے پاس روک لیتا ہے تو کبھی کبھار وہاں کی مسجد میں جماعت ہو رہی ہوتی ہے، کیا مسافر آدمی اس جماعت میں شریک ہوسکتا ہے اور اگر شریک ہو تو کس نیت سے جبکہ اس کو امام کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ وہ مقیم ہے یا مسافر، یا پہلے امام کی حالت معلوم ہونا ضروری ہے؟　　　　مستفتی: عبدالغفار ٹانکوی

﴿جواب﴾ مسافر چار رکعت کی نیت کرے یا دو کی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ امام مسافر ہو اور مسافر مقتدی چار رکعت پڑھ لے تو نماز لوٹانا ضروری ہوگا، اسی طرح امام مقیم ہو اور مسافر مقتدی دو رکعت پڑھ لے تب بھی نماز لوٹانا ضروری ہوگا، نیز شروع میں امام کا حال معلوم ہونا کوئی ضروری نہیں ہے اور بعد میں بھی صرف ایسی صورت میں پتہ چلنا ضروری ہے کہ مقتدی کے ذمے بالفرض چار رکعت ہوں اور اس نے امام کو مسافر سمجھ کر دو رکعت پر اکتفاء کیا ہو یا امام خود بھی مسافر تھا اور مسافر مقتدی نے انہیں مقیم سمجھ کر چار رکعت پوری کی ہوں اس لئے جہاں اسطرح کے اشتباہ کا اندیشہ ہو تو امام کو چاہیے کہ نماز سے فارغ ہو کر بلا تاخیر مقتدیوں کو بتا دیں کہ میں مسافر ہوں یا مقیم تاکہ بعد میں شامل ہونے والے مقتدیوں کی نماز خراب نہ ہو۔

لما في الشامي (۲/۱۲۹، ۱۳۰ طبع سعید)

نعم ذکر في البحر عن المبسوط والقنية ما حاصله: انه اذا صلى في مصر او قرية ركعتين، وهم لا يدرون حاله فصلاتهم فاسدة وان كانوا مسافرين لأن الظاهر من حال من كان في موضع الاقامة انه مقيم والبناء على الظاهر واجب حتى يتبين خلافه، اما اذا صلى خارج المصر لاتفسد ويجوز الأخذ بالظاهر وهو السفر في مثله اه.

والحاصل انه يشترط العلم بحال الامام اذا صلى بهم ركعتين في موضع اقامة والافلا.

ولما في الهداية (۲/۲۶۸ طبع: مكتبة حقانية)

(قال ويستحب للامام) المسافر (اذا سلم) على رأس الركعتين (ان يقول أتموا صلوتكم فانا قوم سفر) بفتح السين وسكون الفاء، جمع سافر وهذا يدل على ان العلم بحال الامام بكونه مقيما او مسافرا ليس بشرط لأنهم ان علموا انه مسافر فقوله هذا عبث وان علموا انه مقيم كان كذبا فدل على ان المراد به اذا لم يعلموا حاله وهو مخالف لما ذكر في فتاوى قاضي خان وغيره ان من اقتدى بامام لايدري انه مقيم او مسافر لا يصح اقتداء. فان قلت ما وجه التوفيق بين الروايتين. قلت تلك الرواية محمولة على ما اذا بنوا امر الامام على ظاهر حال الاقامة، والحال انه ليس بمقيم وسلم على رأس الركعتين، وانصرفوا على ذلك لاعتقادهم فساد صلوة الامام واما اذا علموا بعد الصلوة بحال الامام جازت صلاتهم، وان لم يعلموا حاله وقت الاقتداء.

ولما في الاشباه والنظائر (۳۱، طبع: قديمي)

الخطأ فيما لا يشترط التعيين له لا يضر. كتعيين مكان الصلاة وزمانها وعدد الركعات، فلو عين عدد ركعات الظهر ثلاثا او خمسا صح، لأن التعيين ليس بشرط فالخطأ فيه لا يضر. قال في الهداية: ونية عدد الركعات والسجدات ليس بشرط، ولو نوى الظهر ثلاثا او خمسا صحت وتلغو نية التعيين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: صدیق الور

۷ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ | فتویٰ نمبر: ۳۱۹۴

## ﴿شادی کے بعد والدین کا گھر عورت کے لیے وطن اصلی نہیں رہتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شادی کے بعد والدین کا گھر عورت کے لیے وطن اصلی رہتا ہے یا نہیں اور شرعی مقدار مسافت ہو تو عورت والدین کے گھر نماز میں قصر کرے یا پوری پڑھے؟ مستفتیہ: اہلیہ محمد آصف صاحب

﴿جواب﴾ والدین کا گھر اگرچہ عورت کے لیے وطن اصلی تھا لیکن شادی کے بعد عورت کی

مستقل رہائش خاوند کے گھر ہو چکی ہے اور خاوند کا گھر اس کے لیے وطن اصلی بن گیا ہے، والدین کا گھر جو عورت کے لیے وطن اصلی تھا دوسرا وطن اصلی بنانے کی وجہ سے باطل ہو گیا ہے اس لیے والدین کا گھر اگر شرعی مقدار مسافت پر ہو اور پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو تو عورت قصر نماز پڑھے گی البتہ نیت اقامت کیصورت میں پوری نماز پڑھنا ہوگی۔

لمافی الشامية:(۲/۱۳۱-۱۳۲،طبع سعيد)

(قوله أوتوطنه) أى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل فلوكان له أبوان ببلدغير مولده وهوبالغ ولم يتأهل بها فليس ذلك وطنا له الا اذا عزم على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله.

ولمافى حلبى:(ص۵۴۴،طبع سهيل اكيڈمى)

فى المبسوط هوالذى نشأفيه أوتوطن فيه أوتأهل فتوله أوتوطن فيه يتناول ماعزم على القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل فعلى هذالوعزم من له ابوان فى بلد على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله يكون وطناله.

ولمافى خلاصة الفتاوى:(۱/۲۰۲،طبع رشيديه)

وهوالوطن الاصلى وهومولدالرجل والبلدة التى تأهل بها اما اذا كان له ابوان ببلدة وهوبالغ فليس بوطن له وبان حكمه عن ابويه.

الجواب صحيح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۱۷۴

## ﴿پندرہ روز سے کم اقامت کا ارادہ ہو تو وطن اقامت نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ میری رہائش ایبٹ آباد میں ہے اور میں کاروبار کے لئے پنڈی میں رہتا ہوں کبھی ہفتے اور کبھی مہینے میں گھر جاتا ہوں پنڈی میں میرا ہنڈی کا کام ہے کہ جو سامان وغیرہ بیرون ممالک سے آتا ہے اسکو مختلف شہروں میں پہنچاتا ہوں سوال یہ ہیکہ پنڈی سے کسی دوسرے شہر جاتے ہوئے قصر نماز پڑھوں یا مکمل؟ اور واپس پنڈی آکر نماز مکمل پڑھوں؟ جب کہ اگلے دن پھر کسی شہر کیلئے روانہ ہونا پڑتا ہے نیز یہ بھی بتادیں کہ وطن اقامت مطلق سفر سے باطل ہوتا ہے یا سفر شرعی سے؟　　مستفتی: فیاض احمد

﴿جواب﴾ پنڈی میں مسلسل پندرہ روز تک اقامت کا موقع اگر آپکو نہیں مل رہا تو پنڈی شہر آپکا وطن اقامت نہیں ہے وطن اقامت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم پندرہ روز تک

اسی آبادی میں اقامت کا ارادہ ہو لہٰذا پنڈی شہر میں اور اس سے آگے کسی دوسرے شہر کیلئے سفر کے دوران بھی آپکو قصر کرنا ہوگی۔

وطن اقامت متحقق ہونے کے بعد وہاں سے سفر شرعی کے ارادہ سے نکلنے سے وطن اقامت باطل ہو جاتا ہے، مطلق سفر یعنی ۴۸ میل مسافت سے کم سفر سے وطن اقامت باطل نہیں ہوتا

لما فی بدائع الصنائع:(۹۷/۱مطبع سعید)

واما بيان ما يصير المسافر به مقيما فالمسافر يصير مقيما بوجود الاقامة والاقامة تثبت باربعة اشياء احدها صريح نية الاقامة وهو ان ينوي الاقامة خمسة عشر يوما في مكان واحد صالح للاقامة فلا بد من اربعة اشياء نية الاقامة ونية مدة الاقامة واتحاد المكان وصلاحيته للاقامة.

ولما في نور الايضاح وشرحه مراقي الفلاح:(ص۲۱۹مطبع قديمي)

والسفر في اللغة قطع المسافة وفي الشرع مسافة مقدرة بسير مخصوص بينه بقوله (اقل) مدة (سفر تتغير به) اي السفر (الاحكام).....(مسيرة ثلاثة ايام من اقصر ايام السنة).

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۱صفر المظفر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۴۰۳

## ﴿وطن اصلی اور وطن اقامت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کوئٹہ کا رہنے والا ہے اور کراچی میں کاروبار ہے کراچی میں اس نے مستقل سکونت اختیار کی ہے بیوی بچے بھی ساتھ رہتے ہیں اور اپنے علاقے میں رشتہ دار اور جائیداد وغیرہ بھی ہے اب کراچی اسکا وطن اصلی ہے یا نہیں اور اپنے علاقے میں جا کر پوری نماز پڑھے گا یا قصر اسی طرح دوسرا آدمی جو صرف کاروبار کیلئے کراچی میں رہتا ہے اور اپنے وطن کو چھوڑا نہیں کاروبار کے دوران دو تین ماہ بعد جاتا رہتا ہے تو یہ شخص اپنے علاقے میں جا کر پوری نماز پڑھے گا یا قصر کریگا؟ مستفتی:احمد شاہ ڈیفنس

﴿جواب﴾ اس شخص نے کراچی میں مستقل رہنے کا اگر ارادہ کرلیا ہے اور اہل وعیال سمیت کوئٹہ سے کراچی منتقل ہو کر وہاں واپس مستقل طور پر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس صورت میں کراچی اسکا وطن اصلی ہے کوئٹہ وطن اصلی نہیں رہا عارضی طور پر جانے کی صورت میں پندرہ روز سے کم وہاں قیام اگر کریگا تو مسافر کی نماز پڑھے گا اور پندرہ روز یا زیادہ قیام اگر کریگا تو وطن

اقامت کی وجہ سے پوری نماز پڑھے گا اور دوسرا شخص جو صرف کاروبار کیلئے کراچی میں رہائش پذیر ہے مستقل رہنے کا ارادہ نہیں ہے تو کوئٹہ اسکا وطن اصلی ہے ایک یا دو دن کیلئے بھی وہاں اگر جائیگا تو نماز پوری پڑھے گا۔

لمافی الدر المختار:(۱۳۲/۲، ایچ ایم سعید)

(الوطن الاصلی) ھو موطن ولادته او تاهله او توطنه (یبطل بمثله) اذا لم یبق له بالاول اھل فلو بقی لم یبطل بل یتم فیهما (لا غیر) یبطل (وطن الاقامة بمثله) وبالوطن (الاصلی و) بانشاء (السفر) والاصل ان الشئ یبطل بمثله وبما فوقه لا بما دونه.

ولمافی الھندیة:(۱۴۲/۱، طبع رشیدیه)

ویبطل الوطن الاصلی بالوطن الاصلی اذا انتقل عن الاول باھله واما اذا لم ینتقل باھله ولکنه استحدث اھله ببلدة اخری فلا یبطل وطنه الاول ویتم فیهما ولا یبطل الوطن الاصلی بانشاء السفر وبالوطن الاصلی ولو انتقل باھله ومتاعه الی بلد وبقی له دور وعقار فی الاول قیل بقی الاول وطنا له والیه اشار محمدؒ فی الکتاب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

جمادی الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۷۹

## ﴿نماز قصر کی مختلف صورتوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرگودھا شہر ہمارے گاؤں (مٹھہ ٹوانہ) سے مسافت سفر پر ہے وہاں ہماری ملازمت ہے، ہمیں وہاں پر ٹھہرنے اور واپس گھر آنے میں مختلف صورتیں پیش آتی ہیں: (۱) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ہفتے بعد گھر واپس آجاتے ہیں (۲) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم تیرہ یا چودہ دن بعد گھر واپس آجاتے ہیں (۳) کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم گھر سے جاتے ہیں تو دس، بارہ دن ڈیوٹی کر لینے کے بعد دوست کہتے ہیں کہ ایک ہفتہ اور ڈیوٹی کرلو، آئندہ ہفتے چلے جانا جب ہفتہ گزر جاتا ہے تو کسی مجبوری کی بناء پر ہمیں ایک ہفتہ اور ڈیوٹی کرنی پڑتی ہے بعض دفعہ اس طرح ہفتہ بڑھاتے، بڑھاتے ہمیں ایک، دو ماہ گزارنے پڑتے ہیں تو ان صورتوں میں ہمارے لئے نماز کا کیا حکم ہے؟ ہم پوری نماز پڑھیں گے یا قصر؟ ہر صورت کا واضح حکم بیان کر کے ہماری مشکل کو حل فرمائیں۔　　　　مستفتی: عمر فاروق

﴿جواب﴾ آپ نے جتنی صورتیں ذکر کی ہیں ان تمام صورتوں میں قصر نماز پڑھنا ضروری

ہے، ہاں آپ مسلسل کم از کم پندرہ روز تک قیام کا ارادہ اگر کر لیتے ہیں تو ایسی صورت میں پوری نماز پڑھنا ضروری ہوگا، ارادہ کئے بغیر اتفاقاً کئی ماہ بھی گزر جائیں آپ مسافر ہی شمار ہوتے ہیں۔

لما فی الشامی :(۲/۱۲۶،طبع سعید)

(لو دخل بلدة ولم ينوها) أي مدة الاقامة (بل ترقب السفر) غدا أو بعده (ولو بقي) على ذلك (سنين).

ولما فی البحر الرائق:(۲/۱۳۱،طبع سعید)

وقيد بنية الاقامة لأنه لو دخل بلدا ولم ينو أنه يقيم فيها خمسة عشر يوما وانما يقول غدا اخرج أو بعد غد أخرج حتى بقي على ذلك سنين قصر.

ولما فی قاضیخان:(۱/۱۴۸،طبع قدیمی)

وان لم يكن وطنا أصليا له فانه يقصر الصلاة ما لم ينو الاقامة بها خمسة عشر يوما.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک قائم آبادی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۲۸

## ﴿روز آنے جانے سے جائے ملازمت وطن اقامت نہیں بنتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص اپنے آبائی گاؤں سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر (جو کہ مسافت شرعی نہیں) درس وتدریس کرتا ہے روز آتا جاتا ہے کبھی کبھی رات گزارنے کی نوبت بھی آتی ہے لیکن وہاں نہ اسکا اہل وعیال ہیں اور نہ مستقل رہائش (۱) تو جائے ملازمت اسکے لئے وطن اقامت ہے یا وطن سکنیٰ (۲) اگر مذکورہ شخص کو سفر درپیش ہو اور جائے ملازمت راستے میں پڑتا ہو تو سفر کے احکام کس مقام سے شروع کرے اپنے آبائی گاؤں کی حدود سے نکل کر یا جائے ملازمت کی حدود سے (۳) اگر سفر سے واپسی پر جائے ملازمت میں ایک دو دن قیام کرلے تو مقیم ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: محمد اکرم صاحب

﴿جواب﴾ فقہاء کرام قیام کے اعتبار سے وطن کے تین قسمیں ذکر فرماتے ہیں (۱) وطن اصلی، جہاں انسان رہائش پذیر ہو اور اسے مستقل چھوڑنے کا ارادہ نہ ہو (۲) وطن اقامت، جہاں انسان پندرہ یا زیادہ دن قیام کا قصد کرے لیکن مستقل وطن بنانے کا ارادہ نہ ہو (۳) وطن سکنیٰ، جہاں پندرہ دن سے کم اقامت کا ارادہ ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں مذکورہ جائے ملازمت نہ وطن اصلی ہے اور نہ وطن

اقامت، وطن اصلی کا نہ ہونا تو واضح ہے اور وطن اقامت اس لئے نہیں کہ وطن اقامت میں کم سے کم پندرہ دن قیام کا ارادہ ضروری ہے جبکہ یہاں روز آنا جانا ہوتا ہے، لھذا مذکورہ صورت میں جائے ملازمت وطن سکنی ہے، صرف یہاں تک جانے کے ارادہ سے شرعی سفر تحقق نہیں ہوتا اسلئے پوری نماز پڑھنا ضروری ہے۔

(۲) البتہ شرعی سفر کا ارادہ گاؤں سے کیا ہو تو اپنے گاؤں کی حدود سے نکلنے پر سفر شروع ہوگا اگر چہ مذکورہ جائے ملازمت درمیان میں آجائے۔ (۳) اسطرح واپسی سفر پر اگر مذکورہ جائے ملازمت میں ایک دو دن قیام کرے اور پندرہ یا زیادہ دن ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو تو جب تک اپنے گاؤں کی حدود میں داخل نہ ہو مسافر ہی رہے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۲/ ۱۳۱،طبع سعید)

الوطن الاصلی هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه وقال الشامی تحت قوله:(أو توطنه):ای عزم علی القرار فیه وعدم الارتحال وان لم يتأهل.....قوله:(ويبطل وطن الاقامة)يسمى ايضاًوطن المستعار والحادث وهوماخرج اليه بنية اقامة نصف شهر سواء كان بينه وبين الاصلى مسيرة السفر او لا وهذا رواية ابن سماعة عن محمد وعنه ان المسافة شرط والاول هوالمختار عند الاكثرين قهستانی.

ولمافی حاشية الطحطاوی:(ص۲۳۳،طبع قدیمی)

والوطن الاصلی هوالذی ولد فيه الانسان او تزوج فيه اولم يتزوج ولم يولدولكن قصد العيش لا الارتحال عنه .ووطن الاقامة موضع صالح لها وقد نوى الاقامة فيه نصف شهر فمافوقه.

ولمافی فتح القدیر:(۲/ ۱۲،طبع رشیدیه)

قيل:الاوطان ثلاثة:وطن الاصلى:هوموطن الانسان أو موضع تأهل به ومن قصده التعيش به لا الارتحال..... ووطن الاقامة وهوما ينوى الاقامة فيه خمسة عشر يوماً فصاعدا على نية ان يسافر بعد ذالک ووطن سكنى وهو ما ينوى الاقامة به اقل من خمسة عشر يوما.

ولمافی حلبی کبیر:(ص۵۲۶-۵۲۷،طبع سعید)

الثانی فيما يصير المقيم مسافرا والمسافر مقيما وفی حكم السفر من فارق بيوت موضع هو فيه من مصر أو قرية ناويا الذهاب الى موضع بينه وبين ذالک الموضع المسافة المذكورة صار مسافرا فلا يصير مسافرا قبل ان يفارق عمران ما خرج منه من الجانب الذی خرج منه ..... ولو جاوز العمران من جهة خروجه وكان بحذائه محلة من الجانب الأخر يصير مسافرا اذ المعتبر جانب خروجه والاصل فی هذا ما روی

انس قال صليت الظهر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالمدينة اربعا والعصر بذى الحليفة ركعتين متفق عليه فدل ان بمجرد النية لا يصير مسافرا والا لصلى الظهر بالمدينة ركعتين وما ذكره البخارى قال خرج على رضى الله عنه فقصروهو يرى البيوت بالمدينة فلما رجع قيل له هذه الكوفة قال لاحتى ندخلها فدل انه بالخروج يصير مسافرا وان لم يغب المصر عن بصره.

ولمافى الهندية:(۱۳۹/۱رشيديه)

وكذااذاعادمن سفره الىٰ مصره لم يتم حتى يدخل العمران.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:حبیب الرحمٰن

۱۸جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۱۸۲

## ﴿وطن اقامت سفر سے باطل ہو جاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں تلہ گنگ کے ایک مدرسہ میں مدرس ہوں اور مدرسہ کی طرف سے مجھے مکان ملا ہوا ہے میں بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہتا ہوں اور ضروریات کا ساز وسامان بھی موجود ہے تو جب شرعی مقدار مسافت سفر پر جاؤں تو جب واپس تلہ گنگ آؤں اور پندرہ دن سے کم ٹھہر کر دوبارہ سفر کا ارادہ ہو تو میں نماز میں قصر کروں یا پوری پڑھوں کیونکہ تلہ گنگ میرا وطن اقامت ہے وطن اصلی لیٹی ہے جو یہاں سے کافی آگے ہے تو کیا ساز وسامان اور بیوی بچے موجود ہوتے ہوئے وطن اقامت سفر سے باطل ہوتا ہے یا نہیں؟ مستفتی:مولانا ارشد جاوید صاحب تلہ گنگ

﴿جواب﴾ وطن اقامت بلاشبہ انشأ سفر سے باطل ہو جاتا ہے بقاء سامان بطلان وطن اقامت کے لیے مانع نہیں ہے شرعی سفر متحقق ہونے کے بعد اسکو منقطع کرنے کیلئے ضروری ہے کہ بندہ وطن اصلی آجائے یا کسی ایسی جگہ جو صالح للاقامت ہو کم از کم پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کر لے وطن اقامت سے بندہ جب سفر شرعی کے ارادہ سے نکل جائے تو علت قصر (سفر شرعی) متحقق ہو جاتی ہے اس کے بعد اگر وطن اقامت میں آتا ہے اور پندرہ دن سے کم ٹھہر کر آگے جانے کا ارادہ ہو تو بندہ برابر مسافر رہے گا اور سفر کے احکام کی رعایت اس پر لازم ہے اس لیے کہ یہ جگہ اب اسکے لیے وطن اقامت کے حکم میں نہیں ہے سفر سے وطن اقامت باطل ہو گیا ہے اور دوبارہ وطن اقامت بنایا نہیں ہے لہٰذا یہ شخص برابر مسافر شمار ہوگا۔

لمافی الهداية:(۱/۱۷۴ طبع رحمانیه)

ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة أوقرية خمسة عشر یوما أو اكثر وان نوی اقل من ذلک قصر.

ولمافی الهندية:(۱/۱۴۲)

ووطن الاقامة يبطل بوطن الاقامة وبانشاء السفر وبالوطن الاصلی هکذا فی التبیین.

البتہ اگر کوئی شخص کسی جگہ بیوی بچوں سمیت سکونت اختیار کر لے اور ضروریات زندگی کا سامان بھی وہاں مہیا کر لے تو ایسی جگہ کو فقہا کرام نے وطن اصلی کا حکم دیا ہے، لہٰذا جب تک بیوی بچے وہاں رہائش پذیر ہیں تو اس مقام کا حکم وطن اصلی جیسا ہوگا اور شرعی سفر سے واپسی کی صورت میں اس شخص کے لیے نماز میں اتمام کا حکم ہے، لہٰذا اگر آپ کو باقاعدہ مدرسہ کیطرف سے مکان ملا ہوا ہے اور آپ بیوی بچوں اور ساز وسامان سمیت وہاں رہتے ہیں تو یہ آپ کا وطن اقامت نہیں ہے جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں بلکہ یہ وطن اصلی کے حکم میں ہے جب تک آپ کے بیوی بچے وہاں مقیم ہیں آپ جب شرعی سفر سے واپس آئیں گے تو آپکو پوری نماز پڑھنا ہوگی اگرچہ پندرہ دن سے کم ٹھہر کر آگے سفر کا ارادہ ہو۔

لمافی خلاصة الفتاوی:(۱/۱۹۹ طبع رشیدیه)

انما يصير المسافر مقيما اما بدخوله مصراله فيه اهل أو بان بدا له العود بعد ماخرج وليس بين الموضع الذی بدا له العود وبين مصره مسيرة......سفر صار مقيما حين نوی العود فيه وسواء دخل مصره بنية الاختيار أو لقضاء حاجته والخروج بعد ذلک صار مقيما حين دخلها.

ولمافی السراجية:(ص ۱۲ طبع سعید)

اذا دخل المسافر بلدة فيها اهله صار مقيما نوی الاقامة أولا.

ایسے شہر میں جس میں مسافر کی بیوی مقیم ہو مسافر اگر داخل ہو جائے تو اسکا سفر منقطع ہو جاتا ہے اور اسکو نماز میں اتمام کا حکم ہے چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: قال فی البحر عن المحيط لو كان له اهل بالكوفة واهل بالبصرة......الی ان قال وفی المجتبی نقل القولين فيما اذا نقل اهله ومتاعه وبقی له دور وعقار ثم قال وهذا جواب واقعة ابتلينا بها وكثير من المسلمين المتوطنين بالبلاد ولهم دور وعقار فی القری البعيدة يصيفون بها باهلهم ومتاعهم فلا بداً من حفظهما انهما وطنان له

لا یبطل احدھما بالآخر اھ.

ان جزئیات سے خصوصاً مجتبیٰ کے جزئیہ سے معلوم ہوا کہ جس مقام پر انسان مع اہل وعیال کے مقیم ہوگیا ہو گو قیام عارضی ہو کہ زمانہ صیف ہی میں وہاں قیام کرتا ہو وہ اسکا وطن اصلی ہو جاتا ہے جب تک اہل وعیال وہاں مقیم رہیں گے وطن رہے گا تنہا اسکے سفر سے وہ وطن باطل نہیں ہوگا جب تک وہاں سے اہل وعیال منتقل نہ کر لے پس صورت مسئولہ میں جائے ملازمت پر اہل وعیال مقیم ہیں وہاں نماز کامل پڑھنی چاہیے۔امداد الاحکام: (۱/۱۸۷، طبع دار العلوم کراچی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس جگہ بیوی بچوں کے ساتھ سکونت اختیار کی ہو اور اسباب تعیش خانہ داری کیلئے مہیا کیے ہوئے رہائش پذیر ہو تو یہ مقام وطن اصلی جیسا ہو جاتا ہے اور جب تک بیوی بچوں کی رہائش یہاں ہو تو یہ مقام وطن اصلی کے حکم میں رہے گا لہٰذا سفر سے واپسی کی صورت میں مدت اقامت تک قیام کا ارادہ اگرچہ نہ ہو تب بھی اتمام لازم ہوگا جیسا کہ فقہاء کرام کی عبارات سے یہ حکم واضح ہے، لہٰذا آپ جب تک بیوی بچوں کے ساتھ مدرسہ میں مقیم ہیں تو یہ آپ کے لیے وطن اصلی کے حکم میں ہے نماز پوری پڑھنا ہوگی۔

| واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری | الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ |
|---|---|
| فتویٰ نمبر: ۲۱۸۴ | ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ |

## ﴿مسافر کیلئے قصر کرنا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ مسافر اگر سفر میں بھول کر پوری نماز پڑھ لے تو اعادہ واجب ہے یا نہیں نیز یہ کہ مسافر قصداً ایسا کرے تو کیا حکم ہے صحیح جواب دیکر مشکور وممنون فرمائیں؟

﴿جواب﴾ مسافر کیلئے قصر کرنا واجب ہے لہٰذا مسافر تیسری رکعت کے لیے اگر کھڑا ہو جائے تو سجدہ سے پہلے یاد آجانے کیصورت میں واپس لوٹ آئے اسی طرح اس نے چار رکعتیں اگر پڑھ لی ہیں اور قعدہ اولیٰ بھی کیا ہے تو دونوں صورتوں میں نماز ہو جائے گی لیکن سجدہ سہو دونوں صورتوں میں ضروری ہے سجدہ سہو نہیں کیا تو اعادہ واجب ہوگا لیکن اگر سہواً چاروں رکعتیں پڑھ لی ہیں اور قعدہ اولیٰ نہیں کیا تو فرض باطل ہو جائے گا چار رکعتیں نفل ہو جائیں گی اس لئے کہ اس صورت میں قعدہ اولیٰ فرض ہے نماز کا اعادہ ضروری ہوگا، اور اگر قصداً یعنی جان بوجھ کر سفر میں

پوری نماز پڑھ لی تو سجدہ سہو سے کام نہیں بنے گا فرض اگرچہ ہوجائیگا لیکن واجب ترک کرنے کی وجہ سے سخت گنہگار ہوگا نماز واجب الاعادہ ہے۔

لمافی الدر المختار:(۱۲۳/۲،طبع سعید)

(صلی الفرض الرباعی رکعتین) وجوبالقول ابن عباسؓ ان اللہ فرض علی لسان نبیکم صلوٰۃ المقیم اربعا والمسافر رکعتین.

ولمافی التنویر مع الدر:(۱۲۸/۲،طبع سعید)

(فلو تم مسافران قعدفی) القعدۃ (الاولیٰ تم فرضہ و)لکنہ (اساء) لو عامدا لتاخیر السلام وترک واجب القصر وواجب تکبیرۃ افتتاح النفل وخلط النفل بالفرض۔۔۔ وھذالا یحل کما حررہ القہستانی بعد أن فسر أساء بأثم واستحق النار.

وفی الشامیۃ:وعادقبل ان یقیدالخامسۃ بسجدۃ یسجدللسہولتاخیرالسلام:أی سلام الفرض — أن الاساءۃ ھنا کراھۃ التحریم.

ولمافی الھندیۃ:(۱۳۹/۱ طبع رشیدیہ)

وإن لم یقعد فی الثانیۃ قدرھا بطلت کذا فی الھدایۃ......

ولمافی الدر المختار:(۴۵۶/۱،طبع سعید)

وتعادوجوبا فی العمدوالسہوان لم یسجدلہ وان لم یعدھافاسقاآثما وکذاکل صلوٰۃ أدیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد سجاد کشمیری

۱۸صفر المظفر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۹۰۶

## ﴿لاعلمی کیوجہ سے سفر میں پوری نماز پڑھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب سفر سے واپس لوٹتا تو ابھی منزل مقصود سے دس کلومیٹر دور ہوتا تھا (یعنی جہاں میرے اوپر قصر لازم ہوتا تھا) لیکن مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پوری نماز پڑھ لیتا تھا تو کیا میری وہ نمازیں ہوگئی ہیں یا نہیں اور میرے اوپر گناہ ہے یا نہیں؟ مستفتی:عبدالغفور کرک

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ موضع اقامت کی آبادی میں داخل ہونے سے ہی سفر ختم ہوتا ہے آپ نے اپنی آبادی سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر اگر نمازیں پوری پڑھی ہیں حالانکہ آپ مسافر تھے تو ایسی تمام نمازوں کا اعادہ ضروری ہے اور شرعی حکم کے خلاف ہونے کی وجہ سے گناہ بھی ہوا ہے اسلئے

کہ مسئلہ معلوم نہ ہونا شرعاً کوئی عذر نہیں ہے، ہاں توبہ اور اعادۂ نماز سے گناہ معاف ہو جائے گا۔

لمافی الدر المختار:(۱۲۳/۲، طبع سعید)

(صلى الفرض الرباعي ركعتين) وجوباً لقول ابن عباس رضي الله عنهما ان الله فرض على لسان نبيكم صلاة المقيم اربعاً والمسافر ركعتين.

وايضاً في:(ص۱۲۸)

(فلو اتم مسافران قعد في) القعدة (الاولى تم فرضه و) لكنه (اساء) لو عامداً لتاخير السلام وترك واجب القصر وواجب تكبيرة افتتاح النفل وخلط النفل بالفرض.

ولمافی الهندية:(۱۳۹/۱، طبع رشيديه)

وفرض المسافر في الرباعية ركعتان كذا في الهداية والقصر واجب عندنا كذا في الخلاصة فان صلى اربعاً وقعد في الثانية قدر التشهد اجزأته والاخريان نافلة ويصير مسيئاً لتأخير السلام.

ولما في الهداية:(۳۲۹/۲، طبع رحمانيه)

اذا بلغت الصغيرة وقد علمت بالنكاح فسكتت فهو رضا وان لم تعلم بالنكاح فلها الخيار حتى تعلم فتسكت شرط العلم باصل النكاح لانها لا تتمكن من التصرف الابه والولي يتفرد به فعذرت بالجهل ولم يشترط العلم بالخيار لانها تتفرغ لمعرفة احكام الشرع والدار دار العلم فلم تعذر بالجهل بخلاف المعتقة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۱۴

## ﴿مسافر وطن اصلی سے گذرتے وقت پوری نماز پڑھے گا﴾

﴿سوال﴾ میں چارسدہ سے سروس کیلئے پشاور جاتا ہوں، جس کا درمیانی فاصلہ شرعی سفر سے کم ہے کبھی کبھار اچانک وہاں سے کسی دفتری کام کیلئے ہمیں اڑتالیس میل کے فاصلے سے زیادہ پر بھیجا جاتا ہے، راستے میں ہمیں اگر چارسدہ سے گذرنا ہو تو چارسدہ جو ہمارا وطن اصلی ہے اس میں پوری نماز پڑھیں گے یا قصر کرینگے؟

مستفتی: فضل سبحان چارسدہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جب آپ اپنے شہر چارسدہ میں داخل ہو گئے تو آپ کے سفر کے احکام ختم ہو گئے۔ آپ پر پوری نماز پڑھنا فرض ہے لہٰذا ایسی صورت میں آپ پوری نماز ادا کریں۔

لمافی الهداية:(۱۷۶/۱، رحمانيه)

واذا دخل المسافر مصره أتم الصلوة وان لم ينو المقام فيه.

ولما فی الھندیۃ:(۱۴۲/۱،طبع رشیدیہ)

واذا دخل المسافر مصرہ أتم الصلاۃ وان لم ینو الاقامۃ فیہ سواء دخلہ بنیۃ الاختیار أو دخلہ بقضاء الحاجۃ کذا فی الجوھرۃ النیرۃ.

ولما فی البحر الرائق:(۱۳۶/۲،طبع سعید)

وقولہ لا السفر ای لا یبطل الاصلی بالسفر حتی یصیر مقیما بالعود الیہ من غیر نیۃ الاقامۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد عبداللہ چارسدوی

۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶۵۳

## ﴿مقیم کی اقتداء کے بعد مسافر کو حدث لاحق ہو جائے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسافر نے مقیم امام کی اقتداء میں نماز شروع کی، درمیان نماز مسافر مقتدی کا وضو ٹوٹ گیا وضو کرنے کے بعد جب آیا تو امام صاحب نماز سے فارغ ہو چکے تھے عرض یہ ہے کہ یہ مسافر مقتدی اعادۂ صلوٰۃ کی صورت میں دو رکعتیں پڑھے گا یا چار؟

مستفتی فضل سبحان چارسدہ

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں اعادہ بہتر ہے اگر چہ بناء بھی جائز ہے اعادہ کرنا چاہے تو صرف دو رکعت پڑھے بناء کرنا چاہے تو پوری نماز پڑھے۔

لما فی الھدایۃ:(۱۳۱/۱،طبع رحمانیہ)

ومن سبقہ الحدث فی الصلوۃ انصرف فان کان اماما استخلف وتوضأ وبنی والاستیناف افضل.

لما فی الھندیۃ:(۱۴۲/۱،طبع رشیدیہ)

ان اقتدی مسافر بمقیم أتم أربعا وان افسدہ یصلی رکعتین.

ولما فی الشامیۃ:(۱۳۰/۲،طبع سعید)

واما اقتداء المسافر بالمقیم فیصح فی الوقت ویتم ای سواء بقی الوقت أو خرج قبل اتمامھا لتغیر فرضہ بالتبعیۃ لاتصال المغیر بالسبب وھو الوقت ولو افسدہ صلی رکعتین لزوال المغیر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۷۸۳

## ﴿متاثرین سوات و دیر کی نمازوں کا حکم باعتبار قصر و اتمام﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالیہ سوات و دیر آپریشن

کے نتیجے میں جو متاثرین اپنے گھروں سے نکل کر کیمپوں یا اپنے رشتہ داروں کے ہاں رہائش پذیر ہیں تو انکی نمازوں کے بارے میں کیا حکم ہے کہ آیا وہ قصر کریں یا پوری نماز پڑھیں؟

﴿جواب﴾ متاثرین کی اپنی آبادی اور کیمپوں، یا رشتہ داروں کی آبادی کے درمیان شرعی مسافت یعنی کم از کم ۴۸ میل کا فاصلہ اگر ہے تو یہ لوگ اپنی آبادی سے نکل کر مسافر شمار ہوں گے نماز قصر پڑھنا ضروری ہوگا، اور وہاں پہنچ کر پندرہ دن اقامت کا ارادہ نہیں کیا یا وہ جگہ اقامت کی نہیں ہے جنگل وغیرہ ہے اگر چہ ان کا ارادہ پندرہ یا زیادہ دن اقامت کا ہے، ہر صورت میں یہ لوگ مسافر شمار ہونگے۔ اسی طرح قابل اقامت آبادی میں مثلاً شہر وغیرہ میں پندرہ یا زیادہ دن اقامت کا ارادہ کرلیا لیکن اس نیت کے ساتھ کہ حالات جب بھی درست ہو گئے تو چلے جائیں گے تو ایسی صورت میں پندرہ دن اقامت کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، یہ لوگ برابر مسافر شمار ہوں گے۔

البتہ کسی شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ کا ارادہ ایسا کرلیا کہ حالات جیسے بھی ہوں اب تو اس آبادی میں کم از کم پندرہ بیس دن مثلاً رہنا ہے تو اس صورت میں پوری نماز پڑھیں گے بشرطیکہ حکومت کی طرف سے نکالنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو، ورنہ تب بھی مسافر ہوں گے۔

لمافی التنویر:(۱۲۱/۲،طبع سعید)

من خرج عن عمارة موضع اقامته قاصدا مسيرة ثلاثة ايام ولياليها صلى الفرض الرباعی رکعتين والحاصل ان شروط الاتمام ستة :النية والمدة واستقلال الرأی وترك السير واتحاد الموضع وصلاحيته.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبیداللہ عابد دیروی

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۲۶۵

## ﴿مرد اپنے سسرال اور عورت اپنے میکے میں پوری نماز پڑھے یا قصر؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئٹہ کا رہائشی جس کے سسرال والے کراچی میں رہتے ہوں اپنے سسرال کے پاس کراچی آئے اور پندرہ دن سے کم رہنے کی نیت ہو تو کیا یہ شخص پوری نماز پڑھے گا یا قصر کریگا؟ یعنی شادی کرنے سے سسرال کا وطن داماد کے لئے وطن اصلی بنتا ہے یا نہیں؟

(۲) کراچی کی لڑکی جس کی شادی کوئٹہ میں ہوئی ہے اور رہائش بھی کوئٹہ میں ہے جب وہ کراچی

اپنے میکے آتی ہے اور پندرہ دن سے کم رہنے کی نیت ہو تو کیا وہ قصر کریگی یا پوری نماز پڑھے گی؟

(۳) شوہر اپنی بیوی کے ساتھ سسرال چلا گیا شوہر کا ارادہ یہ ہے کہ پندرہ دن سے پہلے میاں بیوی دونوں واپس اپنے گھر جائینگے، اور بیوی کا پندرہ دن سے زیادہ رہنے کا ارادہ ہے اس صورت میں بیوی کی نیت کا اعتبار ہوگا یا نہیں وہ پوری نماز پڑھے گی یا قصر کریگی؟

﴿جواب﴾ (۱) صرف شادی کرنے سے داماد کیلئے سسرال کا وطن، وطن اصلی نہیں بنتا وہاں مستقل رہائش اختیار کرے تب سسرال کا وطن، وطن اصلی بنتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں یہ آدمی (داماد) جب اپنے سسرال کراچی آئے اور پندرہ دن سے کم رہنے کی نیت ہو تو قصر کریگا۔ پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کا ارادہ ہو تو کراچی وطن اقامت ہوا لہٰذا وہ پوری نماز پڑھے گا۔

لما في فتح القدير: (۲/۲۱ ط رشيديه)

قيل الاوطان ثلاثة وطن أصلي وهو مولد الانسان أو موضع تأهل به و من قصده التعيش به لاالارتحال.

(۲) شادی کے بعد لڑکی کا وطن وہی کہلاتا ہے جو اس کے شوہر کا وطن ہو والدین کے وطن کا اعتبار نہیں رہتا اس لڑکی کی شادی کوئٹہ میں ہوئی ہے تو کوئٹہ اس کا وطنِ اصلی قرار پاتا ہے کراچی اب اس کے لئے وطن نہیں رہا، لہٰذا کراچی آکر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو وہ مسافر رہے گی اور قصر کریگی۔

لما في الشامية: (۲/۱۱۲ ط امداديه)

(الوطن الاصلي يبطل بمثله) فلو كان له ابوان ببلد غيره غير مولده وهو بالغ ولم يتاهل به فليس ذلك وطنا له ،الا اذا عزم على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله شرح المنيه.

(۳) سفر و اقامت میں شوہر کی نیت معتبر ہوتی ہے بیوی کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا شوہر اگر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میاں بیوی دونوں مسافر ہیں اور دونوں قصر کریں گے خواہ بیوی کا ارادہ پندرہ روز یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ہو۔

لما في الدر المختار: (۲/۱۱۶ ط امداديه)

والمعتبر نية المتبوع لا التابع كامراة وعبد وجندى وأجير مع زوج ومولى وأمير.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ چارسدوی

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۳۹

﴿وطن اقامت کیلئے شہر یا قریہ ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا تعلق ایک ایسی کمپنی سے ہے جس کا کام معدنیات تلاش کرنا ہے جسکی وجہ سے کبھی ایسی جگہ جانا ہوتا ہے جس کیلئے اسی (۸۰) نوے (۹۰) کلومیٹر سفر کرنا پڑتا ہے اور وہ جگہ بالکل پہاڑی جنگل نما سی ہوتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہم اگر مذکورہ جگہ میں پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کریں تو ہم وہاں پر قصر کرینگے یا پوری نماز پڑھیں گے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: عبداللہ سواتی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ایسی جگہ اقامت کی نیت کرنے سے وطن اقامت نہیں بنتا اس لئے کہ وطن اقامت کے لیے شہر یا گاؤں کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا آپ مذکورہ صورت میں قصر ہی کرینگے۔

لمافی الهداية: (اولین ۱/۱۶۷ مطبع رحمانیه)

ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة أو قریة خمسة عشر یوما أو اکثر وان نوی اقل من ذلک قصر... والتقیید بالبلدة والقریة یشیر الی انه لاتصح نیة الاقامة فی المفازة وهو الظاهر الخ.

ولمافی منية المصلی: (ص ۲۰۰، سهیل اکیڈمی)

وکذالاتصح نیة الاقامة فی الصحراء الامن اهل الأخبية.

ولمافی کنز الدقائق: (صلوة المسافر، ص ۴۲، طبع قدیمی)

أو ینوی اقامة نصف شهر ببلدة أو قریة فی حاشیته: والتقیید بهما یؤذن بانه لاتصح نیة الاقامة فی المفازة لکن لامطلقا بل مقیدا بما اذا سار ثلاثا الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۲۹۷

﴿یبطل الوطن المستعار بانشاء السفر مع بقاء الاثقال والاموال﴾

﴿وطن اقامت انشاء سفر سے باطل ہوجاتا ہے بقاء سامان اس کیلئے مانع نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وطن اقامت صرف سفر سے باطل ہوجاتا ہے یا اس کے بطلان کے لئے سفر کے ساتھ انتقال سامان اور اعراض عن

التوطن کا ارادہ بھی ضروری ہے یا نہیں؟

مثلاً: ایک عالم جامعہ عثمانیہ لکی مروت میں مدرس ہیں اور ان کا وطن اصلی احمد خیل ہے، جو لکی مروت سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ہے جامعہ عثمانیہ میں مولانا صاحب عموماً پندرہ دن سے زیادہ مقیم رہتے ہیں ان کو کبھی پشاور جانے کا اتفاق ہوتا ہے پشاور اور لکی مروت کے درمیان مسافت سفر ہے اور جب پشاور سے واپس تشریف لاتے ہیں تو جمعہ تک وہ مدرسہ میں رہتے ہیں اس دوران انکو قصر کرنا پڑیگا یا اتمام؟ اسکے علاوہ لکی مروت ان کے لئے وطن اقامت بن سکتا ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ ان کا ارادہ لکی مروت میں پندرہ دن سے زائد رہنے کا اگرچہ ہوتا ہے لیکن احمد خیل اور لکی مروت کے درمیان مسافت سفر نہیں ہے تحقیقی جواب عنایت فرما کر ہماری اس مشکل کو حل فرمائیں، احسن الفتاوی میں مذکورہ مسئلہ کے متعلق علماء ہمارے علاقے میں آپس میں اختلاف کررہے ہیں اور ان کو اس تحقیق سے اطمینان نہیں ہوا۔

سوال میں بجائے مذکورہ دونوں مقام کے آسانی کے لئے اس مثال کو سمجھئے کہ زید کا کہنا ہے کہ میرا وطن اصلی لاہور ہے اور کراچی میری ملازمت ہے اور ہر دو مہینہ کے بعد میں لاہور بیوی بچوں کے پاس آتا ہوں اتفاقاً یہاں کراچی سے عمرہ ادا کرنے کے لئے سعودیہ جانا ہوا اور اپنے سامان وغیرہ کو اپنے کرایہ کے مکان میں چھوڑ دیا عمرہ ادا کرنے کے بعد سعودیہ سے یہ ارادہ تھا کہ کراچی میں ایک ہفتہ تک قیام کروں گا اور پھر اپنے بچوں کے پاس جاؤں گا تو کراچی میں چند دنوں تک عارضی قیام کے دوران میں اتمام کروں گا یا قصر؟ مستفتی: مولنا عبدالمتین جامعہ عثمانیہ لکی مروت

﴿جواب﴾ وطن اقامت انشاء سفر سے باطل ہو جاتا ہے بقاء سامان بطلان وطن اقامت کیلئے مانع نہیں ہے، شرعی سفر متحقق ہونے کے بعد اس کو منقطع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وطن اصلی میں آجائے یا کسی ایسے مقام میں جو صالح للاقامۃ ہو کم از کم ۱۵ روز تک قیام کی نیت کرلے اس کے بغیر سفر منقطع تصور نہیں کیا جائیگا، وطن اقامت میں مقیم جب ایک مرتبہ بارادۂ سفر وہاں سے نکلے اور شرعی سفر جو علت قصر ہے وہ متحقق ہو جائے اس کے بعد دوبارہ اگر اس مقام پر اسکا آنا ہوا اور وہاں قیام کا ارادہ نہیں بلکہ آگے جانے کا ارادہ ہے اور اپنے سفر کو جاری رکھنا چاہتا ہے تو وہ برابر مسافر سمجھا جائیگا محض سابقہ وطن اقامت میں ورود سفر کے لئے مبطل نہیں ہو سکتا جب تک

دوبارہ اس مقام پر ۱۵روز قیام کا ارادہ نہ کرلے۔

لما فی الهداية:(۱/۱۷۲ مطبع رحمانیه)

ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة او قرية خمسة عشر يوما او اكثر وان نوى اقل من ذالك قصر.

فقہ کی تمام کتب، متون و شروح میں یہ مسئلہ واضح طور پر ذکر ہوا ہے کہ جب کوئی ایک بار شرعاً مسافر مانا جائے تو وہ جب تک مقیم نہ ہوگا یعنی کسی ایسے مقام میں جو صالح للاقامۃ ہو کم از کم نصف شہر تک قیام کا ارادہ نہ کرے یا وطن اصلی میں واپس نہ آئے وہ برابر مسافر تصور کیا جائیگا اور سفر کے احکام کی رعایت اس پر لازم ہوگی، چنانچہ کتب فتاوی میں مسافر کے مقیم بننے کیلئے مستقل شرائط بیان کئے گئے ہیں جنکی رعایت کئے بغیر کوئی مسافر مقیم نہیں بن سکتا۔

ولما فى البدائع الصنائع:(۱/۱۷ طبع سعيد)

أما بيان مايصير المسافر به مقيما فالمسافر يصير مقيما بوجود الاقامة و الاقامة تثبت بأربعة أشياء احدها صريح نية الاقامة وهو ان ينوى الاقامة خمسة عشر يوما فى مكان صالح للاقامة فلابد من اربعة أشياء نية الاقامة ونية مدة الاقامة واتحاد المكان وصلاحيته للاقامة.

(والثانى) وجود الاقامة بطريق التبعية وهو ان يصير الاصل مقيما فيصير التبع أيضا مقيما باقامة الاصل .(۱/۱۰۱،طبع سعيد)

(أما الثالث) فهو الدخول فى الوطن فالمسافر اذا دخل مصره صار مقيما سواء دخلها للاقامة او للاجتياز او لقضاء حاجة والخروج بعد ذلك لما روى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يخرج مسافرا الى الغزوات ثم يعود الى المدينة ولا يجدد نية الاقامة ولان مصره متعين للاقامة فلاحاجة الى التعين بالنية.(۱/۱۰۳ مطبع سعيد)

(واما الرابع) فهو العزم على العود للوطن وهو ان الرجل اذا خرج من مصره بنية السفر ثم عزم على الرجوع الى وطنه وليس بين هذا الموضع الذى بلغ وبين مصره مسيرة سفر يصير مقيما حين عزم عليه لان العزم على العود الى مصره قصد ترك السفر بمنزلة نية الاقامة فصح ولن كان بينه وبين مصره مدة سفر لايصير مقيما(۱/۱۰۳ مطبع سعيد).

صاحب بدائع رحمۃ اللہ علیہ نے پوری وضاحت کیساتھ مسافر کے مقیم بننے کے لئے شرائط بیان فرمائیں اور یہی شرائط فتاوی کی دیگر معتبر کتب درمختار، بحرالرائق وغیرہ میں بھی مذکور ہیں کہ جب کوئی اپنی اقامت گاہ سے سفر کے ارادے سے نکلے تو اب اس پر قصر واجب ہے یہاں تک کہ وہ واپس وطن اصلی میں داخل ہو جائے یا کسی دوسری جگہ آبادی میں ۱۵روز تک قیام کا ارادہ

کرے یا اسکا متبوع یہ ارادہ کرے اور یا مسافت سفر کرنے سے پہلے پہلے واپسی کا ارادہ کرے جس سے سفر جو کہ علت قصر ہے وہ منقطع ہو جاتا ہے تو وہ مقیم ہو جاتا ہے اس کے بغیر یعنی مندرجہ بالا مذکورہ شرائط کے بغیر مسافر رہیگا اور اس پر قصر لازم ہوگا، چنانچہ تنویر الابصار و درمختار میں یہ شرائط اس طرح بیان ہوئی ہیں: (۲/۱۲۱-۱۲۵، طبع سعید)

(من خرج من عمارة موضع اقامته قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها... صلى الفرض الرباعي ركعتين) وجوبا...... (حتى يدخل موضع مقامه) ان سار مدة السفر والا فيتم بمجرد نية العود لعدم استحكام السفر (اوينوى)...... (اقامة نصف شهر) حقيقة اوحكما... (بموضع واحد صالح لها.

لہٰذا مذکورہ صورت میں مولانا صاحب جب ایک مرتبہ بارادۂ سفر جامعہ عثمانیہ سے نکلے اور پشاور روانہ ہوئے تو ۴۸ میل مسافت طے کرنے کے بعد اگر واپس جامعہ عثمانیہ لوٹ کر آئیں گے یا پشاور سے ہو کر جامعہ عثمانیہ میں واپس تشریف لائیں گے تو جب تک وہ جامعہ عثمانیہ میں کم از کم ۱۵ روز تک قیام کا ارادہ نہیں کریں گے وہ برابر مسافر سمجھے جائیں گے اور سفر کے احکام کی رعایت لازم ہوگی اس لئے کہ مولانا صاحب جامعہ عثمانیہ سے پشاور جانے کیوجہ سے مسافر قرار پائے اب واپسی کی صورت میں جامعہ عثمانیہ میں آ کر جب آگے جانے کا ارادہ ہے اور ۱۵ روز تک قیام کا ارادہ نہیں ہے تو وہ حکما مسافر ہیں گویا انکا سفر جاری ہے اس لئے کے دوران سفر پندرہ روز سے کم نیت اقامت کا شریعت نے کوئی اعتبار نہیں کیا ہے اور سفر کو جاری سمجھا ہے اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جامعہ عثمانیہ چونکہ مولانا صاحب کا وطن اقامت پہلے سے تھا اس لئے واپسی کی صورت میں ان پر اتمام لازم ہوگا۔ چنانچہ سامان بھی انکا جامعہ میں باقی تھا اس لئے کہ سفر کے احکام کا مدار وجود سفر اور عدم وجود سفر پر ہے چنانچہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ کسی حکم کا مدار اسکی علت پر ہوتا ہے، وجود علت مستلزم ہے وجود حکم کیلئے اسی طرح اسکی نفی سے حکم کی نفی لازم ہے اور یہ بات بھی عبارات فقہاء سے واضح ہو جاتی ہے کہ قصر کے لئے علت وجود سفر ہے اور اتمام کے لئے علت وجود اقامت ہے اس لئے جب تک کوئی مسافر رہیگا اس پر سفر کے احکام کی رعایت لازم ہوگی اور جب سفر منقطع ہو کر مقیم بنے گا تو اقامت کے احکام کی رعایت لازم ہوگی چنانچہ ہمارے شیخ استاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اصول افتاء میں تحریر فرماتے ہیں:

"من المسلم لدى الفقهاء أن الحكم يدور على العلة وجودا وعدما فان وجدت العلة ثبت الحكم وان انعدمت العلة انتهى الحكم" (اصول افتاء،ص۳۸)

اورعلامہ شامیؒ احکام سفر کیلئے علت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: (۱۲۵/۲، طبع سعید)

أقول ويظهر لي في الجواب ان العلة في الحقيقة هي المشقة وأقيم السفر مقامها ولكن لا تثبت عليتها الا بشرط ابتداء وشرط بقاء فالأول مفارقة البيوت قاصدا مسيرة ثلاثة ايام ،والثاني استكمال السفر ثلاثة ايام فاذا وجد الشرط الاول ثبت حكمها ابتداء فلذا يقصر بمجرد مفارقة العمران ناويا ولايدوم الا بشرط الثاني فهو شرط لاستحكامها علة فاذا عزم على ترك السفر قبل تمامه بطل بقاؤها علة لتبولها النقض قبل الاستحكام ومضى فعله في الابتداء على الصحة لوجود شرطه ولذا لو لم يصل لعذر ثم رجع يقضيها متصورة كما قدمناه فتدبر.

اسی قاعدہ کلیہ کی بناء پر سفر واقامت کے تمام احکام متفرع ہوتے ہیں چنانچہ مسافت سفر کے ارادہ سے نکلنے والا جب آبادی سے نکلتا ہے تو اب اسکا سفر شروع ہوجاتا ہے اورعلت کے وجود کی شرط (شہر کی حدود سے ۴۸ میل کے سفر کی نیت سے نکلنا) پائے جانے کیوجہ سے قصر لازم ہوجاتی ہے اور ۴۸ میل مسافت طے کرنے کے بعد علت کی بقاء کی شرط (۴۸ میل کی مسافت طے کرنا) پائی گئی اور قصر کی علت مستحکم ہوگئی ہے۔اب وہ برابر مسافر رہے گا،جب تک کہ سفر کو منقطع کرنے والی چار شرائط میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے جس سے قصر کی علت منتفی ہوکر اتمام کی علت یعنی اقامت متحقق ہوجاتی ہے۔چنانچہ وطن اصلی میں آنے والے کو اتمام کا حکم اس لئے ہے کہ وطن اصلی میں آنے سے سفر منقطع ہوجاتا ہے خواہ اسمیں ایک دن کیلئے بھی رہنے کا کوئی ارادہ نہ ہو بلکہ جانے کا ارادہ ہو اور اپنے سفر کو جاری رکھنا چاہتا ہو تب بھی اس پر اقامت کے احکام کی رعایت لازم ہوگی اس لئے کہ قصر کی علت باقی نہیں رہی اور اتمام کی علت متحقق ہوگئی

لمافی البدائع:(۱۰۳/۱،طبع سعید)

أما الثالث فهو الدخول في الوطن فالمسافر اذادخل مصره صار مقيما سواء دخلها للاقامة او للاجتياز أو لقضاء حاجة والخروج بعد ذالك.

اسی طرح وطن اصلی کے علاوہ کسی دوسری آبادی میں ۱۵ روز تک قیام کا ارادہ کرنے والے کے لئے اتمام کا حکم اس لئے ہے کہ کسی آبادی میں مسافر کا ۱۵ روز تک قیام کے ارادہ سے سفر منقطع ہوجاتا ہے اور قصر کی علت باقی نہیں رہتی اتمام کی علت متحقق ہوجاتی ہے،اسی قاعدہ کلیہ

کو محفوظ رکھتے ہوئے صورت مسئولہ کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ جب مولانا صاحب جامعہ عثمانیہ سے بارادۂ سفر پشاور روانہ ہوئے اور وہاں پہنچے تو انکا سفر متحقق ہوا اور علت قصر پائی گئی، خواہ ان کا سامان جامعہ عثمانیہ میں باقی ہے اسلئے کہ شرعی سفر صحیح ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ سامان بھی ساتھ لیکر جائے اب اگر وہ جامعہ عثمانیہ تشریف لائیں گے تو جب تک جامعہ عثمانیہ میں ۱۵ روز تک قیام کا ارادہ نہیں کریں گے وہ برابر مسافر سمجھے جائیں گے اس لئے کہ وطن اصلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ میں خواہ وہ جگہ اس سے پہلے اس کا وطن اقامت رہا ہو کم از کم ۱۵ روز تک قیام کا ارادہ نہیں کریں گے تو سفر منقطع نہیں ہوگا اور علت قصر باقی رہے گی اس لیے سفر کے احکام کی رعایت لازم ہوگی۔ اور پہلی والی نیت اقامت اس سفر کو منقطع کرنے کیلئے مؤثر نہیں ہوسکتی اس لئے کہ یہ مستقل سفر ہے لہٰذا اس کے انقطاع کے لئے مستقل نیت اقامۃ کی ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتب فتاوی اور تمام متون وشروح اس پر متفق ہیں اور سب میں اس مسئلہ کی تصریح کی گئی ہے کہ وطن اقامت سفر سے باطل ہو جاتا ہے اس لئے کہ وطن اقامۃ میں اتمام کا حکم اسکی علت یعنی نیت اقامت کیوجہ سے تھا اور سفر شروع کرنے سے اقامت باقی نہیں رہتی سفر اور اقامت دونوں آپس میں ضد ہیں اور متضادین کا معاوجود ممتنع ہے اس لئے سفر سے وطن اقامت باطل ہو جاتا ہے، لہٰذا جب بھی سفر کا وجود صحیح تسلیم کیا جائیگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ وطن اقامت کو باطل تصور کیا جائیگا۔

چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ سفر ہوتے ہوئے وطن اقامت باقی نہیں رہ سکتا اس لئے کہ سفر خود ضد ہے اقامت کے لئے۔

لمافی تبیین الحقائق:(۵۱۸/۱،طبع سعید)

قولہ:(والسفر والاصلی)ای ویبطل بانشاالسفر وبالوطن الاصلی لأن السفر ضدالاقامۃ فلایبقی معہ.

اور شرح العنایۃ میں ہے کہ سفر چونکہ ضد وطن ہے اس لئے سفر متحقق ہونے کے بعد وطن اقامت باقی نہیں رہ سکتا اور پھر خود اشکال ذکر فرمایا کہ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ سفر جیسے وطن اقامۃ کے لئے ضد ہے ایسے ہی وطن اصلی کے لئے بھی ضد ہے، لہٰذا وطن اصلی سے سفر کرنے کے بعد اس کی وطنیت بھی باطل ہونی چاہیے اور اسمیں سفر سے واپس آنے کی صورت میں بدون نیت قیام

نصف شہر اتمام جائز نہیں ہونا چاہئے جسکا جواب یہ دیا کہ یہ بات مسلم ہے لیکن وطن اصلی میں مسافر کو بدون نیت قیام نصف شہر مقیم کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ خود حضور ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لاتے خواہ آپ ﷺ کا نصف شہر سے کم قیام کا ارادہ ہوتا تب بھی اتمام فرماتے (قال العبد الضعيف وبمثله بترك القياس) چنانچہ امام اکمل الدین قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں.

أما وطن الاقامة فله ما يساويه وما هو فوقه فيبطل بكل منهما وبانشاء السفر أيضا لأنه ضده فان قيل فهو ضد للوطن الاصلي ايضا فلم لم يبطله فالجواب انه لم يبطله بالأثر لما روى ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يخرج من المدينة الى الغزوات ولم ينتقض وطنه بالمدينة حيث لم يجدد نية الاقامة بعد الرجوع (شرح العناية على هامش فتح القدير: (۱۲/۲ طبع رشيديه) (وفى الهداية: (۱/۱۶۷ طبع رحمانيه) وفى الكفاية: (۱۲/۲ طبع رشيديه) على هامش فتح).

اور صاحب بحر لکھتے ہیں: (۱۳۶/۲، طبع سعید)

اما وطن الاقامة فهو الوطن الذى يقصد المسافر الاقامة فيه وهو صالح لها نصف شهر وهو ينتقض بواحد من ثلاثة، بالاصلي لانه فوقه وبمثله وبالسفر لانه ضده.

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے صاحب بحر کی تعلیل کہ وطن اقامت سفر سے اس لئے باطل ہوجاتا ہے کہ سفر خود اس کی ضد ہے'' کو پسند فرمایا چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں: (۱۳۲/۲، طبع سعید)

وينبغى أن يزيد وبضده كبطلان وطن الاقامة أو السكنى بالسفر فانه فى البحر علل لذلك بقوله لأنه ضده.

ان کے علاوہ دیگر کتب فتاویٰ میں بھی بطلان وطن اقامۃ بالسفر کے لئے علت یہی بیان ہوئی ہے کہ سفر چونکہ خود ضد ہے وطن اور اقامت کے لئے اس لئے سفر کے موجود ہونے سے وطن اقامت خود بخود باطل ہوجاتا ہے اس لئے کہ ایک ضد کے وجود سے دوسرے کی نفی لازم ہے۔
چنانچہ صاحب بدائع ایک مسئلہ کے بیان میں فرماتے ہیں کہ: وجود ضد مستلزم ہے دوسرے کی نفی کو

"أن القياس ان يبطل السفر بقليل لان الاقامة قرار والسفر انتقال والشئ ينعدم بما يضاده فينعدم حكمه ضرورة. (۹۷/۱ طبع سعيد)

یعنی ایک ضد کے وجود سے دوسرے کی نفی لازم ہے اور جب اسکی نفی ہوجاتی ہے تو لامحالہ اس کے حکم کی نفی بھی ہوگی، لہٰذا وطن اقامت سے سفر کرنے کی صورت میں اسکے بطلان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی اور سامان کا باقی رہنا یا ساتھ لیکر جانا دونوں برابر ہیں اس سے مسئلہ پر کوئی اثر

نہیں پڑتا، سفر کے صحیح ہونے کے لئے سامان کو ساتھ لے جانا کسی نے بھی شرط نہیں قرار دیا ہے۔

اور اگر کوئی تحکما یہ کہدے کہ سفر وہی ضد وطن یا ضد اقامت ہوگا جس میں اس مقام کو مستقل چھوڑنے کا ارادہ ہو اور دوبارہ یہاں واپس آنے کا کوئی ارادہ نہ ہو اور سامان کا لیجانا اس ارادہ پر دال ہوگا، اور اگر یہاں سے سفر کرتے ہوئے دوبارہ واپس آنے کا عزم ہے اور سفر کے بعد پھر اس جگہ کو وطن اقامۃ باقی رکھنے کا قصد ہے تو ایسا سفر ضد اقامت یا ضد وطن نہیں ہوگا جیسا کہ احسن الفتاوی میں ہے تو یہ دعوی بلا دلیل ہے (اور جو دلائل احسن الفتاوی میں دیئے گئے ہیں انکا مصداق مسئلہ مذکورہ نہیں ہے، عنقریب اسکو واضح کیا جائیگا) اور فقہاء کرام کی عبارات کے بالکل معارض ہے اس لئے باطل ہے۔

چنانچہ فقہاء کرام نے سفر کو وطن اصلی کے لئے بھی ضد تسلیم کیا ہے البتہ سفر وطن اصلی کے لئے ضد ہونے کے باوجود مبطل اس لئے نہیں ہے کہ اس بارے میں خود حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا عمل ثابت ہے فقہاء کرام نے متعدد جگہ سفر کو ضد وطن بتایا ہے اور شرح العنایہ کی عبارت میں عدم بطلان وطن بالسفر کی وجہ کا ذکر بھی ہو چکا ہے اسی طرح ہدایہ اور کفایہ وغیرہ میں بھی یہی وجہ بیان کی گئی ہے، وجہ بطلان دعوی اس طرح ہے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ صرف وہ سفر (ضد) مبطل وطن ہوگا جس میں اعراض عن التوطن کا ارادہ ہو اور سامان وغیرہ بھی ساتھ لیکر جائے تو پھر فقہاء کرام کا یہ سوال قائم کرنا کہ سفر ضد وطن ہونے کے باوجود اصلی کے لئے کیونکر نہیں ہے حالانکہ قیاس کا تقاضا ہے کہ مبطل ہو اور اس کے جواب میں یہ کہنا کہ اس کے خلاف اثر پایا جاتا ہے اس لئے مبطل نہیں ہے بے معنی ہوگا۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ وطن اصلی سے سفر کرنے والا اعراض عن التوطن کے ارادہ سے سفر نہیں کرتا جیسا کہ ظاہر ہے اور سامان وغیرہ بھی ساتھ نہیں لیجاتا تو وطن اصلی سے سفر کو ضد تسلیم نہ کیا جاتا اور مذکورہ جواب کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ جواب میں یوں کہا جاتا کہ وطن اصلی سے سفر کرنے میں اعراض عن التوطن کا ارادہ نہیں ہوتا اور سامان وغیرہ باقی رہنے سے یہ سفر کی ضد نہیں قرار پاتا اس لئے کوئی نقض وارد نہیں ہوتا" تو معلوم ہوا کہ فقہائے کرام نے مطلق سفر کو ضد قرار دیا ہے اور وطن کیلئے مبطل بتادیا ہے اور عدم نیت اعراض عن التوطن اور بقاء سامان کا کوئی اعتبار نہیں کیا ہے۔

احسن الفتاوی میں مذکورہ مسئلہ کا جواب اس کے خلاف لکھنے کی وجہ بندہ کی ناقص رائے میں ایک تو یہ ہے کہ قصر اور اتمام کی علت پر غور نہیں کیا گیا ہے جسکی وضاحت بندہ نے کی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو بدائع اور بحر کی عبارت سے بظاہر شبہ ہوا ہے بدائع کی عبارت یہ ہے:

وينتقض بالسفر ايضا لان توطنه في هذا المقام ليس للقرار ولكن لحاجة فاذا سافر منه يستدل به على قضاء حاجته فصار معرضا عن التوطن به فصار ناقضا له دلالة(۱۰۲/۱،طبع سعید).

اور بحر کی عبارت یہ ہے:(۱۳۶/۲،طبع سعید)

وفي المحيط ولو كان له اهل بالكوفة واهل بالبصرة فمات اهله بالبصرة وبقي له دور وعقار بالبصرة قيل البصرة لاتبقى وطناله لا نهاانماكانت وطنا بالأهل لا بالعقار ألاترى انه لو تأهل ببلدة لم يكن له فيهاعقار صار توطناله وقيل تبقى وطنا له لانها كانت وطناله بالأهل والدار جميعا فبزوال احد هما لايرتفع الوطن كوطن الاقامة يبقى ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر.

بدائع کی مذکورہ توجیہ سے حضرت اقدس مفتی صاحب دامت برکاتہم نے سفر کو اس قید کیساتھ مقید کر دیا کہ صرف وہ سفر مبطل لوطن الاقامۃ ہوگا جس میں اعراض عن التوطن ہو اور مسافر کا دوبارہ اس مقام پر آنے کا ارادہ نہ ہو چنانچہ لکھتے ہیں:

''عبارات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن اقامۃ سے سفر محض کرنا ہی مبطل نہیں بلکہ دراصل سفر بصورت ارتحال مبطل ہے یعنی یہ بطلان اس وقت ہوگا جبکہ وطن اقامۃ سے بنیت سفر جاتے وقت اپنا سامان وغیرہ بھی ہمراہ لیجائے جس سے یہ سمجھا جائے کہ شخص مذکور کا ارادہ فی الحال یہاں واپس آنے کا نہیں ہے'' (احسن الفتاوی:۱۰۸/۴،طبع سعید)

عبارت بدائع سے سفر کو مقید بالاعراض سمجھا کہ سفر تب مبطل لوطن الاقامۃ ہوگا جبکہ سفر کرنے والا اس ارادہ سے سفر کرے کہ دوبارہ یہاں واپس نہیں آئیگا اور بحر میں جزئیہ محیط سے یہ سمجھا کہ بقاء سامان دلیل ہے عدم اعراض پر یعنی سامان کی موجودگی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس شخص کا دوبارہ بھی یہاں واپس آنے کا ارادہ ہے لہٰذا اعراض عن التوطن نہیں پایا گیا اور بطلان وطنیت کا مدار اعراض پر ہے۔ گویا اصل مدار بطلان وطنیت کا اعراض عن التوطن پر ہے اور حضرت اقدس مفتی

صاحب زید مجدہ کے نزدیک اعراض "عن التوطن" ہی علت ہے بطلان وطنیت کے لئے۔

چنانچہ آگے لکھتے ہیں: ''یہی وجہ ہے کہ وطن اصلی سفر سے باطل نہیں ہوتا کیونکہ وطن اصلی سے سفر کرنا ترک توطن بالوطن الاصلی یا اعراض عن التوطن پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اھل وعیال وغیرہ کی موجودگی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جانے والا اس مقام پر واپس لوٹ آنے کے قصد وارادہ سے جارہا ہے حتی کہ اگر وطن اصلی سے جانے والا اھل وعیال سمیت چلا جائے اور دوسری جگہ وطن اصلی بنالے تو پہلے وطن اصلی کی وطنیت بھی ختم ہوجاتی ہے جیسا کہ تمام کتب فقہ میں مصرح ہے اس سے معلوم ہوا کہ دراصل بطلان وطن کا مدار سفر وغیرہ مع ترک توطن یا اعراض عن التوطن پر ہے محض خروج بنیت سفر پر نہیں'' (احسن الفتاوی: ۴/۱۰۹، طبع سعید)

جناب حضرت اقدس مفتی صاحب دامت برکاتہم کے اس استشہاد ''یہی وجہ ہے کہ وطن اصلی سفر سے باطل نہیں ہوتا کیونکہ وطن اصلی سے سفر کرنا ترک توطن باالوطن الاصلی یا اعراض عن التوطن پر دلالت نہیں کرتا'' کے متعلق عرض کروں گا کہ یہ صحیح نہیں ہے اور عدم بطلان وطن اصلی بالسفر کی وجہ یہ نہیں ہے جو حضرت اقدس نے بیان فرمائی بلکہ اسکی وجہ وہ ہے جو تمام فقہائے کرام نے تقریبا بیان فرمائی ہے جسکا پہلے بھی ذکر ہو چکا کہ امام اکمل الدین قدس سرہ نے شرح عنایہ میں باقاعدہ اعتراض وجواب کی شکل میں اس کی وضاحت فرمائی اور ھدایہ اور صاحب کفایہ وغیرہ نے بھی صراحت فرمائی ہے کہ مسافر اگر وطن اصلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ پندرہ روز سے کم قیام کا ارادہ کرے تو اس کے لئے قصر ضروری ہے اور اسکا سفر جاری سمجھا جائیگا لیکن وطن اصلی میں اگر پندرہ روز سے کم قیام کی نیت ہے تو بھی اتمام کریگا جسکی وجہ خود حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کا عمل ہے جس سے معلوم ہوا کہ وطن اصلی کے سفر سے باطل ہونے کی وجہ اور علت حضور ﷺ کا عمل ہے نہ یہ کہ چونکہ سفر میں اعراض نہیں پایا گیا تھا اس لئے وطنیت باقی تھی۔

لہٰذا بطلان وطنیت کے لئے علت اعراض عن التوطن یا سفر مقید بالاعراض قرار دینا درست نہیں بلکہ بطلان وطنیت کے لئے فقہائے کرام نے متعدد جگہ متون اور شروح میں پوری وضاحت کیساتھ علتیں بیان فرمائی ہیں کوئی خفاء باقی نہیں رہا ہے جسکے حوالے پہلے بھی ذکر ہوئے اور اس مقام پر بھی چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

والاصل ان الوطن الاصلی یبطل بالوطن الاصلی دون وطن الاقامة وانشاء السفر وهو ان یخرج قاصدا مکانا یصل الیه فی مدة السفر لان الشئ انما یبطل بماهو فوقه اوما یساویه ولیس فوقه شئ فیبطل بمایساویه واما وطن الاقامة فله مایساویه وماهو فوقه فیبطل بکل منهما وبانشاء السفر ایضا لانه ضده.(شرح العنایة علی هامش الفتح:(۲/۲۱-۲۲،طبع رشیدیه)

ولمافی البحر:(۲/۱۳۶،طبع سعید)

(قوله ویبطل الوطن الاصلی بمثله لاالسفر ووطن الاقامة بمثله و السفر والاصلی لان الشئ یبطل بماهو مثله لابماهو دونه(الیٰ ان قال)؛قوله لاالسفر ای لایبطل الاصلی بالسفر حتی یصیر مقیمابالعود الیه من غیرنیة الاقامة وکذا لایبطل بوطن الاقامة واما وطن الاقامة فهو الوطن الذی یقصد المسافر الاقامة فیه و هو صالح لهانصف شهر وهو ینتقض بواحد من ثلاثه بالاصلی لانه فوقه وبمثله وبالسفر لانه ضده.

اورعلامہ شامیؒ نے اس تعلیل کو پسند فرمایا ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں:(۲/۱۳۲،طبع سعید)

وینبغی ان یزید وبضده کبطلان وطن الاقامة والسکنی بالسفرفانه فی البحرعلل بقوله لانه ضده

اورصاحب کفایہ فرماتے ہیں:(۲/۱۷،طبع رشیدیہ)

ثم من حکم الوطن الاصلی ان ینتقض بالوطن الاصلی لانه مثله ومن حکم وطن السفر انه ینتقض بالوطن الاصلی لانه فوقه وینتقض بوطن السفر لانه مثله وینتقض بانشاء السفر لانه ضده ولاینتقض بوطن السکنی لانه دونه.

فقہاء کرام کی عبارات سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ بطلان وطنیت کے لئے علت یاتو مثل ہے یا" بما هو فوقه " ہےاور یا"ضده " ہے۔لہٰذابطلان وطن اقامت کے لئے علت ''اقامت کی ضد''یعنی سفر ہے یادوسراوطن اقامت اور یاوطن اصلی ہے اب سفرکواس شرط کیساتھ مقید کرنا کہ سفرتب مبطل ہوگا جب سفرکرنے والااس ارادہ سے سفرکرے کہ اس مقام کی وطنیت آئندہ کے لئے ختم کرتا ہوں اور یہاں پردوبارہ واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے یہ صحیح نہیں ہے یہ تقیید بلادلیل ہےاور صاحب بدائعؒ کی عبارت سے مذکورہ توجیہ پراستدلال کرنااور اس سے سفرکو''مقيد بالاعراض عن التوطن '' سمجھناہرگز درست نہیں بلکہ یہ تقیید ''الاستدلال بمالا یرضی بہ القائل'' کے قبیل سے ہے،اس لئے کہ صاحب بدائعؒ نے اس عبارت میں بطلان وطن اقامۃ بالسفر کی صرف توجیہ بیان فرمائی ہے کہ سفر سے وطن اقامت اس لئے باطل ہوجاتا ہے کہ سفرمیں یعنی نفس سفرمیں اعراض عن التوطن ہوتا ہےاور وطن اقامۃ ایک عارضی غیر

مستقل وطن ہونے کیوجہ سے باطل ہو جاتا ہے صاحب بدائعؒ کی مراد اس عبارت سے ''سفر'' کو مقید بالاعراض کرنا ہرگز نہیں ہے اگر واپس آنے کا ارادہ ہو تو یہ معرض عن التوطن نہیں ہوگا یہ تقیید بلا دلیل ہے بلکہ صاحب بدائع نے نفس سفر کو دلیل علی الاعراض قرار دیا ہے کہ یہاں سے جب سفر کے ارادے سے جائیگا تو یہ سفر خود دلیل ہے اس وطن چھوڑنے پر، اور اگر صاحب بدائعؒ کا مقصود سفر کو مقید بالاعراض کرنا ہوتا تو وہ اعراض عن التوطن بہ کی قید کو مستقل طور پر ذکر کرتے یہاں پر تو نفس سفر کے وطن اقامت کیلئے مبطل ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: (۱/۱۰۴، طبع سعید)

"فاذا سافر منه يستدل به على قضاء حاجته فصار معرضا عن التوطن به فصار ناقضاً له دلالة.

یعنی جب اس عارضی اقامت پذیر نے یہاں سے سفر کیا تو اسکا یہ سفر کرنا خود دلیل ہے اسکی ضرورت پوری ہونے پر (چاہے فی الواقع پوری ہو یا نہ ہو) تو سفر کرنے سے وہ معرض عن التوطن ہوا تو اسکا یہ سفر وطن اقامت کے لئے دلالۃً مبطل ہوا۔

معلوم ہوا کے صاحب بدائعؒ نے نفس سفر کو دلیل بنالیا اعراض عن التوطن پر، لہٰذا جب بھی سفر متحقق ہوگا تو اسکا یہ سفر اعراض سمجھا جائیگا اور اس کے واپس آنے کا کچھ اعتبار نہیں کیا جائیگا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ عبارتِ بدائع سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے، احسن الفتاوی میں مذکور جواب کے لئے دلیل نہیں بن سکتی اور احسن الفتاوی میں ذکر کردہ جواب کے لئے اسی عبارت کو اصل حوالہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اسطرح مراد لینے سے تقیید ''سفر'' لازم آتی ہے اور اس مقام پر ''سفر'' مقید بذلک القید نہیں ورنہ تقیید الشئ بنفسہ لازم آئیگا جو کہ صحیح نہیں ہے اسکے علاوہ دیکھا جائے تو بطلان وطن الاقامۃ بالسفر کی وجہ صرف صاحب بدائعؒ نے تحریر نہیں فرمائی بلکہ دیگر شارحین اور اہل فتاوی حضرات نے بھی اسکی وجہ بیان فرمائی ہے اور تقریباً تمام معتبر کتابوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ سفر چونکہ اقامت اور وطن دونوں کے لئے ''ضد'' ہے اس لئے وطن اقامۃ سفر سے باطل ہو جاتا ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ سفر متحقق ہو جائے اور ایک شخص کو مسافر قرار دیا جائے اسکے باوجود اس کو مقیم بھی تصور کرلیا جائے اسی طرح سفر بھی ہو اور

وطن بھی یہ محال ہے اس لئے کہ سفر اور اقامۃ آپس میں متضادین ہیں اور سفر اور وطن بھی آپس میں متضادین ہیں تو ایک کے تحقق سے دوسرے کی نفی لازم ہے جیسا کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ متضادین کا معاً تحقق محال ہے اس طرح صاحب بدائع کی عبارت کے وہی معنی جو بندہ نے سمجھے ہیں، متعین ہو جاتے ہیں اور تمام عبارات کا مفہوم ایک ہو کر تطبیق ہو جاتی ہے۔

اور جہاں تک ''بحر'' کی عبارت منقول از محیط کا تعلق ہے تو اس سے یہ ثابت کرنا کہ ''وطن اقامۃ بقاء سامان کی صورت میں سفر سے باطل نہیں ہوتا'' ہرگز درست نہیں اس لئے کہ اس عبارت میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ وطن اقامۃ میں سامان وغیرہ باقی ہو اور وہاں سے قریب کسی دوسری جگہ میں اقامت اختیار کر لے تو پہلا وطن اقامۃ محض اس انتقال سے باطل نہیں ہوگا، اس کے بارے میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کا یہ کہنا کہ اس ''موضع آخر کو مادون السفر کی قید کے ساتھ مقید کرنا بلا دلیل ہے اور جیسا کہ اس کے مشبہ وطن اصلی میں ایسی کوئی قید موجود نہیں بظاہر اس مشبہ بہ میں بھی ایسی کوئی قید موجود نہیں'' (احسن الفتاوی: ۴/۱۰۵، طبع سعید)

یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس تقیید کے لئے دلیل ہے اور وہ یہ کہ نفس سفر کا مبطل وطن اقامۃ ہونا متعدد جگہ مذکور ہے تو اس موقع پر انتقال بصورت سفر کا مبطل وطن اقامۃ ہونے میں بظاہر کسی قسم کے شبہ کا اندیشہ ہی نہیں تھا اس لئے تقیید کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا اس کا محمل ''مادون السفر'' ہی ہے نہ کہ مطلق موضع آخر۔

اور یہ کہنا کہ ''مشبہ وطن اصلی میں ایسی کوئی قید موجود نہیں بظاہر اس مشبہ بہ میں بھی ایسی کوئی قید موجود نہیں'' بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وطن اصلی میں اس قید کا موجود ہونا یا موجود نہ ہونا برابر ہے تو ی دلیل کی وجہ سے جو خود حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عمل ہے تو اس کی تقیید اور عدم تقیید سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آتی جبکہ وطن اقامت کا سفر سے باطل ہونا اور سفر کا وطن اور اقامت دونوں کے لئے ضد ہونا عبارات فقہاء کرام سے ظاہر ہے اور اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا مشبہ بہ کو اس لحاظ سے مشبہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہوا۔

اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہ کی بات میں غور نہیں کیا گیا ورنہ دوسرے وطن اصلی کی بحث کوئی الگ بحث نہیں بلکہ یہ ''تمسئلہ'' پر تو بحث ہے چنانچہ وطن اصلی کے لئے دوسرا

وطن اصلی ہی مبطل ہے جسکو بمثلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور صاحب بحرؒ کی پوری بحث اسی سے متعلق ہے جیسا کہ شارحین کی عادت ہے کہ متن کو ذکر کرتے ہیں اور پھر ایک ایک لفظ پر بحث کرتے ہیں تو یہاں پر بھی صاحب بحرؒ نے مصنفؒ کے قول: (قوله ويبطل الوطن الاصلى بمثله لا السفر ووطن الاقامة بمثله والسفر والاصلى) ذکر فرمایا اور پھر وطن اصلی کے "بمثلہ" سے باطل ہونے سے متعلق تفصیلی بحث فرمائی اور وطن اصلی اور وطن اقامت کا سفر سے باطل ہونا یا باطل نہ ہونا اس سے متعلق ابھی تک بحث شروع نہیں فرمائی بلکہ اس سے متعلق بحث کئی سطروں کے بعد آرہی ہے جیسا کہ کئی سطروں کے بعد فرمایا ہے "وقوله: لا السفر اى لا يبطل الاصلى بالسفر (بحر ۲/۱۳۶)) (اس بات کو سمجھنے کے لئے "بحر" کی جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ کا مطالعہ فرمائیں) غور کرنے کے بعد حاصل یہ ہوگا کہ بطلان وطن اصلی کی تشبیہ وطن اقامت سے صرف ایک بات میں دی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ وطن اصلی اپنے مثل سے باطل ہوجاتا ہے اسی طرح وطن اقامۃ بھی اپنے مثل سے باطل ہوجاتا ہے پھر یہاں پر ایک خاص صورت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جس طرح وطن اقامت بوجۂ بقاء سامان وغیرہ صرف انتقال بنفسہ سے باطل نہیں ہوتا اسی طرح وطن اصلی متحقق ہونے کے بعد بقائے دار وغیرہ کیوجہ سے اس کی وطنیت باقی رہے گی اور باطل نہ ہوگی اس طرح غور کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں پر "موضع آخر" کیساتھ قریب کی قید اگرچہ مذکور نہیں ہے لیکن اسکا اعتبار ضروری ہے اس لئے کہ وطن اصلی کیلئے دوسرا وطن اصلی (مثل) مبطل ہے جبکہ وطن اقامت کے لئے اگر مثل مبطل ہے تو سفر بھی مستقل مبطل ہے، اس طرح مراد لئے بغیر فقہاء کرام کی عبارات کی تطبیق بالکل نہیں ہوسکتی اور اگر تسلیم کرلیا جائے کہ "موضع آخر" کیساتھ مادون السفر کی کوئی قید نہیں ہے۔ تو بھی اس عبارت سے ہمارے موقف کے خلاف کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ یہ اثبات بدرجہ احتمال ہے یعنی اس بات کا احتمال ہے کہ اس عبارت میں "بموضع آخر" سے وہ جگہ مراد لی جائے جو وطن اقامت سے مسافت سفر پر ہو اور پھر سفر کے ہوتے ہوئے صرف بقاء سامان کیوجہ سے سابق وطن اقامت کو غیر باطل قرار دیا جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ عبارت میں "بموضع آخر" سے قریب جگہ مراد لیجائے تو سفر کے ہوتے ہوئے پھر اس کو باقی نہ سمجھا جائے جبکہ دلائل کے اعتبار

سے اس سے موضع قریب مراد لینا قوی ہے۔

بہر حال ایسی عبارت سے جس میں احتمال دونوں باتوں کا ہو اور حضرت مفتی صاحب زید مجدہ بھی اس احتمال سے انکار نہیں کرتے جیسا کہ (احسن الفتاویٰ: ۴/ ۱۰۸) کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے اتنا اہم مسئلہ ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے کسی واضح اور غیر محتمل عبارت کی ضرورت ہے جبکہ اس کے خلاف تمام عبارات واضح ہیں اور تمام شروح میں صرف سفر کو مبطل وطن اقامت بتایا ہے صرف متون میں بطلان وطن اقامت کے لئے محض سفر نہیں بتایا گیا بلکہ تمام شروح بھی اس پر متفق ہیں اور اس کے خلاف کسی بھی شرح میں ایسی کوئی عبارت نہیں ملتی جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ بقاء سامان کیوجہ سے وطن اقامت سفر سے باطل نہیں ہوتا۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا کہ اسطرح مراد لینے سے فقہاء کرام کی بعض عبارات بے معنی ہو جاتی ہیں اور بے شمار عبارات بلا ضرورت مقید ہو جاتی ہیں حالانکہ فقہاء کرام نے متون کو خوب واضح کر دیا ہے اور جہاں کسی قید کی ضرورت ہوا کرتی ہے تو وہ حضرات اسکا مستقل طور پر ذکر کر دیتے ہیں اتنا اہم مسئلہ اور اس کو پھر ایسی عبارت میں بیان کرنا کہ اس میں دونوں جانب کا احتمال ہو کسی ایک جانب کی تعیین نہ ہو اور اصالۃً اس مسئلہ کا حکم بتانا مقصود نہ ہو بلکہ بالتبع اس کا ذکر آیا ہو یہ فقہاء کرام کی شان سے بعید ہے، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کم از کم ایک جگہ اس کا ذکر مستقل اور واضح طور پر ضرور فرماتے، لہٰذا عبارت بحر منقول از محیط کا مصداق یہ نہیں ہو سکتا جو حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے سمجھا ہے بلکہ اس سے ما دون السفر والی صورت ہی مراد ہے اور اس عبارت کا مقصد صرف بندہ نے یا مفتی عبد اللطیف مرحوم نے ایسا نہیں سمجھا جس کا ذکر مندرجہ بالا تحریر میں ہوا بلکہ ہمارے اکابرین میں سے حضرت اقدس ترجمان علماء احناف مولانا مفتی ظفر احمد عثمانی قدس سرہ نے بھی اس کا ایسا ہی مطلب مراد لیا ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

اب یہ صورت باقی رہی کہ اگر کوئی شخص مسافۃ ثلثہ ایام قطع کرنے کے بعد وطن اقامت پر گزرا مگر وہاں قیام کا ارادہ نہیں بلکہ آگے جانے کا ارادہ ہے اور وطن اقامت میں اس کے اسباب وغیرہ موجود ہیں اس صورت میں یہ شخص وطن اقامت میں قصر کرے یا اتمام؟ اسکا جواب یہ ہے

کہ جب مسافت سفر قطع کرنے کے بعد وطن اقامت میں داخل ہوا اور اس کے بعد بھی مسافت سفر کا ارادہ ہے تو اب یہ اس کا وطن اقامت باقی نہیں رہا سفر سے اس کی وطنیت باطل ہوگئی اور اسباب کا باقی رہنا بطلان وطنیت بالسفر کو مانع نہیں ہاں اگر وطن اقامت سے منتقل ہو کر دوسری جگہ وطن اقامت بنانا چاہے اور ان دونوں کے درمیان مدت سفر نہ ہو تو پہلا وطن محض انتقال سے باطل نہ ہوگا بلکہ انتقال بنفسہ وانتقال بالمتاع کے مجموعہ سے باطل ہوگا حتی کہ اگر دوسرے موضع میں نیت اقامت کرے اور موضع اول میں اسکے اسباب باقی رہیں اور متاع سے مراد متاع ضروری ہے ''الذی یعد الرجل ببقائه مقیما عرفا کا ثاث البیت الذی لابد منه والدار والعقار''

پس بقاء متاع انشاء سفر کی صورت میں مانع بطلان وطنیت نہیں بلکہ نیت اقامت "بموضع آخر" کی صورت میں بقاء متاع بطلان وطنیت موضع اول کے لئے مانع ہے۔

قال فی البحر کوطن الاقامة یبقیٰ ببقاء الثقل وان اقام بموضع آخر (۱۳۶/۲) فی الهندیة (امداد الاحکام: (۶۹۹/۱-۷۰۰، المکتبة العلم)

نیز فتاوی رحیمیہ میں بھی حضرت اقدس مفتی عبدالرحیم صاحب نے ایک دوسوالوں کے جواب میں ایسا ہی فرمادیا ہے اور جائے ملازمت، کرایہ کا مکان وغیرہ کے ہوتے ہوئے وطن اقامہ کو محض سفر سے باطل قرار دیا ہے۔ دیکھیے فتاوی رحیمیہ: (۵۰/۳-۵۴، دارالاشاعت)

حضرت اقدس مفتی صاحب دامت برکاتھم نے ''باب الیمین'' سے عبارت نقل کر کے زیر بحث مسئلہ کے لئے استشہاد کیا ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے اور مسائل یمین پر اقامت وسفر کے مسائل کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ یمین کے مسائل کا مدار عرف پر ہے۔ اور اقامت وسفر کا مدار عرف پر نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب بحر تحریر فرماتے ہیں: (۲۹۷/۴، طبع سعید)

والاصل ان الایمان مبنیة علی العرف عندنا

اور امام ابن الھمام صاحب فتح القدیر رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسائل وطنیت وسفر کا قیاس مسائل یمین پر درست نہیں ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"قوله وینبغی ان ینتقل الیٰ منزل آخر حتی یبر) الیٰ ان قال ----- واطلاق عدم الحنث اوجه وکون وطنه باقیا فی حق اتمام الصلوٰة مالم یستوطن غیره لایستلزم تسمیته ساکنا عرفا بذلک المکان بل یقطع من العرف فیمن نقل اهله وامتعته وخرج مسافرا ان لایقال فیه انه ساکن فی تلک الحال بل یقال فیه حال السفر انتقل عن سکنی هذا

المكان وهو قاصد سكنى كذا واذا لم يتحرر له قصد مكان معين قبل هو الآن غير ساكن في مكان حتى ينظر ابن يسكن واذا ثبت نفي تلك السكنى ثبت البر والله تعالىٰ اعلم.(۲/۲۸۷،طبع رشیدیہ)

یعنی وطن چھوڑ کر بیوی بچے اور سامان وغیرہ لیجانے سے عرف میں ایسا آدمی غیر ساکن سمجھا جاتا ہے خواہ ابھی تک دوسری جگہ میں مستقل سکونت اختیار نہیں کی ہو جبکہ بطلان وطنیت کیلئے یہ شرط ہے کہ پہلا وطن اصلی صرف چھوڑ دینے سے اور بچے سامان وغیرہ منتقل کرنے سے باطل نہیں ہوگا جب تک دوسری جگہ کو مستقل وطن اصلی نہ بنالے تو معلوم ہوا کہ سکونت کو باقی نہیں سمجھا جائیگا جبکہ وطنیت ابھی تک باقی ہوگی۔

اس لئے کہ یمین کے تمام مسائل کا مدار عرف پر ہے اور عرف میں ایسا آدمی غیر ساکن سمجھا جاتا ہے لیکن وطنیت کے بقاء اور بطلان کا مدار عرف پر نہیں ہے ورنہ ایسا شخص جو کسی جگہ سے بیوی بچے سمیت چلا جائے اور سب کچھ لیجائے اور یہ ظاہر کردے کہ میں نے اس جگہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا لیکن ابھی تک دوسری جگہ کو مستقل وطن نہیں بنایا تو اس کیلئے بھی یہی حکم ہوتا کہ اسکی یہاں کی وطنیت باطل ہوگئی اس لئے کہ عرف میں ایسی جگہ کی وطنیت باطل سمجھی جاتی ہے حالانکہ کوئی بھی اس جگہ کی وطنیت کی بطلان کا فتویٰ نہیں دے سکتا یہاں تک کہ دوسری جگہ کو مستقل وطن نہ بنالے

اس مسئلہ کو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے اور بحر کے اس قول ''وفي الظهيرية والصحيح انه بحنث مالم يتخذ مسكنا آخر'' (۲/ ۳۰۷) پر رد کیا ہے اور علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

" قلت: والمعتبر العرف والعرف خلافه كما علمت" (۲/۷۵۱،طبع سعید)

لہٰذا مفتی صاحب دامت برکاتہم کا استشہاد بھی درست نہیں اور جن عبارات کو اصل حوالہ کے طور پر پیش کیا تھا ان کے متعلق بھی عرض کر چکا کہ ان عبارات کا مصداق مفتی صاحب نے جو سمجھا وہ صحیح نہیں ہے ورنہ فقہاء کرام کی بعض واضح عبارات بے معنی ہو جائیں گی اور بے شمار عبارات بلا ضرورت مقید ہو جائیں گی اور جب اس کے علاوہ صحیح مصداق بھی مراد لیا جا سکتا ہے تو اس طرح مراد لینے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟

احسن الفتاویٰ: (۴/۱۰۶،طبع سعید) میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی تائید میں

اور فتویٰ قاسم العلوم کے رد میں جو دلائل ذکر کیے گئے ہیں انکا جواب مندرجہ بالا تحریر میں تفصیل سے گذرا اور حضرت مفتی صاحب زید مجدہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''اس سے معلوم ہوا کہ سفر کی بنسبت وطن میں (یعنی وطن اقامت میں) قوت ابطال زیادہ ہے وھو ظاھر جداً'' یہ بھی صحیح نہیں ہے اور فقہاء کرام کی تصریحات کے خلاف ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ کے قول: ''وینبغی ان یزید وبضدہ کبطلان وطن الاقامۃ او السکنیٰ بالسفر فانہ علل للمالک بقولہ لانہ ضدہ اھ (شامی: (۲/۱۳۶) طبع سعید) پر ''تقریرات الرافعی'' میں تصریح ہے کہ کبیری میں سفر کو ''بما فوقہ'' میں داخل کر دیا گیا ہے اور پھر اس کی تائید کی اور فرمایا کہ انشاء سفر وطن اقامت اور وطن سکنیٰ دونوں کے لیے ضد ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں سے فوق بھی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں: (۲/۱۰۹، طبع سعید)

(قولہ وینبغی ان یزید وبضدہ الخ) والحلبی جعل انشاء السفر داخلاً فی قولہ وبما فوقہ فیبطل بہ وطن الاقامۃ والسکنیٰ وھو الا وجہ فانہ وان کا ضداً ھو فوقھما.

اس میں صراحت ہے کہ قوت ابطال وطن اقامت (مثل) کی بنسبت سفر میں زیادہ ہے اور آخر میں حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''مسئلہ زیر بحث اس نوعیت کا نہیں کہ اس میں سبب یعنی سفر کو علت یعنی اعراض عن التوطن کے قائم مقام کر کے نفس سفر پر ہی ابطال وطن کا حکم لگایا جا سکے۔ بلکہ ایجاد علت خود بخود مسافر کے اختیار میں ہے اور اس کی نیت پر موقوف ہے'' (احسن الفتاویٰ: (۴/۱۰۶، طبع سعید)

تعجب ہے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتھم نے سفر کو سبب کا درجہ دیا ہے اور ''اعراض عن التوطن'' کو علت کا درجہ دیا ہے یہ بھی بلا دلیل ہونے کے علاوہ فقہاء کرام کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے جس کی تفصیل اوپر گذر گئی کہ بطلان وطن اقامت کے لیے علت نفس سفر ہی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اتمام اور قصر کے تمام احکام وجود سفر اور عدم وجود پر ہی متفرع ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی شخص سفر کے ارادے سے وطن اصلی یا وطن اقامت کی آبادی سے نکلے اور مسافت سفر ۴۸ میل قطع کر لے تو علت قصر مستحکم ہو جاتی ہے اس کے بعد وہ برابر مسافر رہے گا جب تک سفر کو قطع کرنے والا کوئی دوسرا حکم نہ پایا جائے اس پر قصر لازم ہوگا، اب وطن اقامت

میں واپس آنے سے اس کا سفر ختم نہیں ہوتا بلکہ پندرہ روز سے پہلے آگے جانے کی وجہ سے اس کا سفر جاری سمجھا جائیگا تو اتمام کا حکم کس بنیاد پر دیا جاسکتا ہے؟

اس لیے کہ سفر کو صحیح ماننے کے بعد وطن اقامت کو کسی نے بھی سفر کے لیے مبطل قرار نہیں دیا ہے، البتہ وطن اصلی کے مبطل سفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لہٰذا وطن اقامۃ سے سفر کو اگر علت قصر تسلیم کرلیا جائے تو اس کے بعد مسافر کے لئے برابر قصر کا حکم ہوگا اور وطن اقامۃ میں واپسی کی صورت میں اگر وہ اپنے سفر کو خود ختم نہیں کرنا چاہتا اور پندرہ روز تک قیام کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ آگے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جسکو شریعت نے سفر جاری کا حکم دیا ہے تو اب بطلان وطنیت یا بقاء وطنیت کے دلائل کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ مسافر کے سفر کو قطع کرنے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس کا سفر جو کہ علت قصر ہے وہ باقی نہ رہے تب معلول یعنی قصر بھی باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ شرح السیر الکبیر کا قاعدہ ہے: (مجموعۃ قواعد الفقیہ: قاعدۃ: ۲۸۹، ص ۱۱۴، طبع میر محمد)

"ماثبت یکون باقیامالم یوجد الدلیل المزیل".

علامہ شامیؒ علیہ نے وطن سکنی پر کلام کرتے ہوئے امام سرخسی قدس سرہ کا ایک مسئلہ نقل کیا ہے جس سے اس خاص صورت یعنی وطن اقامۃ میں بقاء سامان والی صورت میں مدد مل سکتی ہے چنانچہ وہ شامیہ میں لکھتے ہیں: (۲/۱۳۳، طبع سعید)

"کوفی خرج الیٰ القادسیۃ لحاجۃ وبینهما دون مسیرۃ السفر ثم خرج منها الیٰ الحیرۃ یرید الشام حتی اذا کان قریبا منها بدا له الرجوع الیٰ القادسیۃ لیحمل ثقله منها ویرتحل الیٰ الشام ولایمر بالکوفۃ اتم حتی یرتحل من القادسیۃ استحسانا لأنها کانت له وطن السکنی ولم یظهر له بقصد الحیرۃ وطن سکنی آخر مالم یدخلها فیبقی وطنه بالقادسیۃ ولاینتقض بهذا الخروج کمالوخرج منها لتشییع جنازۃ ونحوہ. ملخصۃ )

یعنی اگر کوئی شخص وطن سکنی سے بارادۂ سفر نکلے اور پھر راستہ میں مسافت سفر طے کرنے سے پہلے واپسی کا ارادہ کرلے کہ جو سامان میرا وطن سکنی میں پڑا ہے اس کو بھی ساتھ لیکر جاؤں اور ابھی تک (وطن سکنی کے لئے دیگر مبطلوں میں سے بھی کسی ایک مبطل کا تحقق نہیں ہوا تھا چنانچہ) کسی دوسری جگہ کو وطن سکنی بھی نہیں بنایا ہے اور نہ وطن اصلی پر مرور ہوا ہے تو اسکے لئے اتمام کا حکم ہے اور مادون السفر مسافت طے کرنے سے باطل نہیں ہوا جس طرح اگر کوئی شخص جنازہ وغیرہ کے لئے نکلے تو اس کے خروج سے وطن سکنی باطل نہیں ہوتا۔

وجہ استدلال یوں ہے کہ مذکورہ مسئلہ میں اس شخص کا سامان باقی تھا تو اگر بقاء سامان بطلان وطنیت کے لئے مانع ہوتا تو اس موقع پر امام صاحب ضرور فرماتے کہ وطن سکنی میں چونکہ اسکا سامان باقی تھا اس لئے اتمام کا حکم ہے، لیکن بقاء سامان کو مانع بطلان وطن سکنی نہیں بتایا اور باقی تمام وہ امور جن سے وطن سکنی باطل ہو جاتا ہے انکے وجود کی نفی کی اور عبارت سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس صورت میں وطن سکنی کے عدم بطلان کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو کسی دوسری جگہ کو وطن بنایا اور نہ سفر متحقق ہوا، اور نہ وطن اصلی میں آیا اس لئے وطن سکنی کی بقاء کے لئے کوئی مانع نہیں ہے ان تمام موانع کے وجود کی نفی کی لیکن وجود سامان کو بقاء وطن سکنی کے لئے علت نہیں بتایا گیا حالانکہ مثال میں وجود سامان کا ذکر اتفاقاً آیا بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ سامان کی بقاء اور عدم بقاء برابر ہے، وطن کی بقاء اور بطلان کا مدار اس پر نہیں ہے۔

اسی مسئلہ پر علامہ شامیؒ نے "منحة الخالق" میں پوری وضاحت کے ساتھ بحث فرمائی ہے اور آخر میں فرمایا کہ سفر متحقق ہونے کے بعد وطن سکنی کا اعتبار نہیں کیا جائیگا اور حاصل کلام میں فرمایا کہ سفر متحقق ہونے کے بعد جب وہ مسافر قرار پایا اب وہ اگر کسی شہر میں (سوائے وطن اصلی کے) پندرہ روز سے کم اقامت کا ارادہ کریگا تو ایسی صورت میں کوئی بھی عاقل اتمام کا حکم نہیں دے سکتا اس لئے کہ سفر متحقق ہونے کے بعد کسی جگہ میں (سوائے وطن اصلی) پندرہ روز سے کم اقامت کی صورت میں کوئی حکم مبیح للاتمام ثابت نہیں ہوا ہے، البتہ پندرہ روز کی اقامت کا ارادہ کرلے تو الگ بات ہے اس لئے پندرہ روز کی اقامت کے ارادہ سے سفر منقطع ہو جاتا ہے اور قصر کی علت مفقود ہو جاتی ہے اور پندرہ روز سے کم قیام کے ارادے سے سفر منقطع نہیں ہوتا، اور علت قصر باقی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"لو خرج كوفي الى القادسية لحاجة ثم منها الى الحيرة يريد الشام حتى اذا كان قريبا منها بدا له الرجوع الى القادسية ليحمل ثقله منها ويرتحل الى الشام ولا يمر بالكوفة اتم حتى يرتحل من القادسية استحسانا لانها كانت له وطن السكنى ولم يظهر له بقصد الحيرة وطن سكنى آخر مالم يدخلها فيبقى وطنه بالقادسية ولا ينتقض كما لو خرج لتشييع جنازة ونحوا الى ان قال: وحاصله انه يعتبر قبل تحقق السفر لا بعده لأن من قال باعتباره قبل تحقق السفر كما في صورة الزيلعي لا يمكنه ان يقول باعتباره بعد تحقق السفر لأنه لم يثبت فيه حكم الاقامة المبيحة للاتمام فان اقلها نصف شهر اذلا

یقول عاقل ان المسافر اذا دخل بلدة ونوی الاقامة فیها یوما مثلاثم خرج منها ثم رجع فی الیوم الثانی انه یتم مالم ینو اقامة نصف شهر (منحة الخالق علی هامش البحر الرائق :۲/۱۲۷،طبع سعید)

مندرجہ بالاعبارات اگرچہ وطن اقامت سے متعلق نہیں، بلکہ ان میں جو حکم بیان ہوا ہے وہ وطن سکنی سے متعلق ہے لیکن صورت مذکورہ کی تائید بلاشبہ اس سے ہوتی ہے چنانچہ دونوں وطن سفر سے باطل ہوجاتے ہیں اور صاحب بدائعؒ نے بطلان اقامۃ بالسفر کیلئے جو وجہ بیان فرمائی تھی (جس کو مفتی صاحب دامت برکاتہم نے اپنے موقف کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے) وہی وجہ بطلان وطن سکنی بالسفر کے لئے بھی بیان فرمائی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ووطن السکنی ینتقض بالوطن الاصلی وبوطن الاقامة لانهما فوقه وبوطن السکنی لانه مثله وبالسفر لمابینا .(بدائع :۱/۱۰۴،طبع سعید)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وطن اقامت سے سفر کے ارادے سے جو کوئی جائیگا تو واپسی کی صورت میں اگر پندرہ روز سے کم قیام کا ارادہ ہے تو اس پر قصر لازم ہے چاہے سامان پہلے سے یہاں پر موجود ہو یا نہ ہو۔

البتہ اگر کوئی شخص کسی جگہ بیوی بچوں سمیت سکونت اختیار کرلے اور اسباب تعیش خانہ داری کے لئے مہیا کرے جیسا کہ آجکل بعض ملازم لوگ کرتے ہیں تو ایسے مقام کو فقہاء کرام نے وطن اصلی کا حکم دیا ہے اور اس بارے میں صریح عبارات موجود ہیں لہٰذا جب تک بیوی بچے وہاں رہائش پذیر ہیں تو اس مقام کا حکم وطن اصلی جیسا ہوگا اور سفر سے واپسی کی صورت میں اگر یہاں پر نصف شہر تک اقامت کا ارادہ نہ ہو تب بھی اس شخص کے لئے اتمام کا حکم ہے اس لئے صاحب خلاصۃ الفتاوی نے مسافر کا مقیم بننے کیلئے شرائط بیان کرنے میں یہ انداز اختیار کیا ہے:

وانمایصیر المسافر مقیما امابدخوله مصرا له فیه اهل اوبان بداله العود الیه بعدما خرج ولیس بین الموضع الذی بداله العود وبین مصره مسیر تسفر صار مقیما حین نوی العود وسواء دخل مصره بنیة الاختیار اولقضاء حاجته والخروج بعد ذلک صار مقیما حین دخلها (خلاصة الفتاوی: (۱/۱۹۹،طبع رشیدیه)

یعنی ایسے شہر میں جس میں مسافر کی بیوی مقیم ہو مسافر اگر داخل ہوجائے تو اسکا سفر منقطع ہوجاتا ہے اور اسکو اتمام کا حکم ہے۔

اور علامہ ظفر احمد عثمانی قدس سرہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"الجواب" قال في البحر عن المحيط لو كان له اهل بالكوفة واهل بالبصرة ـ الى ان قال وفي المجتبى نقل القولين فيما اذا نقل اهله ومتاعه وبقي له دور وعقار ثم قال و هذا جواب واقعة ابتلينا بها وكثير من المسلمين المتوطنين بالبلاد و لهم دور وعقار في القرى البعيدة يصيفون بها باهلهم ومتاعهم فلابد من حفظهما انهما وطنان له لا يبطل احدهما بالآخر وفي السراجية اذا دخل المسافر بلدة له فيها اهل صار مقيما نوى الاقامة او لا.

ان جزئیات سے خصوصاً مجتبیٰ کے جزئیہ سے معلوم ہوا کہ جس مقام پر انسان مع اہل وعیال کے مقیم ہو گو قیام عارضی ہو کہ زمانہ صیف ہی میں وہاں قیام کرتا ہو وہ اس کا وطن ہو جاتا ہے اور جب تک وہاں اہل وعیال رہیں گے وطن رہے گا تنہا اس کے سفر سے وہ وطن باطل نہ ہوگا جب تک وہاں سے اہل وعیال کو منتقل نہ کرے پس صورت مسئولہ میں جائے ملازمت پر جب اہل وعیال مقیم ہیں وہاں نماز کامل پڑھنی چاہیے (امداد الاحکام: ۱/ ۱۸۷، طبع دار العلوم کراچی)

ایک دوسری شق کے جواب میں لکھتے ہیں: "اس کا جواب وہی ہے جو گزرا۔

قال في شرح المنية ولو كان له اهل ببلدتين فايتهما دخلها صار مقيما وان ماتت زوجته في احدهما وبقي له فيها دور وعقار قيل لاتبقى وطنا اذا المعتبر الاهل دون الدار كمالو تأهل ببلدة واستقرت سكنى له وليس له فيها دور وقيل تبقى.

(۱۸) اس سے معلوم ہوا کہ محض تزوج ببلدة یا اقامت اہل ببلدة موجب اتمام نہیں بلکہ اس کے ساتھ استقرار سکونت زوجین بھی یا استقرار زوجہ وحدھا شرط ہے اور صورت مسئولہ میں استقرار سکونت نہیں ہے نہ زوج کیلئے نہ زوجہ کیلئے بخلاف جائے ملازمت کے کہ وہاں استقرار سکونت ہے کیونکہ وہاں زوج مکان کرایہ پر لیتا ہے اور اسباب تعیش خانہ داری کے لئے مہیا کرتا ہے، پس وہ نظیر اس جزئیہ کی ہے جو مجتبیٰ سے اوپر نقل کی گئی ہے وہاں پہنچ کر زوج مسافر مقیم ہو جائیگا جبکہ وہاں شوہر کے اہل وعیال مقیم ہیں اور اس مسئلہ میں مالکیہ بھی ہمارے موافق ہیں اور حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے وہ بھی احتجاج کرتے ہیں:

قال سحنون في المدونة وقال مالك في من خرج من افريقة يريد بمكة وله بمصر اهل فاقام عندهم صلوة واحدة انه يتمها قال ابن القاسم قلت لمالك الرجل المسافر يمر بقرية من قراه في سفره وهو لا يريد ان يقيم بقريته تلك الا يومه و ليلة وفيها عبيده

و بغره وجولربه وليس له بها اهل ولا ولد قال يقصر الصلوٰة (قال المرتب مفتی محمد رفیع العثمانی دامت برکاتهم: وهو موافق لما قال فی شرح المنية اولان المعتبر الاهل دون الدار وهو الأوجه )الاان يكون نوى ان يقيم بها او يكون فيها اهله وولده فان كان فيها اهله وولده اتم الصلوٰة قلت ارأيت ان كانت هذه القرية التي فيها اهله وولده مر بها في سفره وقد هلك اهله وبقي فيها ولده أيتم الصلوٰة ام يقصر قال يقصر قال انما كمحمل هنا (اى القصر بعد هلاك الاهل عندمالك اذا كانت (القرية بعدهلاكها) مسكناله اتم صلوٰة وان لم تكن له مسكنالم يتم الصلوٰة (۱۱۵/۱) واماقبل هلاكها فهى مسكنا له البتة فان مسكن المرأة مسكن له كما دل عليه حديث عثمان رضى الله عنه واتمامه بمنى ،والله تعالىٰ اعلم ،(امداد الاحکام:۱۹-۲۰)

حاصل کلام یہ ہے کہ جس جگہ بیوی بچوں سمیت سکونت اختیار کی ہو اور اسباب تعیش خانہ داری کے لئے مہیا کئے ہوئے رہائش پذیر ہو تو یہ مقام وطن اصلی جیسے ہو جاتا ہے اور جب تک بیوی بچوں کی رہائش یہاں ہو یہ مقام وطن اصلی کے حکم میں رہے گا، لہٰذا سفر سے واپس آنے کی صورت میں مدت اقامت تک قیام کا ارادہ اگر چہ نہ ہو تب بھی اتمام لازم ہوگا، جیسا کہ عبارات بالا میں فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ حکم واضح ہوا ہے اور جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ "وطن الارتحال یبقی ببقاء الانتقال" یعنی وطن اقامۃ بقاء سامان کی صورت میں سفر سے باطل نہیں ہوتا اس کے لئے کوئی صریح قول فقہاء کرام سے ثابت نہیں ہے اور کتب فتاویٰ میں اس پر کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا ہے، چنانچہ اردو کے معروف فتاویٰ میں ایسا کوئی فتویٰ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے البتہ اس دعویٰ کے اثبات کیلئے جو عبارات حضرت اقدس مفتی صاحب دامت برکاتہم نے پیش کی ہیں ان میں سے بعض عبارات ہمارے موقف کے اثبات کے لئے حضرت اقدس مفتی ظفر احمد عثمانی قدس سرہ نے بھی درج فرمائی ہیں اور اسی کے مطابق فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

واللہ تبارک وتعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ اتم

بندہ: عبدالرحمٰن ڈیروی عفا اللہ عنہ دارالافتاء اشرف العلوم بیت المکرّم کورنگی کراچی

## ﴿احکام سفر﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم ہر بدھ کو گشت برائے تبلیغی جماعت کے سلسلے میں کراچی شہر سے باہر نکلتے ہیں، ایک بدھ کو نوری آباد جو کہ کراچی جنرل

پوسٹ آفس سے ۹۶ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور دوسرے بدھ کو کوٹری جو کہ کراچی جنرل پوسٹ آفس سے ۱۵۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، مندرجہ ذیل باتوں کے جواب مطلوب ہیں:

(۱) شرعی سفر کہاں سے شروع ہوگا؟

(۲) ہم کو یہ پتا چلا ہے کہ شرعی سفر شہر کی پکی تعمیرات کے ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے، مثلاً کراچی ٹول پلازہ۔

(۳) کراچی ٹول پلازہ سے نوری آباد کا فاصلہ ۶۶ کلومیٹر ہے اور کوٹری تقریباً ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

(۴) شرعی سفر کی مقدار کلومیٹر اور وقت میں کیا ہے؟

(۵) شرعی سفر میں واپسی کا کیا حکم ہے؟

(۶) جو نمازیں اب تک ہم نے ادا کی ہیں انکا کیا حکم ہے؟

(۷) بعض حضرات سے سنا ہے کہ سفر گھر سے شروع ہوتا ہے۔ مستفتی: عمران بخش

﴿جواب﴾ (۱)(۲)(۳)(۷) آبادی کی تعمیرات سے نکل کر ۴۸ میل دور جانے کا ارادہ ہو تو اس سے شرعی سفر شروع ہوجاتا ہے لہٰذا کوٹری شرعی سفر کی مسافت پر ہے لیکن نوری آباد کراچی سے ۴۸ میل مسافت سے کم فاصلہ پر ہے اس لئے نوری آباد جانے کے ارادہ سے نکلنا شرعی سفر نہیں کہلائے گا پوری نماز پڑھنا ضروری ہوگا، شرعی سفر کی مسافت جنرل پوسٹ آفس یا رہائشی گھر سے شروع ہونے کا بعض حضرات اگر کہتے ہیں تو یہ قول فقہاء احناف کی تمام معتبر کتب اور اکابرین کے فتاویٰ سے متضاد ہوگا اور کسی واضح فقہی عبارت سے اس مؤقف کو ثابت کرنا بڑا مشکل ہوگا اس لئے اتفاق نہیں کرسکتے۔

لما في تنوير الأبصار: (۱۲۱/۲، طبع سعید)

من خرج من عمارة موضع اقامته قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة صلى الفرض بالركعتين.

ولما في حاشية الطحطاوي: (ص۲۲۸، طبع قديمي)

(والسفر في اللغة قطع المسافة) التعبير بالمسافة يشعر بالامتداد فهو بمعنى قول السعد في التلويح هو في اللغة الخروج المديد وشرعا خروج من عمران الوطن مع

قصد سير مسافة مخصوصة.

ولما في الهداية:(۱/ ۱۶۷،طبع رحمانيه)

السفر الذي يتغير به الاحكام أن يقصد مسيرة ثلاثة أيام ولياليها بسير الابل ومشي الأقدام.

ولما في شرح المنية :(ص ۲۶۲،طبع نعمانيه)

من فارق بيوت موضع هو فيه من مصر أو قرية ناويا الذهاب الى موضع بينه وبين ذلك الموضع المسافة المذكورة صار مسافرا فلا يصير مسافرا قبل أن يفارق عمران ما خرج منه.

ولما في الدر المختار:(۲/ ۱۲۲،طبع سعيد)

ولا يشترط سفر كل يوم الى الليل بل الى الزوال ولا اعتبار بالفراسخ على المذهب، (قوله بل الى الزوال )فان الزوال أكثر النهار الشرعي الذي هو من الفجر الى الغروب وهو نصف النهار الفلكي الذي هو من الطلوع الى الغروب ثم ان من الفجر الى الزوال في أقصر أيام السنة في مصر وما ساواها في العرض سبع ساعات الأربعا فمجموع الثلاثة أيام وعشرون ساعة وربع ، ويختلف بحسب اختلاف البلدان في العرض.

ولما في رد المحتار:(۲/ ۱۲۲،طبع سعيد)

(حتى يدخل موضع مقامه)أي الذي فارق بيوته سواء دخله بنيّة الاجتياز أو دخله لقضاء حاجة، لأن مصره متعين للاقامة فلا يحتاج الى نيّة.....(قوله ان سار الخ )قيد لقوله حتى يدخل أي انما يدوم على القصر الى الدخول ان سار ثلاثة أيام.

ولما في الهداية:(۱/ ۱۶۷،طبع رحمانيه)

وفرض المسافر في الرباعية ركعتان لا يزيد عليهما وان صلى أربعا وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته الأوليان عن الفرض والأخريان له نافلة اعتبارا بالفجر ويصير مسيئا لتأخير السلام. ولا يزال على حكم السفر حتى ينوي الاقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر.

ولما في التنوير وشرحه:(۲/ ۱۲۳،طبع سعيد)

(صلى الفرض الرباعي ركعتين )وجوبا.

و هكذا في الهندية:(۱/ ۱۳۹،مكتبه رشيديه)

(۴)احادیث میں شرعی سفر کی مسافت تین دن کی مسافت بیان ہوئی ہے جس سے عام لوگوں کی آسانی کیلئے فقہاء کرام نے ۴۸ میل یا ۷۷،۲۴ کلومیٹر کی مقدار اخذ کیا ہے۔

(۵)شرعی سفر سے واپسی کی صورت میں بھی آبادی میں داخل ہونے پر سفر ختم ہوگا، آبادی میں داخل ہونے سے پہلے قصر لازم ہوگا۔

(٦) مذکورہ حکم کے خلاف کرتے ہوئے اگر آپ نے نمازیں پڑھی ہیں تو ان کا اعادہ ضروری ہے اور توبہ واستغفار بھی۔

واضح رہے کہ دارالعلوم کراچی سے بھی ابتک کوئی ایسا فتوی جاری نہیں ہوا جو اس کے خلاف ہو، چنانچہ منسلکہ فتوی پر شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی نے واضح طور پر تحریر فرمادیا ہے کہ مجھے تردد ہے دوسرے علماء سے بھی رجوع کیا جائے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم: علی خان

۱۴ صفر الخیر ۱۴۳۶ھ — فتوی نمبر: ۲۴۶۱

## ﴿قیام پر قدرت رکھنے والا سر کے اشارے سے باقی ارکان ادا کرسکتا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے وہ کبھی ایسے اعذار میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ نماز میں صرف کھڑا ہو سکتا ہے باقی رکوع، سجود، قومہ وغیرہ کی ادائیگی میں شدید تکلیف ہوتی ہے بیٹھ بھی نہیں سکتا تو کیا وہ کھڑے ہو کر باقی ارکان کو سر کے اشارے سے ادا کرسکتا ہے؟

مستفتی محمد داؤد شاہ ڈیرہ اسماعیل خان

﴿جواب﴾ آپ کا ساتھی واقعتاً ایسے اعذار میں اگر مبتلا ہے کہ نماز میں قیام کے علاوہ باقی تمام ارکان کو آسانی سے ادا نہیں کرسکتا، بلکہ ادائیگی میں شدید تکلیف ہوتی ہے تو وہ حالت قیام میں ہی تمام ارکان کو سر کے اشارہ سے ادا کریں البتہ سجدے کیلئے رکوع کی بنسبت تھوڑا زیادہ جھکنا ضروری ہے نماز ادا ہو جائیگی بیٹھ کر اشارہ اگر کرسکتا ہے تو قیام سے قعود بہتر ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۲/۹۷-۹۸ مطبع سعید)

(وان تعذرا) لیس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود کاف (لا القیام اومأ) بالهمز (قاعدا) وهو افضل من الایماء قائما لقربه من الارض (ویجعل سجوده اخفض من رکوعه) لزوما. (قوله هو افضل) قال فی شرح المنیة لو قیل ان الایماء افضل للخروج من الخلاف لکان موجها ولکن لم ار من ذکره (قوله لقربه من الارض) ای فیکون اشبه بالسجود (ویجعل سجوده اخفض الخ) اشار الی انه یکفیه ادنی الانحناء عن الرکوع وانه لا یلزمه تقریب جبهته من الارض باقصی ما یمکنه کما بسطه فی البحر عن الزاهدی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۷۵

## ﴿مسافر امام کا نمازوں میں اتمام کرنا﴾

﴿سوال﴾ زید کو اپنے وطن کرک (شاہ سلیم) سے انکے رشتہ دار نے اپنے ہاں کوہاٹ بلایا (دونوں کے درمیان شرعی مسافت ہے) ۲۴ رمضان کو کوہاٹ جاتے وقت اس کا یہ ارادہ تھا کہ میں عیدگزارنے کے لئے واپس اپنے آبائی علاقہ آؤں گا کوہاٹ پہنچنے کے بعد اس کو مسجد کی امامت مل گئی رمضان کے چار پانچ ایام گزارنے کے بعد زید حسب ارادہ واپس چلا گیا ان چندروزہ قیام کے دوران زید نے امامت قبول کرنے کے بعد اتمام کیا آیا اس کا اتمام کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ زید نے جب کوہاٹ کی طرف سفر کیا تو اس پر قصر لازم تھی کیونکہ اس نے نہ تو کوہاٹ جاتے وقت کم از کم پندرہ دن قیام کی نیت کی تھی اور نہ ہی امامت قبول کرنے کے بعد لہٰذا کوہاٹ میں قیام کے دوران اس کا سفر ختم نہیں ہوا تھا بلکہ بدستور وہ مسافر تھا، شرعی سفر متحقق ہونے کے بعد اس کو منقطع کرنے کے لئے ضروری تھا کہ کوہاٹ میں ایسی جگہ جو صالح للاقامت ہو کم از کم پندرہ روز قیام کی نیت کر لیتا تاکہ اقامت (سفر کی ضد) پائی جاتی پھر اتمام درست ہوتا۔

لما فی الهداية:(۱/۱۶۲،طبع رحمانيه)

ولايزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة او قرية خمسة عشر يوما اواكثر و ان نوى اقل من ذلك قصر.

ولما فی بدائع الصنائع:(۱/۹۷،طبع سعيد)

امابيان مايصير المسافر به مقيما فالمسافر يصير مقيما بوجود الاقامة والاقامة تثبت بأربعة اشياء، احدها صريح نية الاقامة وهو ان ينوى الاقامة خمسة عشر يوما فى مكان صالح للاقامة فلابد من اربعة اشياء، نية الاقامة ونية مدة الاقامة، واتحاد المكان وصلاحيته للاقامة.

ولما فی البحر الرائق:(۲/۱۲۱،طبع سعيد)

وفى المجتبى لايبطل السفر الابنية الاقامة اودخول وطن(اى الاصلى) اوالرجوع قبل الثلاثة.

چندروزہ قیام کے دوران مسافر ہونے کے باوجود امام صاحب نے پوری نماز پڑھائی ہے تو آخری دو رکعتوں میں اقتداء المفترض خلف المتنفل لازم آنے کی وجہ سے مقتدیوں کی نماز نہیں ہوئی مقتدیوں کے ذمہ فرض باقی ہے البتہ خود امام صاحب یا انکی اقتداء میں مسافر مقتدیوں نے دو رکعتوں پر اگر قعدہ کر لیا تھا تو فرض انکے ذمہ سے ساقط ہو گیا ہے، لیکن

تاخیر سلام کی وجہ سے ان کی نماز بھی واجب الاعادہ ہے۔

ولمافی الشامية:(۱۳۰/۲ طبع سعيد)

قوله لم يصر مقيما فلو اتم المقيمون صلاتهم معه فسدت لانه اقتداء المفترض بالمتنفل ظهيرية اى اذا قصدوا متابعته اما لو نووا مفارقته وافقوه صورة فلا فساد، افاده الخير الرملي.

ولمافی التنوير وشرحه:(۱۲۸/۲ طبع سعيد)

(فلو اتم مسافران قعد فى) القعدة (الاولى تم فرضه و) لكنه (اساء لو عامدا لتاخير السلام.

ولمافی الشامية:(۶۴/۲،طبع سعيد)

اقول فتلخص من هذا كله ان الارجح وجوب الاعادة وقد علمت انها عند البعض خاصة بالوقت وهو مامشى عليه فى التحرير وعليه فوجوبها فى الوقت ولا تسمى بعده اعادة وعليه يحمل ما مر عن القنية عن الوبرى واما على القول بانها تكون فى الوقت وبعده كما قدمناه عن شرح التحرير وشرح البزدوى فانها تكون واجبة فى الوقت وبعده ايضا على القول بوجوبها واما على القول باستحبابها الذى هو المرجوح تكون مستحبة فيهما وعليه يحمل مامر عن القنية عن الترجمانى واما كونها واجبة فى الوقت مندوبة بعده كما فهمه فى البحر وتبعه الشارح فلا دليل عليه وقد نقل الخير الرملى فى حاشية البحر يجب ان لا يعتمد عليه لاطلاق قولهم:كل صلوة اديت مع الكراهة سبيلها الاعادة.قلت اى لانه يشمل وجوبها فى الوقت وبعده اى بناء على ان الاعادة لا تختص بالوقت الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۰۳

## ﴿شہر کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے شرعی مسافت نہ رہے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ پہلے ہمارے گاؤں سے شہر تک شرعی فاصلہ (۴۹ میل) تھا لیکن اب شہر کی آبادی پھیلنے کی وجہ سے وہ فاصلہ کم ہو کر پینتالیس (۴۵) میل رہ گیا کیا اب ہم پہلے کی طرح شہر جا کر نماز قصر کرینگے یا پوری نماز ادا کرینگے؟　　　مستفتی: حاجی ابرھیم صاحب ڈیرہ اسمٰعیل خان

﴿جواب﴾ مسافر جب سفر شرعی (۴۸ میل) کی نیت سے اپنے گاؤں کی حدود سے نکل جائے تو اس پر سفر کے احکام جاری ہونگے ،اگر مسافر کا مقصد (جہاں تک قصد کیا ہے) مسافت شرعی (۴۸ میل) یا اس سے زیادہ فاصلہ ہے تو وہ نماز قصر پڑھے گا ،ورنہ نہیں لہٰذا اب چونکہ آپ کے گاؤں سے شہر تک کا فاصلہ شرعی فاصلہ سفر نہیں رہا اس لئے یہ سفر شرعی نہیں ہے ،مکمل نماز پڑھنا ضروری ہے۔

لما فی الشامی:(۱۲۱/۲،طبع سعید)

من خرج من عمارة موضع اقامته قاصداً مسيرة ثلاثة ايام ولياليها بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة صلى الفرض الرباعي ركعتين وجوباً.

ولما فی البحر:(۱۲۹/۲،مکتبه ایچ ایم سعید)

وذكر الاسبيجابي في المبسوط انه قصد مصراً من الامصار وهو مادون مسيرة ثلاثة ايام لايكون مسافراً.

ولما فی الهندية:(۱۳۸/۱،طبع رشیدیه)

فاذا قصد بلدة والى مقصده طريقان احدهما مسيرة ثلاثة ايام ولياليها والاخر دونها سلك الطريق الابعد كان مسافراً عندنا هكذا في فتاوى قاضيخان وان سلك الاقصر يتم.

ولما فی التاتارخانية:(۲/۰،طبع قدیمی)

وان كانت المحلة بعيدة من المصر وكانت قبل ذلك متصلة بالمصر فانه لايقتصر حتى يجاوز تلك المحل.

ولما فی رد المحتار:(۱۲۲/۲،طبع سعید)

(او ان كان احدهما تبعاًللاخر)كالقرية التي قربت من المصر بحيث يسمع النداء على ماياتي في الجمعة وفي البحر لو كان الموضعان من مصر واحد او قرية واحدة فانها صحيحة لانهما متحدان حكماًالا ترى انه لو خرج اليه مسافراً لم يقصر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ کھیلی

۲۶ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۱۹۹۶

## ﴿امامة المسافر يوم الجمعة﴾

## ﴿مسافر شخص نماز جمعہ پڑھا سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ هل يجوز امامة المسافر يوم الجمعة؟ مستفتی: احمد

﴿جواب﴾ يجوز امامته لان السفر ليس مانعاعن الامامة في صلوة ما لا في الجمعة ولا في غيرها. والله اعلم

لما فی الهداية:(۱۷۹/۱،طبع رحمانیه)

ويجوز للمسافر والعبد والمريض ان يؤم في الجمعة.

لما فی الکنز:(ص۴۴،طبع قدیمی)

ومن لا جمعة عليه اذا اداها جاز عن فرض الوقت وللمسافر والعبد والمريض ان يؤم فيها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمہ اللہ تعالیٰ

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۸۰۳

## ﴿مسافر امام بغیر قعدہ اولیٰ کے چار رکعت پڑھادے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر امام نے بھول کر چار رکعت بغیر قعدۂ اولیٰ کے پڑھادیں تو اب فرض واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟ نیز کیا نفل بغیر سجدہ سہو کے درست ہیں؟ مستفتی: حافظ خالد محمود لکی مروت

﴿جواب﴾ مسافر کیلئے قعدۂ اولی بمنزلہ قعدۂ اخیرہ کے ہے یعنی فرض ہے لہٰذا رہ جانے کی صورت میں فرض باطل ہوگیا اور واجب الاعادہ ہے البتہ نفس نماز باقی ہے، یعنی چاروں رکعت نفل شمار ہونگی، نفل بغیر سجدۂ سہو کے درست نہیں۔

لما فی الدر المختار:(۱۲۸/۲،طبع سعید)

وان لم یقعد بطل فرضه )وصار الکل نفلا لترك قعدة المفروضة.

وقال ابن عابدینؒ (وصار الکل نفلا )ای بتقیده الثالثة بسجدة لتمکنه من العود قبلها وهذا عندهما بناء علی انه اذابطل الوصف لایبطل الاصل خلافا لمحمدؒ قوله:(لترك القعدة)علة لبطلان الفرض لم القعدة وان کانت فرضا فی النفل ایضا لکنه اذا لم یأت بها فی اخر شفع تصیر الخاتمة هی الفرض کما بیناه فی باب النوافل.

ولما فی الدر المختار:(۸۷/۲،طبع سعید)

(ولا یسجد لسهو علی الاصح)لان النقصان با لفساد لا ینجبر.

وقال ابن عابدینؒ :(لان النقصان )ای الحاصل بترك القعدة لا ینجبر بسجود سهو فان قلت: انه وان فسد فرضا فقد صح نفلاً ومن ترك القعدة ساهیاً وجب علیه سجود سهو فلما ذا لم یجب علیه السجود نظراً لهذا الوجه ؟ قلت:انه فی حال ترك القعدة لم یکن نفلاً انما تحققت النفلیة بتقید الرکعة بسجدة والضم فالنفلیة عارضة.

الجواب صحیح :عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :اسلام بادشاہ ہمیش

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۱۸۱۷

## ﴿بیس، پچیس دنوں کی تشکیل ایک ہی آبادی میں ہو تو قصر جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب تبلیغی جماعت کی تشکیل کسی شہر یا آبادی میں بیس (۲۰) یا پچیس (۲۵) دن کی ہوئی ہو تو اس صورت میں وہ مقیم شمار ہونگے یا مسافر؟۔شریعت کی رو سے جواب دیکر ممنون فرمائیں۔ مستفتی: حافظ خالد محمود لکی مروت

﴿جواب﴾ جو مسافر کسی ایک جگہ (شہر یا آبادی) میں پندرہ (۱۵) یا اس سے زیادہ دن کی

نیت کرلے اور پندرہ دن سے پہلے وہاں سے جانے کا ارادہ نہ ہو اگرچہ وہاں ان کے اہل وعیال نہ ہوں تو اس صورت میں یہ جگہ یعنی شہر ہو یا آبادی وطن اقامت کہلاتی ہے۔اب یہ شخص مقیم شمار ہوگا اور اقامت کی نماز یعنی پوری چار رکعت پڑھے گا۔

لما فی الهداية:(۱/۲۰۳،طبع رحمانيه،كتاب الزكوة)

ولهذا يصير المسافر مقيماً بمجرد النية ولا يصير المقيم مسافراً بالنية الا بالسفر.

ولمافی الهندية:(۱/۱۳۹)هكذا فی الهداية.

ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فی بلدة او قرية خمسة عشر يوما او اكثر.

ولمافی ردالمحتار:(۲/۱۳۱،طبع سعيد)

قوله(الوطن الاصلی) هو موطن ولادته او تأهله او توطنه(قوله اوتوطنه)ای عزم على قرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل.

ولمافی الفقه الحنفی:(۱/۲۹٦)

ومن دخل بلد المنوی الاقامة فيه نصف شهر او اكثر اتم الصلاة الرباعية ولا يزال يتم حتى يرتحل عنه بانشاء سفر منه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:اسلام بادشاہ کمیشی

۱۸ ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۸۱۵

## ﴿دو راستے ہوں تو قصر کے لئے کون سے راستہ کا اعتبار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ، میں کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر جاتا ہوں وہ جگہ ۶۵ کلومیٹر ہے لیکن جب میں وہاں پہنچتا ہوں تو میں ۹۵ کلومیٹر سفر طے کرلیتا ہوں یعنی دوسرا راستہ اختیار کرتا ہوں جو کہ لمبا راستہ ہے اس دوران میں قصر نماز پڑھوں گا یا نہیں؟ اور اس صورت میں مجھے کیا نیت کرنی ہوگی؟　　مستفتی:محمد یامین صاحب

﴿جواب﴾ اپنی آبادی سے نکل کر آپ نے اس لمبے راستہ کو اختیار کرنے کا ارادہ اگر کیا ہے تو آپ مسافر ہیں اگرچہ اس آبادی تک پہنچنے کیلئے کم مسافت کا دوسرا بھی راستہ ہے البتہ مختصر راستہ اختیار کرنے کی صورت میں آپ مسافر شمار نہ ہوں گے اور جب شرعاً مسافر ہوں تو قصر پڑھنا ضروری ہے اور مسافر نہ ہوں تو پوری نماز پڑھنا ضروری ہے زبان سے پوری نماز یا قصر پڑھنے کا ذکر کرنا کوئی ضروری نہیں ہے نیت دل سے ارادہ کرنے کا نام ہے۔

لما فی الدر المختار (۲/۱۲۱) ایچ۔ایم۔سعید

(من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم یجاوز من جانب الآخر.

لما فی رد المحتار (۲/۱۲۱) ایچ۔ ایم۔سعید

(قوله من جانب خروجه) قال فی شرح المنیة: فلا یصیر مسافراً قبل ان یفارق عمران ماخرج منه من الجانب الذی خرج حتی لو کان ثمة محلة منفصلة عن المصر و قد کانت متصلة به لا یصیر مسافراً ما لم یجاوزها، ولو جاوز العمران من جهة خروجه و کان بحذائه محلة من جانب الآخر یصیر مسافراً اذ المعتبر جانب خروجه

لما فی الدر المختار (۲/۱۲۲) ایچ۔ایم۔سعید

و من طاف الدنیا بلا قصد لم یقصر (مسیرة ثلاثة ایام و لیالیها) من اقصر ایام السنة ولا یشترط سفر کل یوم الی اللیل بل الی الزوال

لما فی الدر المختار (۲/۱۲۳) ایچ۔ایم۔سعید

و لو لموضع طریقان احدهما مدة السفر والآخر اقل قصر فی الاول لا الثانی (صلی الفرض الرباعی رکعتین) وجوباً لقول ابن عباس ان الله فرض علی لسان نبیکم صلاة المقیم اربعاً و المسافر رکعتین

لما فی العالمگیریه (۱/۱۳۸) مکتبه رشیدیه

فاذا قصد بلدة و الی مقصده طریقان احدهما ثلاثة ایام و لیالیها و الآخر دونها فسلک الطریق الابعد کان مسافراً عندنا هکذا فی فتاوی قاضی خان وان سلک الاقصر یتم

لما فی حاشیة الطحطاوی (ص ۴۲۲) قدیمی

و لا یعتبر القصد ما لم یتصل به عمل السفر، و لو لم یقصد لا یکون مسافراً و لو طاف الدنیا جمیعاً

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۱۰ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۷۹

### ﴿سفر میں وہ راستہ معتبر ہے جس پر سفر کیا ہو﴾

﴿سوال﴾ میں ضلع ٹانک کے ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں اگر میں اپنی جگہ سے ڈیوٹی کیلئے پیدل جاؤں تو فاصلہ اڑتالیس (۴۸) میل سے کم بنتا ہے البتہ راستہ دشوار گزار پہاڑیاں ہیں اور اگر گاڑی پر سوار ہو کر جاؤں تو فاصلہ اڑتالیس میل سے زیادہ بنتا ہے۔ تو سوار ہونے کی حالت میں پوری نماز پڑھوں یا قصر کروں؟

مستفتی: منور گل بھیٹنی لکی مروت

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جس راستے پر سفر کیا ہو اسی راستے کے فاصلے کا اعتبار ہوگا،

لہٰذا آپ اگر پیدل کا راستہ اختیار کرتے ہیں جس میں فاصلہ اڑتالیس میل سے کم ہے تو پوری نماز پڑھنی ہوگی اور اگر سواری پر جائیں تو قصر کرنے کا حکم ہے۔ بشرطیکہ اڑتالیس (۴۸) میل یا اس سے زیادہ فاصلہ بنتا ہو۔

لما فی الشامی: (۱۲۳/۲، طبع سعید)

ولو لموضع طریقان احدهما مدة سفر والآخر اقل قصر فی الاول لا الثانی۔

ولما فی الهندیة: (۱۳۸/۱، طبع رشیدیه)

فاذا قصد بلدة والیٰ مقصده طریقان احدهما مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها والآخر دونها سلک الطریق الابعد کان مسافراً عندنا هکذا فی فتاوی قاضی خان وان سلک الاقصر یتم بحر۔

ولما فی التاتار خانیة: (۷/۲، طبع قدیمی)

مصر له طریقان احدهما مسیرة یوم والآخر ثلاثة ایام ولیالیها و ان اخذفی طریق الذی هو مسیرة یوم لایقصر وان اخذ فی الطریق الذی هو مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها قصر الصلاة۔

واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ ہمیش

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۰۴۱

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

## ﴿بغیر نیتِ سفر کے اتمام ہی کرے گا چاہے سفر جتنا لمبا ہو جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص اپنے علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان سے شرعی سفر کا ارادہ کئے بغیر چلتے چلتے کراچی پہنچا اب کراچی سے واپس اپنے علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان جا رہا ہے تو قصر کہاں سے شروع کریگا؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد عظیم

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یہ شخص چونکہ اپنے علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان سے شرعی سفر کا ارادہ کئے بغیر چلتے چلتے کراچی پہنچا جو کہ شرعی سفر نہیں ہے شرعی سفر کیلئے نیت اور قصد سفر ضروری ہے، لہٰذا اس دوران اتمام کرے گا، البتہ کراچی سے واپس اپنے علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان جب جانے لگا تو کراچی کی حدود (ٹول پلازہ) عبور کر کے قصر شروع کریگا اسلئے کہ اب اس نے شرعی سفر کا ارادہ کر کے عملی طور پر شروع کیا۔

لما فی التنویر وشرحه: (۱۲۲/۲، طبع سعید)

(قاصدا) ولو کافرا ومن طاف الدنیا بلا قصد لم یقصر (مسیرة ثلاثة ایام) من اقصر ایام السنة.

وفی الشامی تحت قوله: (قاصدا) اشار به مع قوله خرج الیٰ انه لو خرج ولم یقصد او قصد ولم یخرج لا یکون مسافرا الیٰ قوله...... (بلا قصد) بان قصد بلدة بینه وبینها

يومان للاقامة بها ، فلما بلغها بدا له ان يذهب الى بلدة وبينها يومان وعلم جرا.

قال في البحر :(۱۲۸/۲،طبع سعيد)

وعلى هذا قالوا الى قوله......اما في الرجوع فان كان مدة سفر قصر اه وايضا في الهداية:(۱۲۵/۱،طبع رحمانيه)

ولما في التنوير وشرحه :(۱۲۱/۲،طبع سعيد)

(من خرج من عمارة موضع اقامته.من جانب خروجه وان لم يجاوز من الجانب الاخر— صلى الفرض الرباعي ركعتين.

ولما في الشامية:(۲ /۱۲۱،طبع سعيد)

قوله:(من خرج من عمارة موضع اقامته )اراد بالعمارة ما يشمل بيوت الاخبية لان بها الى قوله — واشار الى انه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الاقامة وهو ماحول المدينة من بيوت ومساكن فانه في حكم المصر وكذا القرى المتصلة بالربض في الصحيح الى قوله _ قوله (من جانب خروجه)قال في شرح المنية فلا يصير مسافرا مالم يجاوزها ولو جاوز العمران من جهةخروجه وكان بحذائه محلة من الجانب الاخراه اذ المعتبرجانب خروجه.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ  واللہ اعلم بالصواب :عزیز الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۲۶ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ  فتویٰ نمبر:۱۴۳۲

## ﴿اگر سفر شرعی پورا ہونے سے پہلے لوٹ آیا تو قصر نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک آدمی اپنے گھر سے سفر کے ارادے سے نکلا جو کہ حد شرعی کی مقدار کے برابر تھا سفر کرتے ہوئے ابھی مسافت سفر طے نہیں ہوئی تھی کہ کسی وجہ سے واپس آنا پڑ گیا تو کیا واپسی میں نماز کی قصر کرے گا یا نہیں؟ مستفتی :مسعود اختر ٹیکسلا

﴿جواب﴾ اگر شرعی سفر طے کرنے سے پہلے واپسی کا عزم کرلیا اور آگے سفر روک لیا تو اس صورت میں مقیم ہو جائے گا، اور نماز کا اتمام کرے گا لیکن اگر ۴۸ میل سفر طے کرلیا تھا پھر واپس لوٹ آیا تو اس صورت میں اپنے شہر کی آبادی میں داخل ہونے سے پہلے تک قصر کرے گا۔

لما في الشامية :(۱۲۵/۲،طبع سعيد)

اقول:ويظهر لي في الجواب ان العلة في العلية هي المشقة واقيم السفر مقامها ولكن لاتثبت عليتها الابشرط ابتداء وشرط بقاء فالاول مفارقة البيوت قاصدا لمسيرة ثلثة ايام والثاني استكمال السفر ثلثة ايام فاذاوجد الشرط الاول ثبت حكمها ابتداء فلذا يقصر بمجرد مفارقة العمران ناويا ولايدوم الابالشرط الثاني فهو شرط

لاستحکامها علة فاذا عزم علی ترك السفر قبل تمامه بطل بقاء ما علا لقبولها النقض قبل الاستحکام ومضی فعله فی الابتداء علی الصحة لوجود شرطه ولذا لو لم یصل لعذر ثم رجع یتضیبا متصورة کما قدمناه فتدبره وقال ابضاص ۱۲۵ والحاصل ان نیة الاقامة قبل تمام المدة تکون نقضا للسفر کنیة العود الی بلده والسفر قبل استحکامه یقبل النقض.

ولمافی البحر الرائق:(۱۳۱/۲،طبع سعید)

وفی المجتبی لا یبطل السفر الابنیة الاقامة او دخول الوطن او الرجوع قبل الثلاثة الخ، والمذکور فی الخانیة والظهیریة وغیرهما انه اذارجع لحاجة نسیها ثم تذکرها فان کان له وطن اصلی یصیر مقیما بمجرد العزم علی الرجوع وان لم یکن له وطن اصلی یقصر.

ولمافی الهندیة:(۱۳۹/۱،طبع رشیدیه)

هذا اذاسار ثلثة ایام اما اذالم یسر ثلثة ایام فعزم علی الرجوع او نوی الاقامة یصیر مقیما وان کان فی المفازة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفااللہ عنہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۱۹۹

## ﴿قصر نماز کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام قصر نماز کیلئے کتنا سفر کرنا شرط ہے اور سفر کے شروع اور جہاں سے قصر نماز شروع ہوتی ہے اسکا تعین کیسے کیا جائے جبکہ آجکل شہر اور قصبے آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے آپس میں مل رہے ہیں، دوسری بات کہ ہماری کام کی جگہ پر رہائش کے علاوہ تمام سہولتیں ہیں عارضی ایک دو دن بوجہ مجبوری یا کام کی زیادتی کی بناء پر رہائش رکھ سکتے ہیں اور بشرط زندگی (۲۵) سے (۴۰) یا (۴۵) سال ہم نے یہاں نوکری کرنی ہے آیا کہ ہم روزانہ قصر کریں گے اس مسئلہ پر بھی ہمیں قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیل سے آگاہ فرمائیں؟

ہمارے گاؤں اور اسی طرح دیگر اور دیہات کو واہ کینٹ میں داخل کر دیا گیا ہے تو کیا ہم اپنے گاؤں کی آبادی سے نکلنے پر قصر کریں یا واہ کینٹ کی حدود ختم ہونے پر قصر کریں؟

﴿جواب﴾ اپنی بستی یا شہر سے اڑتالیس (۴۸) میل دور سفر کا ارادہ ہو تو آبادی کی تعمیرات سے نکل جانے پر شرعی سفر شروع ہو جاتا ہے شہر یا قصبے اور بستی وغیرہ شروع میں اگرچہ مستقل الگ آبادیاں تھیں اور نام اب بھی الگ الگ ہیں لیکن ملنے سے شرعاً ایک آبادی قرار پاتی ہے۔

لہٰذا آپ کے گاؤں اور دیگر بستیوں کو اگر حکومت نے واہ کینٹ کا حصہ قرار دیا ہے اور آبادیوں میں اب فاصلہ بھی نہیں رہا تو یہ اب پوری ایک آبادی ہے اسکے آخری تعمیراتی حصے سے نکلنے کے بعد آپ کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

سفر شروع ہونے کے بعد جب تک اپنی آبادی میں آپ واپس نہیں آتے یا کم از کم پندرہ روز تک اقامت کا ارادہ آپ نہیں کرتے آپ مسافر شمار ہونگے اور قصر لازم ہوگا، لہٰذا جس جگہ آپ کام کرتے ہیں یہاں مسلسل پندرہ دن تک قیام کا ارادہ ہو تو یہ وطن اقامت بن جائے گا اور پھر آپ پر اتمام لازم ہوگا اس سے کم ٹھہرنے کے ارادے سے آپ مقیم قرار نہیں پاتے خواہ پینتالیس سال تک بھی آپ کے کام کا یہ سلسلہ جاری رہے آپ پر قصر لازم ہوگا۔

لما فی الشامیة:(۱۲۱/۲ طبع سعید)

وأشار الی أنه یشترط مفارقة ما کان من توابع موضع الاقامة کربض المصر وهو ما حول المدینة من بیوت ومساکن فانه فی حکم المصر وکذا القری المتصلة بالربض فی الصحیح۔۔۔ وبعد اسطر وأما الفناء وهو المکان المعد لمصالح البلد کرکض الدواب ودفن الموتیٰ والقاء التراب وان انفصل بغلوة أو مزرعة فلا (الی قوله) والقریة المتصلة بالفناء دون الربض لا تعتبر مجاوزتها علی الصحیح.

ولما فی الفقه الاسلامی:(۱۳۵۳/۲ طبع رشیدیه)

ولو کانت قریتان متدانیتین (متقاربتین) واتصل بناء احداهما بالاخری فهما کالواحدة وان لم یتصل بناؤهما فلکل قریة حکم نفسها.

ولما فی الهندیة:(۱۵۲/۱ طبع قدیمی)

ولا یزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة أو قریة خمسة عشر یوما أو أکثر.

ولما فی قاضیخان :(۱۴۸/۱ طبع قدیمی)

ان کان بین المصر وفنائه اقل من قدر غلوة ولم یکن بینهما مزرعة یعتبر مجاوزة الفناء أیضا وان کان بینهما مزرعة أو کانت المسافة بین المصر وفنائه قدر غلوة یعتبر مجاوزة عمران المصر لا یعتبر فی مجاوزة الفناء وکذلک اذا کان هذا الانفصال بین القریتین أو بین قریة و مصر وان کانت القری متصلة بربض المصر فالمعتبر مجاوزة القری هو الصحیح.

وهکذا فی تنویر الابصار:(۱۲۲/۲)(هندیة:۱۳۹/۱)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۲۳

## ﴿مسافر کیلئے تکرار جماعت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل میں کہ محلّہ کی مسجد میں نماز ہو چکی تھی کہ مسافر جماعت مثلاً تبلیغی جماعت باہر سے آ گئی تو کیا وہ جماعت ثانیہ قائم کر سکتی ہے یا نہیں؟ نیز اگر جماعت ثانیہ قائم کر لی تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ تفصیل سے آگاہی فرمائیں۔

﴿جواب﴾ اہل محلّہ کیلئے تکرار جماعت مکروہ ہے البتہ اگر تکرار جماعت بلا اذان و اقامت و بلا ہیئت اولیٰ ہو تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اسکی گنجائش ہے، نیز غیر اہل محلّہ کیلئے جیسا کہ سوال کے اندر مذکور ہے تکرار جماعت جائز ہے کیونکہ اس میں کراہت کی علت یعنی تقلیل جماعت نہیں پائی جا رہی۔

لمافی رد المحتار:(۱/۵۵۲،طبع سعید)

ویکرہ:أی تحریما لقول الکافی لایجوز۔۔باذان واقامة۔۔الخ.عبارة فی الخزائن:أجمع مما ههنا ونصبها:یکره تکرار الجماعة فی مسجد محلة باذان واقامة الا اذا صلی بهما اولا غیر اهله او اهله لکن بمخافتة الاذان، ولو کرر اهله بدونهما او کان مسجد طریق جاز اجماعا۔۔۔هذا،وقدمنا فی باب الاذان عن اخر شرح المنية عن ابی یوسفؒ انه اذا لم تکن الجماعة علی هيئة الاولیٰ لا تکره والا تکره، وهو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة کذا فی البزازیة انتهی.وفی التاترخانیة عن الولوالجیة وبه ناخذ.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱/۱۵۲،طبع سعید)

وروی عن انس بن مالک رضی الله عنه ان اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم کانوا اذا فاتتهم الجماعة صلوا فی المسجد فرادی ولا ن التکرارا یؤدی الیٰ تقلیل الجماعة ..... و بخلاف ما اذا صلی فیه غیر اهله لانه لا یؤدی الیٰ تقلیل الجماعة۔الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۱/۲/۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۱۵۱

## ﴿عذر کی وجہ سے قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانے میں کوئی قباحت نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معذور آدمی اگر قبلہ کی طرف پاؤں پھیلا کر نماز پڑھے تو کیا شرعاً یہ درست ہے یا نہیں؟ یہ بے ادبی شمار ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قبلہ کی طرف بلا کسی عذر کے قصداً پاؤں پھیلانا خلاف ادب ہے اور شرعی عذر

ہوتو خلاف ادب نہیں ہے، لہذا کسی مجبوری کی وجہ سے نمازی کو قبلہ کی جانب پاؤں پھیلا کر نماز پڑھنی پڑتی ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما في الدر المختار مع الرد:(۶۵۵/۱،طبع سعید)

کره مد رجليه في نوم أو غيره اليها أي عمداً لانه اساءة ادب..... وفي الشاميه(قوله عمدا)اى من غير عذر اما بالعذر أوالسهو فلا.

ولما في الهنديه:(۳۱۹/۵، طبع سعيد)

يكره مد الرجلين الى القبلة في النوم وغيره عمداً.

ولما في البحر الرائق:(۳۳/۲طبع سعيد)

يكره ان يمد رجليه في النوم وغيره الى القبلة.

ولما في المحيط البرهاني:(۲۸/۳طبع ادارة القرآن)

واذا لم يستطع القعود صلى مستلقياً على قفاه متوجهاً نحو القبلة ورأسه الى المشرق، ورجلاه الى المغرب، وهذا هو الافضل عندنا.

ولما في مراقي الفلاح مع نور الايضاح ص ۴۲۳)

وان تعسر القعود اوما مستلقيا او على جنبه والاول اولى.....(وينبغي) للمريض( نصب ركبتيه من قدر حتى لايمدهما) فيمتد برجليه (الى القبلة) وهو مكروه للقادر على الامتناع عنه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۸۸

## ﴿معذور کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے آٹھ سال سے مجھے خروج ریح کا مسئلہ ہے، جس کی وجہ سے مجھے نماز پڑھنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے کبھی کبھار ایک نماز میں ہی تین، چار مرتبہ ریح خارج ہوتی ہے، عصر کی نماز مغرب سے ایک، دو منٹ پہلے پڑھ لیتی ہوں اور عشاء کی نماز تہجد سے آٹھ دس منٹ پہلے پڑھ لیتی ہوں، اور اس کی وجہ سے اکثر غصہ بھی آتا ہے، لیکن کبھی کبھار یہ مسئلہ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے اور ایک، دو دن تک صحیح رہتا ہے پھر شروع ہو جاتا ہے ایسی صورت میں شریعت میری نماز کے بارے میں مجھے کیا حکم دیتی ہے؟

﴿جواب﴾ عموماً یہ وسوسہ ہوتا ہے حقیقت میں کوئی ریح خارج نہیں ہوتی محض احساس ہوتا

ہے شیطان نیک لوگوں کو تنگ کرتا رہتا ہے جسکی ایک علامت یہ ہوتی ہے کہ نماز کے علاوہ اوقات میں یہ شکایت نہیں ہوتی اور جوں ہی وضو کیا نماز کی تیاری کی تو بار بار احساس ہوتا ہے کہ ریح خارج ہوگئی، ایسے شخص کے لئے حکم یہ ہے کہ جب تک آواز یا بدبو نہ آئے توجہ نہ دے، وضو نہیں ٹوٹتا، ہاں یقین ہو تو وضو نیا بنالیا کریں لیکن وسواسی آدمی کو شیطان یقین کے درجہ میں وسوسہ میں مبتلا کردیتا ہے جس کا علاج یہی ہے کہ توجہ نہ دیں ورنہ شیطان کو مزید موقع ملتا ہے، بعض لوگوں کو واقعی بیماری ہوتی ہے معمولی بیماری ہو تو وضو نیا کرنا ضروری ہوتا ہے اور باقاعدہ معذور کے درجہ میں ہو تو وقت کے اندر اندر اس بیماری کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

شرعاً معذور وہ کہلاتا ہے جس پر کسی نماز کا پورا وقت اس طرح گذرے کہ وہ بغیر عذر کے صرف فرض پر اکتفاء کرتے ہوئے بھی نماز ادا نہ کر سکے، لھذا آپ کو واقعی اگر بیماری ہے وسوسہ نہیں ہے تو آپ ایک مرتبہ اندازہ کرلیں اس طرح کہ مثلاً مغرب کی نماز کا وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے اس پورے وقت میں اگر آپ کو اتنا وقت بھی نہ ملے کہ وضو کر کے بغیر عذر کے فرض نماز پڑھ سکیں تو آپ شرعاً معذور شمار ہونگی پھر آپ کے لئے حکم یہ ہوگا کہ کسی بھی نماز کا وقت آنے پر نیا وضو کرلیا کریں جب تک وقت باقی رہے گا اس وضو سے فرض، نفل، واجب نماز اور تلاوت وغیرہ سب کر سکتی ہونگی اسی وقت کے اندر اندر ریح نکلنے سے دوبارہ وضو ضروری نہیں ہوگا اور جب تک مرض کی نوعیت ایسی ہو کہ ہر نماز کے وقت میں کم از کم ایک بار یہ عذر پیش ہوتا رہتا ہو تو یہ رعایت آپ کے ساتھ ہوگی اور جب کوئی ایک وقت مکمل عذر پیش آئے بغیر گذر جائے تو معذوری ختم ہوگی یعنی ریح نکلنے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

لما فی صحیح البخاری :( باب لا یتوضأ من الشک حتی یستیقن، ۲۵/۱ طبع :قدیمی)

عن سعید ابن المسیب وعن عباد ابن تمیم عن عمه انه شکیٰ الی رسول الله ﷺ الرجل الذی یخیل الیه انه یجد الشئی فی الصلوۃ فقال لا ینفتل أو لا ینصرف حتی یسمع صوتاً أو یجد ریحاً.

لما فی التنویر مع الدر المختار :( ۳۰۵/۱ طبع :سعید کراچی)

وصاحب عذر من به سلس بول لا یمکنه امساکه أو استطلاق بطن أو انفلات ریح أو استحاضة...... ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة بان لا یجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیاً عن الحدث ولو حکماً لأن الانقطاع الیسیر ملحق

بالعدم، وهذا شرط العذر في حق الابتداء، وفي حق البقاء كفى وجوده في جزء من الوقت ولو مرة، وفي حق الزوال يشترط استيعاب الانقطاع تمام الوقت حقيقة لانه الانقطاع الكامل، و حكمه الوضوء ..... لكل فرض، اللام للوقت ثم يصلي به فرضاً ونفلاً فاذا خرج الوقت بطل.

ولما في نور الايضاح :(ص:۵۰،۵۱، طبع:قديمي)

ومن به عذر كسلس بول و استطلاق بطن لوقت كل فرض و يصلون به ما شاؤوا من الفرائض والنوافل و يبطل وضوء المعذورين بخروج الوقت فقط ولا يصير معذوراحتى يستوعبه العذر وقتا كاملا ليس فيه انقطاع بقدر الوضوء، والصلاة، وهذا شرط ثبوته، وشرط دوامه وجوده في كل وقت بعد ذلك ولو مرة وشرط انقطاعه وخروج صاحبه عن كونه معذورا خلو وقت كامل عنه .

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد ابرار بنوی

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر :۳۶۷۵

## ﴿معذور کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کھانسی اور سینے کا درد ایک ساتھ لگ جاتا ہے جب کھانستی ہوں تو کھانسی کی وجہ سے پیشاب کے قطرے نکل جاتے ہیں اور یہ صورتحال ایک دومنٹ کے وقفے سے ہوتی ہے نماز میں بھی یہی صورتحال رہتی ہے معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت ایسی صورت حال میں مجھے معذور قرار دیتی ہے یا نہیں نیز یہ بھی بتائیں کہ کپڑوں کا دھونا لازم ہے یا نہیں؟ مستفتیہ :بنت عبدالخالق

﴿جواب﴾ پیشاب کے قطرے یقینی طور پر آنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے اور کپڑے کا وہ حصہ جس کو قطرے لگے ناپاک ہو جاتا ہے ایسی صورت میں وضوء کر کے یہ مخصوص حصہ کپڑے کا دھو کر دوبارہ نماز پڑھنا ضروری ہے۔

البتہ معذور کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ نماز کے ہر نئے وقت کیلئے نیا وضوء کرے پھر اسی وضوء سے وہ جس قدر نماز وغیرہ پڑھنا چاہے وقت کے اندر پڑھ سکتا ہے، اس عذر کے پیش آنے سے اسکا وضوء نہیں ٹوٹتا خواہ دوران نماز ہو لیکن انسان شرعاً معذور تب قرار پاتا ہے جب کہ نماز کے پورے وقت میں اتنا بھی موقع اسکو نہ ملے کہ صرف فرائض پر کفایت کرتے ہوئے وضوء، نماز عذر پیش آئے بغیر وہ ادا کر سکے ایسی کیفیت والا شخص معذور کہلاتا ہے اور ایک بار جب معذور قرار پایا تو

اب نماز کے پورے وقت میں صرف ایک بار عذر کا ظاہر ہونا بقائے عذر کیلئے کافی ہے اور جب پورا وقت ایسا گذرے کہ وہ شکایت ایک دفع بھی ظاہر نہ ہو تو شرعا وہ شخص اب معذور نہیں رہا۔

آپ نے اپنی کیفیت جسطرح بیان کی ہے کہ دو منٹ کے وقفے سے یہ صورت پیش آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معذور ہیں، پیشاب کے قطروں سے آپ کا وضو نہیں ٹوٹتا نماز جاری رکھیں، البتہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دوسری نماز کیلئے کپڑے کا یہ خاص حصہ دھولیا کرے آپ کی نماز ہوجائیگی۔

لما فی در المختار:(۱/۵۰۴،طبع امدادیه)

(وصاحب عذر من به سلس) بول لا یمکنه امساکه (او استطلا ق بطن او انفلات ریح او استحاضة) او بعینه رمد او عمش اوغرب وکذا کل ما یخرج بوجع ولو من اذن وثدی وسرة (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) ولو حکما وهذا شرط فی حق الابتداء وفی البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت وفی استعاب الانقطاع حقیقة.

ولمافی الدرالمختار:(۱/۵۰۶،طبع امدادیه)

(وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جاز له ان لا یغسله ان کان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها ای الصلوة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله هوالمختار للفتوی.

ولما فی البنایة:(۱/۱۵۹،طبع حقانیه)

(ومن به سلس البول) وهو من لا یقدر علی امساکه (والرعاف) الدم الخارج من الانف (والجرح الذی لایرقا) الذی لایسکن دمه من رقأالدم سکن وقوله (یتوضئون لوقت کل صلوة) وهوحکم المسئلة فیصلون بذالک الوضوء فی الوقت ماشاء من الفرائض والنوافل والواجبات.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۸۸۴

## ﴿معذور کی نماز کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو گیس کی بیماری ہے، جسکی وجہ سے وہ نماز نہیں پڑھتا، کیا ایسے عذر کی وجہ سے کوئی نماز چھوڑ سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ ایمان کے بعد پہلا حکم نماز کا ہے، جب تک بندہ نماز پڑھنے کی قدرت رکھتا ہے تو نماز پڑھنا اس پر فرض ہے، البتہ بعض اعذار کی بناپر اس کے احکام بدل جاتے ہیں لیکن نماز پڑھنا بہرحال لازم رہتا ہے، چنانچہ اگر کسی آدمی کو وضو توڑنے والی چیزوں میں سے

کوئی چیز مثلاً: قطرہ، ریح (گیس)، وغیرہ مسلسل آتا رہتا ہے، اور پورے وقت میں اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ وضو اور پاکی کے ساتھ اس وقت کی فرض نماز ادا کر سکے تو وہ معذور ہے، ایسا معذور شخص ہر نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد نیا وضو کر کے فرض، واجب، سنت جو چاہے پڑھ لے، جب تک نماز کا وقت باقی رہیگا تو اس وضو توڑنے والی چیز کے جاری رہنے سے وضو نہیں ٹوٹے گا، بشرطیکہ کوئی اور وضو توڑنے والی چیز نہ پائی جائے،

ہاں اگر نماز کا ایک پورا وقت ایسا گزر جائے کہ اس میں وہ عذر ایک مرتبہ بھی نہ پایا نہیں گیا تو اب وہ معذور نہیں رہیگا۔ مسئولہ صورت میں اگر آدمی کو گیس کی بیماری ایسی ہے کہ نماز کے پورے وقت میں اتنا موقع بھی اسکو نہیں ملتا کہ وضو کر کے فرض نماز ادا کرے تو وہ معذور ہے، اسی تکلیف کے ساتھ ساتھ وضو کر کے نماز پڑھا کرے، نماز چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار: (۱/۱۳۵ طبع: سعید)

(وصاحب عذر من به سلس البول) لا یمکنه امساکه (أو استطلاق بطن أو انفلات ریح أو استحاضة) أو بعینه رمد أو عمش أو غرب، وکذا کل ما یخرج بوجع ولو من أذن وثدی وسرة (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لا یجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث (ولو حکما) لأن الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم (وهذا شرط) العذر (وحکمه الوضوء) لا غسل ثوبه ونحوه لکل فرض (ثم یصلی) به (فیه فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالأولى (فإذا خرج الوقت بطل) أی ظهر حدثه السابق، حتى لو توضأ على الانقطاع ودام الى خروجه لم یبطل بالخروج مالم یطرأ حدث آخر أو یسیل کمسألة مسح خفه.

ولما فی الهندیة: (۱/۴۱ طبع رشیدیه)

(ومما یتصل بذلک أحکام المعذور) شرط ثبوت العذر ابتداء أن یستوعب استمراره وقت الصلاة کاملا وهو الأظهر، کالانقطاع لا یثبت مالم یستوعب الوقت کله حتى لو سال دمها فی بعض وقت صلاة فتوضأت وصلت ثم خرج الوقت ودخل وقت صلاة أخرى وانقطع دمها فیه أعادت تلک الصلاة لعدم الاستیعاب، وشرط بقائه أن لا یمضی علیه وقت فرض الا والحدث الذی ابتلی به یوجد فیه هکذا.

المستحاضة ومن به سلس البول أو استطلاق البطن، أو انفلات الریح أو رعاف دائم أو جرح لا یرقأ یتوضئون لوقت کل صلاة، ویصلون بذلک الوضوء فی الوقت ماشاؤوا من الفرائض والنوافل۔

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ
۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ
فتوی نمبر: ۳۲۳۱

﴿عذر کی وجہ سے تیمم کر کے گاڑی میں نماز پڑھ سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک عورت جو ایک پاؤں سے معذور ہو اسکے ساتھ جسم کی کمزوری بھی ہو نیز دماغی حالت بھی کمزور ہو، اور یہ سفر پر جارہی ہو نماز کا وقت آجائے تو اسکی نماز کا طریقہ کیا ہوگا؟ جبکہ گاڑی سے اترنا اور سوار ہونا آسان نہ ہو نیز گاڑی بھی اتنی نہ رکے کہ ساتھ والا آدمی پہلے اپنی نماز پڑھے بعد میں ان کو پڑھوائے، پوچھنا یہ ہے کہ از روئے شرع اسکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد ابراہیم شاہ حسن خیل ڈیرہ اسمٰعیل خان

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ حالت کو شریعت نے عذر کا درجہ دیا ہے، اور عذر کی وجہ سے تیمم کرنا اور سواری پر نماز پڑھنا درست ہوجاتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں تیمم کر کے گاڑی میں اشارہ سے نماز پڑھنے سے فریضہ ذمہ سے ساقط ہوجائیگا۔

لمافی حلبی کبیر: (ص۵۹، طبع نعمانیہ)

(والميل اربعة آلاف خطوة) وعن أبي يوسف لو كان بحيث لو ذهب الى الماء وتوضا تذهب القافلة وتغيب عن بصره فهو بعيد يجوزله التيمم وهو حسن جدا.

ولمافی الهندية: (۱/۱۵۸، قديمی)

ولاتجوز المكتوبة على الدابة الامن عذر هكذا في فتاوى قاضيخان..... ومن الاعذار أن يخاف..... أوكانت جموحا لونزل عنها لا يمكنه الركوب الا بمعين أو كان شيخا كبيرا لايمكنه أن يركب ولايجد من يركبه.

ولمافی الشامية: (۲/۱۴۰، طبع سعيد)

(ولو صلى على دابة في)..... (محمل وهو يقدر على النزول) بنفسه (لاتجوز الصلاة عليها اذا كانت واقفة، الا أن تكون ..... (فهي صلاة على الدابة، فتجوز في حالة العذر المذكور في التيمم (لافي غيرها) ومن العذر المطر ..... وذهاب الرفقاء او دابة لاتركب الا بعناء، أو بمعين ولو محرما، لان قدرة الغير لاتعتبر حتى لو كان مع امه مثلا في شق محمل ولو اذا نزل لم تقدر تركب وحدها جازله أيضا ..... (هذا) كله (في الفرائض).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۳۵۷

﴿انسان معذور کب بنتا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ آدمی کب شرعی معذور بنتا

ہے؟ اگر کوئی شخص نماز کے وقت میں صرف وضو کر کے فرض نماز ہی بغیر عذر کے ادا کرے تو اس سے بھی کیا وہ معذور کے حکم میں ہوگا؟ مستفتی: فدا محمد

﴿جواب﴾ صاحب عذر بننے کے لئے ضروری ہے کہ نماز کے پورے وقت میں سے اتنا وقت بھی نہ ملے جس میں وضو کر کے طہارت کے ساتھ فرض نماز ادا کر سکے، اگر پورے وقت میں سے صرف وضو کر کے فرض نماز ہی بغیر عذر کے ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو شرعاً یہ شخص معذور نہیں ہے۔

لما فی شرح التنویر: (۵۰۴/۱)

(ان استوعب عذره تمام وقت صلوٰة مفروضة) بان لا يجد فی جميع وقتها زمناً يتوضا ويصلی فيه خالياً عن الحدث (ولو حكماً) لأن الانقطاع اليسير ملحق بالعدم (وهذا شرط العذر).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ وباللہ التوفیق: محمد عزیز چترالی

۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:

# ﴿فصل فی الجمعة﴾

## ﴿جمعہ کے مسائل﴾

### ﴿جمعہ کی فضیلت﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب جمعۃ المبارک کی فضیلت احادیث کی روشنی میں حوالہ جات کے ساتھ بیان فرمائیں۔ مستفتی: محمد طیب صاحب ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ احادیث مبارکہ میں جمعۃ المبارک کے فضائل بہت زیادہ وارد ہیں، یہاں چند احادیث کا ترجمہ لکھ دیتے ہیں۔

لما فی سنن ابن ماجه (ص ۷۶ قدیمی کتب خانه)

عن اوس بن اوس الثقفی رضی الله عنه قال سمعت النبی ﷺ يقول من غسل يوم الجمعة واغتسل وبكر وابتكر ومشى ولم يركب ودنا من الامام فاستمع ولم يلغ كان له بكل خطوة عمل سنة اجر صيامها وقيامها.

(ترجمہ) حضرت اوس ثقفیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا کہ جو شخص جمعہ کے دن صفائی میں مبالغہ کرے اور غسل کرے اور سویرے چلا جائے اور خطبہ کو پالے سوار ہو کر نہ

جائے اور امام کے قریب بیٹھے اور خطبہ غور سے سنے، اور اس دوران کوئی لغو فعل نہ کرے تو اس کو ہر قدم کے عوض پورے ایک سال کی عبادت کا ثواب لکھ دیتے ہیں گویا سال بھر اس نے رات میں تہجد کا اور دن میں روزوں کا اہتمام کیا۔

ولما فی سنن ابی داؤد:(ص:۱۵۸،مکتبہ:رحمانیہ)

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ من توضأ فأحسن الوضوء ثم اتى الجمعة فاستمع وانصت غفرله ما بين الجمعة الى الجمعة.باب فضل الجمعة

(ترجمہ) حضرت ابوھریرۃؓ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے وضو کیا پس اچھی طرح سے وضو کیا پھر اس کے بعد نماز جمعہ کیطرف آیا اور توجہ سے سنا اور خاموش رہا تو اللہ رب العزت ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادیتے ہیں۔

ولما فی مشکوۃ المصابیح:(ص:۱۲۲،طبع:سعید)

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ اذا كان يوم الجمعة وقفت الملائكة على باب المسجد يكتبون الاول فالاول ومثل المهجر كمثل الذى يهدى بدنة ثم كالذى يهدى بقرة ثم كبشا ثم دجاجة ثم بيضة فاذا خرج الامام طووا صحفهم ويستمعون الذكر متفق عليه.

(ترجمہ) حضرت ابوہریرۃؓ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو مسجد کے دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور باری باری سے آنے والوں کا نام لکھتے ہیں جو سب سے پہلے مسجد میں آئے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ اس نے اونٹ کی قربانی کی ہو اس کے بعد آنے والے کی مثال ایسی ہے جیسا کہ اس نے گائے کی قربانی کی ہو اور اس کے بعد آنے والے کی مثال ایسی ہے جیسا کے اس نے دنبہ کی قربانی کی ہو اس کے بعد آنے والے کی مثال ایسی ہے جیسا کے اس نے مرغی کی قربانی کی، اور اس کے بعد آنے والے کی مثال ایسی ہے جیسا کے اس نے انڈہ صدقہ کر دیا، اور جب امام خطبہ کے لئے نکل آتے ہیں تو اس وقت یہ فرشتے اپنے اندراج کرنے والے رجسٹر بند کر دیتے ہیں مزید آنے والوں کے لئے اضافی ثواب نہیں لکھتے بلکہ وہ خود پھر امام کے ذکر (خطبہ) کو سننے بیٹھ جاتے ہیں۔

ولما فی سنن ابی داؤد:(ص:۱۵۸،طبع: رحمانیہ)

عن اوس بن اوسؓ قال قال رسول الله ﷺ ان من افضل ايامكم يوم الجمعة فيه خلق

(ادم وفيه قبض وفيه نفخة وفيه الصعقة فاكثروا الى من الصلوة فيه فان صلاتكم معروضة على قال قالوا يا رسول الله ﷺ وكيف تعرض صلوتنا عليك وقد ارمت قال يقولون بليت فقال ان الله عز وجل حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء.

(ترجمہ) حضرت اوس بن اوسؓ روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا دنوں میں سب سے زیادہ فضیلت والا دن جمعۃ المبارک کا ہے، اسی ہی دن میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور اسی دن میں آپکی روح قبض کی گئی اور اسی دن حضرت اسرائیل علیہ السلام صور میں پھونکیں گے اور جمعہ ہی کو دوسری بار (مردوں کو زندہ کرنے کے لئے) پھونکیں گے، پس کثرت سے اس روز میرے اوپر درود بھیجا کرو بے شک تمہاری صلوۃ (درود) میرے اوپر پیش کی جاتی ہے، راوی کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا اے اللہ کے رسول یہ کیسے ہوگا حالانکہ آپ کا جسم اطہر تو بوسیدہ ہو چکا ہوگا اور راوی کہتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا تو رسول اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا بے شک اللہ رب العزت نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھا جائے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان غفرلہ ولوالدیہ

۴ شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۲۷۵

## ﴿نماز جمعہ کی نیت کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے کہ بارے میں کہ جو شخص جمعہ کی نماز میں یہ نیت کرتا ہو کہ میں دو رکعت نماز جمعہ پڑھتا ہوں ظہر کے وقت تو اسکی نماز جمعہ ادا ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نیت دراصل دل سے کسی عمل کے قصد وارادے کو کہتے ہیں اور شرعاً اسی کا اعتبار ہے زبان سے تعبیر صرف توجہ کو مرکوز کرنے کیلئے کی جاتی ہے سو اگر دل میں قصد وارادہ جمعہ کی نماز ادا کرنے کا ہے تو نیت صحیح ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے، زبان سے تعبیر اگر چہ خلاف ہو، مذکورہ صورت میں تو تعبیر بھی صحیح ہے معلوم نہیں شبہ کیوں ہو رہا ہے؟

لما فی التنویر وشرحہ: (۱/۱۵ مطبع سعید)

والمعتبر فيها عمل القلب اللازم للارادة فلا عبرة للذكر باللسان ان خالف القلب لانه كلام لا نية (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ با لعصر سهوا أجزأه كما فى

المزاهدى قهستانى (قوله فيكفيه اللسان) اى بدلا عن النية.

ولمافى الحلبى: (ص ۲۴۹، طبع سهيل أكيڈمى)

(ولو نوى) فى صلوة الوتر (او) فى صلوة (الجمعة او) فى صلوة (العيد) فانه (ينوى) صلوة (الوتر) ويعينها (و) كذا ينوى صلوة (الجمعة و صلوة العيد اى يشترط فيها التعين.

ولمافى الهندية: (۱/ ۶۵-۶۷، طبع رشيديه)

الواجبات والفرائض لا تتادى بمطلق النية اجماعا كذا فى الغيائية فلا بد من التعين فيقول نويت ظهر اليوم او عصر اليوم.....لونوى الاقتداء فى الجمعة ونوى الظهر والجمعة جميعا جوز وانلك و رجحوا نية الجمعة بحكم الاقتداء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: حبیب الوہاب سواتی عفااللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر ۱۳۶۵

## ﴿خطبہ کے دوران بالکل خاموش رہنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب امام مسجد خطبہ جمعہ کے دوران قرآن کریم کی آیت "یا ایھا الذین امنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما" یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا تذکرہ کرلیں تو کیا مقتدیوں کو دوران خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ضروری ہے؟ جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنا ضروری ہے۔

مزید یہ کہ دوران خطبہ تسبیح وتحمید کا شرعاً کیا حکم ہے؟ جبکہ بعض لوگ تو دونوں خطبوں کے دوران ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں بھی مانگتے ہیں براہ کرم شرعی راہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ خطبہ کے دوران بالکل خاموش رہنا واجب ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی آئے یا امام صاحب مذکورہ آیت کی تلاوت کریں تو مقتدیوں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا ضروری نہیں بلکہ زبان سے سراً یا جہراً پڑھنا بھی منع ہے البتہ دل دل میں یعنی خیال اور تصور میں درود پڑھنا بہتر ہے۔

یہی حکم تسبیح وتحمید اور دو خطبوں کے درمیان دعا کا ہے کہ دل دل میں مانگے زبان سے مانگنا یا اسکے لئے ہاتھ اٹھانا بالکل منع ہے۔

لمافى ردالمحتار: (۲/ ۳۵، طبع سعيد)

وكل ماحرم فى الصلاة حرم فيها اى فى الخطبة فيحرم أكل وشرب وكلام ولو تسبيحا او

ردسلام اوامر ابمعروف بل یجب علیه ان یستمع ویسکت.

ولمافی فتاوی شامی:(۲/۱۶۴،طبع سعید)

قال فی المعراج:فیسن الدعاء بقلبه لابلسانه لانه مامور بالسکوت.

ولمافی الدرمع الرد:(۲/۱۵۸،طبع سعید)

(اذاخرج الامام)من الحجرة ان کان والافقیامه للصعود(فلاصلاة ولاکلام الی تمامها) قوله فلاصلاة شمل السنة وتحیة المسجد (وقوله لاکلام)ای من جنس کلام الناس أماالتسبیح ونحوه فلایکره وهوالأصح کمافی النهایة والعنایه وذکرالزیلعی أن الأحوط الأنصات وقال البقالی فی مختصره واذاشرع فی الدعاء لایجوزللقوم رفع الیدین ولاتأمین باللسان جهرافان فعلواذالک أثموا وقیل أساءوا فلااثم علیهم والصحیح هوالأول وعلیه الفتوی--- وکذالک اذاذکرالنبی صلی الله علیه وسلم لایجوزان یصلوا علیه بالجهربل بالقلب وعلیه الفتوی.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ    واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ    فتوی نمبر:۲۷۵۸

## ﴿دوران خطبہ کسی کواشارہ سے خاموش کرانا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بسااوقات خطبہ جمعہ کے دوران مسجد میں بچے شورکررہے ہوتے ہیں،جس سے خطبہ کے سننے میں دشواری پیش آتی ہے کیادوران خطبہ بچوں کوخاموش کرایاجاسکتاہے؟

نیزنکاح کے خطبہ کابھی حکم جمعہ کے خطبہ کی طرح ہی ہے یادونوں میں فرق ہے؟بینواتوجروا

﴿جواب﴾ دوران خطبہ حتی الامکان خاموش بیٹھ کرخطبہ سنناچاہیے تاہم اگربچے اتناشورکر رہے ہیں کہ خطبہ سننے میں دشواری پیش آرہی ہوتواشارہ کے ذریعے یاقریب بیٹھنے والاآدمی بچوں کوپکڑکربٹھادے،اوران کواشارہ سے سمجھائے کہ خاموش ہوجائیں۔

نیزجس طرح جمعہ کے خطبے کوخاموشی سے سننے کاحکم ہے،اسی طرح نکاح اوردیگرخطبوں کا بھی یہی حکم ہے۔

لمافی التنویروشرحه:(۲/۱۵۹،طبع سعید)

(وکل ماحرم فی الصلاة حرم فیها)ای فی الخطبه(وبعد سطرین)والاصح أنه لابأس بان یشیر برأسه أو یده عند رؤیة منکر...... وکذایجب الاستماع لسائر الخطب کخطبة النکاح وخطبة عید وختم علی المعتمد.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱/۲۶۴،شرائط الجمعة،طبع سعید)

ولان الانصات لم یکن مقصودا بل لیتوصل به الی الاستماع.

ولمافی البحر:(۲/۱۵۶،قبیل العیدین،طبع سعید)

ولو لم یتکلم لکن اشار بیده أو بعینه حین رأی منکرا الصحیح انه لا باس به.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ناجد محمود کہوٹہ

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۰۱۳

## ﴿توضیح الحیثیة الفقهیة للخطبة الأردیة﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

خطبہ جمعہ میں انصات اور استماع سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مثلاً ''اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام'' وغیرہ اور شریعت میں اسکی تاکید واہمیت سے شاید ہی کوئی صاحب علم ومطالعہ ناواقف ہو، پھر دوسری طرف اچھے دین دار نمازی حضرات کا بھی اجتماعی عمل سے اعراض اور اس سے استخفاف برتنا مشاہدہ میں آتا رہتا اور بڑی تشویش ہوتی، اجتماعی عمل سے اعراض اس طرح لوگوں کا نہ صرف ذاتی نقصان ہے بلکہ ساتھ ساتھ پورے مجمع کے لوگوں کے لئے بھی بار گذرتا ہے اور توجہ بھٹکتی رہتی ہے، اس لئے ایک مرتبہ اسی مسئلہ کو موضوع بیان رکھا اور وضاحت کے ساتھ عرض کردیا کہ ہر اجتماعی عمل کے دوران خصوصاً جمعہ کے لئے اردو بیان کے دوران نوافل پڑھنا ممنوع ہے، اس پر ایک صاحب نے ردّ عمل کے طور پر تحریری فتویٰ کا مطالبہ کیا پھر اسی فتویٰ کو لیکر دوسرے ایک بڑے دار الافتاء سے اس پر ردلا کر دکھایا جسمیں دوران تقریر ووعظ اگرچہ نماز جمعہ کے لئے کوئی خطیب صاحب بیان کریں نوافل کو بلا کراہت جائز کہا گیا تھا، ایک طرف جہاں اس فتویٰ پر تعجب ہوا وہیں اس مسئلے کی مکمل تحقیق کرنیکی ضرورت کا بھی احساس ہوا کہ اس بیان کی شرعی حیثیت واضح کرنا ضروری ہے کیونکہ حدیث ''اذا خرج الامام'' مسلسل دل میں کھٹک رہی تھی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک خطبہ کا جو معیار فقہاء نے بیان کیا ہے یہ بیان مکمل اس کا مصداق نظر آرہا تھا اور اجتماعی عمل کی اہمیت اور اس سے اعراض کی شناعت بھی اجمالی طور ذہن میں تھی اور فقہاء نے نماز کے مکروہات میں نمازی کی توجہ کو بھٹکانے

والے موقع کو بھی باقاعدہ شمار کیا ہیں تو یہ تمام باتیں مذکورہ بالا فتوی پر اطمینان سے مانع رہی۔

اطمینان کے لیے مندرجہ ذیل مباحث کی طرف مراجعت کی۔

(۱) خطبہ کیا ہے؟ (۲) خطبہ کی شرائط، رکن، اور سنن وغیرہ۔

(۳) اجتماعی عمل سے متعلق سورۃ النور کی آیت نمبر (۶۲) "واذا کانوا علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ" کی تفسیر۔

(۴) قرآن کریم کی تلاوت اور اسکی تفسیر خصوصاً جب دعوت کی غرض سے بیان کی جائے تو اس کا استماع واجب ہے (۵) مکروہات صلوۃ میں فقہاء کرام کا بیان کردہ مسئلہ کہ شور وشغب اور ہر ایسا موقع جو نمازی کے ذہن کو منتشر کردے۔

ان تمام مباحث کو مطالعہ کرنے کے بعد اور ہر پہلو پر خوب غور کرنے کے بعد تحریری طور پر اس تحقیق کو اصلاح وتائید کی غرض سے مختلف دارالافتاء بھجوایا گیا، جس پر بعض حضرات کی طرف سے اکثر سطحی نوعیت کے اشکالات موصول ہوئے صرف ایک اشکال اس قابل تھا کہ اسکو دور کیا جائے وہ یہ کہ "اس بیان میں قصد خطبہ نہیں ہوتا" چونکہ قصد غیر حسی عمل ہے اس لیے واقعی وضاحت طلب تھا۔

پھر واضح حوالوں کی روشنی میں اس اشکال کو بھی دور کیا گیا، اس کے علاوہ جو شبہات متوقع ہوسکتے تھے کسی کا نام لیے بغیر اس فتوی میں ان سب کا ازالہ کیا گیا ہے، البتہ ہمارے ایک قابل قدر مفتی صاحب نے اس کے خلاف کچھ اشکالات چونکہ باقاعدہ کتاب کا حصہ بنا کر شائع کیے، اس لیے ان کا شافی وکافی جواب مستقل عنوان کیساتھ شائع کرنا ضروری سمجھا، اب امید ہے کہ اہل علم حضرات کو فقہی نقطہ نظر سے مطالعہ کے بعد کوئی اشکال باقی نہ رہے گا، لیکن ہم اپنی بات کو حرف آخر نہیں سمجھتے، اس لئے اگر اس کے خلاف حوالہ یا دلیل کوئی پیش کردے اور ہماری غلطی کی نشاندہی کردے تو انشاء اللہ رجوع کرنے میں ادنی تامل نہ ہوگا۔

باسم ملہم الصواب

خطبہ کیا ہے؟

فی السنن لابی داود عن جابر بن سمرۃ قال کانت صلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم قصدا وخطبته قصدا یقرء آیات من القرآن ویذکر الناس(۱/۱۶۵،طبع رحمانیہ).

وفی بذل المجهود:یقرء آیات من القرآن:ای فی الخطبة ویذکر الناس:ای یعظهم فیه.
(۸۵/۲، طبع مکتبة الشیخ).

علامہ امام اکمل الدین محمد بن محمود رحمہ اللہ شرح العنایہ علی الھدایہ میں خطبہ کے بارے میں لکھتے ہیں: (۲/۲۸ طبع قدیمی)

(ومنها)من شرائط الجمعة(الخطبة)وهی اسم لما یخطب به.

اور علامہ سید احمد الطحطاوی لکھتے ہیں: (حاشیۃ الطحطاوی: ص ۲۷۷)

(والرابع الخطبة) فعلة بمعنی مفعولة فهی اسم لما یخطب به عناية من الخطب وهو فی الاصل کلام بین اثنین قهستانی عن الازاهر وهی بالضم فی الموعظة.

اور محیط برہانی میں ایک جگہ لکھتے ہیں: (۲/۴۵۹)

لان الخطبة فی الحقیقة وعظ وامر بالمعروف.

اور دیکھئے کشاف اصطلاحات الفنون: (۱/۴۰۵) اور قواعد الفقہ: (ص ۲۷۸)

علامہ سید شریف الجرجانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: (التعریفات للجرجانی: ص ۷۲)

الخطبة هو قیاس مرکب من مقدمات مقبولة اومظنونة من شخص معتقد فیه والغرض منها ترغیب الناس فیماینفعهم من امور معاشهم ومعادهم کما یفعله الخطباء والوعاظ.

مذکورہ بالا حوالوں سے خطبہ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ کہ اس حد تک اردو تقریر، بیان، خطاب جو بھی نام دیں مکمل طور پر نفس خطبہ کا مصداق ہے۔

اب اس بات کی تحقیق کہ خطبہ جمعہ کیلئے فقہاء کرام کی بیان کردہ شرائط بھی مکمل طور پر اردو بیان کے لئے پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اور اصل خطبہ کے رکن پر بھی یہ اردو خطبہ مشتمل ہے یا نہیں؟

خطبہ جمعہ کا "رکن" تو ذکر اللہ ہے، بلاشبہ اردو بیان ذکر اللہ پر اصل خطبہ کی طرح مشتمل ہوتا ہے۔

شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بادشاہ یا مجاز آفیسر کی جانب سے اذن شرط ہے اور اسلامی حکومت نہ ہو جیسے آج کل ہمارے ملک کا حال ہے، تو کم از کم جامع مسجد کی انتظامیہ کیطرف سے خطیب مقرر ہو، اسی طرح اپنی جگہ اس خطیب نے کسی دوسرے کو اجازت دی ہو تو خطیب صاحب کی اجازت بھی کافی ہے اس کے بغیر خطبہ جمعہ معتبر نہیں۔

لما فی الشامیۃ:(۲/۱۴۰طبع سعید)

ثم قال واقامۃ الجمعۃ عبارۃ عن امرین الخطبۃ والصلاۃ والموقوف علی الاذن هو الاول دون الثانی فالمراد من الاستخلاف الاستخلاف لاقامۃ الجمعۃ الاستخلاف للخطبۃ لا للصلاۃ کما توهمه البعض۔

ولما فی الشامیۃ:(۲/۱۴۱طبع سعید)

وحاصله انه لا تصح اقامتها الا لمن اذن له السلطان بواسطۃ او بدونها اما بدون ذلک فلا کما هو صریح مایذکره الشارح عن السراجیۃ۔

ولما فی الدر المختار:(۲/۱۴۳طبع سعید)

وقالوا یقیمها امیر البلد ثم الشرطی ثم القاضی ثم من ولاه قاضی القضاۃ (ونصب العامۃ) الخطیب (غیر معتبر مع وجود من ذکر) اما مع عدمهم فیجوز للضرورۃ۔

وانظر الهندیۃ:(۱/۱۴۶)والمحیط البرهانی:(۲/۲۵۸)۔

(۲)(۳)خطبہ جمعہ زوال کے بعد نماز سے پہلے ضروری ہے۔

ولما فی البحر:(۲/۱۴۶)

(قوله والخطبۃ قبلها) ای وشرط صحتها الخطبۃ وکونها قبل الصلاۃ لما قدمنا من ان النبی صلی الله علیه وسلم ماصلاها دون الخطبۃ ونقل فی فتح القدیر الاجماع علیٰ اشتراط نفس الخطبۃ ولانها شرط وشرط الشیء سابق علیه ولو قال فیه ای فی وقت الظهر لکان اولی لانه شرط حتی لو خطب قبله وصلی فیه لم تصح۔

(۴)خطبہ کے لیے اتنے لوگ حاضر ہوں کہ نماز جمعہ صحیح ہو سکے اور ایک روایت میں خطبہ کے لئے ایک آدمی کی حاضری کو بھی کافی بتایا ہے، بلکہ پورے خطبہ کے لیے حاضری صرف امام کے حق میں شرط ہے مقتدیوں کے حق میں نہیں۔

ولما فی الشامیۃ:(۲/۱۵۱طبع سعید)

(قوله ولو غیر الثلاثۃ الذین حضروا الخطبۃ) ای علی روایۃ اشتراط حضور ثلاثۃ فی الخطبۃ اما علی روایۃ عدم الاشتراط اصلا اوانه یکفی حضور واحد فاظهر۔

ولما فی البحر:(۲/۱۴۶)

وشرط الشارح ان یکون بحضرۃ جماعۃ تنعقد بهم

الجمعۃ وان کانوا صما او نیاما وظاهره انه لا یکفی لوقوعها الشرط حضور واحد وفی الخلاصۃ ما یخالفه فانه قال لو خطب وحده ولم یحضره احد لا یجوز وفی الاصل قال فیه روایتان ولو حضر واحد او اثنان وخطب وصلی بالثلاثۃ جاز — وفی الفتح القدیر المعتمد انه لو خطب وحده فانه یجوز۔

ولما فی منحۃ الخالق:علی ھامش البحر:(۱۴۶/۲ طبع سعید)

لکن لقائل ان یقول ان الامر بالسعی الی الذکر لیس الا لاستماعه والمامور جمع فاذا جازت وحده لم یحز الامر فائدته وکان ھذا ھو وجه مارجحه فی الظھیریة وبه یترجح ماجزم به الشارح من اشتراط حضرة جماعة تنعقدبھم الجمعة علی مامر.

ولما فی البحر:(۱۴۸/۲ طبع سعید)

واما شھود الخطبة فشرط فی حق الامام دون المأموم.

(۵) خطبہ اور نماز کے درمیان طویل فصل ایسے امور کیوجہ سے آجائے جن کا تعلق نماز سے نہ ہو تو خطبہ کا اعادہ ضروری ہے مثلاً خطبہ دینے کے بعد خطیب صاحب گھر چلا جائے، کھانا کھالے یا جماع کرلے پھر غسل کرلے تو ایسی صورت میں اعادہ ضروری ہے اور فصل ایسے امور کی وجہ سے آجائے جن کا تعلق نماز سے ہے مثلاً جنابت کی حالت میں خطبہ دیا یا بغیر وضوء کے دے دیا پھر خطبہ کے بعد خطیب صاحب غسل کرنے چلا گیا یا وضوء کرنے یا خطبہ کے بعد قضاء نماز پڑھ لی یا نفل، سنت وغیرہ چونکہ ان امور کا تعلق نماز کیساتھ ہے اس لیے ایسی صورت میں اعادہ خطبہ ضروری نہیں ہے۔

لما فی البحر:(۱۴۷/۲ طبع سعید)

ولم یشترط المصنف انه یصلی عقب الخطبة بلاتراخ ففیه اشارة الی انه لیس بشرط فلذا قالوا ان الخطبة تعاد علی وجه الاولویة لوتذکر الامام فائتة فی صلاة الجمعة ولو کانت الوتر حتی فسدت الجمعة لذلک فاشتغل بقضائها وکذا لو کان افسد الجمعة فاحتاج الی اعادتها او افتتح التطوع بعد الخطبة وان لم یعد الخطبة اجزاه. وکذا اذا خطب جنبا کذا فی فتح القدیر ولم یفرق بین الفصل القلیل والکثیر وفرق بینهما فی الخلاصة فقال ولو خطب محدثا او جنبا ثم توضأ او اغتسل وصلی جاز ولو خطب ثم رجع الی بیته فتغدی او جامع واغتسل ثم جاء استقبل الخطبة وکذا فی المحیط معللا بان الاول من اعمال الصلاة بخلاف الثانی فان ظاهره ان الاستقبال فی الثانی لازم والا فلا فرق بین الکل، وقد صرح فی السراج الوهاج بلزوم الاستئناف وبطلان الخطبة وهذا هو الظاهر لانه اذا طال الفصل لم یبق خطبة للجمعة بخلاف ما اذا قل وقد علم من تفاریعهم انه لا یشترط فی الامام ان یکون هو الخطیب وقد صرح فی الخلاصة بانه لو خطب صبی باذن السلطان وصلی الجمعة رجل بالغ یجوز.

(۶) مطلق ذکر اللہ اگرچہ غیر عربی میں ہو، خواہ قادر علی العربی سے ہو بشرطیکہ خطبہ کے قصد وارادہ سے ہو خطبہ کیلئے (یعنی شرط کے درجہ میں) کافی ہے۔

لما فی البحر:(۲/۱۴۹، طبع سعید)

(قوله وكفت تحميده او تهليله او تسبيحه)ای وكفی فی الخطبة المفروضة مطلق ذكر الله تعالى على وجه القصد عندابی حنيفة لاطلاقه فی الاية الشريفة وقالا الشرط ان ياتی بكلام يسمى خطبة فی العرف واقله قدر التشهدالى عبده ورسوله تقييداله بالمتعارف كماقالاه فی القراءة وابوحنيفة عمل بالقاطع والظنی فقال بالقراض مطلق الذكر للاية وباستنان الخطبة المتعارفة للمعله عليه الصلوة والسلام تذيلاً للمشروعات على حسب ادلتها.

ولمافی التنويرمع الدر:(۲/۱۴۸، طبع سعيد)

(كفت..... )للخطبة المفروضة مع الكراهة.....(بنيتها فلو حمد لعطاسه) او تعجبا (لم ينب عنها على المذهب) وفی الشامية:(قوله بنيتها)ای نية الخطب.

ولمافی مراقی الفلاح:(ص۵۰۹)

والرابع الخطبة ولو بالفارسية من قادر على العربية

ولمافی الشامية:(۲/۱۴۷، طبع سعيد)

(تتمه)لم يتقيد الخطبة بكونهابالعربية اكتفاء بماقدمه فی باب صفة الصلاة من انها غيرشرط ولومع القدرة على العربية عنده خلافا لهما حيث شرطاها الا عندالعجزكالخلاف فی الشروع فی الصلاة.

حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بھی واضح فرمادیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں دینا سنت ہے فرض نہیں ہے اورامام صاحب کے مذہب پر مطلق ذکراللہ خواہ کسی لفظ سے ہو طویل ہو یا مختصر خطبہ کے لیے فرض ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

’’فرض صرف دو ہیں (۱) وقت جمعہ (۲) مطلق ذکراللہ خواہ کسی لفظ سے ہو پھرامام صاحب کے مذہب پر طویل ہو یا مختصراور صاحبین کے مذہب پر ذکر طویل جس کوعرفاً خطبہ کہا جاسکے شرط ہے۔ كذا فی الهدايه والفتح والبحر‘‘(جواهر الفقه: ۱/۳۵۰)

’’دوسری جگہ ارشادفرماتے ہیں‘‘ اسی کے ساتھ ایک سولہویں سنت اور ہے......کہ خطبہ صرف عربی زبان میں ہو غیرعربی میں نہ ہو(جواہرالفقہ :۱/۳۵۰)

اورعلامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اپنے رسائل میں فرماتے ہیں:

مسأله لوخطب فی الجمعة بالفارسية جاز عندابی حنيفة وروی بشرعن ابی يوسف انه اذا خطب بالفارسية وهويحسن العربية لايجزيه الاان يكون ذكرالله فی ذلک بالعربية فی حرف اواكثرمن قبل انه يجزی فی الخطبة ذكرالله ومازادفهوفضل قال الحاكم:

[illegible] المحیط البرہانی (٦) الامام العلامة [illegible]
[illegible] (۲/۲۲)

خطبہ جمعہ کے رکن اور شرائط پر پرکھا جائے تو عربی خطبوں سے پہلے پاک و ہند میں رائج اردو بیان امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک فرض خطبہ کا مکمل مصداق ہے کوئی شرط ایسی نہیں ہے جسکو یہ بیان شامل نہ ہو عرف میں اس کو بیان، وعظ، تقریر، خطاب یا خطبہ جو بھی نام دیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کسی بھی عمل کی صحت وعدم صحت کا مدار صرف ارکان اور شرائط پر ہوتا ہے۔

چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے بیان میں لکھتے ہیں: (۲/٦۵ طبع سعید)

واللازم الحکم ببطلان الاولیٰ بترک ما لیس برکن ولا شرط کما مر عن الفتح

اور مفتی اعظم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''کہ خطبہ کے لیے کچھ تو ارکان وفرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ: ۱/۳۴۹)

لہٰذا شرط کے درجہ میں یہ بیان بھی خطبہ جمعہ ہے بالفرض کوئی اسی پر اکتفاء کرے تو نماز جمعہ صحیح ہو جائے گی، اس لئے وجوب استماع اور انصات کے بابت اس کو بھی خطبہ جمعہ کا احترام حاصل ہے اور اس دوران نوافل وغیرہ پڑھنا منع ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اردو بیان کو ہم عربی خطبوں کا مکمل بدل یا وہی مقام دے رہے ہیں بلاشبہ صرف اردو بیان پر اکتفاء کرنا بدعت، اور خلاف سنت ہے جس طرح جواہر الفقہ میں مفتی اعظمؒ نے تفصیلا واضح فرمادیا ہے۔

اور فتاویٰ رحیمیہ میں حضرت سید مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے خوب وضاحت کے ساتھ کئی فتاویٰ میں فرمادیا ہے اور وارد ہونے والے شبہات کے جوابات بھی دیئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت امام اعظمؒ سے جو روایت ہے کہ وہ غیر عربی میں خطبہ جائز قرار دیتے ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر کوئی غیر عربی میں خطبہ پڑھ لے تو صحت جمعہ کیلئے جو شرط ہے وہ پوری ہوجائے گی اور نماز صحیح ہوجائے گی لیکن ترک سنت کی وجہ سے کراہت لازم آئے گی اس کا مطلب یہ سمجھنا کہ امام اعظمؒ نے غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنے کا حکم دیا ہے قطعاً غلط ہے یہ بات ذیل کی چند مثالوں سے واضح ہوجائے گی:

(۱) خطبہ طہارت میں پڑھنا سنت ہے لیکن اگر کوئی شخص بلا وضو بلکہ بلا غسل کے خطبہ پڑھے

گا تو شرط خطبہ پوری ہو جائے گی مگر خلاف سنت اور مکروہ تحریمی۔

(۲) لوگوں کی طرف رخ کر کے خطبہ پڑھنا سنت ہے، اگر کوئی شخص لوگوں کی طرف پشت کر کے خطبہ پڑھے تو شرط خطبہ پوری ہو جائے گی لیکن خلاف سنت اور مکروہ تحریمی۔

(۳) خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا سنت ہے لیکن اگر کوئی شخص بیٹھ کر خطبہ پڑھے تو خطبہ ہو جائے گا مگر خلاف سنت اور مکروہ تحریمی۔

(۴) خطبہ کم از کم مقدار تشہد پڑھا جائے اگر بہ نیت خطبہ فقط الحمد للہ کہہ کر بیٹھ گیا تب بھی امام اعظمؒ کے نزدیک خطبہ ہو جائے گا مگر خلاف سنت اور مکروہ۔

(۵) پورا لباس پہن کر نماز پڑھنا سنت ہے اگر کوئی شخص ناف سے گھٹنے تک لنگی یا ازار پہن کر نماز پڑھے تو ستر عورت کی شرط پوری ہو جائے گی نماز درست ہو جائے گی مگر خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ تحریمی" (فتاویٰ رحیمیہ: ۶/۱۴۴)

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ رسائل میں فرماتے ہیں:

ونعنک تتفطن مما ذکرنا ان الحکم فی تادیۃ اذکار الصلاۃ بالفارسیۃ کذلک فانہا وان کانت جائزۃ بہا لکنہا لاتخلو عن البدعۃ والکراھۃ لما ھنالک.

فان قلت فما معنی قولہم یجوز کذا وکذا؟

قلت نفس الجواز امر آخر والجواز بلاکراھۃ امر آخر واحدھما لایستلزم ثانیہما وھم انما یکتفون بنفس الجواز من غیر نفی الکراھۃ وھو لا یستلزم انتفاء الکراھۃ وتحقیقہ ان فی الخطبۃ جہتین الاولی کونہا شرطا لصلاۃ الجمعۃ والثانیۃ کونہا فی نفسہا عبادۃ ولکل منہما وصف علی حدۃ فمعنی قولہم یجوز الخطبۃ بالفارسیۃ انہا تکفی لتادیۃ الشرط وصحۃ صلاۃ الجمعۃ وھو لا یستلزم ان یخلو من البدعۃ والکراھۃ من حیث الجہۃ الثانیۃ وقس علیہ غیرہ وسربہ وسیرہ .(مجموعہ رسائل: ۲/۲۸۰).

**ایک ضروری وضاحت:** اردو کا یہ بیان خطبہ جمعہ کی تمام شرائط پر مشتمل ہے قصد کے علاوہ باقی تمام شرائط کا پایا جانا تو کسی پر مخفی نہیں ہے اس لیے باقی شرائط پر کلام کرنے کی ضرورت نہیں البتہ صرف اس شرط کے بارے میں بعض اہل علم وفضل کو اشکال رہا۔

چونکہ یہ ایسا شرعی مسئلہ ہے جسکا حکم واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ بے شمار نمازیوں کے عمل کا اس سے تعلق ہے فقہاء کرام کی عبارات سے بندہ کو جو سمجھ آیا ہے اگر دیگر اہل تحقیق کے

سامنے پیش نہ کروں اور خاموشی اختیار کروں تو کتمان علم سے متعلق احادیث میں وارد سخت وعیدوں سے ڈرتا ہوں، نیز ایسے موقع پر تربیت اپنے انہیں بزرگوں سے یہی حاصل ہوئی ہے کہ اپنا موقف اگر چہ اپنے اساتذہ کرام کے موقف کے خلاف ہو بشرطیکہ ناشی عن دلیل ہو ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہ احترام کے منافی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان بزرگوں کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے اور ہمیں ان کی قدر کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور ناقدری سے اپنے پناہ میں رکھے، بلاشبہ ان کی ناقدری دنیا اور آخرت کے خسران کا باعث ہے اس لئے بہت زیادہ ڈرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں باوجود یہ کہ اس وقت تک اپنے موقف کے صحیح ہونے کا مکمل یقین ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھتا ہوں کہ ممکن ہے میں نے غلط سمجھا ہو اس کے خلاف حقیقت واضح ہونے کے بعد رجوع کرنے میں تامل نہیں کروں گا۔

اردو کے اس بیان میں خطبہ کا قصد ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں عرض کرتا ہوں کہ عموما خطیب صاحب باقاعدہ مضمون کا انتخاب کرتا ہے شروع میں حمد وثناء کے بعد ایک دو آیات کی تلاوت کرتا ہے وعظ ونصیحت پر مشتمل بیان ہوتا ہے اور عملاً وارادۃً باقاعدہ دوسروں سے خطاب کرتا ہے، تو بلاشبہ یہ سب کچھ بغیر قصد وارادہ کے تو نہیں ہوتا اور یہی تمام باتیں خطبہ کے لئے مصداق ہیں عرف میں اگر چہ اس کو تقریر، بیان، وعظ یا خطاب کہا جاتا ہے اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، اس طرح تو ہر زبان میں نماز کے لئے بھی الگ نام ہیں بلکہ ہر عمل کے لئے ہر زبان میں نام مختلف ہوتے ہیں، اصل چیز تو اس عمل کا مصداق ہے اور اس اعتبار سے یہ عمل فقہی اصطلاح میں مکمل طور پر خطبہ ہی ہے اور یہ بغیر ارادہ کے نہیں ہوتا کوئی بھی عمل اس قدر اہتمام اور نظم ونسق کے ساتھ انجام دیا جائے تو بغیر قصد اور ارادہ کے تو ممکن نہیں لہٰذا نفس خطبہ کے لئے ارادہ سے تو انکار نہیں ہوسکتا۔

اس مقام پر فقہاء کرام نے جتنی مثالیں دی ہیں ان مثالوں سے بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ذکر اللہ بقصد الخطبۃ اور ذکر اللہ بغیر قصد الخطبۃ سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ چھینک آنے والے کا الحمدللہ کہنا خطاب کی غرض سے نہیں ہوتا، اسی طرح تعجباً خطیب سبحان اللہ کہدے تو یہ خطبہ نہیں کہلائے

گا، اس لئے کہ بلاشبہ یہ ذکر خطاب کی غرض سے نہیں ہے، لیکن خطیب صاحب مجمع کے سامنے مسنون کلمات کے ساتھ شروع میں عربی خطبہ پھر چند آیات اور احادیث اس کے بعد اردو میں تفصیلی خطاب کرے تو اس پورے بیان کو جو کہ خوب ذکر پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ فقہاء کرام کی بتائی ہوئی خطبہ کی ترتیب کے زیادہ موافق ہے، تعجبا سبحان اللہ کہنے کی طرح قصد خطبہ سے خالی سمجھنا تعجب کی بات ہے۔

چھینک آنے پر الحمد للہ کہنا ایک مستقل سنت ہے خطبہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ بسا اوقات تو غیر ارادی طور پر چھینک کے بعد الحمد للہ زبان پر جاری ہوتا ہے اسی طرح تعجبا سبحان اللہ بھی۔

خطیب صاحب کا یہ عمل باقاعدہ اس قصد وارادہ سے ہوتا ہے کہ یہ نماز جمعہ کی تیاری ہے اور نماز جمعہ سے پہلے لوگوں کو وعظ ونصیحت کا موزوں موقع ہے اور ذہن میں پورا مضمون مستحضر ہوتا ہے لہٰذا خطیب صاحب کا یہ ارادہ عین خطبہ کا ارادہ ہے۔

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ ایک مسئلہ کے متعلق لکھتے ہیں بطور تائید پیش خدمت ہے:

''اور یہ طریق میرا ایجاد کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس کی دلیل موجود ہے دیکھو حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص دو رکعتیں پڑھے اور ان کی صفت یہ ہو کہ ''مقبلا علیھما بقلبہ'' یعنی ان دونوں رکعتوں پر اپنے دل سے متوجہ ہو، اب دیکھ لیجئے کہ رکعتین کی کیا حقیقت ہے؟ رکعت نام ہے قیام قراءت، رکوع، سجود کا، پس حاصل ''مقبلا علیھما'' کا یہ ہوا کہ ''مقبلا علی القراۃ والرکوع والسجود'' (قراۃ، رکوع اور سجود پر متوجہ ہو) پس عبادت کے اجزاء خارجیہ اور ذکر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مامور بہ اور مطلوب ہوا اور یہی عین توجہ الی اللہ ہے'' بحوالہ البدائع: (ص ۱۷۶، جمیلی)

خلاصہ یہ ہوا کہ حقیقتِ خطبہ کا قصد ہوتا ہے اور اس سے انکار سمجھ سے دور ہے، ہاں کوئی یہ کہدے کہ نفس خطبہ کا ارادہ اگرچہ ہوتا ہے لیکن اصل عربی خطبہ کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو اتم واکمل کا ارادہ ہوتے ہوئے ناقص خطبہ کا ارادہ معتبر نہیں میں عرض کرتا ہوں کہ اتم واکمل کا ارادہ ہے اس کے ساتھ ناقص خطبہ کا ارادہ جب ہوا اور اس ارادہ پر عمل بھی مرتب ہوا اسکے باوجود غیر معتبر قرار دینا دعوی بلا دلیل ہے بالفرض کسی وجہ سے عربی خطبہ نہیں دیا تو کیا نماز جمعہ صحیح نہیں ہوگی؟

تعجب ہے اخالص اردو میں خطبہ (جس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہ ہو) شرط کے درجہ میں صحت جمعہ کے لئے کافی سمجھا جائے، لیکن عربی اردو ملا خطبہ جس کے بعد مستقل دو خطبے مسنون طریقہ سے دیئے جاتے ہیں اس کو شرط کے درجہ میں خطبہ تسلیم نہیں کرتے اور اس دوران نوافل پڑھنے کو بلا کراہت جائز قرار دیتے ہیں، آخر وہ کونسی چیز ہے کہ اردو، عربی ملا خطبہ کو خطبہ ہونے سے نکال دے؟ کیا بعد میں دو مستقل عربی کے خطبے دینے کی وجہ سے پہلے سے اس خطبہ کو خطبہ کے درجہ سے نکالنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے؟ عربی خطبے قاطع شمار ہو جاتے ہیں؟ اور ابھی عربی خطبے دئے نہیں ہیں، دینے کا ارادہ ہے تو پہلے سے فساد کا حکم متوجہ ہوا؟ اور اس عربی اردو ملے خطبہ کے دوران نوافل پڑھنے کی اجازت مل گئی؟ یا استماع کا حکم صرف عربی خطبوں کے ساتھ خاص ہے ان کے نزدیک؟ اور اردو بیان کو اگر چہ خطبہ کا مقام حاصل ہے لیکن اس دوران نوافل، تلاوت وغیرہ کی بلا کراہت اجازت ہے؟ اس لئے کہ یہ عربی کا خطبہ نہیں ہے۔

ہاں ممکن ہے کہ کوئی اس طرح شبہ کرے کہ خالص اردو میں خطبہ کو شرط کے درجہ میں خطبہ اس لئے تسلیم کرتے ہیں کہ اس صورت میں یہی اردو خطبہ، خطبہ جمعہ اور فرض خطبہ کی نیت سے ہوتا ہے اور عام رائج اردو بیان اگر چہ مصداق خطبہ قرار پاتا ہے اور قصد اور ارادہ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس موقع پر نفس خطبہ کا ارادہ ہوتا ہے، فرض خطبہ، خطبہ جمعہ کا ارادہ چونکہ عربی خطبہ میں ہوتا ہے، اس لئے رائج اردو خطبہ، خطبہ جمعہ شمار نہیں ہوتا۔

تو عرض ہے کہ اول تو یہ تسلیم نہیں کہ پہلے نفس خطبہ کا ارادہ ہوتا ہے اور خطبہ جمعہ کا ارادہ صرف عربی خطبوں کے موقع پر ہوتا ہے، اس لئے کہ اردو بیان بھی تو جمعہ کے لئے ہی ہوتا ہے اس دوران جمعہ مکمل طور پر غیر ملحوظ تو نہیں ہوتا بلکہ خطیب جانتا ہے اور سننے والا مجمع بھی کہ یہ جمعہ کے لئے تقریر، بیان یا وعظ، خطبہ ہے جو بھی نام دیں۔

ثانیاً بالفرض مان لیا کہ اردو بیان کے وقت جمعہ قطعی غیر ملحوظ ہوتا ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، الحمد للہ فقہاء کرام نے کچھ چھوڑا نہیں ہے (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) بات یہ ہے کہ خطبہ نماز جمعہ کے لئے شرط ہے اور فقہاء کرام کا معروف ضابطہ ہے کہ شرائط کا نفس وجود کافی ہوتا ہے مثلاً وضو، اور بعض شرائط کا وجود اگر نیت پر موقوف ہے تو نفس عمل کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے مثلاً تیمم

چنانچہ نفس تیمم ہی کا ارادہ کافی ہوتا ہے، مس قرآن کیلئے یا نماز فرض، نفل، جنابت، وضو وغیرہ کو ملحوظ رکھنا کوئی ضروری نہیں ہے اسی طرح خطبہ جمعہ صحت جمعہ کیلئے شرط ہے لیکن نفس خطبہ ہی کا قصد کرنا کافی ہے یعنی نفس خطبہ کے علاوہ اس قصد میں خطبہ کی فرضیت کا قصد کرنا یا اس خطبہ کا جمعہ ہی کے لئے ہونے کا قصد کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ بحر الرائق میں ہے: (۱۴۶/۲، طبع سعید)

ونقل في فتح القدير الاجماع على اشتراط نفس الخطبة.

شرح الحموی علی الاشباہ والنظائر (۶۸/۱، طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ) ملاحظہ ہو:

وجوابنا عنه بوجهين الاول :النقض وتقريره ان ماذكرتم منقوض بقوله تعالىٰ :(اذا نودي للصلوٰة من يوم الجمعة فاسعوا الىٰ ذكر الله ) وبقوله تعالى :(خذوا زينتكم عند كل مسجد) وبقوله تعالىٰ :(وثيابك فطهر ) وبقوله تعالى :(فولوا وجوهكم شطره ):اى لاجل الصلوٰة،فان السعي ووجوب اخذ الزينة:اى ستر العورة للصلوٰة،وكذا التولية الىٰ القبلة وتطهير الثوب ولم يشترط له النية في هذه المواضع ،فكذا في الوضوء.

واما ماذكرتم من المعنى:فموجود فيها فما هو جوابكم فهو جوابنا عن الوضوء، على انهم تركوا مفهوم الآية لانهم قالوا الونوى كلما يحتاج الى الطهارة غير الصلاة صحت نيته وتم وضوءه وان لم ينو الصلاة.

والثاني الحل وتحريره ان ماذكر فهو فيما اذا كان حكما غير شرط لحكم آخر اما اذا كان شرطا لحكم لاتشترط النية في هذا الشرط لان الشرط يراعى وجوده مطلقا ولا وجوده قصدا كما في قوله تعالىٰ (اذا نودي للصلوٰة ) الآية لما كان السعي شرطا لاداء الجمعة لا تشترط النية في السعي ان يكون لاجل الجمعة حتى اذا سعى لغير قصد الجمعة او لقصد حاجة او لزيارة انسان وحضر الجمعة فادى يجوز (۶۸/۱).

اور شرح الحموی علی الاشباہ والنظائر میں فرمایا: (۱۱۶/۱، طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)

وقالوا في التيمم لايجب التمييز بين الحدث والجنابة حتى لو تيمم الجنب يريد به الوضوء جاز خلافا للخصاف لكونه يقع لهما على صفة واحدة فيميز بالنية كالصلاة المفروضة وقالوا ليس بصحيح لان الحاجة اليها ليقع طهارة واذا وقع طهارة جاز ان يؤدى به ماشاء لان الشروط يراعى وجودها لاغير الاترى انه لوتيمم للعصر جاز له ان يصلي به غيره.

اور دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں: حموی (۱/۱۳۵)

واما التيمم فلا تشترط له نية الفرضية لانه من الوسائل وقدمنا ان نية رفع الحدث كافية، وعلى هذا الشروط كلها لا تشترط لها نية الفرضية لقولهم انما يراعى حصولها لاتحصيلها

وكذا العمارة لاتشترط اما نية الفرضية وان شرطناالها النية لانها لاينتال بها.

اس کے علاوہ طواف کے لئے بھی نیت شرط ہے لیکن نفس طواف کی نیت کافی ہوتی ہے یہاں تک کہ نفلی طواف کی نیت سے بھی فرض طواف ادا ہو جاتا ہے جب موقع فرض کا ہو۔

ولمافي الدر المختار:(۵۲۳/۲،طبع سعید)

ثم النية للطواف شرط فلو طاف هاربا او طالبا لم يجز لكن يكفي اصلها.قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحته(قوله لكن يكفي اصلها):اى اصل نية الطواف بلا لزوم تعيين كونه للصدر او غيره ولا تعيين وجوب او فرضية(قوله فلو طاف الخ)الحاصل كما في الفتح وغيره ان من طاف طوافا في وقته وقع عنه نواه بعينه اولا او نوى طوافا آخر.ومن فروعه لو قدم معتمر او طاف وقع عن العمرة..... ولو كان في يوم النحر وقع للزيارة او بعد ما حل النفر بعد ما طاف للزيارة فهو للصدر،وان نواه للتطوع فلا تعمل النية في التقديم والتاخير الا اذا كان الثاني اقوى كما لو ترك طواف الصدر ثم عاد باحرام عمرة فيبدأ بطواف العمرة ثم الصدر وتمامه في اللباب.

## چند شبہات اور انکے جوابات:

شبہ:(۱) خطبہ جمعہ صرف دو ہیں اس سے زیادہ نہیں ہیں جبکہ اردو بیان کو شرط کے درجہ میں خطبہ تسلیم کرنے سے خطبہ تین ہو جائینگے؟

جواب شبہ:امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مطلق ذکر اللہ فرض خطبہ کیلئے کافی ہے اگر چہ قلیل ہو اور صاحبین کے نزدیک کم سے کم تشہد کے مقدار میں خطبہ دینا ضروری ہے لیکن خطبہ بہت زیادہ طویل ہو جائے تو خلاف سنت اگر چہ ہے لیکن اس سے خطبہ کی نفی تو لازم نہیں آرہی اس کے باوجود ہے تو خطبہ رہا یہ کہ اب دو نہیں رہے بلکہ تین ہو گئے،دراصل شروع میں یہ تعداد نہیں تھی، چنانچہ صراحت ہے کہ نبی کریم ﷺ شروع میں ایک ہی خطبہ فرماتے تھے بعد میں عمر کے تقاضے سے درمیان میں تھوڑی دیر کیلئے تشریف فرماتے تھے،اب امت کے لئے اگر چہ یہ مستقل سنت ہے لیکن نفس عمل کے لئے اس کی رعایت رکھنا شرط کے درجہ میں تو نہیں ہے بالفرض عربی خطبوں کے دوران کوئی خطیب کئی بار بیٹھ جائے یا نماز وغیرہ کے ذریعہ فصل واقع کر دے تو کراہت ہوگی اور زیادہ سے زیادہ اعادہ کا حکم ہوگا لیکن خطبہ کا وہ حصہ جو فصل واقع ہونے سے پہلے کا ہے اگر چہ فصل ایسے عمل سے واقع ہو جائے جس کا نماز سے کوئی تعلق نہیں تب بھی پہلے کا حصہ خطبہ ہی تھا اس دوران نوافل پڑھنا منع تھا اس لئے کہ فساد کا حکم اگر چہ متوجہ ہوا لیکن بعد میں ہوا،جبکہ راجح

فصل کو فاسد بھی قرار نہیں دے سکتے۔

شبہ: (۲) تمام فقہاء کرام نے غیر عربی میں خطبہ کو مکروہ لکھا ہے، بدعت قرار دیا ہے تو اردو بیان کو شرط کے درجہ میں تسلیم کرنے سے خلاف شرع عمل کو مشروع کا مقام مل رہا ہے گویا بدعت کو ترویج دے رہے ہیں بلکہ یہ تو ''تشریع بمالم یاذن به الله" کے قبیل سے ہے۔

جواب شبہ: ''تشریع بمالم یاذن به الله'' یا بدعت کو ترویج دینا تب ہوتا اگر ہم نئے کسی عمل کو مشروع قرار دیتے یا کسی بدعت کا ارتکاب کرتے اور اس کو جائز بتاتے اردو بیان تو پہلے سے رائج ہے اور اہلسنت والجماعت کے جمہور علماء اسکو جائز اور بدعت حسنہ قرار دے رہے ہیں ہم تو فقہاء کرام کی عبارتوں سے تفریعاً شرط کے درجہ میں اس کا مقام ظاہر کر رہے ہیں کہ اس کو بھی شرط کے درجہ میں خطبہ کا مقام حاصل ہے لہٰذا اس دوران نوافل پڑھنا منع ہے استماع ضروری ہے۔

اس طرح تو فقہاء کرام نے ہزاروں مسائل تفریعاً بیان فرمائے ہیں بلکہ مندرجہ بالا حوالوں میں سے رسائل مولانا عبدالحی لکھنویؒ کا حوالہ ص ۳۸۰ ج ۴، اور سید مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ کے فتاویٰ رحیمیہ کا حوالہ ص ۱۴۴ ج ۶، کو دوبارہ مطالعہ فرمائیں امید ہے کہ شبہ نہیں رہیگا۔

شبہ: (۳) اردو بیان کو کوئی بھی خطبہ شمار نہیں کرتا عرف میں عربی خطبے ہی خطبے شمار ہوتے ہیں بلکہ کسی خطیب صاحب سے دوران اردو بیان دریافت کریں کہ کیا آپ خطبہ دے رہے ہیں؟ تو جواب دیں گے کہ نہیں یہ تو میں اردو بیان کر رہا ہوں خطبہ بعد میں دونگا معلوم ہوا کہ اردو بیان خطبہ کے ارادہ سے نہیں ہوتا۔

جواب شبہ: اس شبہ کا جواب تفصیلاً عرض کر دیا ہے کہ کسی بھی حکم کا مدار محض لفظی تعبیر پر نہیں ہوتا لوگ اس کو تقریر کہتے ہیں وعظ یا خطبہ اسی طرح خود خطیب صاحب بھی جو چاہے تعبیر کرے لیکن یہ پورا عمل فقہاء کرام کے بیان کردہ خطبہ کا مکمل مصداق ہے بلکہ ابوداود شریف کی حدیث سے بھی واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے اور خطیب صاحب اس مصداق کے ارادہ سے انکار نہیں کرتا اور نہ ہی کر سکتا ہے، ہر مسئلہ کو عرف پر پرکھنا غلط ہے خطبہ ان مسائل میں سے نہیں ہے جن کا عرف پر مدار ہو۔

چنانچہ علامہ کاسانیؒ نے بدائع الصنائع میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے خوب جواب دیا ہے فرماتے ہیں: (۲۶۲/۱، طبع سعید)

ولابی حنیفة رحمه الله طریقان احدهما ان الواجب هو مطلق ذکر الله لقوله فاسعوا الی ذکر الله الخ. فکان هذا اجماعا من الصحابة رضی الله عنهم علی ان الشرط هو مطلق ذکر الله تعالیٰ. ومطلق ذکر الله تعالیٰ مما ینطلق علیه اسم الخطبة لغة وان کان لاینطلق علیه عرفا وتبین بهذا ان الواجب هو الذکر لغة وعرفا وقد وجد. او ذکر هو خطبة لغة وان لم یسم خطبة فی العرف وقد اتی به وهذا لان العرف انما یعتبر فی معاملات الناس فیکون دلالة علی غرضهم واما فی امر بین العبد وبین ربه فیعتبر فیه حقیقة اللفظ لغة وقد وجد، علی ان هذا القدر من الکلام یسمی خطبة فی المتعارف الا تری الیٰ ماروی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال للذی قال من یطع الله ورسوله فقد رشد ومن عصاهما فقد غوی بئس الخطیب انت سماه خطیبا بهذا القدر من الکلام.

اسی طرح علامہ ابن الھمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: (۲/۵۷-۵۸، طبع رشیدیہ)

ولابی حنیفة رحمه الله قوله تعالیٰ (فاسعوا الی ذکر الله) والمراد به الخطبة الخ (العنایة). ولان هذا العرف انما یعتبر فی محاورات الناس بعضهم لبعض للدلالة علیٰ غرضهم فاما فی امر بین العبد وربه فیعتبر فیه حقیقة اللفظ لغة الخ (فتح القدیر).

شبہ: (۴) حضرت ابوھریرۃ اور حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ جمعہ کے روز منبر کے قریب احادیث بیان فرماتے تھے اور جب خطیب صاحب ظاہر ہوتے تو بیان ختم فرمادیتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کے علاوہ بیان ہمارے بزرگوں کا معمول رہا ہے کسی نے اس کو خطبہ کا حکم نہیں دیا۔

جواب شبہ: ایسی کوئی ایک مثال پیش فرمائیں کہ خود خطیب صاحب یا اس کے قائم مقام نے جمعہ کے روز پاک وہند میں رائج ترتیب کے مطابق یعنی زوال کے بعد جامع مسجد میں اذان اول کے بعد منبر پر وعظ فرمایا ہو اور اس کو خطبہ قرار نہ دیا ہو اور اس دوران نوافل پڑھنا یا خلاف استماع کوئی عمل ثابت ہو تو ایک بات ہے، شبہ میں ذکر کردہ حوالہ صرف وہی دے سکتا ہے جو خطبہ کی شرائط سے ناواقف ہو، امیر المومنینؓ کے ہوتے ہوئے کوئی اور خطبہ دے سکتے تھے؟ اسی روایت میں صراحت ہے کہ جب خطیب صاحب ظاہر ہوتے تو وہ اپنا درس ختم فرمادیتے تھے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خطیب تو نہیں تھے انکا یہ عمل خطبہ کے ارادہ سے نہیں تھا اور اگر خطبہ کا ارادہ فرماتے تب بھی معتبر نہیں تھا اس لئے کہ خطیب خود امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ تھے۔

شبہ: (۵) اردو میں خطبہ خلاف سنت ہے تمام نے اسکو مکروہ لکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے

کہ مکروہ تحریمی کا ارتکاب کرتے ہیں اور اسکو اچھا جانتے ہیں پھر تو اسکو سختی سے منع کرنا چاہیئے۔

جواب شبہ: بیشک صرف اردو خطبہ پر اکتفاء کرنا مکروہ تحریمی ہے کوئی بھی اسکی اجازت نہیں دیتا لیکن رائج ترتیب میں کوئی کراہت نہیں ہے اس لئے کہ بعد میں باقاعدہ عربی دو خطبے دیئے جاتے ہیں جن میں کمی کی تلافی ہو جاتی ہے اور شروع میں ناقص خطبہ (اردو بیان) ضرورت اور عوام کے فائدہ کیلئے دیا جاتا ہے کہ خطبہ کا فائدہ پوری طرح حاصل ہو، اس لئے کہ لوگ عربی خطبہ سے وعظ ونصیحت کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے اور اسکی مثال ایسی ہے مثلاً کسی نے ٹھنڈک حاصل کرنے کیلئے منہ ہاتھ، پاؤں دھو لئے اور سر پر بھی پانی ڈال دیا لیکن وضو کی سنتوں کی رعایت نہیں رکھی تو بلاشبہ ناقص وضو ہے، مکروہ ہے، لیکن نماز کیلئے شرط کے درجہ میں کافی ہے اب نماز سے پہلے اگر وہ دوبارہ تمام سنتوں کا اہتمام کرتے ہوئے وضو بنا لے تو اب کراہت بھی نہ رہی، اسکے علاوہ بے شمار نظائر ہیں:

شبہ: (٦) درمختار کی عبارت ہے: (۱/۶۶۳، طبع سعید)

في المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة أولى.

اور ہندیہ میں ہے: (۵/۳۱۹، طبع رشیدیہ)

لا بأس بالجلوس للوعظ اذا اراد به وجه الله تعالى.

دونوں حوالوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ وعظ سننا مستحب ہے واجب نہیں ہے۔

جواب شبہ: دونوں میں سے کسی ایک حوالے سے بھی قطعاً یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ وعظ کا سننا محض مستحب ہے اور مجلس وعظ میں ہوتے ہوئے اس سے اعراض جائز ہے پہلی عبارت میں استماع وعظ کو بمقابلہ تلاوت قرآن کریم کے اولیٰ بتایا ہے یعنی مسجد میں وعظ کا حلقہ ہو اور تلاوت قرآن کا بھی تو ایسی صورت میں عام لوگ چونکہ وعظ سے استفادہ زیادہ کر سکتے ہیں اس لئے وعظ کا سننا ان کیلئے زیادہ بہتر ہے بمقابلہ تلاوت کے۔ رہا اصل حکم استماع کہ واجب ہے یا مستحب؟ سو وعظ کے بارے میں اس حوالہ میں صراحت اگرچہ نہیں ہے لیکن التزاماً وجوب استماع بلاشبہ ثابت ہو رہا ہے، اس لئے کہ استماع وعظ کو بمقابلہ تلاوت کے اولیٰ بتا رہے ہیں جبکہ خود تلاوت کا استماع واجب ہے جیسا کہ اکثر فتاویٰ میں صراحت ہے کہ تلاوت قرآن کریم کا استماع واجب

ہے اور اس حکم کی رعایت رکھنا قاری اور سننے والے دونوں پر واجب ہے چنانچہ پہلے سے کوئی جہراً تلاوت کر رہا ہو تو اس مجلس میں جا کر خلاف استماع کوئی کام کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور قاری کو بھی حکم ہے کہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں تو جہراً تلاوت نہ کریں ورنہ قاری گنہگار ہوگا اور کام میں مشغول لوگ معذور شمار ہونگے۔

لمافی الهندية:(۵/۲۱۷-۲۱۸،طبع رشيديه)

ولو كان القارى واحدا فى المكتب يجب على المارين الاستماع وان كان اكثر ويقع الخلل فى الاستماع لا يجب عليهم صبى يقرأ فى البيت واهله مشغولون بالعمل يعذرون فى ترك الاستماع ان افتتحوا العمل قبل القرأة والا فلا وكذاقراءة الفقه عندقراءة القرآن مدرس يدرس فى المسجدوفيه مقرئ يقرء القرآن بحيث لوسكت عن درسه يسمع القرآن يعذرفى درسه...... يكره من الفقه وغيره يقرء القرآن لا يلزمه الاستماع قال الوبرىؒ فى المسجد عظة وقراءة القرآن فالاستماع الى العظة اولى كذا فى القنيه.

رجل يكتب الفقه ، بجنبه رجل يقرأ القرآن ولا يمكنه استماع القرآن كان الاثم على القارى ولا شئ على الكاتب وعلى هذا لو قرأ على السطح فى الليل جهرا يأثم كذا فى الغرائب.

حاصل یہ کہ تلاوت قرآن کریم کا سننا واجب ہے تو وعظ کا سننا بطریق اولیٰ واجب ہے اس لئے کہ مذکورہ حوالے میں استماع وعظ کو اولیٰ قرار دیا ہے بمقابلہ استماع تلاوت کے۔

دوسرا حوالہ: (۵/۳۱۹،طبع رشیدیہ) لا باس بالجلوس للوعظ اذا اراد به وجه الله تعالىٰ.

یعنی اللہ کی رضا مقصود ہو کوئی اور دنیاوی غرض نہ ہو تو وعظ کیلئے باقاعدہ مجلس منعقد کرنا جائز ہے اس حوالے میں صرف اتنی بات ہے اور بس، باقی مجلس وعظ میں حاضر ہو کر دوران مجلس نفل نماز پڑھنا یا کسی دوسرے عمل کے ذریعہ اعراض کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اس کا ذکر تو کچھ بھی نہیں ہے چنانچہ متصلاً فرمایا" الواعظ اذا سال الناس شيئا فى المجلس لنفسه لا يحل له ذالك لانه اكتساب الدنيا بالعلم ......الخ (ص۳۱۹، طبع رشیدیہ) اور اس کے بعد والے حوالے سے ہمارے مؤقف کی تائید واضح ہو رہی ہے چنانچہ فرمایا" رفع الصوت عند سماع القرآن والوعظ مكروه، 'تلاوت قرآن اور وعظ کے موقع پر آواز بلند کرنا مکروہ ہے (اس لئے کہ آواز بلند کرنا بھی خلاف استماع ہے) اس سے مراد اگرچہ خاص حالت یا کیفیت کی آواز ہے لیکن ہر وہ عمل جو خلاف استماع ہو تمام کا حکم بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

تعجب ہے بلکہ افسوس ہے بعض اصحاب علم پر جو کہتے ہیں'' دوران وعظ نماز پڑھنا ذکر وتلاوت کرنا جائز ہے اور بعض گول مول جملے استعمال کرتے ہیں کہ ''فی نفسہ جائز ہے'''' ہرگز مناسب نہیں'' کوئی کہتے ہیں'' ہماری دانست میں درایں باب ندارد'' صاف حکم بتانے والے بہت کم ہیں کہ منع ہے، مکروہ ہے، گناہ ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ذکر وتلاوت اور نفل پڑھنا جائز ہے تو عام باتوں میں مشغول رہنا بھی جائز ہوگا اور ایک فرد کے لئے اگر جائز ہے تو پورے مجمع کے لئے بھی جائز ہوگا عام خطیب بیان فرمارہے ہیں ان کے وعظ کے دوران پورے مجمع کے لئے اعراض جائز ہے تو امیر المؤمنین کے وعظ کے دوران بھی جائز ہوگا، اس طرح تو وعظ خصوصا جب اجتماعی صورت میں ہو اس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی، ذرا ذوق سلیم سے استفسار کریں!

وعظ درحقیقت قرآن کریم کی آیات، احادیث نبوی علیہ الصلاۃ والسلام، پھر ان کی تفاسیر اور تشریحات پر مشتمل ایک اجتماعی عمل کا نام ہے، خصوصا دو خطبوں سے پہلے کا وعظ یا خطبہ، تو خاص وقت میں خود امام وخطیب صاحب دے رہے ہیں تو اس مجلس میں حاضر ہو کر اعراض کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ اس سے صرف ایک شرعی حکم کی مخالفت نہیں بلکہ کئی واضح واضح شرعی حکموں کی خلاف ورزی لازم آرہی ہے اور مفتی صاحب باقاعدہ تحریری فتویٰ کی صورت میں ان تمام خلاف ورزیوں کی اجازت عام لوگوں کو دے رہے ہیں۔

شرح جامی یا قطبی پڑھانے والے مدرس کے سامنے شاگردوں میں سے کوئی دوران درس نوافل پڑھنا شروع کردے تو معلوم نہیں کتنے القاب سے اس کو نوازیں گے، استاذ کے علاوہ ہم درس تمام ساتھی بھی اس کو بے وقوف واحمق قرار دیں گے اس طالب العلم کا یہ عمل اگر جائز ہے تو استاذ اور ساتھیوں کا انکار'' نھی عن المعروف '' کے زمرہ میں ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی عمل کی صورت میں مجلس وعظ میں حاضر ہو کر کسی خاص عذر کے بغیر خلاف استماع کوئی کام کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ بھی قرآن کریم کے استماع سے اعراض ہے احادیث اور تفسیر سے اعراض بھی قرآن کریم کی تلاوت سے اعراض کے حکم میں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے باقاعدہ باب قائم کیا ہے: ''باب الانصات للعلماء '' صحیح البخاری:

(۲۲/۱، طبع قدیمی) اور علامہ بدر الدین عینی حنفی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری میں اسی حکم کا استنباط فرمایا ہے اور خوب واضح طور پر وجوب استماع کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ اس باب کے تحت فرماتے ہیں:

هذا باب في بيان الانصات لاجل العلماء واللام فيه للتعليل والانصات بكسر الهمزة السكوت والاستماع للحديث يقال نصت نصتا وانصت انصاتا اذاسكت واستمع للحديث.... وجه المناسبة بين البابين من حيث ان العلم انما يحفظ من العلماء ولابد فيه من الانصات لكلام العالم حتى لايشذ عنه شئ.

وفيه ايضا: بيان استنباط الاحكام. الاول قال ابن بطالؒ: فيه ان الانصات للعلماء والتوقير لهم لازم للمتعلمين قال الله تعالى لا ترفعوا اصواتكم فوق صوت النبي ..... الخ. ويجب الانصات عند قراءة حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم مثل مايجب له وكذالك يجب الانصات للعلماء لانهم الذين يحيون سنته ويقيمون بشريعته ..... الخ (عمدة القارى: ۲/۲۸۲).

اور دلیل الفالحین شرح ریاض الصالحین میں ہے: (۳/۱۴۷)

باب اصغاء الجليس لحديث جليسه الذى ليس بحرام وانصات العالم والواعظ حاضرى مجلسه.

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر یعنی مظہری میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ ہر وعظ کے دوران انصات ضروری ہے۔

"وقال عمر بن عبد العزيز الانصات لقول كل واعظ (مظهرى: ۳/۴۵۰، طبع رشيديه).

اس قدر واضح حوالے اور دلائل کے باوجود بعض حضرات دوران وعظ نوافل اور تلاوت کی بلا کراہت اجازت دیتے ہیں اور کسی واضح فقہی عبارت کے بغیر ان حوالوں سے وعظ مراد لینے سے انکار کرتے ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ کوئی ایک حوالہ تو پیش فرمائیں کہ کسی حنفی مفتی نے اس کی اجازت دی ہو۔ خصوصاً خطیب صاحب نماز جمعہ سے پہلے وقت داخل ہونے کے بعد منبر پر بیان فرمائیں اور علماء احناف حاضرین مجلس کو نوافل پڑھنے کی اجازت دیتے ہوں یہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اسکی اجازت دینے میں کئی شرعی حکموں کے خلاف کرنے کی گویا اجازت ہے۔

(۱) جمعہ سے پہلے وعظ کے دوران نوافل پڑھنے کی اجازت دینا خطبہ جمعہ کے دوران نوافل

پڑھنے کی اجازت دینے کے مترادف ہے اس لئے کہ یہ وعظ شرط کے درجہ میں خطبہ جمعہ ہے جیسا کہ دلائل سے واضح ہو گیا ہے۔

(۲)''اذا خرج الامام فلا صلاۃ ولا کلام'' حکم نبوی ﷺ کی کھلی خلاف ورزی ہے اور بعض حضرات کی تاویل: کہ مراد خطبہ کیلئے خروج ہے جبکہ یہ خروج بقصد الخطبہ نہیں ہے۔ بلاشبہ تأویل فاسد ہے امام صاحب گھر سے نکلے ہیں تو بیان، عربی خطبہ، نماز سب کچھ کا ارادہ کر کے نکلے ہیں خطبہ کے لئے نکلنا کیا دوبارہ ہوتا ہے؟

(۳) وعظ دین اسلام کا اہم ترین اجتماعی عمل ہے، مجلس میں ہوتے ہوئے دوسرے انفرادی عمل میں لگنا اس عظیم عمل کی ظاہری، صورتی مخالفت ہے جس پر قرآن کریم میں سخت وعید آئی ہے اور بیان سننے کے بجائے نوافل پڑھنے میں لگنا بلاشبہ مخالفت ہے جیسا کہ روح المعانی میں ہے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مخالفت کی وضاحت کی ہے لکھتے ہیں: (روح المعانی: ۱۸/۵۶۵)

المخالفة كما قال الراغب: ان يأخذ كل واحد طريقا غير طريق الأخر في حاله او فعله ــ
وقيل الخروج اى يخالفون معرضين اوخارجين عن امره.

(۴) جمعہ کا وعظ نماز کے متعلقات میں سے اجتماعی عمل ہے امام خطیب کی اطاعت امور مباحہ میں خصوصاً دینی اجتماعی امور میں لازم ہے، اس دوران نوافل کی اجازت دینا امام کے حکم کے خلاف کرنے کو جائز قرار دینا ہے اس لئے کہ وعظ دعوت کو متضمن ہے ہر ایک واعظ کو حاضرین کی توجہ مطلوب ہوتی ہے، اس دوران نوافل پڑھنا اجابت دعوت سے انکار کو مستلزم ہے۔

ولما في الشامية:(۲/۱۷۲ طبع سعيد)

مطلب تجب طاعة الامام فيما ليس بمعصية ـــ قال في المعراج لان طاعة الامام فيما ليس بمعصية واجبة ـــ الخ.

ولما في قوله تعالى:(سورة النور،ايت ۶۲)

﴿واذا كانوا معه على امر جامع لم يذهبوا......الخ﴾

ولما في روح المعاني:(۱۸/۵۶۱ مطبع رشيديه)

والحصر باعتبار الكمال اى انما الكاملون في الايمان الذين امنوا بالله تعالىٰ ..... كما اذا كانوا معه عليه الصلاة والسلام على امر مهم يجب اجتماعهم في شانه كالجمعة والاعياد والحروب وغيرها من الامور الداعية الى الاجتماع لغرض من الاغراض ...وعن ابن زيد ان الامر الجامع الجهاد وقال الضحاك وابن سلام: هو كل

صلاة فيها خطبة كالجمعة والعيدين والاستسقاء ولا يخفى ان الاولى العموم وان كانت الآية نازلة فى حفر الخندق ولعل ماذكر من باب التمثيل الخ

ولمافى روح المعانى:(١٨/ ٥٦٢،طبع رشيديه)

"وفى احكام القرآن" للجلال السيوطى ان فى الآية دليلا على وجوب استئذانه ﷺ قبل الانصراف عنه عليه الصلاة والسلام فى كل امر يجتمعون عليه قال الحسن غير الرسول ﷺ من الائمة مثله فى ذلك لما فيه من ادب الدين وادب النفس

ولمافى المظهرى:(٦/ ٥٧٦،طبع رشيديه)

قال اهل العلم وكذالك كل امر اجتمع عليه المسلمون مع الامام لايخالفونه ولايرجعون عنه الاباذنه.

ولمافى التحرير والتنوير للشيخ محمد طاهر بن عاشور:(١٨/ ٢٢٥)

وهو استاذان الرسول فى مفارقة مجلسه او مفارقة جمع جمع عن اذنه لامرهم كالشورى والقتال والاجتماع للوعظ ونحو ذلك.وكذافى التفسير السعدى للشيخ عبدالرحمن بن ناصر بن عبدالله رحمه الله تعالى (١/ ٥٧٦).

اس آیت کے تحت معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں:(٦/ ٤٥٤-٤٥٥)

باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی واسلامی ضرورت کیلئے جاری کیا گیا ہے اور ایسی ضرورتیں ہر زمانے میں ہوسکتی ہیں اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر امام وامیر جس کے قبضے میں زمام حکومت ہو اسکا اور اسکی ایسی مجلس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونے کا حکم دیں تو اسکی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے۔

مولانا عاشق الٰہی بلند شہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:(انوار البیان:١٢٠/٦)

فائدہ: علماء کرام نے فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر جمع ہونا لازم تھا اسی طرح جب آپ کے خلفاء اور علماء اور امراء اسلام اور دینی مدارس کے ذمہ دار اور مساجد کے متولی کسی دینی ضرورت کے لئے بلائیں تو حاضر ہو جائیں اور مجلس کے ختم تک بیٹھے رہیں اگر درمیان میں جانا ہو تو اجازت لیکر جائیں۔

مندرجہ بالا حوالوں نے صاف بتا دیا کہ علماء کرام کی اجتماعی مجالس سے بغیر اجازت کے جانا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ دینی امور سے اعراض اور مخالفت کی صورت ہے، تو اسی مجلس میں ہوتے ہوئے اعراض اور مخالفت میں گناہ اور بھی زیادہ ہوگا کہ پورا مجمع دین کی بات کی طرف متوجہ ہے اور ایک صاحب نوافل میں لگے ہوئے ہیں دوسرا کوئی موقع اس کو نہیں مل رہا اور مفتی

صاحب بھی اس کی اجازت دیتے ہیں تعجب ہے!۔

(۵) مجمع میں بعض لوگوں کو اس سے بڑی تشویش ہوتی ہے، بلکہ خود خطیب صاحب کو بھی جبکہ بعض لاپرواہ قسم کے لوگ دوسرے کو دیکھ کر وعظ کو وہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ کسی ایک کو دیکھ کر دیگر بھی نوافل میں لگ جاتے ہیں اور انفرادی عمل میں خلاف حقیقت بمقابلہ اجتماعی عمل کے زیادہ ثواب سمجھتے ہیں۔

(۶) تمام فقہاء کرام نے ایسے مواقع میں نماز پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے جہاں توجہ بھٹکنے کا اندیشہ ہو اگرچہ کسی غیر کی مشغولیت کی وجہ سے ہو، بیان اور تقریر کے دوران اسی مجلس میں ہوتے ہوئے توجہ بھٹکنا تو لازمی امر ہے اس کے باوجود بعض مفتیان کرام نوافل پڑھنے کو جائز قرار دے رہے ہیں افسوس ہے!

لما فی الشامیة:(۱/ ۶۵۲،طبع سعید)

(تتمة)بقی فی المکروهات اشیاء اخر ذکرها فی المنیة و نور الایضاح و غیرهما :منها الصلاة بحضرة ما یشغل البال ویخل بالخشوع کزینة ولهو ولعب ،ولذلک کرهت بحضرة طعام تمیل الیه نفسه وسیأتی فی کتاب الحج قبیل باب القرآن یکره للمصلی جعل نحو نعله خلفه لشغل قلبه.

خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے اردو بیان کے دوران نوافل پڑھنے کی ہرگز اجازت نہیں، بلاشبہ مکروہ تحریمی ہے سخت گناہ ہے اسکی اجازت دینا کئی واضح شرعی حکموں کے خلاف کرنے کی اجازت دینے کو متضمن ہے۔

هذا ما ظهر لی من عباراتهم فان کان صوابا فمن الله تعالی وان کان خطئا فمن قلة فهمی والشیطان الرجیم فاعوذ بالله تعالی منه وجنوده واستغفر الله ربی فانه لا حول ولا قوة الا به وهو العلیم الکریم الخبیر.

منجانب:

دارالافتاء والتحقیق جامع مسجد ابوبکر صدیق ڈیفنس فیز ۲ کراچی

بتاریخ ۱۸/۸/۱۴۳۱ھ شعبان المعظم

عبدالرحمٰن ملاخیل عفا اللہ عنہ

مذکورہ بالا تحقیق جب علماء کرام کی خدمت میں پیش کی گئی تو بعض حضرات کی طرف سے

اس پر کچھ فقہی اشکالات موصول ہوئے، ذیل میں ان اشکالات کا خلاصہ اوران کا جواب نقل کیا جاتا ہے:

## ﴿الأجوبة المزيلة للاشكالات المريبة﴾

اردو تقریر جبکہ وقتِ جمعہ میں ہوتو اس کو خطبہ جمعہ کا مقام حاصل ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ کی بابت ہماری تحریر کے جواب میں آنجناب کا تفصیلی فتوی ''نجم الفتاوی'' میں ملاحظہ ہوا، رہنمائی فرمانے پر مشکور ہیں لیکن جہاں تک ہمیں یاد ہے، ہماری شائع شدہ تحریر کے علاوہ بھی ایک مراسلہ جس میں قصد ونیت کی وضاحت تھی، خدمتِ عالی میں ارسال کیا گیا تھا، معلوم نہیں وہ شائع کرنے سے رہ گیا یا جناب کی نظر سے نہیں گذرا، یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری یاداشت غلطی کررہی ہے، بہرصورت مسئلہ کی اہمیت اور جناب کی معروفیت کے پیش نظر انتہائی اختصار کے ساتھ بنیادی نکات پر کلام کرتے ہیں اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہواور دین میں تفقہ عطاء فرمائے۔

﴿نوٹ﴾ مسئلے کا دارومدار چونکہ نیتِ خطبہ کے تحقق یا عدم تحقق پر ہے، اس لئے اس پر قدرے تفصیل سے کلام مناسب معلوم ہوتا ہے۔

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ ''صحتِ خطبہ کیلئے قصد ونیت شرط ہے''۔

﴿جواباً عرض ہے﴾ مسلم ہے لیکن اردو تقریر میں اس کا نہ ہونا تسلیم نہیں اس اختصار کی تفصیل یہ ہے کہ خطبے میں قصد ونیت کے شرط ہونے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

(۱) مطلق خطبے کا قصد ہونا...... بالفاظ دیگر نفسِ خطبے کا قصد ہونا قطع نظر اس کے کہ یہ جمعہ کیلئے ہے یا نہیں؟

(۲) خطبہ للجمعہ کا قصد ہونا...... یعنی جمعہ کیلئے دیئے جانے والے خطبے کا قصد ہونا۔

اگر آپ کی مراد اشتراط قصد سے معنی ثانی ہوتو یہ ہمیں تسلیم نہیں کیونکہ خطبہ جمعہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس نیت سے دیا جائے کہ یہ جمعہ کے لئے ہے بلکہ فقہاء کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ وقتِ جمعہ میں کوئی بھی خطبہ کسی بھی نیت سے بشرطیکہ نفس خطبہ کا قصد ہوتو جمعہ کا خطبہ ہی شمار ہوگا کیونکہ شرط کا حصول مقصود ہوتا ہے نہ کہ تحصیل، ملاحظہ فرمائیے، (حموی: ۱/ ۱۳۵)

وأما التيمم فلا تشترط له نية الفرضية، لأنه من الوسائل وقدمنا أن نية رفع الحدث كافية

وعلى هذا الشروط كلها لا تشترط لها نية الفرضية لقولهم انما يرعى حصولها لا تحصيلها،كذا الخطبة لا تشترط لها نية الفرضية وان شرطنا لها النية لأنها لا يتنفل بها.

یہ صریح حوالہ ہے جسمیں خطبہ ہی کی مثال پیش کی گئی ہے مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: (حموی:۱۱۶/ ۶۸)اور(شامیہ:۲/۵۲۳)اندیشہ طوالت سے ترک کر دیا۔

اور اگر آپ کی مراد اشتراطِ قصد سے معنی اول ہے یعنی نفس خطبہ کا قصد ہونا تو مسلم ہے لیکن اردو تقریر میں ایسے قصد کا نہ ہونا تسلیم نہیں کیونکہ قصد دل کے ارادے کا نام ہے کوئی حسی چیز تو ہے نہیں پس جب خطیب باقاعدہ مضمون سوچ کر آتا ہے اور اردو تقریر کے شروع میں حمد وصلاۃ کے بعد پوری دل جمعی اور توجہ سے اپنی بات سمجھا رہا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی لہولعب کے ارادے سے یا غیر ارادی طور پر اچانک تو ہونے سے رہا، لازماً اس کے ذہن میں ہے کہ میں تقریر کر رہا ہوں ،پس اسی استحضار کا نام قصدِ خطبہ ہے اور اردو تقریر میں اس کا انکار بداہت کا انکار ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ تو وعظ وتقریر کی نیت سے ہے خطبہ کی نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو وعظ ذکر اللہ پر مشتمل ہو وہ خطبہ سے جدا نہیں ان دونوں میں فرق کرنا محتاج دلیل ہے جو ہماری دانستن دریں باب ندارد بلکہ اس کے برعکس وعظ وخطبہ کا ایک ہونا اور ایک دوسرے پر اس کا اطلاق ہونا فقہاء کرام کی عبارات اور تعریفات خطبہ سے مترشح ہے بذل المجہود میں ہے کہ:

قرء آيت من القرآن اى فى الخطبة ويذكر الناس اى يعظهم (۱۸۵/۲،طبع شيخ)

وخطبته قصداً يقرأ آيات من القرآن اى فى الخطبة ويذكر الناس اى يعظم فيه(۵۳/۲ رشيديه).

شرح العناية:(۲۸/۲) میں ہے:هى اسم لمايخطب به.

علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

الخطبة فى الأصل كلام بين اثنين وهى بالضم فى الموعظة(ص۵۰۱،طبع قديمى).

محیط برہانی میں ہے کہ:

الخطبة فى الحقيقة وعظ وأمر بالمعروف(۴۵۹/۲،طبع ادارة القرآن)

علامہ سید شریف جرجانی کی تعریف خطبہ، وعظ کے خطبہ ہونے میں بے غبار ہے اور اردو تقریر پر مکمل صادق ہے فرماتے ہیں:

الخطبة هو قياس مركب من مقدمات مقبولة أو مظنونة من شخص معتقد فيه والغرض منها ترغيب الناس فيما ينفعهم من أمور معاشهم ومعادهم كما يفعله الخطباء والوعاظ (التعريفات للجرجاني:ص۷۲)

اردو تقریر میں سوائے قصد ونیت کے باقی تمام شرائط کے تحقق کے تو سبھی قائل ہیں جیسا کہ شائع شدہ تحریر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے امید ہے کہ مذکورہ بالا وضاحت سے قصد کے تحقق پر بھی اطمینان ہو گیا ہوگا۔

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ "عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینے سے صاحبین کے نزدیک خطبہ ادا ہی نہیں ہوتا امام صاحب اگر چہ جواز کے قائل ہیں لیکن بعض حضرات نے امام صاحب کا صاحبین کی طرف رجوع ثابت کیا ہے اگر رجوع ثابت نہ بھی ہو تب بھی عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے"۔

﴿جواباً عرض ہے﴾ مفتی بہ قول کے مطابق صحتِ خطبہ کیلئے عربی میں ہونا شرط نہیں اور اس بارے میں امام صاحب کا قول ہی مختار للفتویٰ ہے اور ان کی طرف رجوع کی نسبت صحیح نہیں، فقہاء متاخرین خصوصاً اکابر علماء دیوبند نے اس کی تصریح فرمائی ہے، اطمینان کے لیے ملاحظہ ہو: (جواہر الفقہ، فقہی مقالات لشیخ الاسلام محمد تقی عثمانی)

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ "اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو مکروہ تحریمی اور بدعت ہے جسکا ترک واجب ہے"۔

﴿جواباً عرض ہے﴾ اس پر گذارش یہ ہے کہ اس سے کسی کو مجال انکار نہیں لیکن اولاً تو اس موقع پر یہ کہنا خروج عما نحن فیہ ہے کیونکہ بحث یہ چل رہی ہے کہ اردو تقریر میں خطبہ کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ کراہت اور عدم کراہت کا سوال ہی نہیں، ثانیاً کراہت کے آجانے سے ہمارے مدعا پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اسکی وجہ سے کوئی شئی من الاصل معدوم اور منتفی نہیں ہوتی بلکہ مکروہ کہنا ہی اس کے اصل کے موجود ہونے پر دال ہے کہ خطبہ تو ہے لیکن مکروہ ہے اور یہی ہمارا مدعا ہے اور جہاں تک کراہت کی بات ہے تو وہ بعد میں عربی کے دو مستقل خطبے پڑھ دینے

سے جاتی رہی کیونکہ سنت کے مطابق اس کا اعادہ ہو گیا۔

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ ''اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کرنے کی صورت میں دو بدعتوں میں سے ایک کا ارتکاب لازم آئے گا کیونکہ اگر اردو ملے خطبہ کو اصل تسلیم کر لیا جائے تو باقی دو خطبے نفل ہونگے جبکہ جمعہ میں خطبہ نفلاً مشروع نہیں۔

لمافی الاشباہ مع الحموی:(ص۱۳۵)(و کذا الخطبة..... و ان شرطالها النیة لانہا لا یتنفل بها.

﴿جواباً عرض ہے﴾ اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کرنے سے بقیہ دو خطبہ نفل نہیں ہونگے بلکہ یہ اعادہ کہلائے گا کیونکہ وقتِ جمعہ ہی میں دوبارہ بغیر کراہت کے ادا کیے جا رہے ہیں، نیز حوالہ بالا سے جب واضح ہو گیا کہ خطبہ جمعہ میں نفلیت مشروع نہیں پھر اس کو نفل کہنا چہ معنی دارد؟ بلکہ حوالہ بالا تو واضح ہماری تائید ہے کہ شرائط خطبہ پائے جانے کے بعد وقت جمعہ میں کوئی تقریر کوئی خطاب فرض خطبہ کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ '' تین خطبوں کو ماننے کی صورت میں ایک تیسرا خلافِ سنت امر'' تطویل خطبہ'' کا ارتکاب لازم آئے گا جو کہ بنص حدیث ممنوع ہے''۔

﴿جواباً عرض ہے﴾ یہ طرزِ استدلال کچھ عجیب سا ہے کہ اگر خطبہ طویل ہو جائے تو اسکے بعض حصے کو خطبہ ہی تسلیم نہ کیا جائے اگر تطویل خطبہ سے بچنے کا یہی حل ہے کہ خطبہ کے بعض حصہ کو باوجود تمام شرائط پائے جانے کے خطبہ ہی تسلیم نہ کیا جائے تو یہ صورت دو خطبوں میں بھی آ سکتی ہے کہ جب دو خطبے زیادہ طویل ہو جائیں تو ایک کو خطبہ ہی تسلیم نہ کیا جائے۔ ماھو جوابکم فھو جوابنا۔

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ '' سوال یہ ہے کہ اردو تقریر کے بعد عربی خطبے سے قبل چار رکعت سنتیں پڑھنا جبکہ امام تشریف لا چکا ہے کیسا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ اکابرین کے عمل سے متصادم ہے اور اگر جواب اثبات میں ہے تو کس دلیل کی بنیاد پر؟ جبکہ امام منبر پر براجمان ہے۔

﴿جواباً عرض ہے﴾ اسکا جواب اثبات میں ہے ایک تو اردو خطبہ کی ضرورت پیش آنے اور رائج ہونے کی وجہ سے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ عمل چونکہ خطیب صاحب کی اجازت سے ہوتا ہے اور احادیث میں اس کی مثال موجود ہے کہ حضرت سلیک الغطفانی کو دوران خطبہ آپ علیہ السلام نے نوافل پڑھنے کی اجازت عنایت فرمائی تھی (بذل المجہود:۱۹۲۲-۱۹۱، مکتبۃ الشیخ)

﴿جناب والا نے اردو تقریر کے خطبہ نہ ہونے پر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتویٰ سے استدلال فرمایا ہے﴾ ''یہ صورت جائز ہے اور تین خطبے نہیں ہوئے بلکہ اذان ثانی کے بعد جو خطبے وہ پڑھتا ہے وہی مسنون خطبے جمعہ کے ہو جاتے ہیں اور پہلا وعظ وعظ ہی ہوگا خطبہ میں شامل نہیں ہوگا''۔

﴿جواباً عرض ہے﴾ حضرت مفتی صاحب کے مذکورہ بالا کلام سے اردو وعظ کے خطبہ ہونے کی بالکلیہ نفی نہیں ہوتی، حضرت اقدس رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اذان ثانی کے بعد جو عربی خطبے پڑھے جاتے ہیں چونکہ وہی مکمل سنت کے مطابق ادا ہوتے ہیں تو پہلے اردو خطبہ کی حیثیت (بعد عربی خطبوں کے) ناقص خطبہ یا نری وعظ کی رہ جاتی ہے، اس طرح نہ ہی خطبے تین ہوئے اور نہ ہی یہ وعظ خطبہ میں شامل رہا اور اس تاویل کی تائید حضرت کے کلام میں لفظ ''مسنون خطبے'' سے ہوتی ہے یعنی مسنون خطبے تو بعد والے ہی ہوتے ہیں اور اس سے ہم نے کب انکار کیا ہے، اسی طرح حضرت کے جملے ''پہلا وعظ وعظ ہی ہوگا خطبہ میں شامل نہیں ہوگا'' کا یہی محمل ممکن ہے کہ بعد خطبہ عربی کے پہلا اردو وعظ وعظ ہی رہ جائے گا اب خطبہ میں شامل نہیں ہوگا اور اس کے بے شمار نظائر ہیں تطویل کی وجہ سے لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

جہاں تک اردو تقریر میں انصات اور اسکے استماع کا تعلق ہے تو اس بارے میں عرض یہ ہے اگر خطبہ کی تمام شرائط وارکان ہونے کی وجہ سے تادیہ شرط جمعہ کے لئے اس تقریر کو کافی سمجھا جائے تو اس کے وجوبِ استماع اور اثناء تقریر حرمتِ صلوۃ وکلام میں کوئی شک ہی نہیں لیکن بنا بر تسلیم اگر اسکو خطبہ جمعہ نہ بھی مانا جائے تب بھی اس وعظ کا سننا حاضرین مجلس کیلئے بہرحال لازم ہے، پس یہاں تک کی تحریر اصل مدعا کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے تاہم مطلق وعظ سننے سے متعلق چند گذارشات پیش خدمت ہے:

﴿جناب والا نے تحریر فرمایا ہے﴾ ''ہمارے نزدیک ہر وعظ کا سننا واجب نہیں''

﴿جواباً عرض ہے﴾ آپ نے وعظ وقرآن کے عدمِ وجوب استماع پر جو دلائل قائم فرمائے ہیں وہ سر آنکھوں پر مگر وہ اس اردو تقریر پر وارد نہیں ہوتے کیونکہ ذکر کردہ دلائل اس صورت سے متعلق ہیں جب مسجد میں مختلف حلقے لگے ہوں تو ہر کسی پر اس حلقہ وعظ میں بیٹھ کر استماع ضروری

نہیں بلکہ کوئی نماز پڑھنا چاہے یا اپنی تلاوت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اگر کوئی نمازی بیچ حلقہ وعظ میں کھڑا ہو کر نفلیں پڑھنا شروع کردے تو کوئی بھی سلیم الطبع شخص اسکو روانہ جانے گا، پس جب امام وخطیب کے مخاطبین تمام مجلس کے حاضرین ہوں تو ان میں سے کسی کا خلافِ مقتضی وعظ کوئی عمل کرنا کراہت سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ پیش کردہ دلائل میں کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مجلس وعظ میں بیٹھ کر وعظ سے اعراض یا عدم استماع جائز ہے بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر حلقہ وعظ میں حاضر ہونا ضروری نہیں بلکہ ان دلائل میں غور کرنے سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مجلس وعظ میں بیٹھ جانے کے بعد استماع بہر حال لازم وضروری ہوگا، براہ کرم اپنے حوالوں پر دوبارہ غور فرمائیں، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا فیصلہ کن قول آپ نے خود نقل کیا ہے:

فرماتے ہیں ''یہاں مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تلاوت خارج صلوۃ اپنے ثواب یا ذکر نے کیلئے ہو کسی کو تذکیر اور تبلیغ کے لیے نہ ہو وہ آیت میں مراد نہیں'' خط کشیدہ الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آیت یا معنی آیت ''وعظ وغیرہ'' تذکیر وتبلیغ کیلئے ہو تو خارج صلوۃ بھی اس کا استماع ضروری ہے۔

اسی طرح قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ کی جو عبارت پیش کی گئی ہے اسمیں بیان کی گئی علت (اسماع مخاطبین) بھی واضح طور پر ہماری تائید کرتی ہے جو آیت یا معنی آیت اسماع مخاطبین کیلئے ہو تو اسکا سننا ضروری ہوگا ورنہ اسکا بیکار ہونا لازم آئے گا، فرماتے ہیں: (مظہری: ۳/۴۵۲، رشیدیہ)

قلت اللام فی قوله اذا قرء القرآن للعهد دون الجنس والمراد به القرآن المقرو لاستماعكم كالكلام يقرء حتى يسمع من خلفه والخطيب يقرء للمتخاطب والمقرى يقرء كل التلميذ.

اسی طرح حضرت ابن عباس کے قول "المؤمن فی سعة من الاستماع اليه الا فی صلوة مفروضة اويوم الجمعة" میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ اگر بیچ مجلس وعظ میں صلوۃ وکلام کی اجازت دی جائے تو یہ عقلاً محل تعجب ہے ہی، شرعی دلائل بھی جواز کا انکار کرتے ہیں کیونکہ جب ضروریاتِ دین کی بات ہو رہی ہو تو یہ معنیٔ قرآن ہے مجلس وعظ میں بیٹھ کر اس میں خلافِ استماع کوئی کام کرنا نہ صرف اعراض عن القرآن واستخفافِ دین ہے بلکہ واعظ اور بقیہ حاضرین کے لئے باعثِ تشویش وایذاء بھی اور اندیشہ ہے کہ دین اور اہل دین سے روکنے کا ذریعہ بن جانے کی وجہ سے کفار کے ساتھ آیتِ پاک کی

وعید میں داخل ہو جائے۔

لمالی قوله تعالی بسورة السجدة (آیت ۲۶)

قال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیه لعلکم تغلبون۔

## ﴿خلاصہ کلام﴾

(۱) اردو تقریر میں اگر قصد خطبہ للجمعہ نہ بھی ہو تب بھی نفس قصد سے تو کوئی بھی انکاری نہیں ہو سکتا اور تأدیہ شرط کے لئے نفس قصد کافی ہے۔

(۲) مفتیٰ بہ قول کے مطابق غیر عربی میں خطبہ جمعہ صحت جمعہ کے لئے کافی ہے۔

(۳) کسی عمل کے مکروہ تحریمی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ عمل بالاصل منتفی اور کالعدم ہو جائے۔

(۴) اردو تقریر کو اصل خطبہ تسلیم کرنے کی صورت میں عربی خطبے اعادہ کہلائیں گے نہ کہ نفل کیونکہ خطبہ جمعہ نفلاً مشروع نہیں۔

(۵) تطویل خطبہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ باوجود تمام شرائط کے بعض حصہ خطبہ کو تسلیم نہ کیا جائے۔

(۶) اردو تقریر کے بعد چار رکعات سنتیں پڑھنا امام کی اجازت سے ہے، اس لئے جائز ہے۔

(۷) ہر وعظ کا سننا اگرچہ لازم نہیں لیکن مجلس وعظ میں بیٹھ کر اعراض عن الاستماع ہر حال میں ناجائز ہے۔

منجانب:

دار الافتاء والتحقیق جامع مسجد ابوبکر صدیق ڈیفنس فیز 2 کراچی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ بمطابق یکم مارچ 2011

## ﴿جمعہ کے دن قبولیت دعا کی گھڑی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حدیث میں جو آتا ہے کہ جمعہ کے دن ایک ایسا وقت ہے کہ جس میں بندہ جو بھی دعا مانگے اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں

اب پوچھنا یہ ہے کہ وہ وقت متعین ہے یا نہیں اگر متعین ہے تو کونسا وقت ہے؟

**﴿جواب﴾** مسئولہ وقت کی تعیین وعدم تعیین کے بارے میں حضرات محدثین وفقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے متعدد اقوال ہیں لیکن ان تمام اقوال میں سب سے زیادہ مشہور اور اوثق بالاحادیث دو قول ہیں (۱) جب امام خطبہ کیلئے بیٹھ جائے اس وقت سے لیکر نماز کے ختم ہونے تک (۲) عصر کی نماز کے بعد سے لیکر سورج کے غروب ہونے تک، پھر ان دونوں قولوں میں بھی دوسرا قول امام ابوحنیفہؒ اور اکثر محدثین ومشائخ کے نزدیک زیادہ راجح ہے، اللہ تعالیٰ فقہائے کرام اور محدثین حضرات پر رحمتیں نازل فرمائیں کہ انہوں نے محنت کرکے اس وقت کو متعین کرنے کی کوشش فرمائی ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ اس وقت کو مبہم رکھنے کی حکمت بندے کو کثرت عبادت ودعاء پر برآنگیختہ کرنا مقصود ہے، لہٰذا اس تعیین پر بھروسہ کرکے انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ دن بھر کو عبادت ودعاء کا موقع سمجھنا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

**لمافی الصحیح لمسلم:(۱/۲۸۱،طبع قدیمی)**

عن أبی بردة بن أبی موسی الأشعری قال: قال لی عبداللہ ابن عمر اسمعت اباک یحدث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شان ساعة الجمعة قال قلت نعم سمعته یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول هی مابین أن یجلس الامام الی أن تقضی الصلوة

**ولما فی جامع الترمذی:(۱/۶۵،فاروقی کتب خانه)**

عن أبی هریرة رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم خیر یوم طلعت فیه الشمس یوم الجمعة فیه خلق آدم وفیه ساعة لایوافقها عبد مسلم یصلی فیسأل اللہ فیها شیأ الا اعطاه ایاه قال أبوهریرة فلقیت عبداللہ بن سلام فذکرت له هذا الحدیث فقال أنا أعلم بتلک الساعة، قال هی بعد العصر الی أن تغرب الشمس قلت فکیف تکون بعد العصر وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لایوافقها عبد مسلم وهو یصلی وتلک الساعة لایصلی فیها فقال عبداللہ بن سلام ألیس قد قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من جلس مجلسا ینتظر الصلوة فهو فی الصلوة قلت بلی قال فهو ذاک ــ الخ.

**ولما فیما علق علی الکوکب الدری:(۱/۱۹۲،طبع سعید)**

اختلفت مشائخ الحدیث فی هذه الساعة هل هی باقیة أو رفعت علی قولین والذین قالوا هی باقیة اختلفوا أیضا هل هی فی وقت من الیوم بعینه او غیر معینة وبلغت اقوال المحققین فی ذلک الی خمسین ذکرها أصحاب المطولات والمشهور منها احدعشر

قولا واشهر هذه الاقوال كلها قولان وهذان القولان أشهر الأقوال في ذالك قال ابن القيم أرجح هذه الأقوال قولان تضمنتهما الأحاديث الثابتة أحدهما أرجح من الاخر الأول أنها من جلوس الامام الى انقضاء الصلوة لماروى مسلم من حديث أبي موسى والقول الثاني أنها بعد العصر وهو أرجح القولين وهو قول عبدالله بن سلام انتهى والبسط في الأوجز قال في الأوجز وفي تقارير المشائخ ان الراجح عندنا الحنفية هو اخر ساعة من العصر، وعليه كان عمل والدي المرحوم نور الله مرقده فانه رضي الله عنه كان لا يخرج من المسجد بعد العصر حتى يصلي المغرب في يوم الجمعة وفي شرح الاشباه عن اليتيمة أن الدعوة المستجابة في يوم الجمعة في وقت العصر عندنا على قول علمائنا واختاره جمع من المشائخ — الخ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ واللہ اعلم بالصواب: محمد بلال شاہ وزیرستانی

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۹۹۷

## ﴿جمعہ کے دن غسل سے متعلق تفصیل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں (۱) جمعہ کے دن غسل کرنا واجب ہے یا سنت یا مستحب؟

کیونکہ احادیث اس بارے میں مختلف ہیں بعض سے اس کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور بعض سے سنیت اور بعض سے اس کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

(۲) کیا یہ غسل نماز کے لئے ہے یا جمعہ کے دن کی تعظیم کے لئے ہے، اگر کسی نے جمعرات کے دن یا جمعہ کے دن فجر سے پہلے یا فجر کے بعد یا نماز جمعہ کے بعد غسل کیا تو کیا اس سے غسل کے حکم کی تعمیل ہوگی یا نہیں؟

(۳) کیا یہ غسل تمام لوگوں پر واجب یا سنت ہے یا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن پر نماز جمعہ واجب ہے؟

﴿جواب﴾ (۱) جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے واجب نہیں ہے اور جن احادیث سے وجوب معلوم ہو رہا ہے وہاں واجب ثابت کے معنی میں ہے یا یہ کہا جائے گا کہ وجوب کا حکم پہلے تھا اب منسوخ ہو چکا ہے۔

(۲) صحیح اور مختار قول کے مطابق یہ غسل نماز کے لئے ہے جمعہ کے دن کی تعظیم کے لئے نہیں

ہے،لہذا اگر کسی نے جمعرات کے دن یا جمعے کے دن فجر سے پہلے یا فجر کے بعد نماز جمعہ کی نیت سے غسل کیا تو اس سے سنت ادا ہو جائے گی لیکن سب سے افضل طریقہ یہ ہے کہ غسل ایسے وقت میں کیا جائے جس سے نماز جمعہ ادا کیا جاسکے درمیان میں حدث لاحق نہ ہو جائے اور اگر کسی نے نماز جمعہ کے بعد غسل کیا تو بالاتفاق اس سے سنت ادا نہ ہوگی اور اس غسل کو غسل مسنون نہیں کہا جائیگا۔

(۳) یہ غسل صرف ان لوگوں کے لئے مسنون ہے جن پر نماز جمعہ واجب ہے،لہذا بچوں عورتوں مسافروں اور ان لوگوں کیلئے جو نماز جمعہ جانے سے قاصر ہیں یہ غسل مسنون نہیں ہے۔

لمافی الهدایه:(۱/۳۲،فصل فی الغسل،طبع رحمانیه)

وسن رسول الله صلى الله عليه وسلم الغسل للجمعة والعيدين وعرفة والاحرام۔۔۔۔ولنا قوله: عليه السلام من توضأيوم الجمعة فبهاونعمت ومن اغتسل فهوأفضل،وبهذا يحمل ماروا ه على الاستحباب أوعلى النسخ ثم هذاالغسل للصلوة عندابي يوسف رحمه الله تعالى وهوالصحيح لزيادة فضيلتها على الوقت واختصاص الطهارة بهاالخ.وهكذافي فيض الباري:(۲/۲۲۴،طبع رشيديه)

ولمافي المبسوط للسرخي:(۱/۸۹،طبع دارالمعرفة،بيروت)

(وليس الغسل بواجب يوم الجمعة ولكنه سنة)۔۔۔ (ولنا)حديث أبي هريرةأن النبي صلى الله عليه وسلم قال:من توضايوم الجمعة فبها ونعمت الخ.ولمادخل عثمانؓ المسجد يوم الجمعة وعمرؓ يخطب فقال أية ساعة المجئ هذه ۔۔۔ فقال:والوضوايضا وقد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأمرنا بالاغتسال في هذاليوم ثمّ لم يأمره بالانصراف فدل أنه ليس بواجب.

ولمافي التنوير مع الدروالرد:(۱/۱۶۸،طبع ایچ ایم سعید)

(وسن لصلاة جمعة و)لصلاة عيد هوالصحيح ، في الخانية لواغتسل بعدصلاة الجمعة لا يعتبر اجماعاًالخ.(قوله وسن)هومن سنن الزوائد فلا اعتاب بتركه۔۔۔۔(قوله هوالصحيح) أى كونه للصلاة هوالصحيح وهو ظاهرالرواية وهوقول أبي يوسفؒ وكذالبس اغتسل قبل الفجر وصلّى به ينال عندالثاني لاعند الحسن۔۔۔۔ حاصله أنهم صرّحوا بأن هذه الاغتسالات الأربعة للنظافة لاللطهارة ۔۔ فالأولى عندى الاجزاء وأن تخل الحدث أقول:ويؤيده طلب التبكير للصلاة ويؤيده مافي المعراج لو اغتسل يوم الخميس أوليلة الجمعةاستنّ بالسنة لحصول المقصود وهو قطع الرائحة

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد بلال شاہ وزیرستانی

۱۴صفر المظفر ۱۴۳۲ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۹۳۰

## ﴿نماز جمعہ کے لیے مسجد شرط نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک جگہ مدرسہ کے لیے وقف کی تھی وہاں پر مدرسہ قائم کیا اور اسمیں پانچ وقت کی نماز بھی شروع کر دی باہر کے لوگوں نے بھی آنا شروع کر دیا دو تین سالوں سے عید کی نماز بھی شروع کر دی اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم وہاں پر جمعہ کی نماز نہیں پڑھتے کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مدرسہ میں جمعہ کی نماز جائز نہیں، پورے علاقے میں بریلوی حضرات کی مساجد ہیں ہم سوچتے ہیں کہ اس جگہ جمعہ کی نماز شروع کر دیں کیوں کہ جمعہ والے دن نماز کے لئے بڑی پریشانی ہوتی ہے آیا اس جگہ کو مسجد بنا کر اور اطراف میں یا اوپر کی منزل میں مدرسہ قائم کر کے جمعہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ وقف کرنے والے نے یہ زمین جس مقصد کے لیے وقف کی ہے اس کے خلاف استعمال کرنا جائز نہیں ہے، مسئولہ صورت میں وقف مدرسہ کے لیے ہے تو اسکو مسجد میں تبدیل کرنا درست نہیں البتہ اسمیں نماز جمعہ وغیرہ کا اہتمام کر لیا جائے تو اسمیں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہاں عام نمازیوں کیلئے اجازت ہو اس لئے کہ نماز جمعہ کے لیے اذن عام شرط ہے، مسجد کوئی شرط نہیں ہے، اگر چہ مسجد کا مستقل اجر وثواب ہے وہ مدرسہ میں پڑھنے سے حاصل نہ ہوگا۔

لما في تنوير الابصار وشرحه: (۴/۳۴۳، طبع سعيد)

فان شرائط الواقف معتبره اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية وله ان يخص صنفا من الفقراء ولو كان الوضع في كلهم قربة.

لما في الهداية: (۱/ ۱۷۷-۱۷۸، طبع رحمانيه)

لا تصح الجمعة الا في مصر جامع او في مصلى المصر ولا تجوز في القرى لقوله عليه السلام لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحى الا في مصر جامع---- ومن شرائطها: الجماعة لان الجمعة مشتقة منها واقلهم عند ابي حنيفةؒ ثلثة سوى الامام وقالا اثنان سواه الخ.

لما في تنوير الابصار وشرحه: (۲/۱۳۷، طبع سعيد)

(ويشترط لصحتها) سبعة اشياء: قال في النهر: ولها شرائط وجوب واداء منها: ماهو في المصلي ومنها ما هو في غيره والفرق ان الاداء لا يصح بانتفاء شروطه ويصح بانتفاء شروط الوجوب ونظمها بعضهم فقال:

وحر صحيح بالبلوغ مذكر ☆ مقيم وذو عقل لشرط وجوبها

و مصر و سلطان ووقت و خطبة ؟؟ واذن كذا جمع لشرط ادائها

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرم

اا ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۸۹

## ﴿جہاں شرائط پوری نہ ہوں وہاں جمعہ پڑھنے سے ادا نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ ایک بستی میں کافی عرصہ سے جمعہ اُدا کیا جارہا ہے جبکہ وہاں کی آبادی تقریباً پانچ سو افراد پر مشتمل ہے اور دو تین دوکانیں ہیں معاشی ضروریات بھی وہاں پوری نہیں ہوتیں۔ کیا وہاں جمعہ جاری رکھا جائے یا ختم کیا جائے۔　　　مستفتی: محمد خالد صاحب ہزاروی

﴿جواب﴾ وہ چیز جس کو شریعت نے جائز نہیں کیا وہ شروع کرنے سے جائز نہیں ہوا کرتی، لہٰذا ایسی بستی جہاں پانچ سو کی آبادی ہے اور معاشی ضروریات بھی وہاں پوری نہیں ہوتیں تو اس آبادی میں جمعہ پڑھنے سے اُدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ان لوگوں کے ذمہ سے ظہر کی نماز ساقط ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ جمعہ کو ترک کریں اور ظہر کی نماز اُدا کریں اور اب تک ظہر کی نمازیں جو رہ گئی ہیں انکی قضا کریں اور توبہ استغفار بھی کریں۔

لما في الشامية: (۷/۲، طبع امدادیه)

وفيما ذكرنا اشارة الى أنه لا يجوز في صغيرة التي ليس فيها قاض ومنبر وخطيب..... ألا ترى ان في الجواهر لو صلوا في القرى لزمهم أدا الظهر.

ولما في البدائع: (۲۵۹/۱، طبع سعيد)

وكذا لا يصح اداء الجمعة الا في المصر وتوابعه فلا تجب على اهل القرى التي ليست من توابع المصر ولا يصح اداء لجمعة فيها.

ولما في الدر المختار مع رد المحتار: (۴۶/۲، طبع امدادیه)

وفي القنية: صلوة العيد في القرى تكره تحريما: أي لأنه اشتغال بما لا يصح لان المصر شرط الصحة وفي الشامية: قوله (صلوة العيد) ومثله الجمعة ..... الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۵ ظفر المظفر ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر ۸۸۰

## ﴿جمعہ کی نماز فوت ہونے کی صورت میں ظہر کی نماز انفرادی طور پر پڑھی جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند اشخاص سے جمعہ کی

نماز فوت ہوگئی تو اسی مسجد میں ظہر کی نماز باجماعت پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: محمد عباس صوابی

﴿جواب﴾ جمعہ کے دن ظہر کی نماز باجماعت پڑھنا منع ہے نہ صرف جامع مسجد میں بلکہ پوری آبادی میں مکروہ تحریمی ہے، البتہ دیہات جہاں جمعہ کی نماز فرض نہیں ہے وہ لوگ ظہر کی نماز باجماعت ادا کریں شہر میں ایسی صورت پیش آجائے تو ہر ایک ظہر کی نماز انفرادی طور پر پڑھ لے۔

لما فی ردالمحتار: (۱۵۷/۲، ایچ ایم سعید)

(وکذا اهل مصر فاتتهم الجمعة) فانهم يصلون بغيراذان ولا اقامة ولا جماعة.

ولما فی الهنديه: (۱۴۵/۱، طبع رشيديه)

وكذا اهل المصر اذا فاتتهم الجمعة يصلون فرادى ويكره لهم الجماعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۹ صفر ۱۴۳۱ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۴۴۸

## ﴿اذن عام کی وضاحت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے متعلق کہ ایک سرکاری مسجد ہے جس میں باقاعدہ امام ومؤذن کا تقرر نہیں ہوا اور اس میں پنجگانہ نماز باجماعت نہیں ہوتی، سرکاری ملازمین کے علاوہ خارج سے کسی کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں ہے تو کیا ایسی مسجد میں نماز جمعہ ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: محمد شفقت کراچی

﴿جواب﴾ کسی مسجد میں پانچوں وقت جماعت کا اہتمام، اسی طرح امام ومؤذن کی مستقل تقرری صحت جمعہ کے لیے شرط نہیں ہے البتہ ملازمین کے علاوہ عام لوگوں کو اس مسجد میں آنے سے واقعی اگر روکا جاتا ہے تو یہ اذن عام کے منافی ہے جبکہ اذن عام صحت جمعہ کے لیے شرط ہے لیکن آبادی میں اس مسجد کے علاوہ بھی نماز جمعہ کا اہتمام اگر ہو رہا ہے جہاں پر کسی کو نہیں روکا جاتا اور سرکاری مسجد میں سیکورٹی کی وجہ سے صرف اپنے ملازمین کے لیے انتظام ہے تو یہ جمعہ کے لیے اذن عام شرط کے منافی نہیں ہے، اسی طرح جیل، ائیر پورٹ، وغیرہ میں بھی عام لوگوں کو مسجد میں آنے نہیں دیتے۔ دراصل ایسی حساس جگہوں میں تخریب کاری کے اندیشہ کی وجہ سے مطلقاً عام لوگوں کو آنے جانے سے روکا جاتا ہے تو یہ جمعہ ادا کرنے سے روکنا نہ ہوا عام لوگوں کے لیے شہر میں دوسری جگہ جمعہ کا انتظام نہ ہوتا تو اس شرط کے خلاف ہوتا اور نماز جمعہ ادا نہ ہوتی۔

لما فی تنویر الابصار والدر:(۱۵۱/۲،طبع: سعید)

(و)السابع:(الاذن العام )من الامام .وهو یحصل بفتح ابواب الجامع للواردین فلا یضر غلق باب القلعة لعدو أو لعادة قدیمة لان الاذن العام مقرر لاهله وغلقه لمنع العدو لا لمصلی،نعم لو لم یغلق لکان احسن کما فی مجمع الانهار معزیا بشرح عیون المذاهب قال وهذاأولی مما فی البحر والمنح فلیحفظ.

لما فی رد المحتار:(۱۵۱/۲،۱۵۲طبع سعید)

(قوله الاذن العام )ای ان یاذن الناس اذنا عاما بان لا یمنع احدا ممن تصح منه الجمعه عن دخول الموضع الذی تصلی فیه وهذا مراد من فسر الاذن العام باشتهار،وانما کان هذا شرطا لان الله تعالی شرع النداء لصلوة الجمعة بقوله فاسعوا الی ذکر الله (قوله للواردین)ای من المکلفین بها فلا یضر منع نحو النساء لخوف الفتنه (قوله لان الاذن العام مقرر لاهله )ای لاهل القلعة لانها فی معنی الحصن والاحسن عود الضمیر الی المصر المفهوم من المقام لانه لا یکفی الاذن لاهل الحصن فقط بل الشرط الاذن للجماعات کلها.قلت :ولا یخفی بعده عن السیاق وفی الکافی التعبیر بالدار حیث قال والاذن العام هو ان تفتح ابواب القلعة ویؤذن للناس حتی لو اجتمعت جماعة فی الجامع واغلقوا الابواب وجمعوا لم یجز ،وکذا السلطان اذا اراد ان یصلی بحشمه فی داره فان فتح بابها واذن للناس اذنا عاما جازت صلوته شهدتها العامة أو لا وان لم یفتح ابواب الدار واغلق الابواب واجلس البوابین لیمنعوا عن الدخول لم تجز لان اشتراط السلطان للتحرز عن تفویتها علی الناس وذا لا یحصل الا بالاذن العام .قلت:وینبغی ان یکون محل النزاع ما اذا کانت لا تقام الا فی محل واحد أما لو تعددت فلا لانه لا یتحقق التفویت کما افاده التعلیل تأمل.

ولما فی البحر الرائق:( ۱۵۱/۲،طبع: سعید )

(قوله الاذن العام )ای شرط صحتها الاداء علی سبیل الاشتهار حتی لو ان أمیرا أغلق ابواب الحصن وصلی فیه باهله وعسکره صلوة الجمعة لا تجوز کذا فی الخلاصه وفی المحیط فان فتح باب قصره واذن للناس بالدخول جاز ویکره لانه لم یقض حق المسجد الجامع وعللوا الاول بانها من شعائر الاسلام وخصائص الدین فتجب اقامتها علی سبیل الاشتهار

ولما فی الهندیه:(۱۴۳/۱،طبع:قدیمی کتب خانه)

ومنها الاذن العام ،وهو ان تفتح ابواب الجامع فیؤذن للناس کافة حتی ان جماعة لواجتمعوا فی الجامع واغلقوا ابواب الجامع علی انفسهم وجمعوا لم یجز وکذلک السلطان اذا اراد ان یجمع بحشمه فی داره فان فتح باب الدار واذن اذنا عاما جازت صلوته شهدتها العامة أو لم یشهدوها کذا فی المحیط ،ویکره کذا فی التاتارخانیة ،وان

لم يفتح باب الدار واجلس البوابين عليها لم تجز لهم الجمعة كذا في المحيط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ　　　فتوی نمبر: ۳۲۲۸

## ﴿جمعہ کے دن اذان اول کے بعد سوائے جمعہ کی تیاری کے کوئی کام جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم فیکٹری میں کام کرتے ہیں فیکٹری کے قریب دو مسجدیں ہیں ایک میں جمعہ ایک بجے ہوتا ہے اور دوسری میں دو بجے فیکٹری بند کرنے سے بڑا نقصان ہوتا ہے تو کیا ہمارے لیے گنجائش ہے کہ آدھے ملازمین ایک بجے والی مسجد میں جمعہ اُدا کریں اور باقی بدستور فیکٹری میں کام کرتے رہیں جب وہ واپس آجائیں تو باقی ملازمین ۲ بجے والی مسجد میں جمعہ اُدا کریں؟　　　مستفتی: اقبال سلمان صاحب

﴿جواب﴾ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد نماز کیلئے نکلنا ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ اذان سے بھی پہلے جمعہ کی تیاری مکمل کر کے مسجد میں پہنچ جائیں لیکن کسی وجہ سے اذان سے پہلے تیاری نہ ہو سکے تو اذان اول کے بعد جمعہ کی تیاری کے علاوہ کسی بھی کام میں لگنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا جو ملازمین ۱ بجے والی مسجد میں جمعہ ادا کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسجد کی اذان کے ساتھ ہی فیکٹری کا کام چھوڑ کر جمعہ کی تیاری کریں اور خطبہ سے پہلے مسجد میں پہنچ جائیں، البتہ جن ملازمین کو ۲ بجے والی مسجد میں جمعہ ادا کرنا ہے ان کے لیے اس مسجد کی پہلی اذان تک کام کرنے کی گنجائش ہے، لہٰذا دو بجے والی مسجد کی پہلی اذان تک ۱ بجے والی مسجد کے ملازمین فارغ ہو کر اگر آ سکتے ہیں تو اس ترتیب سے فیکٹری کے کام کو جاری رکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

لما في الهندية: (۱/۱۴۹، طبع رشيديه)

يجب السعي وترك البيع با لاذان الاول.

ولما في الدر المختار: (۱/۲۹۹، طبع سعيد)

وان يجيب بقدمه اتفاقا في الأذان الأول يوم الجمعة لوجوب السعي بالنص.

ولما في التاتر خانية: (۱/۲۹۹-۳۰۰، طبع قديمي)

انما يجب أذان مسجده وسأل ظهير الدين عمن سمعه في آن من جهات ماذا يجيب عليه؟ قال اجابة اذان مسجده بالفعل.

ولما في الشامية: (۱/۴۰۰، طبع سعيد) قوله انما يجب اذان مسجده اى بالقدم.

ولما فی الدر المختار:(۱۰۱/۵ مطبع سعید)

(وكره)تحريماًمع الصحة(البيع عند أذان الأول) الاّاذا تبايعا يمشيان فلاباس به لتعليل النهي بالاخلال بالسعي, فاذاانتفى انتفى.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب:محمد سجاد کشمیری

۲۲صفر المظفر ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر ۱۹۲۲

## ﴿جمعہ کے دن بیع کی ممانعت میں اذان اول کا اعتبار ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن خرید و فروخت کی ممانعت قرآن کریم کی آیت "اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة الخ سے ثابت ہے، یہ ممانعت اذان اول کے بعد ہے یا اذان ثانی کے بعد؟ اگر اذان اول کے بعد ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اذان اول حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوئی جبکہ اس آیت کے نزول کے وقت صرف ایک اذان ہوا کرتی تھی، لہٰذا خرید وفروخت وغیرہ کی ممانعت میں بھی اسی اذان کا اعتبار ہونا چاہئے جو آیت کے نزول کے وقت ہوا کرتی تھی نہ کہ اس اذان کا جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوئی؟ مستفتی:نعمان ٹنڈوآلہ یار

﴿جواب﴾ جمعہ کے دن خرید وفروخت کی ممانعت میں اذان اول کا اعتبار ہے، لہٰذا اذان اول کے بعد خرید وفروخت ممنوع ہے۔

قرآن پاک کی آیت" اذا نودی للصلوة الخ مطلق ہے، آیت میں صرف اتنا ہے کہ جب اذان ہو تو خرید وفروخت ترک کردو، آیت میں اذان اول اور نہ اذان ثانی کا ذکر ہے اگر چہ نزول آیت کے وقت صرف اذان ثانی ہی تھی کیونکہ اس وقت ایک ہی اذان ہوا کرتی تھی، اسی لئے احکام جمعہ مثلاً سعی الی الجمعہ اور خرید وفروخت کی ممانعت میں اسی اذان کا اعتبار کیا جاتا تھا۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ "اذا نودی للصلوة.... الخ سے صرف یہی اذان مراد ہو، پھر جب آبادی بڑھ گئی اور لوگ دور دور پھیل گئے تو اس وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اذان اول کا حکم دیا اور یہ حکم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں دیا جس وقت بہت سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرات تابعین رحمہم اللہ موجود تھے کسی نے بھی نکیر

نہیں فرمائی، لہٰذا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر اجماع سکوتی ہو گیا، مزید یہ کہ اگر اذان ثانی کا اعتبار کیا جائے تو بہت سے لوگ جمعہ سے پہلے والی سنتوں اور خطبہ ونماز سے بھی رہ جائیں گے اس لیے اذان ثانی کے بجائے اذان اول کو احکام جمعہ میں معتبر مانا گیا ہے۔

لمافی روح المعانی:(جزء۲۸/۲۰۷ رشیدیہ)

وقال مفتی الحنفیة فی دار السلطنة السنیة الفاضل سعدالله جلبی المعتبر فی تعلق الامر یعنی قوله تعالی (فاسعوا) هوالاذان الاول فی الاصح عندنا لان حصول الاعلام به، لاالاذان بین یدی المنبر.... وقیل العبرة للاذان الثانی الذی یکون بین یدی المنبر لانه لم یکن فی زمنه الاهو، وهو ضعیف. لانه لو اعتبر فی وجوب السعی لم یتمکن من السنة القبلیة ومن الاستماع بل ربما یخشی علیه فوات الجمعة.

ولمافی مرقاۃ المفاتیح:(۲/۲۲۹، طبع رشیدیہ)

(اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر الله وذروا البیع) قال الطحاوی انما یجب السعی، وترک البیع اذا اذن الاذان والامام علی المنبر لانه الذی کان علی عهده علیه الصلاة والسلام وزمن الشیخین وهو الاظهر لکن قال غیره: هو الاذان علی المنارة الآن الذی احدث فی زمان عثمان قال الشمنی: وهو الاصح واختاره شمس الائمة ولعلهم اخذوا العموم لفظ الآیة مع قطع النظر عن کونه بین یدیه صلی الله علیه وسلم اونظر الی ان الواجب علیهم السعی وترک الشغل المانع قبل اذان الخطبة لئلا یفوتهم شئ فتدروا الاذان الاول الذی یقع اول الوقت ویؤیده الاجماع السکوتی.

ولمافی التنویر وشرحه:(۲/۱۶۱، طبع سعید

(ووجب سعی الیها وترک البیع)......(بالاذان الاول) فی الاصح وان لم یکن فی زمن الرسول بل فی زمن عثمان.

ولمافی الشامی:(۲/۱۶۱ ایچ ایم سعید)

واختلفوا فی المراد بالاذان الاول فقیل الاول باعتبار المشروعیة وهو الذی بین یدی المنبر لانه الذی کان اولاً فی زمنه علیه السلام وزمن ابی بکر وعمر حتی احدث عثمان الاذان الثانی علی زوراء حین کثر الناس والاصح انه الاول باعتبار الوقت وهو الذی یکون علی المنارة بعد الزوال.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۲۶

## ﴿جمعہ کی اذان اول کے بعد تاخیر اور خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں مارکیٹ

کی مختلف مساجد میں جمعہ کی نماز کے اوقات مختلف ہیں کسی جگہ سوا ایک (1:15) بجے اور کسی جگہ ڈھائی بجے (2:30) جماعت ہوتی ہے اور جمعہ کی نماز کیلئے دکان کو بند کرنا کافی مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ باہر لگے ہوئے سامان کو اتارنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے چنانچہ ایک بندہ (1:15) سوا ایک والی جماعت میں شامل ہوتا ہے اور اس بندہ کے آنے تک دوسرا بندہ دکان میں بیٹھا رہتا ہے ساتھی کے آنے کے بعد وہ ڈھائی بجے (2:30) والی جماعت میں شامل ہوتا ہے کیا اس طرح کرنا صحیح ہے اور اس دوران میں جو کچھ بیچے اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد نماز کیلئے نکلنا ضروری ہے بہتر تو یہ ہے کہ اذان سے پہلے جمعہ کی تیاری مکمل کر کے مسجد میں پہنچ جائیں لیکن کسی وجہ سے اذان سے پہلے تیاری نہ ہو سکے تو اذان کے بعد جمعہ کی تیاری کے علاوہ کسی بھی کام میں لگنا جائز نہیں ہے لہٰذا جو بندہ سوا ایک (1:15) بجے والی مسجد میں جمعہ ادا کرنا چاہتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس مسجد کی پہلی اذان کے ساتھ ہی دکان چھوڑ کر جمعہ کی تیاری کرلے اور خطبہ سے پہلے مسجد پہنچ جائے، البتہ جس بندہ کو ڈھائی بجے (2:30) والی مسجد میں جمعہ ادا کرنا ہے اس کیلئے اس مسجد کی پہلی اذن تک کام کرنے کی گنجائش ہے لہٰذا اس مسجد کی پہلی اذان تک سوا ایک (1:15) بجے والی مسجد کا بندہ فارغ ہو کر اگر آسکتا ہے تو اس ترتیب سے دکان کا کام جاری رکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر اس مسجد کی پہلی اذان تک سوا ایک (1:15) بجے والی مسجد کا بندہ فارغ ہو کر نہیں آسکتا تو اس صورت میں دوسرا بندہ ڈھائی بجے (2:30) والی مسجد کی پہلی اذان کے بعد سعی کی تاخیر کی وجہ سے گناہ گار ہوگا، اسی طرح پہلی اذان کے بعد خرید وفروخت مکروہ تحریمی ہے لہٰذا اس دوران جو کچھ بھی بیچے اسکا فسخ دیانۃ واجب ہے قضاءً نہیں اور توبہ واستغفار کرنا لازم ہے اگر چہ دکاندار روپوں کا مالک اور گاہک چیز کا مالک بن جائے گا۔

لمافی قوله تعالیٰ:(آیة :۹ سورة الجمعة)

یاایها الذین اٰمنوا اذانودی للصلوٰة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر الله و ذروا البیع.

ولما فی الهندیة:(۱/۱۴۹،طبع رشیدیه)

ویجب السعی وترک البیع بالاذان الاول.

ولمافی الهدایة:(۲/۷۰،طبع رحمانیه)

قال والبیع عند اذان الجمعة قال الله تعالی وذروا البیع ... قال وکل ذلک یکره لما ذکرنا.

ولمافی رد المحتار:(۵/ ۴۹،طبع سعید)

واما المکروہ فهو لغة ضد المحبوب واصطلاحا ما نهی عنه لمجاور کالبیع عند اذان الجمعة.

ولمافی التنویر وشرحه:(۵/ ۱۰۱،طبع سعید)

(وکره)تحریما مع الصحة(البیع عند الاذان الاول) وقال الشامیؒ تحته أشار الی وجه تاخیر المکروہ عن الفاسد مع اشتراکهما فی حکم المنع الشرعی والاثم.... وفیها أیضا أنه لایجب فسخه ویملک المبیع قبل القبض ویجب الثمن لا القیمة ،لکن فی النهرعن النهایة أنه فسخه واجب علی کل منهما أیضاصونالهماعن المحظور.

ولمافی الشامی:(۵/ ۱۰۵،طبع سعید)

قلت:ویمکن التوفیق بوجوبه علیهمادیانة بخلاف البیع الفاسد.

ولمافی الدر المختار:(۱/ ۳۹۹-۴۰۰،طبع سعید)

وأن یجیب بقدمه اتفاقافی الاذان الاول یوم الجمعة لوجوب السعی بالنص،وفی التاتر خانیة انمایجیب اذان مسجده،وسأل ظهیرالدین عمن سمعه فی آن من جهات ماذا یجب علیه؟قال اجابة اذان مسجده بالفعل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ  واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم:علی خان

۱۹صفرالخیر۱۴۳۱ھ  فتویٰ نمبر:۴۶۲

## ﴿جمعہ کی سنتوں کی مقدار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے بعد کتنی سنتیں ہیں بعض چار بتاتے ہیں اور بعض چھ مفتی بہ قول کونسا ہے؟ نیز جمعہ سے پہلے اور بعد کی سنتوں میں نیت کرتے وقت ''وقت جمعہ کا نام لیا جائے گا'' یا وقت ظہر کا؟ نیت کا صحیح طریقہ بتادیں۔

﴿جواب﴾ جمعہ کے بعد کی سنتوں میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے،فتویٰ اس پر ہے کہ جمعہ کے بعد چھ سنتیں ہیں،پہلے چار سنت مؤکدہ اور پھر دو مؤکدہ۔

جمعہ سے پہلے اور بعد کی سنتیں سنت جمعہ کہلاتی ہیں نہ کہ سنت ظہر،ویسے سنت مطلق نماز کی نیت سے بھی ادا ہو جاتی ہے تعین نیت اس کے لئے شرط نہیں اور نہ اس میں وقت کا نام لینا کوئی ضروری ہے،لیکن اگر کوئی نیت کرنا چاہے تو پہلی سنتوں میں ''سنت قبل از جمعہ'' کی اور بعد والی سنتوں میں ''بعد از جمعہ'' کی نیت کر لی جائے تو بہتر ہے۔

لما فی تنویر الابصار مع الدر المختار:(۴۱۷/۱ طبع سعید)

(وکفی مطلق نیة الصلاة) وان لم یقل لله(لنفل وسنة) راتبة(وتراویح علی المعتمد،اذ تعیینها بوقوعها وقت الشروع،والتعیین احوط. وقال العلامة ابن عابدینؒ: قوله:(وکفی الخ)أی بان یقصد الصلاة بلا قید نفل اوسنة اوعدد...... قوله:(وسنة)..... وکذا الاربع المنوی بها آخر ظهر ادرکه عند الشک فی صحة الجمعة،فاذا تبین صحتها ولاظهر علیه نابت عن سنة الجمعة علی قول الجمهور لأنه یلغو الوصف ویبقی الاصل،وبه تتأدی السنة کما بسطه فی الفتح،وأقره فی البحر والنهر...... قوله(علی المعتمد)ای من قولین مصححین،وانما اعتمد هذا لمافی البحر من انه ظاهر الرواية وجعله فی المحیط قول عامة المشایخ،ورجحه فی الفتح ونسبه الیٰ المحققین.قوله:اذ(تعیینها الخ) لان السنة ماواظب علیها النبی صلی الله علیه وسلم فی محل مخصوص،فاذا أوقعها المصلی فیه فقد فعل الفعل المسمی سنة،والنبی صلی الله علیه وسلم لم یکن ینوی السنة بل الصلاة لله تعالیٰ،وتمام تحقیقه فی الفتح.

ولمافی غنیة المستملی:(ص ۲۱۲ الشرط السادس النية،طبع نعمانیه)

المصلی اذا کان متنفلا سواء کان ذلک النفل سنة مرکدة اوغیرها یکفیه مطلق نیة الصلاة ولا یشترط تعیین ذلک النفل بانه سنة الفجر مثلا أوتراویح أو غیر ذلک ثم قال بعد اسطر وذکر المتأخرون ان التراویح وسائر السنن تتأدی بمطلق النیة وهو اختیار صاحب الهداية ومن تابعه الخ.

ولما فیه ایضا:(ص ۳۲۷،طبع نعمانیه)

وعند ابی یوسف السنة بعد الجمعة ست رکعات وهو مروی عن علی رضی الله عنه والافضل ان یصلی اربعا ثم رکعتین للخروج عن الخلاف.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۲۵/۵/۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۳۳۱

## ﴿جمعہ کے دوخطبوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار وحکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعۃ المبارک کے دو خطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے یا واجب؟ اور کتنی مقدار بیٹھنا چاہیے؟

﴿جواب﴾ جمعۃ المبارک کے دوخطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے اور اس کی مقدار یہ ہے کہ اتنی دیر تک بیٹھا رہے کہ جسم کے تمام اعضاء اپنی جگہ پر قرار پائیں جو تقریباً تین آیات پڑھنے کے برابر ہوتا ہے۔

لما فی الهندیة:(۱/۱۴۶-۱۴۷،طبع رشیدیه)

(وأما سننها فخمسة عشر الیٰ أن قال(والخامس عشر)الجلوس بین الخطبتین فی بحر الرائق ومقدار الجلوس بینهما مقدار ثلاث آیات فی ظاهر الروایة هکذا فی السراج الوهاج ناقلا عن الفتاویٰ قال شمس الائمة السرخسی فی تقدیر الجلسة بین الخطبتین انه اذا تمکن فی موضع جلوسه واستقر کل عضو منه فی موضعه قام من غیر مکث ولبث کذا فی التاتار خانیة. والمختار ماقاله شمس الائمة السرخسی.

ولما فی الدر المختار:(۳/۲۰،طبع امدادیه)

(ویسن خطبتان)خفیفتان وتکره زیادتهما علی قدر سورة من طوال المفصل(بجلسة بینهما) بقدر ثلاث آیات علی المذهب.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم :صلاح الدین چترالی

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۱۱۵

﴿تیز بارش کے بعد جمعہ کے لئے مسجد جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جمعہ کی اذان کے بعد تیز بارش ہو تو پھر بھی جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں جانا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ اگر بارش اتنی تیز ہو کہ اس میں جمعہ کے لئے مسجد میں جانا مشکل ہو جائے تو اس مجبوری کی وجہ سے جمعہ کو چھوڑنے کی رخصت ہے لیکن پھر بھی مسجد میں جانے کے لئے کوشش کرنا بہتر ہے۔

لما فی الهدایة:(۱/۲۱۱،طبع رحمانیه)

اذا اصاب الناس مطر شدید یوم الجمعة فهم فی سعة من التخلف.(خلاصة الفتاویٰ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد آصف

۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۲۳

﴿خطیب صاحب کا دوران خطبہ لاٹھی لینا امر مستحب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ دوران خطبہ خطیب صاحب کا لاٹھی ہاتھ میں لینا کیسا ہے؟ یہ واجب ہے یا سنت اور سنت بھی کونسی بعض خطیب تو اس کا بہت التزام کرتے ہیں جبکہ بعض اس کو کوئی ضروری نہیں سمجھتے ہیں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

﴿جواب﴾ یہ ایک امر استحبابی ہے اس کو سنت مؤکدہ نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اس بارے میں

احادیث مختلف آئی ہیں ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ میں عصا لے کر خطبہ دینا ثابت ہے ابوداؤد شریف کی روایت ہے جس میں "وهو يتوكا على يد بلال" کے الفاظ آئے ہیں اور ابو داؤد کی دوسری روایت میں "فقام متوكنا على عصا" اور قوس کے الفاظ آئے ہیں، غرض احادیث مختلف وارد ہوئی ہیں ان میں تطبیق کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ اس کو سنت مؤکدہ نہ سمجھا جائے بلکہ "استحباب" کی حد تک رکھنا چاہیئے۔

لمافی ردالمحتار:(۲/۲۱،طبع امدادیه)ويكره ان يتكئ على قوس أو عصا.

ولمافی الشامية:(۲/۲۱،طبع امداديه)

استشكله في الحلية بأنه في رواية أبي داؤد أنه صلى الله عليه وسلم قام أي في الخطبة متوكنا على عصا أو قوس اه ونقل القهستاني عن عبد المحيط أن أخذ العصا سنة كالقيام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد عزیز فیض آبادی

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۲۱۹

## ﴿نماز جمعہ کے بعد سنت ادا کرنے کی ترتیب﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی پہلی چار رکعت سنت مجھ سے کبھی رہ جاتی ہیں جو کہ نماز جمعہ کے بعد پڑھ لیتا ہوں لیکن مجھے اس میں خلجان رہتا ہے کہ دو رکعتیں پہلے پڑھوں یا چار چار رکعتیں پڑھ کر بعد میں دو رکعت پڑھوں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ جمعہ کے دن جماعت کے بعد کی رکعتوں میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے بعض چار رکعت کے سنت مؤکدہ کے قائل ہیں اور بعض چھ رکعت کے۔ لیکن مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ جمعہ کے بعد پوری چھ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں لہٰذا اگر کبھی جماعت سے پہلے کی چار رکعت رہ جائیں تو نماز کے بعد پہلے چار رکعت پڑھے پھر دو رکعت اور آخر میں جماعت سے پہلے کی رہی ہوئی چار رکعت پڑھے تاکہ بعد والی سنتیں اپنے مقام پر ہوں پہلے کی سنت تو ویسے بھی اپنے اصل موقع سے ہٹ گئی ہیں۔

لما فی الدرالمختار:(۲/۱۲،طبع سعید)

(وسنن)مؤكدة(اربع قبل الظهر و)اربع قبل (الجمعة) واربع(بعدها بتسليمة)فلو

بتسليمتين لم تنب عن السنة.

ولما في ردالمحتار:(۲/۱۳،طبع سعيد)

وروى ابن ماجه باسناده عن ابن عباسؓ كان النبي صلى الله عليه وسلم يركع قبل الجمعة اربعاً لا يفصل في شيء منهن وعن ابي هريرة انه صلى الله عليه وسلم قال من كان منكم مصلياً بعدالجمعة فليصل اربعاً.

ولما في حلبي كبير:(ص۳۳۷،طبع نعمانيه)

وعندابي يوسف رحمه الله السنة بعدالجمعة ست ركعات وهومروى عن علي رضي الله عنه والافضل ان يصلي اربعاثم ركعتين للخروج عن الخلاف.

ولما في الدرالمختار:(۲/۱۹،طبع سعيد)

(ولوتكلم بين السنة والفرض لايسقطهاولكن ينقص ثوابها) وتحته قال الشامي وكذا لوفصل بقراءة الاورادلان السنة الفصل بقدراللهم انت السلام الخ حتى لوزادتقع سنة لافي محلهاالمسنون كمامرقبيل فصل الجهر بالقرائة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۵رجب المرجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۶۶

## ﴿خطیب صاحب کا خطبہ کے دوران چہرے کو گھمانا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ بعض خطباء حضرات دوسرے خطبے کے اندر چہرے کو دائیں بائیں پھیرتے ہیں اسکی کیا حقیقت ہے؟ کیا یہ سنت ہے؟

﴿جواب﴾ جمعہ کے خطبے کے دوران درود شریف پڑھتے وقت چہرہ کو دائیں بائیں پھیرنا درست نہیں ہے فقہاء کرام نے اسکو بدعت تک لکھا ہے اسکا ترک لازم ہے تاکہ کسی کو سنت کا شبہ نہ ہو۔

لمافي الشامية:(۲/۱۲۹،طبع سعيد)

تنبيه ما يفعله بعض الخطباء من تحويل الوجه جهة اليمين وجهة اليسار عند الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم في الخطبة الثانية لم ار من ذكره ، والظاهر انه بدعة ينبغي تركه لئلا يتوهم انه سنة . ثم رايت في منهاج النووي قال: ولا يلتفت يميناً وشمالاً في شئي منها قال ابن حجر في شرحه : لان ذالك بدعة، ويوخذذالك عندنا من قول البدائع : ومن السنة ان يستقبل الناس بوجهه ويستدبر القبلة ، لان النبي صلى الله عليه وسلم كان يخطب هكذا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۰جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۸۹

## ﴿دوران خطبہ چندہ کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مسجدوں میں جمعہ کے خطبہ کے وقت جب امام صاحب خطبہ پڑھ رہے ہوتے ہیں چند آدمی چادر لے کر مسجد کے لئے چندہ کرنے میں مصروف ہوتے ہیں کیا دوران خطبہ مسجد کے لئے چندہ کرنا جائز ہے؟ جبکہ مسجد کے لئے چندہ کرنا بھی ایک نیک کام ہے اور مسجد کی خدمت ہے؟

﴿جواب﴾ جمعۃ المبارک کا خطبہ توجہ اور خاموشی سے سننا ضروری ہے۔ جب جمعہ کا خطبہ شروع ہو جائے تو دوسرے کاموں کو چھوڑ کر خطبہ سننا واجب ہے، لہٰذا دوران خطبہ مسجد کے لئے چندہ کرنا ہرگز جائز نہیں، اس سے بچنا لازم ہے مسجد کے چندہ کے لئے دوسرا کوئی وقت مقرر کرنا چاہیے۔

لما فی البحر الرائق:(۱۴۸/۲، طبع سعید)

واما المستمع فيستقبل الامام اذا بدأ بالخطبة وينصت ولا يتكلم ولا يرد السلام ولا يشمت ولا يصلى على النبى صلى الله عليه وسلم وقالا يصلى السامع فى نفسه. وفى الهندية واذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام وقالا لاباس اذا خرج الامام قبل أن يخطب واذا فرغ قبل أن يشتغل بالصلاة كذا فى الكافى. سواء كان كلام الناس أو التسبيح أو تشميت العاطس أو رد السلام كذا فى السراج الوهاج الىٰ أن قال: ويحرم فى الخطبة ما يحرم فى الصلاة حتى لا ينبغى أن يأكل أو يشرب والامام فى الخطبة

ولما فى حلبى كبير:(ص ۴۸۲، طبع نعمانيه)

ثم ان الاستماع والانصات واجب عندنا وعند الجمهور حتى انه يكره قرأة القرآن و نحوها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۴

## ﴿خطیب کیلئے خطبے کے درمیان امر بالمعروف کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقے میں ایک خطیب صاحب ہیں، دوران خطبہ جب کسی کو چلتے پھرتے یا باتیں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ڈانٹتے ہیں اور سخت سست کہتے ہیں۔ خطبے کے دوران ان کا یہ عمل درست ہے؟ مستفتی: محمد بابر

﴿جواب﴾ دوران خطبہ خطیب کے لئے امر بالمعروف کی گنجائش ہے اس کے علاوہ دوسری باتیں مکروہ ہیں اور امر بالمعروف مناسب اور شائستہ طریقے سے ہو تو بہتر ہے۔

لمافی الدر المختار:(۱۴۹/۲) ویکرہ تکلمہ فیہا الا الأمر بمعروف لأنہ منہا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۰۶

## ﴿خطبہ کے دوران نبی کریم ﷺ پر دل ہی دل میں درود پڑھنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب امام صاحب جمعہ کے خطبہ میں آیت کریمہ "ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی الخ" پڑھتے ہیں تو اکثر لوگ بلند آواز کیساتھ درود پاک پڑھنے لگتے ہیں کیا خطبہ کے دوران بلند آواز کیساتھ درود پاک پڑھنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ خطبہ نماز کی طرح ہوتا ہے، جو چیزیں نماز میں حرام ہیں وہ خطبہ کے دوران بھی حرام ہیں جیسے کھانا، پینا، کلام کرنا اگر چہ تسبیح ہی کیوں نہ ہو، سلام کا جواب دینا اور امر بالمعروف کرنا وغیرہ، لہٰذا جب امام آیت مذکورہ "ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی الخ" پڑھے یا درود پاک پڑھے یا آپ ﷺ کا نام مبارک لے تو سن کر بلند آواز کیساتھ درود شریف پڑھنا درست نہیں بلکہ دل ہی دل میں پڑھ لے زبان سے نہ پڑھے۔

لمافی شرح التنویر وشرحہ:(۱۵۹/۲، طبع سعید)

(وکل ماحرم فی الصلاۃ حرم فیہا) أی فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرہا، فیحرم أکل وشرب وکلام ولو تسبیحا، أو رد سلام أو أمر بمعروف بل یجب علیہ أن یستمع ویسکت ...... والصواب أنہ یصلی علی النبی ﷺ عند سماع اسمہ فی نفسہ وفی الشامیۃ: (فی نفسہ) أی بأن یسمع نفسہ أو یصحح الحروف فانہم فسروہ بہ، وعن أبی یوسف: قلبا اختیارا لأمری الانصات والصلاۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلم کمافی الکرمانی، قہستانی، قبیل باب الامامۃ واقتصر فی الجوہرۃ علی الاخیر حیث قال: ولم ینطق بہ لأنہا تدرک فی غیر ہذا الحال والسماع یفوت.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۶۸

## ﴿نماز جمعہ سے متعلق کچھ مسائل﴾

محترم جناب بزرگوار مولانا صاحب حفظہ اللہ

آپ کا فتویٰ پڑھا (الحمد للہ) خط ھذا کے ساتھ منسلک ہے، لیکن آپ نے حوالہ نماز جمعہ کا

دیا جو کہ بالکل ٹھیک ہے نیز اگر کوئی شخص جمعہ کے دن یا دوسرے دن وعظ کے درمیان ذکرواذکار بھی کر رہا ہو اور وعظ بھی سن رہا ہو تو کیا یہ بھی مذموم ہے؟ یعنی کہیں توجہ بھی نہیں ہٹانے کی کوشش کرتا مگر انسان ہے اگر ہو سکے تو وضاحت فرما کر معاف بھی فرمادیں، مہربانی ہوگی۔

## ﴿اذان جمعہ اور خطبہ جمعہ سے متعلق کچھ مسائل﴾

آجکل مولانا صاحب تقریباً ایک بجے وعظ فرماتے ہیں اور تقریباً ۱:۳۰ بجے پہلی اذان ہوتی ہے اور سنت پڑھنے کا وقت دیا جاتا ہے، تقریباً ۱:۴۰ ایک بجکر چالیس منٹ پر پھر دوسری اذان ہوتی ہے شاید خطبہ کی اذان ہے اسکے بعد خطبہ عربی میں ہوتا ہے پھر تکبیر کے بعد جمعہ پڑھایا جاتا ہے، عرض درج ذیل ہے:

(۱) پہلی اذان میں کیا ہم اذان کے الفاظ دہرا سکتے ہیں یا نہیں؟ (۲) دوسری اذان میں کیا ہم اذان کے الفاظ دہرا سکتے ہیں یا نہیں؟ (۳) خطبہ کے دوران خاموش بیٹھنا ہے یا ذکر کر سکتے ہیں؟ (۴) خطبہ کے درمیان وقفہ میں دعا آہستہ کر سکتے ہیں؟ (۵) تکبیر کے الفاظ دوہرا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) دوران وعظ اگر توجہ واعظ کی طرف رہے تو دل دل میں ذکر کرنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے (۲) جمعہ کی پہلی اذان کے الفاظ دہرانا سنت ہے۔

لما فی الترمذی وحاشیتہ:(۱/۹۲)

عن ابی سعیدقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذاسمعتم النداء فقولوامثل مایقول المؤذن لقولہ( مثل ما یقول المؤذن )الا فی الحیعلتین فانہ یقول لا حول ولا قوۃ الا باللہ.

(۳) جمعہ کی دوسری اذان کے الفاظ زبان سے دہرانا مکروہ ہے، البتہ دل میں دہرانے کی گنجائش ہے۔

لما فی الدرالمختار:(۱/۲۹۹،طبع سعید)

وینبغی ان لا یجیب بلسانہ اتفاقا فی الاذان بین یدی الخطیب.

(۴) خطبہ کے دوران خاموشی کے ساتھ خطبہ سننا ضروری اور واجب ہے، اس دوران نماز، تلاوت اور ذکر سب منع ہیں۔

لما فی الدر المختار:(۱۵۹/۲،طبع سعید)

وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیہا ای فی الخطبۃ خلاصۃ وغیرہا فیحرم اکل وشرب وکلام ولو تسبیحاً او رد سلام او امر بمعروف بل یجب علیہ ان یستمع ویسکت.

(۵) دوخطبوں کے درمیان وقفہ کے وقت بھی زبان سے دعامانگنامنع ہے،البتہ دل میں مانگنے کی گنجائش ہے۔

لما فی الدر مع الرد:(۱۵۸/۲،طبع سعید)

(واذاخرج الامام فلا صلاۃ ولا کلام الیٰ تمامہا)وفی الرد:شمل السنۃ وتحیۃ المسجد.

(۶) تکبیر کے الفاظ دہرانا مستحب ہے۔

لما فی الدر المختار:(۷۱/۲،طبع سعید)

(ویجیب الاقامۃ)ندباً اجماعاً(کالاذان)ویقول عند قد قامت الصلوٰۃ:اقامہا اللہ وادامہا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ چارسدوی

۲۲ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۸۱۲

## ﴿خطبہ وتقریر کے دوران نماز وتلاوت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن خطیب صاحب تقریر فرمارہے ہوں اس وقت تحیۃ المسجد پڑھنا،قرآن پاک کی تلاوت کرنا،نفل اور قضاء نماز پڑھنا کیسا ہے؟(۲)امام صاحب جب عربی خطبہ فرمارہے ہوں اس وقت کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اصلاحی بیان اجتماعی عمل ہے اور نماز وتلاوت وغیرہ میں مشغول رہنا انفرادی عمل ہے اجتماعی عمل کو انفرادی عمل پر بہت زیادہ فوقیت حاصل ہے لہٰذا اصلاحی بیان سننے کے لئے انفرادی اعمال کو چھوڑ دینا چاہیے اس کے باوجود اگر کوئی نماز وتلاوت میں مشغول رہنا چاہتا ہے تو مجمع سے ہٹ کر الگ کسی دوسری جگہ انفرادی اعمال اپنا تارہے ورنہ اجتماعی عمل سے اعراض کے علاوہ دوسروں کی توجہ ہٹانے کا بھی ذریعہ بنے گا جو شرعاً مذموم ہے،یہ تو عام وعظ کا حکم ہے نماز جمعہ سے پہلے خود خطیب صاحب اگر تقریر فرمارہے ہوں تو اعراض جائز نہیں ہے پوری مسجد حکماً ایک مکان ہے اس لئے صرف وعظ سننا لازم ہے نوافل پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

لمافی الدر المختار:(۶۶۳/۱)فی المسجد عظۃ وقرآن فاستماع العظۃ اولیٰ.

(۲) خطبہ کے دوران خاموشی کے ساتھ خطبہ سننا ضروری اور واجب ہے۔اس دوران نماز،

تلاوت اور ذکر سب منع ہیں۔

ولمافی الهداية:(۱۸/۱،طبع رحمانیه)

واذا خرج الامام يوم الجمعة ترك الناس الصلوة والكلام حتى يفرغ من خطبته.

ولمافی الهندية:(۱۴۷/۱،طبع )واذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام.

ولمافی الدرمع الرد:(۱۵۸/۲،طبع سعيد)

(واذاخرج الامام)من الحجرة ان كان والا فقيامه للصعود شرح المجمع(فلاصلوة ولا كلام الی تمامها)وفی الرد:شمل السنة وتحية المسجد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ چارسدوی

۲۹ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۷۲۱

## ﴿فیکٹری میں نماز جمعہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں ایک فیکٹری میں ملازم ہوں جمعہ کے دن ہمیں صرف ایک گھنٹہ وقت کھانا کھانے اور نماز پڑھنے کیلئے دیاجاتا ہے چونکہ جامع مسجد کافی فاصلے پر ہے اسلئے ہمارے لئے ایک گھنٹہ میں فارغ ہونا بہت مشکل ہے کیا ایسی صورت میں ہم سب مزدور ملکر جمعہ کی نماز فیکٹری میں اداء کرسکتے ہیں یانہیں؟

﴿جواب﴾ اگر فیکٹری ایسی ہو کہ شہر کی ضروریات اور مصلحتیں اس سے وابستہ ہوں اور فیکٹری کی ضروریات اور مصلحتیں شہر سے وابستہ ہوں تو آپ لوگ فیکٹری میں نماز جمعہ ادا کرسکتے ہیں کیونکہ یہ فیکٹری فناء شہر (شہر کی حدود) کے حکم میں ہے اور جسطرح جمعہ شہر میں صحیح ہے اسی طرح فناء شہر میں بھی صحیح ہے۔

لمافی الهندية:(۱۴۵/۱،طبع رشيديه)

وكمايجوزاداء الجمعة فی المصراداء هافی فناء المصروهوالموضع المعدلمصالح المصرمتصلاًبالمصر.

ولمافی الدرمع الرد:(۱۳۸/۲،طبع سعيد)

(اوفناء ه)بكسرالفاء(وهوما)حوله(اتصل به)اولا كماحرره ابن الكمال وغيره(لاجل مصالحه)كدفن الموتى وركض الخيل.وفی الرد:قال واعتبربعضهم قيدالاتصال وقلخطاء صاحب الذخيرة قائلافعلى قول هذا لاتجوزاقامة الجمعة ببخارى فی مصلى العيدلان بين المصلى وبين المصرمزارع ووقعت هذه المسئلة مرة والمفتى بعض

مشائخ زماننا بعدم الجواز ولکن هذا لیس بصواب فان احدا لم یذکر جواز صلاۃ العید فی مصلی العید ببخاری لا من المتقدمین ولا من المتاخرین وکان المصر او فناء ه شرط جواز الجمعة فهو شرط جواز صلاۃ العید.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۲۰ جمادی الاولی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۹۰۷

## ﴿نماز جمعہ کی ترتیب کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جمعہ کی ترتیب کیا ہے نیز جمعہ کی سنتوں کی کیا حیثیت ہے یعنی مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ مستفتی: سید بشیر احمد

﴿جواب﴾ نماز جمعہ کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت ادا کرے اس کے بعد دو رکعت فرض باجماعت ادا کرے اور فرض کے بعد چھ رکعت سنت ادا کرے اور ان چھ رکعتوں کو ادا کرنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ پہلے چار رکعت ادا کرے اور بعد میں دو رکعت ادا کرے اور دوسرا یہ کہ پہلے دو رکعت ادا کرے پھر چار رکعت اور پہلا طریقہ افضل بتلایا ہے نیز جمعہ کی تمام سنتیں مؤکدہ ہیں ہاں آخری دو سنتوں میں مختلف اقوال ہیں لیکن فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجیح اسکو دی گئی ہے کہ یہ بھی مؤکد ہیں۔

لما فی التاتارخانیة: (۱/ ۶۷۲ مطبوعه قدیمی)

التطوع قبل الجمعه اربع رکعات وقد اختلفوا فیه بعدها فعن ابن مسعودؓ انه اربع وبه اخذ ابوحنیفةؒ و محمدؒ وفی الذخیرة عن ابی حنیفة ایضا انه رکعتان وعن علیؓ انه یصلی بعدها ستا رکعتین ثم اربعا وروی عنه بروایة اخری انه یصلی اربعا ثم رکعتین وبه اخذ ابویوسفؒ والطحاویؒ وکثیر من المشایخؒ علی هذا.

ولما فی منحة الخالق علی البحر الرائق: (۲/ ۴۹ مطبوعه ایچ ایم سعید)

قال فی الذخیرة وعن علیؓ انه یصلی ستا رکعتین ثم اربعا وعنه بروایة اخری انه یصلی بعدها ستا اربعا ثم رکعتین وبه اخذ ابویوسفؒ والطحاویؒ وکثیر من المشایخؒ علی هذا قال شمس الائمة الحلوانیؒ الاصل ان یصلی اربعا ثم رکعتین فقد اشار الی انه مخیر بین تقدیم الاربع وبین تقدیم المثنی ولکن الافضل تقدیم الاربع کیلا یصیر متطوعا بعد الفرض مثلها) ومثله فی کبیری (ص ۳۸۸ مطبوعه سهیل اکیڈمی لاهور)

ولما فی بدائع الصنائع: (۱/ ۲۸۵ مطبوعه ایچ ایم سعید کراچی)

فقد ذکر فی الاصل اربع قبل الجمعة واربع بعدها وکذا ذکر الکرخیؒ وذکر الطحاویؒ عن

ابی یوسفؒ انه قال یصلی بعدها ستا وقیل هو مذهب علیؓ وماذکرنا انه کان یصلی اربعا مذهب ابن مسعودؓ۔۔۔ونحن لانمنع من یصلی بعدها کم شاء غیر انا نقول السنة بعدها اربع رکعات لاغیر لما روینا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد

۳ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۶۰۹

## ﴿نماز جمعہ میں قنوت نازلہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قنوت نازلہ صرف فجر کی نماز کے ساتھ خاص ہے یا نماز جمعہ میں بھی پڑھی جاسکتی ہے؟ مستفتی: حبیب اللہ

﴿جواب﴾ قنوت نازلہ کے بارے میں احناف کی کتب میں دو قسم کی روایتیں مذکور ہیں:

(۱) فجر کی نماز میں پڑھی جائے (۲) جہری نمازوں میں پڑھی جائے۔

جمعہ کو چونکہ جہری نمازوں میں شمار کیا جاتا ہے اس بناء پر جمعہ کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا درست ہے۔

لما فی اعلاء السنن:(۱۱۵/۶ طبع دارلکتب بیروت)

ان رسول الله ﷺ قنت شهرا یدعو علی احیاء العرب ثم ترکه رواه مسلم.قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ ---ولکن قال العلامة الشامیؒ تحت قول الدر ولا یقنت لغیره ای لغیر الوتر الا لنازلة فیقنت الامام فی الجهرية.

ولما فی مراقی الفلاح:(ص۳۷۷ طبع قدیمی)

وفی الغاية ان نزل بالمسلمین نازلة قنت الامام فی صلاة الجهر وهو قول الثوریؒ واحمد.

لما فی الشامية:(۴۲۸/۲ طبع امدادیه ملتان)

(فیقنت الامام فی الجهرية) یوافقه ما فی البحر والشرنبلالية عن شرح النقاية عن الغاية:وان نزل بالمسلمین نازلة قنت الامام فی صلاة الجهر وهو قول الثوریؒ واحمدؒ وکذا فی شرح اسماعیل عن البنایة اذا وقعت نازلة قنت الامام فی صلاة الجهرية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۳ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۵۹

## ﴿أخذ الخطيب العصاء يوم الجمعة﴾

## ﴿خطیب صاحب کا جمعہ کے دن لاٹھی لینا مستحب ہے﴾

﴿سوال﴾ ما حکم أخذ الخطيب العصاء يوم الجمعة فان کان جائزا فبای يده

یاخذ؟بینوابالدلائل الشرعیۃوتوجروا عنداللہ
مستفتی:ضیاء الدین

﴿جواب﴾الاعتماد علی العصاء ان کان للضرورة اوعلی اعتقاد انه مستحب فجائز وان ظن انه سنة مقصودة يكره وينبغي تركها احيانا واما انه بای يد ياخذها ففى الفقه الاسلامي: انه يعتمد عليه بيساره.

لما فى الفقه الاسلامى وادلته:(۱۳۱۲،طبع رشيديه)

اعتماد الخطيب بيساره أثناء قيامه على نحو عصاأوسيف اوقوس سنة عند الجمهور مندوب عند المالكية ،لما روى الحكم بن حزن قال: "وفدت على النبى ﷺ فشهدنا معه الجمعة ،فقام متوكئا على سيف او قوس او عصا مختصرا" ولانه امكن له فا الاستناد الى شىء يعطى قوة للخطيب كما انه يجعل يمناه على المنبر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب:محمد سلمہ

۲۵ذی الحجہ۱۴۲۹ھ
فتوی نمبر:۲۸۱۲

## ﴿خطیب کادوران خطبہ ہاتھ ہلانادرست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خطیب صاحب جمعہ کا خطبہ مسنونہ دیتے وقت اپنے ہاتھوں کے ساتھ اشارہ وغیرہ کرسکتا ہے یانہیں؟نیزخطیب صاحب کادوران خطبہ دائیں بائیں رخ کرناجائز ہے یانہیں؟بینواتوجروا۔

﴿جواب﴾دوران خطبہ خطیب صاحب کاہاتھوں سے اشارہ کرنااور اسی طرح دائیں بائیں رخ پھیرناصحیح نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ خطبہ ارشادفرماتے وقت قبلہ کی طرف پشت مبارک کر کے لوگوں کی طرف رخ مبارک کر کے کھڑے رہتے تھے اس لئے علامہ شامیؒ نے دوران خطبہ دائیں بائیں رخ کرنے کوبدعت قراردیا ہے۔

لما فى البدائع:(۱/۲۶۳،طبع سعيد)

ومنهاان يستقبل القوم بوجهه ويستدبرالقبلة لان النبى ﷺ هكذا كان يخطب.

ولمافى الدرالمختار:(۲/۲۱،طبع امداديه)

تنبيه،ما يفعله بعض الخطباء من تحويل الوجه جهة اليمين وجهة اليسار عندالصلاة على النبى ﷺ فى الخطبة الثانية لم ار من ذكره.والظاهر انه بدعة ينبغى تركه لئلايتوهم انه سنة.ثم رأيت فى المنهاج النووى قال: ولا يلتفت يمينا وشمالا فى شئ،

منهيا ،قال ابن حجرؒ في شرحه لان ذلك بدعة.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی
۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
فتویٰ نمبر: ۷۴۳

## ﴿استفتاء برائے نماز جمعہ در( عبدل خیل )ضلع ڈیرہ اسماعیل خان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں عبدل خیل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں نماز جمعہ کے بارے میں کئی سالوں سے علماء کرام کا اختلاف چلا آرہا ہے بعض علماء جمعہ کے وجوب کے قائل ہیں جبکہ دیگر بعض عدم جواز کا قول کرتے ہیں جو حضرات عدم جواز کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ گاؤں میں پولیس چوکی ،تھانہ ،ہوٹل اور بینک وغیرہ نہیں ہیں ،لہٰذا یہاں جمعہ کی شرائط پوری نہیں ہیں اور جمعہ جائز نہیں جبکہ گاؤں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

گاؤں کی آبادی سات ہزار سے متجاوز اور رقبہ ایک کلومیٹر سے زائد ہے گھروں کی تعداد سات سو اور ہزار کے درمیان ہے ،لڑکے اور لڑکیوں کے لئے دو ،دو پرائمری اور ایک ایک ہائی سکول ہے ،ایک کالج بھی ہے لیکن تاحال زیر تعمیر ہے ،چھوٹی بڑی کل دس مسجدیں ہیں بڑا قبرستان ہے ،بجلی ،ٹیلیفون ایکسچینج ،ڈاکخانہ ،وی وائرلیس کی سہولیات موجود ہیں واٹر سپلائی کی ٹینکی بھی ہے اور گلیاں بھی پختہ ہیں ،ایک سول ہسپتال ،ایک جانوروں کا ہسپتال اور ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے ،حفظ وناظرہ کے لئے لڑکے ،لڑکیوں کیلئے مستقل تین دینی مدارس ہیں ،ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی ہے ،دو پبلک سکول (امین پبلک سکول ،کرن پبلک اسکول ) بھی ہیں اور تقریباً ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں ،دکانیں بڑی تعداد میں ہیں جن سے نہ صرف اس آبادی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ قرب وجوار کی بستیوں والے بھی سودا خریدنے یہاں آتے ہیں لیکن دکانیں بازار کی صورت میں نہیں ہیں ،البتہ متفرق دکانوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(1) محمد نادر میڈیکل اسٹور (2) عبد القیوم میڈیکل اسٹور (3) محمد اکبر میڈیکل اسٹور (4) فوجی سلطان جنرل اسٹور ومیڈیکل (5) نور محمد جست وجنرل ومیڈیکل (6) عبد اللہ جان جنرل سٹور (7) قطبی بک وجنرل اسٹور (8) گیس بھرائی کی دکان (9) مولوی محمد الیکٹریشن (10) سیف الرحمٰن کلاتھ ہاؤس (11) نثار سائیکل پنکچر (12) سعد الدین سائیکل پنکچر (13)

پٹرول کی دکان (14) موچی کی دکان (15) حبیب خان غلہ منڈی (16) محمد نادر سائیکل پنکچر (17) عزیز خان کلاتھ ہاؤس (18) گل سرور کلاتھ ہاؤس (19) سعدالدین ٹیلر ماسٹر (20) عبدالعلیم ٹیلر ماسٹر (21) محمد قیصر ولڈنگ کی دکان (22) چودھری جنرل اسٹور و پی سی او (23) نائی (24) لوہار (25) شفیع اللہ ویلڈنگ و جنرل اسٹور (26) نعمت اللہ جنرل اسٹور (27) رابعہ جنرل اسٹور (28) کفایت اللہ دودھ دہی و جنرل (29) عبدالسنان جنرل اسٹور (30) عبداللہ جان سبزی و پھل فروش (31) محمد جنرل اسٹور (32) مجیب سبزی و پھل فروش (33) رشید احمد سبزی و پھل فروش (34) دو آٹے کی چکیاں (35) سعید نواز جنرل اسٹور (36) آرے کی دکان (37) عبدالحمید پنسار (38) سلطان سبزی و پھل فروش (39) حاجی رحیم داد جنرل اسٹور (40) محمد غلام جنرل اسٹور (41) نورولی سبزی و پھل فروش (42) سعداللہ جنرل اسٹور (43) عبدالرشید جنرل اسٹور (44) یوسف سائیکل پنکچر (45) حاجی عبدالقاہر مٹی برتن فروش (46) بابو جنرل اسٹور (47) محمد علی جنرل اسٹور و سبزی (48) محمد اکرم جنرل اسٹور (49) محمد اعظم ٹیلر ماسٹر (50) سعید خان پکوڑہ فروش (51) محمد قاسم جنرل اسٹور (52) محمد شکیل جنرل اسٹور (53) شیخ اسماعیل جنرل اسٹور (54) حبیب ترکان (55) خیر الدین ترکان (56) عبداللہ ترکان (57) ہمایوں الیکٹریشن (58) سعداللہ ورمٹر پائپ فروش (59) مولوی گل محمد منڈی (60) عبدالسنان جنرل اسٹور، اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز واجب ہے یا نہیں؟ اور جمعہ کی نماز نہ پڑھنے کی صورت میں گاؤں والے گنہگار ہوں گے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔ مستفتی: رفیع اللہ عبدل خیلوی

﴿جواب﴾ فقہاء احناف نے متون میں نماز جمعہ کے لئے اگر چہ شہر (مصر) کی شرط لگائی ہے لیکن مفتٰی بہ قول کے مطابق قصبہ اور بڑی بستی جو تین ہزار افراد پر مشتمل ہو اور ضروری اشیاء کی دکانیں موجود ہوں تو ایسی آبادی میں جمعہ صحیح اور واجب ہے شہر (مصر) کا قول اس زمانے کے عرف کے اعتبار سے کیا گیا تھا یعنی بڑی آبادی کو مصر کہتے تھے چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ترمذی کی شرح کوکب الدری میں فرماتے ہیں: (۲۸۱/۱)

واما ماقال بعضهم من ان شرط المصر فمسلم لكنهم اختلفوا في ما يتعلق به

المصرية ... وقيل مافيه اربعة آلف رجال الى غير ذالك وليس هذا كله تحديدله بل اشاره الى تعيينه وتقريب له الى الاذهان

لمافى المبسوط السرخسى:(۲/۲۳،طبع دارالمعرفةبيروت)

وقدقال بعض مشائخنا ان يتمكن كل صانع ان يعيش بصنعته ولا يحتاج فيه الى التحول الى صنعة اخرى۔

ولمافى العرف الشذى على الترمذى:(۱/۲۲۳)

احدهما بيان محل اقامة صلوة الجمعة وهو المصر او القرية الكبيره عندنا.

ولمافى الرد المحتار:(۲/۱۳۸،طبع سعيد)

وعبارة القهستانى تقع فرضا فى القصبات والقرى الكبيرة ..... الى انها لا تجوز فى الصغيرة.

اکابر علماء دیوبند کے تمام فتاویٰ میں مذکورہ صفات والی آبادی کے بارے میں جمعہ واجب الاداء قرار دیا گیا ہے اکابر کے فتاویٰ کا مطالعہ کیا جائے تو تین ہزار افراد پر مشتمل آبادی ہی کو معیار بنایا گیا ہے تین ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل آبادی ہو اور جمعہ کی فرضیت کا فتویٰ نہ دیا ہو، ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فتاوی دار العلوم دیوبند میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اگر کل آبادی اور مردم شماری ہندو مسلم کی اس قریہ میں تین چار ہزار آدمیوں کی ہے اور ضروری اشیاء وہاں دستیاب ہوں تو وہ قریہ کبیرہ مثل قصبہ کے ہے جمعہ اس میں فرض ہے اور اداء ہو جاتا ہے جیسا کہ شامی باب الجمعہ میں ہے:

وتقع فرضا ---(عزيز الفتاوى:۱/۲۹۱،فتاوى دار العلوم ديوبند)

اسی طرح ایک اور جگہ پوچھا گیا کہ گاؤں میں جمعہ کی ادائیگی کے لئے تین چار ہزار آدمیوں کی آبادی شرط ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ تو جواب میں تحریر فرمایا:

یہ اس بناء پر ہے کہ جمعہ کے لئے قریہ کبیرہ کی شرط ہے اور عرفاً قریہ کبیرہ وہی کہلاتا ہے جس میں تین چار ہزار آدمی آباد ہوں جس سے وہ مثل قصبہ کے ہو جاوے واللہ اعلم (فتاوی دیوبند:۱/۸۸)

اسی طرح ایک سائل نے سوال کیا کہ موضع سوجڑو ضلع مظفر نگر میں تقریباً تین ہزار مردم شماری یا کچھ کم ہے اور بازار اس موضع میں نہیں ہے اور کوئی سودا وغیرہ کپڑا یا غلہ یا دوا کچھ بھی نہیں ملتی تو جواب میں نہ سوق (بازار) کی شرط لگائی نہ اتصال حوانیت (دکانوں کا متصل ہونا) کی بلکہ فرمایا:

''پس قریہ مذکورہ بظاہر قریہ کبیرہ ہے کہ آبادی اس کی تین ہزار کے قریب ہے لہٰذا جمعہ پڑھنا اس میں واجب اور صحیح ہے (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۵/۶۶)

ایک اور جگہ پر سائل پوچھتا ہے کہ ایک قریہ عظیمہ جس میں تین ہزار دو سو (۳۲۰۰) آدمی آباد ہیں اور چند دکانیں بھی موجود ہیں تو حضرت مفتی صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

''ایسے قریہ میں جمعہ عند الحنفیہ صحیح ہے اور واجب الاداء ہوتا ہے کیونکہ وہ قریہ کبیرہ ہے اور قریہ کبیرہ میں موافق تصریح شامی کے جمعہ صحیح ہوتا ہے (۵/۷۷)

اکابر کی ان عبارات اور تصریحات سے معلوم ہوا کہ جمعہ تین ہزار کی آبادی میں واجب ہوتا ہے جبکہ مذکورہ آبادی (عبدل خیل) تو تقریباً سات ہزار پر مشتمل آبادی ہے اور کافی سہولیات میسر ہیں اس قسم کی آبادی میں عدم جواز جمعہ کا کوئی فتوی ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔

مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے کسی سائل نے سوال کیا کہ نماز جمعہ کا لزوم ہمارے ملک پاکستان میں کتنی بستی پر ہوسکتا ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا:

''جو بستی بڑی ہو اور اس میں کم از کم دو مسجدیں ہوں یا وہاں ضروری سامان مل جاتا ہو اس میں جمعہ پڑھنا چاہئے (کفایت المفتی: ۳/۱۹۴)

ایک اور جگہ فرمایا: (کفایت المفتی: ۳/۹۶۱)

''لیکن مصر کی تعریفیں مختلف اور متعدد منقول ہیں اس مسئلہ میں زیادہ سختی کا موقع نہیں ہے اور اس زمانے کے مصالح عامہ مہمہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اقامت جمعہ کو نہ روکا جائے''

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

اور آج کل اس تعریف کا مصداق ہندوستان میں ہمارے نزدیک ہر وہ موضع ہے جس کی آبادی قریب چار ہزار کی ہو جس میں تیس، چالیس دکانیں متصل یکجا ہوں (کہ بازار اسی کا نام ہے متفرق دوکانوں کو جن میں فصل کثیر ہو بازار نہیں کہا جاتا ہے) اور اس بازار میں ضروریات روزمرہ دستیاب ہوتی ہوں کہ پارچہ کی دکان بھی ہو جوتہ کی بھی، عطارہ کی بھی، دودھ، گھی، غلہ وغیرہ کی بھی...... الخ (امداد الاحکام: ۱/۷۶۳)

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تو اپنی رائے کا اظہار فرماتے ہوئے دکانوں کے اتصال کو ضروری قرار دیا ہے لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک تحقیق میں واضح فرمایا:

''اور کبیرہ میں مابہ الفرق اگر آبادی کی مقدار لی جاوے تو اس کا مدار عرف پر ہوگا اور عرف کے تتبع سے معلوم ہوا کہ حکام وقت جو کہ حکماء تمدن بھی ہیں چار ہزار کی آبادی کو قصبہ میں شمار کرتے ہیں اور اگر مابہ الفرق وہ صفات لی جاویں جو روایات مرقومہ میں صغیرہ کبیرہ کی صفت میں وارد ہیں یعنی اسواق و حاکم و خطیب و ممبر کا ہونا تو بھی موضع مذکور قریہ کبیرہ میں داخل ہے کیوں کہ اسواق بقرینہ مقام اسم جنس ہے جو واحد کو بھی شامل ہے سو اتنی دکانوں سے ایک سوق کا مہیا ہو جانا متیقن ہے، اب صرف شبہ عدم اتصال سے ہو سکتا ہے سو تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوق کے اشتراط کا حاصل یہ ہے کہ ہر وقت کے حوائج ضروری میں وہاں کے سکان دوسرے مصر کے محتاج نہ ہوں، سو اس غرض کے حصول میں اتصال اور انفصال برابر ہیں چنانچہ مولانا بحر العلوم نے رسالہ ارکان اربعہ میں اپنے والد قدس اللہ سرہ کا قول جو نقل کیا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے:

"حيث قال وكان مطلع الاسرارابى قدس سره يفتى بان المصر موضع يندفع حاجة الانسان الضرورية بان يكون هناك من يبيع طعاما والكسوة الضرورية وان يكون هناك اهل حرف يحتاج اليهم كثيرا.

وايضا يؤيده مافى المضمرات فى تعريف المصر هو ان يعيش كل محترف بحرفته من سنة الى سنة من غيران يحتاج الى حرفة اخرى (مجموع الفتاوى لمولانا عبدالحیؒ: ۲/۱۲) بحواله امدادی الفتاوی: (۱/۲۱۸، ۲۸۸).

واضح رہے اس علاقے کو حضرت تھانویؒ نے خود دیکھا تھا اور اس کے بارے میں فرمایا کہ وہاں دکانیں چالیس کے قریب ہیں البتہ متصل نہیں، اسی طرح بہشتی گوہر میں حضرت تحریر فرماتے ہیں: ''البتہ جس گاؤں کی آبادی قصبے کے برابر ہو مثلاً: تین چار ہزار آدمی ہوں وہاں جمعہ درست ہے۔'' (حصہ یازدہم ص ۶۸۳)

فقیہ ملت مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا:

''کہ شہر اور قصبہ اور بڑے قریہ میں جس میں دو چار ہزار آدمی ہوں اور ضروری اشیاء کی دکانیں ہوں وہاں جمعہ واجب اور ادا ہوتا ہے (فتاویٰ مفتی محمود: ۲/۳۶۴)

ایک اور استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

"صحت جمعہ اور جواز کے لئے مصر اور قریہ کبیرہ ہونا شرط ہے جسکی آبادی تین چار ہزار کے قریب ہو اور ضروریات کی تمام اشیاء وہاں میسر ہوں لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے وہاں رجوع کرتے ہوں" (فتاویٰ مفتی محمود: ۲/۳۷۱)

ایک اور استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"مذہب حنفیہ کے تمام کتب میں مذکور ہے جمعہ کے ادا ہونے اور واجب ہونے کے لئے مصر شرط ہے اور مصر کہتے ہیں شہر کو اور قصبہ اور بڑا قریہ جس میں دو چار ہزار آدمی آباد ہوں اور ضروری اشیاء کی دکانیں ہوں وہ بھی حکم شہر میں ہے کما فی الشامیہ (فتاویٰ مفتی محمود: ۲/۳۷۷)

فتاویٰ حقانیہ: (۲/۳۸۳) پر مرقوم ہے:

موجودہ وقت کے اعتبار سے جس گاؤں کی مستقل آبادی بشمول مرد و زن چھوٹے بڑے اور مسلم و غیر مسلم دو ہزار تک پہنچے ہوں تو وہ گاؤں بڑا سمجھا جاتا ہے اور اس میں ضروریات زندگی کا سامان بھی موجود ہو، لہٰذا جمعہ کے وجوب کے لئے ایک گاؤں کی آبادی کم از کم دو ہزار ہونا ضروری ہے، فتاویٰ محمودیہ میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے ایک استفتاء کے جواب میں منقول ہے" کہ بڑا گاؤں وہ ہے جسمیں گلی کوچے ہوں اپنے پھیلاؤ اور ضروریات کے اعتبار سے قصبہ کے مثل ہو تین چار ہزار کی آبادی ہو" (۲/۳۰۴)

جن لوگوں کو تھانہ چوکی نہ ہونے کی وجہ سے اشکال ہے ان کے لئے شہید اسلام حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ کی عبارت پیش خدمت ہے، چنانچہ مولانا آپ کے مسائل اور ان کا حل (۲/۳۹۸) پر تحریر فرماتے ہیں:

"بہر حال تھانے کا وہاں موجود ہونا صحت جمعہ کے لئے شرط لازم نہیں ہے"۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب جدید فقہی مسائل میں دیہات میں جمعہ کے مسائل پر نہایت جامع گفتگو فرمائی ہے اور شہر (مصر) کی تعریف و تحدید کے بارے میں بارہ اقوال نقل کئے ہیں اور آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آراء وخیالات کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر شہر کے مفہوم میں جس قدر توسیع ممکن ہو پیدا کی جائے کہ جمعہ محض ایک عبادت ہی نہیں تذکرہ ودعوت بھی ہے، مسلمانوں کی اجتماعیت کا اظہار بھی ہے اور اسلام کا شعار بھی۔ (۱/۶۳)

نیز شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے تقریباً بارہ سال پہلے اسی آبادی (عبدل خیل) سے متعلق ایک سوال کے جواب میں نماز جمعہ کے وجوب کا فتویٰ دیا تھا اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ فاروقیہ کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور دیگر مشہور دارالافتاؤں نے بھی اس کی تصدیق کی تھی، لہٰذا مذکورہ آبادی (عبدل خیل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان) میں بلاشبہ جمعہ واجب ہے، ادا نہ کرنے کی صورت میں تمام ذمہ دار افراد گنہگار ہوں گے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: راحت اللہ چارسدوی
۱۴۲۷ھ
فتویٰ نمبر: ۷۹۰

## ﴿استفتاء برائے نماز جمعہ در عبدل خیل ضلع لکی مروت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جمعہ مصر (شہر) میں ضروری ہے یا بڑے گاؤں میں بھی؟ ہمارا گاؤں عبدل خیل علاقے میں بڑا گاؤں شمار ہوتا ہے چنانچہ اسکی آبادی گذشتہ مردم شماری میں چار ہزار دوسو افراد تحقیق سے ہے اور اب مزید اضافہ بھی ہوا ہوگا، اس گاؤں میں پانچ مساجد ہیں، دو ہائی سکول کے علاوہ ایف اے کالج بھی ہے، ہسپتال بھی ہے، البتہ تھانہ آبادی میں نہیں ہے لیکن تھانہ پولیس پہنچنے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی چار دینی مدارس ہیں، ضروریات زندگی بآسانی میسر ہیں، تقریباً پچیس دوکانیں ہیں، ٹیلیفون بجلی کی سہولت بھی ہے اور گاؤں کے راستے کھلے اور ترتیب سے ہیں علاقہ کے علماء کا اس آبادی کے بارے میں دورائے ہیں بعض جمعہ واجب قرار دے رہے ہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔

﴿جواب﴾ فقہ کی اکثر کتب خصوصاً متون میں نماز جمعہ کیلئے مصر (شہر) کو شرط قرار دیا ہے لیکن فتاویٰ اور شروحات کیطرف مراجعت کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ قریہ کبیرہ (بڑا گاؤں) اور قصبہ بھی مصر کے حکم میں ہے اور اسکو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ترمذی کی شرح کوکب الدری میں فرماتے ہیں:

واما ماقال: بعضهم من ان شرط المصر لمسلم لكنهم اختلفوا الى مايتحقق به المصرية ...... وقيل مافيه اربعة آلاف رجال الى غير ذالك وليس هذا كله تحديدله بل اشارة الى تعيينه وتقريب له الى الاذهان (۱/ ۲۱۳-۲۱۴).

اور مبسوط سرخسی میں ہے: (۲/ ۲۳، طبع دار الکتب بیروت)

وقدقال بعض مشائخنا ان يتمكن كل صانع ان يعيش بصنعته فيه ولا يحتاج فيه الى التحول الى صنعة اخرى.

اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں: (۱/ ۲۲۹، طبع فاروقی لاہور)

احدهمابيان محل اقامة صلوة الجمعة وهو المصر او القرية الكبيرة عندنا.

اور خاتم المحققین علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (۲/ ۱۳۸، طبع سعید)

وعبارة القهستاني تقع فرضا فى القصبات والقرى الكبيرة .....الى انه لا تجوز فى الصغيرة.

یہ بھی واضح رہے کہ محض متون کے مطالعہ سے ایسے اہم مسائل سے متعلق فتوی دینا جائز نہیں ہے شروحات اور فتاوی کیطرف مراجعت ضروری ہے بلکہ اکابر علماء کے فتاوی کیطرف مراجعت ضروری ہے جن کو اس میدان میں کافی تجربہ اور علماء کرام کا اعتماد وتائید حاصل ہے، ہمارے اکابر علماء دیوبند نے اپنے فتاوی میں مذکورہ صفات والی ہر آبادی میں جمعہ کو واجب قرار دیا ہے اکابر کے فتاوی کا مطالعہ کیا جائے تو تین ہزار افراد پر مشتمل آبادی ہی کو معیار بنایا گیا ہے تین ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل آبادی ہو اور جمعہ کی فرضیت کا فتوی نہ دیا ہو، ایسی کوئی مثال نہیں ملتی چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فتاوی دار العلوم دیوبند میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر کل آبادی اور مردم شماری ہندو مسلم کی اس قریہ میں تین چار ہزار آدمیوں کی ہے اور ضروری اشیاء وہاں دستیاب ہوں تو وہ قریہ کبیرہ مثل قصبہ کے ہے جمعہ اس میں فرض ہے اور ادا ہو جاتا ہے جیسا کہ شامی باب الجمعہ میں ہے: وتقع فرضا (عزیز الفتاوی: ۱/ ۲۹۱، دار العلوم دیوبند)

اسی طرح ایک اور جگہ پوچھا گیا کہ گاؤں میں جمعہ کی ادائیگی کے لئے تین چار ہزار آدمیوں کی آبادی شرط ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ تو جواب میں تحریر فرمایا:

یہ اس بناء پر ہے کہ جمعہ کے لئے قریہ کبیرہ کی شرط ہے اور عرفاً قریہ کبیرہ وہی کہلاتا ہے جس میں

تین چار ہزار آدمی آباد ہوں جس سے وہ مثل قصبہ کے ہو جاوے، واللہ اعلم (فتاویٰ دیو بند: ۱/۸۸)

اسی طرح ایک سائل نے سوال کیا کہ موضع سوجڑو ضلع مظفر نگر میں تقریباً تین ہزار مردم شماری یا کچھ کم ہے اور بازار اس موضع میں نہیں ہے اور کوئی سودا وغیرہ کپڑا یا غلہ یا دوا کچھ بھی نہیں ملتی تو جواب میں نہ سوق (بازار) کی شرط لگائی نہ اتصال حوانیت (دکانوں کا متصل ہونا) کی بلکہ فرمایا:

''پس قریہ مذکورہ بظاہر قریہ کبیرہ ہے کہ آبادی اس کی تین ہزار کے قریب ہے لہٰذا جمعہ پڑھنا اس میں واجب اور صحیح ہے'' (فتاویٰ دار العلوم دیو بند: ۵/۶۶)

ایک اور جگہ پر سائل پوچھتا ہے کہ ایک قریہ عظیمہ جس میں تین ہزار دوسو (۳۲۰۰) آدمی آباد ہیں اور چند دکانیں بھی موجود ہیں تو حضرت مفتی صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

''ایسے قریہ میں جمعہ عند الحنفیہ صحیح ہے اور واجب الاداء ہوتا ہے کیونکہ وہ قریہ کبیرہ ہے اور قریہ کبیرہ میں موافق تصریح شامی کے جمعہ صحیح ہوتا ہے'' (۵/۷۷)

مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے کسی سائل نے سوال کیا کہ نماز جمعہ کا لزوم ہمارے ملک پاکستان میں کتنی بستی پر ہو سکتا ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا:

''جو بستی بڑی ہو اور اس میں کم از کم دو مسجدیں ہوں یا وہاں ضروری سامان مل جاتا ہو اس میں جمعہ پڑھنا چاہیے'' (کفایت المفتی: ۳/۱۹۴)

ایک اور جگہ فرمایا: ''لیکن مصر کی تعریفیں مختلف اور متعدد منقول ہیں اس مسئلہ میں زیادہ سختی کا موقع نہیں ہے اور اس زمانے کے مصالح عامہ مہمہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اقامت جمعہ کو نہ روکا جائے'' (کفایت المفتی: ۳/۱۹۶) اس سے متعلق تفصیل کیلئے: (صفحہ ۳۹۷-۳۹۸) ملاحظہ ہو۔

لہٰذا اکابر علماء کے مذکورہ فتاویٰ کی روشنی میں (عبدل خیل، لکی مروت) میں نماز جمعہ بلاشبہ واجب ہے، علاقہ کے علماء کو چاہیے کہ مندرجہ بالا فتاویٰ کی عبارات اور اکابر کے فتاویٰ سے اطمینان حاصل کریں اور اس آبادی میں نماز جمعہ کی اقامت کے بارے میں متفقہ فیصلہ دیں تاکہ گاؤں کے لوگوں میں اختلاف وانتشار پیدا نہ ہو۔

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۱۱

﴿جہاں جمعہ نہ ہوتا ہو وہاں سے دوسری جگہ جمعہ پڑھنے کیلئے جانا﴾

﴿سوال﴾ میں عبدل خیل (ڈیرہ اسماعیل خان) کا باشندہ ہوں ہمارے گاؤں میں جمعہ نہیں ہوتا تو جمعہ پڑھنے کے لئے میں پنیالہ جایا کرتا ہوں مجھے ایک عالم دین نے کہا'' کہ آپ پر ظہر کی چار رکعت فرض ہیں اور آپ جمعہ پڑھنے کیلئے پنیالہ جاتے ہیں یہ تو بہت بڑا گناہ ہے'' جس کی وجہ سے میں نے جمعہ پڑھنے جانا چھوڑ دیا اس بات کے کئی سال ہو گئے، اب دوسرے عالم سے معلوم ہوا کہ اس عالم کی بات غلط ہے، براہ کرم آپ تحقیقی جواب دیدیں اور یہ کہ کئی سالوں سے میں جمعہ پڑھنے نہیں جاتا اور ثواب سے محروم ہوں کیا یہ صرف میرا نقصان ہے یا بتانے والے عالم کا بھی؟ مستفتی: حاجی محمود صاحب عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان

﴿جواب﴾ اگر چہ آپ کے علاقہ میں جمعہ نہیں ہوتا اور آپ کو ظہر کی چار رکعت پڑھنے کی شرعاً رخصت دی گئی ہے لیکن اسکے باوجود دوسرے علاقہ میں جمعہ پڑھنے آپکا جانا اور مشقت برداشت کرنا باعث اجر وثواب تھا کیونکہ آپ عزیمت پر عمل کرتے رہے، لہٰذا عالم دین کا یہ کہنا کہ'' آپ پر ظہر کی چار رکعت فرض ہیں اور جمعہ کے لئے دوسرے علاقہ میں جانا بڑا گناہ ہے،، درست نہیں اور دوسرے عالم دین نے آپ کو جو بتایا کہ اس عالم کی بات غلط ہے'' درست کہا ہے، علاوہ ازیں آپ جو کئی سالوں سے جمعہ پڑھنے نہیں گئے اور ثواب سے محروم ہوئے اسمیں آپ کا نقصان ہوا کیونکہ آپ نے عزیمت پر عمل کرنا چھوڑ دیا، البتہ غلط مسئلہ بتانے کی وجہ سے عالم پر بھی اس کا وبال اور گناہ ہوگا، بغیر تحقیق کے کوئی عالم دین ثواب کے کام کو گناہ کا کام بتادے تو یہ بڑے خطرے کی بات ہے۔

لما فی مرقاۃ المفاتیح شرح المصابیح:(۱/ ۴۵۸،کتاب العلم،طبع رشیدیه)

وعن ابی هريرة قال:قال رسول الله عليه وسلم من افتى بغير علم كان اثمه على من افتاه(رواه ابوداؤد)

وعن ابی هريرة قال:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من افتى )على صيغة المجهول وقيل من المعروف(بغير علم كان اثمه على من افتاه )قال الاشرف وتبعه ابن الملك:يجوز ان يكون افتى الثانی بمعنى استفتى وافتى الاول معروفا اى كان اثمه على من استفتاه فانه جعله فی معرض الافتاء بغير علم ويجوز ان يكون مجهولا اى فاثم افتائه على من افتاه:اى الاثم على المفتى دون المستفتى والاظهر الثانی

وهو الاصح من النسخ بمعنى كل جاهل سأل عالماً عن مسئلة فافتاه العالم بجواب باطل فعمل المسائل بها ولم يعلم بطلانها فاثمه على المفتى ان قصر فى اجتهاده.

ولما فى البحر:(۱۵۲/۲،طبع سعيد)

(قوله: ومن لا جمعة عليه ان اداها جاز عن فرض الوقت لانهم تحملوا فصاروا كالمسافر اذا صام ولم ارتلا صريحاهل الافضل لمن لا جمعة عليه صلاة الجمعة او صلاة الظهر لكن ظاهر الهداية والعناية وغاية البيان ان الافضل لهم الجمعة لانهم ذكروا ان صلاة الظهر لهم يوم الجمعة رخصة فدل ان العزيمة صلاة الجمعة.

ولما فى التنوير مع الدر والرد:(۱۵۲/۲-۱۵۵،باب الجمعة،طبع سعيد)

وفاقدها اى هذه الشروط او بعضها (ان) اختار العزيمة و(صلاها وهو مكلف) بالغ عاقل (وقعت فرضا) عن الوقت لئلا يعود على موضوعه بالنقض.(قوله اى هذه الشروط) اى شروط الافتراض (قوله ان اختار العزيمة اى صلاة الجمعة لانه رخص له فى تركها الى الظهر فصارت الظهر فى حقه رخصة و الجمعة عزيمة كالفطر للمسافر هو رخصة له والصوم عزيمة فى حقه لانه اشد فافهم (قوله لئلا يعود على موضوعه بالنقض )بمعنى لو لم نقل بوقوعها فرضا بل الزمناه بصلاة الظهر لعاد على موضوعه بالنقض وذلك لأن صلاة الظهر فى حقه رخصة فاذا اتىٰ بالعزيمة وتحمل المشقة صح ،ولو الزمناه بالظهر بعدها لحملناه مشقة ونقضنا الموضوع فى حقه و هو التسهيل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن

فتویٰ نمبر: ۱۳۲۹ھ

## ﴿گاؤں میں نماز جمعہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بستیوں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو آبادی کی کوئی مقدار متعین ہے یا نہیں؟ اگر ایسی جگہ پہلے جمعہ ہوتا ہو تو اب کیا کرنا چاہیئے؟ حوالہ جات کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

﴿جواب﴾ احناف کے مذہب میں نماز جمعہ درست ہونے کے لئے شہر یا بڑے گاؤں کا ہونا ضروری ہے چھوٹے گاؤں، دیہات میں نماز جمعہ درست نہیں ہے، بڑے گاؤں سے مراد ایسی آبادی جس میں تین چار ہزار آدمی بستے ہوں اور تمام ضروری اشیاء کی دکانیں موجود ہوں تو وہاں جمعہ واجب ہے اور چھوٹے گاؤں جو مذکورہ بالا صفت پر نہ ہوں وہاں جمعہ درست نہیں ہے، ایسی آبادی کے لوگ ظہر کی نماز ادا کریں۔

لمافی البحر:(۱۴۰/۲،طبع سعید)

(قوله شرط ادائها المصر)ای شرط صحتها ان تؤدی فی مصر حتی لاتصح فی قرية ولامفازة لقول علیؓ لاجمعة ولاتشريق ولاصلاة فطر والأضحى الافی مصر جامع اوفی مدينة عظيمة

ولمافی ردالمحتار:(۱۳۷/۲،طبع سعید)

تحت قوله( و ظاهر المذهب)......علی ماصرح به فی التحفة عن ابی حنيفة انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولهارساتيق وفيهاوال يقدرعلى انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه اوعلم غيره يرجع الناس اليه فيمايقع من الحوادث وهذاهوالاصح اھ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد حیات کمالوی

۵محرم الحرام ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:۶۱۶

## ﴿دیہات والا اگر شہر میں آجائے تو اس پر جمعہ لازم ہونے کی شرط﴾

﴿سوال﴾ میں ایک سکول ٹیچر ہوں اور دیہات سے شہر پڑھانے جاتا ہوں اور جمعہ والے دن جب گھر لوٹ رہا ہوتا ہوں تو جمعہ کا وقت داخل ہو چکا ہوتا ہے اور میرے گاؤں اور شہر کا درمیانی فاصلہ تین میل کا ہے تو کیا اس صورت میں میرے اوپر جمعہ لازم ہوتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ دیہاتی آدمی اگر کسی کام کی غرض سے شہر میں آئے اور پورا دن شہر میں رہنے کا ارادہ ہو تو اس پر جمعہ لازم ہے اور اگر یہ نیت ہو کہ کام ہوتے ہی شہر سے نکل جاؤں گا جمعہ کا وقت داخل ہونے سے پہلے یا وقت داخل ہونے کے بعد تو اس پر نماز جمعہ لازم تو نہیں ہے مگر پڑھ لے تو بہت ثواب ملے گا بلکہ احتیاط اسی میں ہے کہ وقت داخل ہونے کے بعد جمعہ پڑھ کر ہی نکلے اس لئے کہ بعض روایات میں واجب قرار دیا گیا ہے۔

لمافی الهندية:(۱۴۵/۱،طبع رشیدیہ)

من كان مقيمابموضع بينه وبين المصر فرجة من المزارع والمراعی نحو القلع ببخاری لاجمعة على اهل ذلک الموضع وان كان النداء يبلغهم والغلوة،الميل والأميال ليس بشیء هكذا فی الخلاصة...... القروی اذادخل المصرونوی ان يمكث يوم الجمعة لزمته الجمعة لانه صار كواحد من اهل المصر فی حق هذااليوم وان نوی ان يخرج فی يومه ذلک قبل دخول الوقت اوبعد الدخول لا جمعة عليه ولو صلى مع ذلک كان ماجوراً كذافی فتاوی قاضيخان والتجنيس والمحيط.

ولمافی التنويرمع الدر:(۱۶۲/۲،طبع سعید)

(القروی اذا دخل المصريومها ان نوی المكث ثمة ذلک اليوم لزمته) الجمعة( وان

نوی الخروج من ذلک الیوم قبل وقتها او بعده لاتلزمه)لکن فی النهر:ان نوی الخروج بعده لزمته والالا وفی شرح المنیة:ان نوی المکث الیٰ وقتها لزمته وقبل لا.

ولما فی شرح المنیة:(ص۴۷۵-۴۷۶،طبع نعمانیه)

وان دخل القروی المصر یوم الجمعة فان نوی المکث الیٰ وقتها لزمته ولو نوی الخروج قبل دخوله لاتلزمه ولونواه بعددخول وقتهاتلزمه وقال الفقیه ابو اللیث:لا تلزمه کذا فی الخلاصة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:خضر حیات کمالوی

۵جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۸۶۰

## ﴿جمعہ کے دن سورۃ کہف پڑھنے اور جمعہ کیلئے سوار ہوکر آنے کے فضائل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ(۱) بعض لوگ جمعہ کے دن سورۃ کہف پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں شرعاً اسکا ثبوت ہے یا نہیں؟(۲) جمعہ پڑھنے کیلئے گاڑی میں سوار ہوکر آنا کیسا ہے؟ مستفتی:ہدایت اللہ چالیار سواتی

﴿جواب﴾(۱)جمعہ کے دن سورۃ کہف پڑھنے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے روز سورۃ کہف پڑھے گا تو دونوں جمعوں کے درمیان اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص نور نصیب ہوگا۔

لما فی المشکوٰۃ:(ص۱۸۹،طبع سعید)

عن کعبٌ ان النبی ﷺ قال من قرأ سورة کهف فی یوم الجمعة اضاء له النور مابین الجمعتین.

(۲)بہتر تو یہ ہے کہ نماز جمعہ کیلئے پیدل آیا جائے لیکن اگر کوئی گاڑی میں سوار ہوکر جمعہ پڑھنے جائے تو اسمیں بھی کوئی حرج نہیں۔

لما فی الخلاصة:(۲۱۱/۱،طبع رشیدیه)

ولابأس بالرکوب للجمعة والعیدین والمشی افضل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:حبیب الوہاب سواتی عفااللہ عنہ

۲۳جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۶۱۱

## ﴿نماز جمعہ فرض ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جمعہ

فرض ہے یا واجب؟ دلائل سے جواب عنایت فرمائیں۔ مستفتی: عزت رحمٰن قصبہ کالونی کراچی

﴿جواب﴾ نماز جمعہ کی فرضیت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے بلکہ نسبتا اس میں زیادہ تاکید ہے، البتہ جہاں اسکی شرائط پائی جاتی ہوں وہاں فرض ہے عام نماز ظہر کیطرح نہیں ہے کہ وہ تو ہر جگہ اور ہر عاقل بالغ خواہ بیمار یا مسافر ہو اس پر بھی فرض ہے لیکن نماز جمعہ دیہات والوں پر فرض نہیں ہے اسی طرح مسافر اور معذور لوگوں پر بھی فرض نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۳۶/۲،طبع سعید)

(هي فرض)عين(يكفر جاحدها)لثبوتها بالدليل القطعي كما حققه الكمال وهي فرض مستقل آكد من الظهر(قوله بالدليل القطعي)وهو قوله تعالىٰ يأيها الذين آمنوا اذانودي للصلوٰة من يوم الجمعة فاسعوا الى ذكر الله.الآية.

ولمافي الحلبي:(ص۵۴۷،طبع سهيل اكيڈمي)

اعلم ان صلوة الجمعة فرض عين على كل من استكمل شرائط وجوبها دل على فرضيتها الكتاب وهو قوله تعالىٰ فاسعوا الىٰ ذكر الله وذروا البيع.

ولمافي تنوير الابصار:(۱۵۲/۲-۱۵۳،طبع سعيد)

و شرط لافتراضها اقامة بمصر وصحة وحرية وذكورة وبلوغ وعقل ووجود بصر وقدرته على المشي وعدم حبس وخوف ومطر شديد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۳ رجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر ۱۶۸۴

## ﴿عورتوں پر نماز جمعہ اور عیدین واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ابھی تک ہم عورتیں اپنے گھروں میں جمعہ کے دن جمعہ کی نماز پڑھتی تھیں کہ کسی عورت نے بتایا کہ عورتوں پر جمعہ کی نماز فرض نہیں ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا عورتوں پر جمعہ اور عیدین کی نماز فرض ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نماز جمعہ امام اور خطیب کے بغیر ادا نہیں ہوتی اور عورتوں پر جمعہ کا اہتمام اور عیدین کی نماز میں حاضری واجب نہیں ہے، جمعہ کے دن بھی وہ اپنے گھروں میں ظہر کی نماز ادا کریں اور ابھی تک جمعہ کے دن اپنے گھروں میں چار رکعت فرض کے بجائے اگر دو رکعت جمعہ کی پڑھی ہے تو ایسی نمازوں کا اعادہ ضروری ہے اور توبہ واستغفار کرتی رہیں۔

لما في المختصر القدوري:(ص ۵۳-۵۴،طبع قديمي)

لا تصح الجمعة الا في مصر جامع أو في مصلىٰ المصر ولا تجوز في القرىٰ ولا تجوز اقامتها الا لسلطان أو لمن امره السلطان...... ومن شرائطها الجماعة واقلهم عندابي حنيفةؒ ثلاثة سوىٰ الامام...... ولا تجب الجمعة على مسافر ولا امرأة ولا مريض ولا صبي ولا عبد ولا اعمىٰ فان حضروا وصلوا مع الناس اجزأهم عن فرض الوقت.

ولما في كنز الدقائق:(ص ۴۳-۴۴-۴۵،طبع قديمي)

شرط ادائها المصر وهو كل موضع له امير وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود او مصلاه ومنا مصر لا عرفات وتؤدى في مصر في مواضع والسلطان اونائبه ووقت الظهر فتبطل بخروجه والخطبة قبلها وتسن ...... والجماعة وهم ثلاثة فان نفروا قبل سجوده بطلت والاذن العام وشرط وجوبها الاقامة والذكورة والصحة والحرية وسلامة العينين والرجلين تجب صلوٰة العيد علىٰ من تجب عليه الجمعة بشرائطها سوى الخطبة.

واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان سواتی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر ۱۲۲۲

۱۶ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

## ﴿دوران خطبہ منکر کام سے روکنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ نماز جمعہ کے لئے بچے مسجد میں آتے ہیں اور دوران خطبہ مسجد میں شور کرتے ہیں اور بھاگتے دوڑتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ جنھیں مسئلہ معلوم نہیں ہوتا وہ بھی دوران خطبہ باتیں کرتے رہتے ہیں، آیا ان سب کو دوران خطبہ منع کرنے کی گنجائش ہے؟

مستفتی: راشد خان ہری پور

﴿جواب﴾ دوران خطبہ باتیں کرنے والوں کو اور بھاگنے دوڑنے والے بچوں کو صرف اشارے سے روکنا جائز ہے، آواز دینے کی اجازت نہیں ہے، والدین کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو مسجد کے آداب اور خطبہ سننے کی اہمیت بھی بتایا کریں۔

لما في الهندية:(۱/۱۴۷،طبع رشيديه)

ومنهم من قال لا باس به واذالم يتكلم بلسانه ولكنه اشار بيده او برأسه اوبعينه نحو ان رأى منكرا من انسان فنهاه بيده اواخبر بخبر فأشار برأسه الصحيح انه لاباس به.

ولما في البحر الرائق:(۲/۱۵۶،طبع سعيد)

ويصح وقت الخطبة ولو لم يتكلم لكن اشار بيده اوبعينه حين رأى منكرا الصحيح انه لاباس به.

ولما فی التاتارخانیۃ:(۲/۵۲،طبع قدیمی)

اختلف المشائخ ایضا انہ اذالم یتکلم بلسانہ ولکنہ اشار براسہ او بیدہ او بعینہ ان رای منکرا من انسان فنہاہ بیدہ او اخبر بخبر فاشار براسہ ھل یکرہ ذلک ام لا؟فمن اصحابنا من کرہ ذلک وسوی بین الاشارۃ والتکلم باللسان والصحیح انہ لاباس بہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفااللہ عنہ

۴: جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر ۱۵۵۹

## ﴿قریۂ صغیرۃ میں نماز جمعہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں ۱۱۰ گھروں پر مشتمل ہے جسمیں بالغ افراد کی تعداد تین سو پچاس (۳۵۰) کے قریب ہے، خورد ونوش کی کچھ دکانیں ہیں لیکن باقاعدہ بازار نہیں ہے جبکہ بجلی، سڑک، ڈاکخانہ اور ہسپتال جیسی بنیادی ضروریات زندگی بھی نہیں ہیں گاؤں کے لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ایک گروہ یہاں پر جمعہ کے وجوب کا قائل ہے جبکہ دوسرا اسکے برعکس ہے جو حضرات جمعہ کے وجوب کے قائل ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کا قول ''جہاں پچاس آدمی ہوں وہاں جمعہ پڑھنا واجب ہے'' کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ظاہری بات ہے کہ وہ بھی بہت بڑے عالم ہیں جس میں کسی کو شک نہیں ہے براہ کرم ایسا جواب مرحمت فرمائیں جس سے مسئلہ واضح ہو جائے اور آپس کا انتشار بھی ختم ہو جائے۔

﴿جواب﴾ نماز جمعہ کے درست ہونے کیلئے شہر یا بڑے گاؤں کا ہونا ضروری ہے چھوٹے گاؤں، دیہات میں نماز جمعہ درست نہیں ہے اور بڑا گاؤں وہ ہے جسمیں دو چار ہزار افراد رہتے ہوں اور وہاں ضروریات زندگی بھی پائی جاتی ہوں جسکی صراحت ہمارے اکابر علماء دیوبند نے اپنے فتاویٰ میں کی ہے چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ؒ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اگر کل آبادی اور مردم شماری ہندو و مسلم کی اس قریہ میں تین چار ہزار آدمیوں کی ہے اور ضروری اشیاء وہاں دستیاب ہوں تو وہ قریہ کبیرہ مثل قصبہ کے ہے، جمعہ اس میں فرض ہے اور ادا ہو جاتا ہے، جیسا کہ شامی باب الجمعہ میں ہے: وتقع فرضا....(عزیز الفتاوی ۱/۱۹۱)

اسی طرح فقیہ ملت مفتی محمود ؒ نے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

"صحت جمعہ کیلئے مصر اور قریہ کبیرہ ہونا شرط ہے جسکی آبادی تین چار ہزار کے قریب ہو اور ضروریات کی تمام اشیاء وہاں میسر ہوں لوگ اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے وہاں رجوع کرتے ہوں" (فتاویٰ مفتی محمود ۲/ ۳۷۱)

اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی گاؤں میں نماز جمعہ کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر اس گاؤں کی آبادی تین چار ہزار افراد سے کم ہے اور وہاں تمام ضروریات معاش نہیں ملتیں تو وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز درست نہیں پس اس صورت میں زید کو وہاں جمعہ و عیدین نہ پڑھنا چاہیے اور جو لوگ پڑھتے ہیں ان سے منازعت اور جھگڑا بھی نہ کرنا چاہئے ہاں نرمی سے عقلاء کو سمجھا دیا جائے" (امداد الاحکام ۱/ ۷۹۸ دار العلوم کراچی)

لہذا مذکورہ گاؤں جس کے سکان کی تعداد تین سو پچاس کے لگ بھگ ہے اور ضروریات بھی تقریباً مفقود ہیں، میں نماز جمعہ صحیح نہیں ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ اگر چہ بلاشبہ بہت بڑے عالم اور ہم سب کیلئے مقتدیٰ ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ کے مقام تک تو نہیں پہنچ سکتے آپ کے اس بات کا جواب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یوں دیا ہے۔

"سائل کو معلوم ہونا چاہئے کہ شاہ ولی اللہؒ...... کو ہم امام شافعی و امام مالک و امام احمد بن حنبلؒ کی خاک پاء کے برابر بھی نہیں سمجھتے تو جب ہم نے اس مسئلہ میں ان ائمہ ثلاثہؒ کے قول کے خلاف ابوحنیفہؒ کا قول اختیار کیا ہے کیونکہ روایۃً و درایۃً ان کا قول ہمارے نزدیک صحیح ہے تو ہم ان متاخرین کے قول کو اس کے مقابلہ میں کب تسلیم کر سکتے ہیں ان کے اقوال کو ائمہ اربعہ کے اقوال سے کیا نسبت ہے، کچھ نہیں، اگر ان کی تحقیق امام ابوحنیفہؒ کے خلاف ہے، ہوا کرے ہم نے ان کی تقلید کا التزام نہیں کیا" (امداد الاحکام ج ۱/ ۷۳۰ طبع دار العلوم کراچی)

لما فی البحر الرائق: (۲/ ۱۴۰ طبع: سعید)

قوله شرط أدائها المصر) ای شرط صحتها أن تودی في مصر حتى لا تصح في قرية ولا مفازة لقول علیؓ "لا جمعة ولا تشريق ولا صلوة فطر ولا أضحى الا في مصر جامع أو في مدينة عظيمة" رواه ابن أبي شيبة وصححه ابن حزم وكفى بقوله قدوة واماماً واذا لم تصح في غير المصر فلا تجب على غير أهله.

ولما فی غنیة المستملی: (۵۴۳،طبع: نعمانیه)

الشرط الأول المصر أو فنائه فلا تجوز فی القری عندنا وهو مذهب علی بن أبی طالبؓ وحذیفه وعطاء والحسن بن أبی الحسن والنخعی ومجاهد وابن سرین والثوری وسحنون خلافاً للائمة الثلثةؒ.

ولما فی رد المحتار: (۲/ ۱۳۸، طبع: سعید)

وفیما ذکرنا اشارة الی أنه لا تجوز فی الصغیرة التی لیس فیها قاض ومنبر وخطیب کما فی المضمرات والظاهر أنّه أرید به الکراهة لکراهة النقل بالجماعة؛ألا تری أن فی الجواهر لو صلوا فی القری لزمهم أداء الظهر وهذا اذا لم یتصل به حکم.

ولما فی بدائع الصنائع: (۱/ ۲۵۹،طبع: سعید)

لا یصح أداء الجمعة الا فی المصر وتوابعه فلا تجب علی أهل القری التی لیست من توابع المصر ولا یصح أداء الجمعة فیها.

ولما فی الفتاوی الهندیة: (۱/ ۱۴۵ طبع: رشیدیة)

ومن لا تجب علیهم الجمعة من أهل القری والبوادی لهم أن یصلّوا الظهر بجماعة یوم الجمعة بأذان واقامة

ولما فی المحیط البرهانی: (۲/ ۴۳۸،طبع: ادارة القرآن)

لأن المکان مصر فیه بالاجماع حتی لا یجوز اقامة الجمعة فی البوادی بالاجماع.

ولما فی خلاصة الفتاوی: (۱/ ۲۰۷، طبع:رشیدیة)

ومنها المصر حتی لم یجب علی أهل القری

ولما فی الدر مع الرد: (۲/ ۱۶۷،طبع: سعید)

صلوٰة العید فی القری تکره تحریماً أی لأنه اشتغال بما لا یصح لأنّ المصر شرط الصحة ، قال العلامة الشامیؒ (قوله صلوٰة العید) ومثله الجمعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: علی حیدر چارسدوی

۶ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۹۳

## ﴿چھوٹی بستی میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں، علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ہماری تشکیل ٹھٹھہ کی ایک چھوٹی سی بستی میں ہوئی جو چند گھرانوں پر مشتمل ہے، وہاں جانے کے بعد جمعہ کے روز ہمارا ارادہ ظہر پڑھنے کا تھا لیکن پتہ چلا کہ وہاں سالہا سال سے جمعہ کی نماز پابندی سے پڑھی جارہی ہے، چنانچہ مقامی لوگوں نے ہم میں سے ایک ساتھی کو جمعہ پڑھانے کے لئے آگے کر دیا،

پوچھنا یہ ہے کہ ایسی جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور پڑھنے کی صورت میں ظہر کی نماز انکے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد بابر کراسنگ کراچی

﴿جواب﴾ وجوب جمعہ کے لئے شہر یا قریہ کبیرہ کا ہونا شرط ہے، قریہ کبیرہ سے مراد ایسی بستی جو کم از کم دو تین ہزار افراد پر مشتمل ہو، نیز وہاں خرید و فروخت کے لئے کافی دکانیں ہوں جن میں ضروریات زندگی میسر ہوں اور گلیاں کوچے ہوں، مسائل بتانے کے لئے کوئی عالم ہو تو وہاں جمعہ پڑھنا جائز ہے۔

سوال مذکور میں جس بستی کا ذکر ہے یہ نہ شہر ہے اور نہ قریہ کبیرہ، ایسی چھوٹی بستی میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے، لہٰذا مقامی لوگوں پر لازم ہے کہ ظہر کی نماز باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کرلیں اور آپ لوگوں نے چونکہ نماز پڑھائی ہے تو صحیح مسئلہ بتانا بھی آپ کے ذمہ ہے۔

لما فی التنویر وشرحه :(۱۳۸/۱۳۷/۲، طبع سعید)

(ویشترط لصحتها المصر وهو مالا یسع أکبر مساجده أهله المکلفین بها) وعلیه فتوی أکثر الفقهاء

ولما فی الشامیة:(۱۳۸-۱۳۷/۲ طبع سعید)

عن ابی حنیفةؒ انه بلدة کبیرة فیها سکک واسواق و لها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم بحشمته وعلمه اوعلم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث......الیٰ ان قال وعبارة القهستانی تقع فرضًا فی القصبات والقری الکبیرة التی فیها اسواق ..... الی ان قال فیما ذکرنا اشارة الیٰ انه لا یجوز فی الصغیرة التی لیس فیها قاض ومنبر خطیب کما فی المضمرات، والظاهر اريد به الکراهة لکراهة النفل بالجماعة الا تری ان فی الجواهر،لوصلوا فی القری لزمهم اداء الظهر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲ صفر الخیر ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۱۴۳

## ﴿شہر سے دور الگ آبادی میں رہنے والے کے متعلق جمعہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک گاؤں جس میں جمعہ کی نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے، اس کے مضافات میں جو لوگ دو، تین کلومیٹر کی مسافت پر رہتے ہیں ان کے لیے نماز جمعہ میں شریک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالحق اٹک

﴿جواب﴾ نماز جمعہ اسی آبادی میں موجود لوگوں پر فرض ہے جس میں اقامت جمعہ کا حکم

ہے لہٰذا آبادی سے باہر دوسری الگ آبادیوں میں رہنے والوں کے لیے اس بڑی آبادی میں آنا کوئی ضروری نہیں ہے البتہ نماز جمعہ کے لیے بڑی آبادی میں آکر نماز جمعہ میں شامل ہو جائیں تو زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔

لما فی تنویر الابصار ۱۵۳/۲ طبع سعید)

(وشرط لافتراضها )تسعة تختص بها (اقامة بمصر)وأما المنفصل عنه فان كان يسمع النداء تجب عليه عند محمد وبه يفتى كذا فى الملتقى ،وقدمنا عن الولوالجية تقريره بفرسخ ورجح فى البحر اعتبار عوده لبيته بلا كلفة

ولما فى الرد المحتار ۱۵۳/۲ طبع سعيد)

(قوله اقامة )خرج به المسافر وقوله .بمصر اخرج الاقامة فى غيره الا ما استثنى بقوله فان كان يسمع النداء (قوله يسمع النداء)أى من المنابر بأعلى صوت كما فى القهستانى (قوله وقدمنا)فيه ان ما مر عن الو لوالجية فى الحد الفناء الذى تصح اقامة الجمعه فيه والكلام ههنا فى حد المكان الذى من كان فيه بينه وبين المصر فرسخ يلزمه حضور الجمعة وهو المختار للفتوى.

قلت:وينبغى تقييد ما فى الخانية والتاتارخانية بما اذا لم يكن فى فناء المصر لما مر انها تصح اقامتها فى الفناء ولو منفصلا بمزارع فاذا صحت فى الفناء لانه ملحق بمصر يجب على من كان فيه ان يصليها لانه من اهل المصر كما يعلم من تعليل البرهان .

ولما فى قاضى خان ۱۵۵/۱ قديمى كتب خانه)

وكما يجوز اداء الجمعة فى المصر يجوز ادائها فى فناء المصر ،وفناء المصر هو الموضع المعد لمصالح المصر المتصل به ،ومن كان مقيما فى عمران المصر وأطرافه وليس ذلك الموضع وبين المصر فرجة من المزارع والمراعى نحو القلع ببخارى ،فلا جمعة على اهل ذلك الموضع ،وان كان النداء يبلغهم ،والغلوة والميل والاميال ليس بشىء ،هكذا روى الفقيه ابوجعفر عن ابى حنيفة وابى يوسف رحمهما الله وهو اختيار شمس الأئمة الحلوانى".

ولما فى البحر الرائق ۱۴۱/۲ طبع سعيد)

واختلفوا فى ما يكون من توابع المصر فى حق وجوب الجمعة على اهله فاختار فى الخلاصة والخانية انه الموضع المعد لمصالح المصر متصل به ومن كان مقيما فى عمران المصر واطرافه وليس بين ذلك الموضع وبين عمران المصر فرجة فعليه الجمعة ولو كان بين ذلك الموضع وبين عمران المصر فرجة من مزارع او مراع كالقلع ببخاره لا جمعة على اهل ذلك الموضع وان سمعوا النداء والغلوه والميل والاميال ليس بشرط ،واختار فى البدائع ما قاله بعضهم انه ان امكنه ان يحضر الجمعة ويبيت باهله

من غير تكلف تجب عليه الجمعة والا فلا قال وهذا احسن.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۱۳

## ﴿جس جگہ جمعہ کی شرائط نہ پائی جائیں وہاں جمعہ پڑھنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی علاقے میں جمعہ کی شرائط پوری نہ ہوں اور لوگ وہاں جمعہ پڑھ رہے ہوں اور ہم لوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ وہاں جائیں تو کیا ان کے ساتھ جمعہ پڑھیں یا اپنی ظہر کی نماز الگ سے پڑھیں؟ نیز مقامی لوگ ہمیں جمعہ پڑھانے کو کہیں تو کیا ہم جمعہ کی دو رکعت پڑھا سکتے ہیں؟ مستفتی: حبیب الرحمٰن بلوچستان

﴿جواب﴾ جس علاقے میں جمعہ کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں وہاں جمعہ پڑھنا ہی درست نہیں مقامی لوگوں کے ذمہ لازم ہے کہ ظہر کی نماز با جماعت پڑھنے کا اہتمام کریں ورنہ ظہر کی نماز انکے ذمہ سے ساقط نہیں ہوگی، ایسی جگہ جماعت کی تشکیل ہو جائے تو جمعہ کی نماز پڑھنے سے ان کے ذمہ سے بھی ظہر کی نماز ساقط نہ ہوگی، جماعت کے امیر صاحب مناسب سمجھیں تو مقامی لوگوں کو بھی مسئلہ بتادیں کہ ایسی چھوٹی بستی میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی اور مقامی لوگوں کو مسئلہ بتانے میں فتنہ یا توڑ کا اندیشہ ہو تو خاموشی اختیار کریں، ضرورت معلوم ہو تو جمعہ کی نماز میں بھی نوافل کی نیت سے شرکت کرلیں بعد میں انفرادی طور پر ظہر کی فرض نماز ادا کرلیں لیکن پڑھانے سے معذرت کرنے میں کوئی فتنہ وغیرہ کا اندیشہ نہیں ہے اور نہ اس کی اجازت معلوم ہو رہی ہے۔

لما في رد المحتار: (۱۳۸،۱۶۷/۲ طبع سعید)

صلاة العيد في القرى تكره تحريما أي لانه اشتغال بما لا يصح، لان المصر شرط الصحة وملله الجمعة ــــ ألا ترى في الجواهر: لو صلوا في القرى لزمهم اداء الظهر.

ولما في الهندية: (۱۴۵/۱ طبع رحمانيه)

ومن لا تجب عليهم الجمعة من أهل القرى والبوادي لهم أن يصلوا الظهر بجماعة يوم الجمعة باذان واقامة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۲۶

## ﴿حكم اداء الجمعة في بلاد الكفار﴾

## ﴿کافروں کے ملک میں جمعہ کی ادائیگی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ الیٰ ساداتی الکرام دام اقبالهم السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته وبعد المشاهد في بلاد الكفار هو اداء الجمعة مع ان السلطان احد من شرائط ادائها عند الحنفية فهل يسع للمسلمين ان يقيموا الجمعة في بلاد الكفار والحال ما ذكرنا؟

﴿جواب﴾ الشرط الاصلي عند الحنفية هو المصر ولاجل ان الجمعة لاتكون في المصر الا باذن السلطان ذكرها الفقهاء شرطا برأسه مع التصريح منهم بان الامام اذا منع الناس عن اداء الجمعة تعنتا او لقصد الضرر بهم او لم يكن الامام فاجتمعت العامة على تقديم رجل جاز لمكان الضرورة.

لما في خلاصة الفتاوى مع مجموعة الفتاوى: (۱۶۳/۱ طبع رشيديه)

اما آنچه که بذهن عوام می رسد کی در کتب حنفیة از شرائط اداء جمعه سلطان مذکور است پس مدفوع است به این وجه که در جامع الرموز می نویسد السلطان ای الخليفة ای للوالي الذي فوقه والي عادلا كان او جائرا والاطلاق مشعر بان الاسلام ليس بشرط وهذا اذا امكن استئذانه والا فالسلطان ليس بشرط حتى لو اجتمعوا على رجل وصلوا جاز.

ولما في البحر الرائق: (۱۴۳/۲ طبع سعيد)

لو اجتمعت العامة على تقديم رجل لم يأمره القاضي ولا خليفة الميت لم يجز ولم تكن جمعة ولو لم يكن ثمة قاض ولا خليفة الميت فاجتمع العامة على تقديم رجل جاز للضرورة ـــ قال الفقيه ابو جعفر هذا اذا نهاهم مجتهدا بسبب من الاسباب واراد ان يخرج ذلك المصر من ان يكون مصرا اما اذا نهاهم متعنتا او اضرارا بهم فلهم ان يجمعوا على رجل يصلي بهم الجمعة.

ولما في رد المحتار: (۱۴۴/۲-۱۴۵-۱۴۶ طبع سعيد)

(ونصب العامة) الخطيب (غير معتبر مع وجود من ذكر) اما مع عدمهم فيجوز للضرورة.

ولما في الشامي: (۱۴۳/۲-۱۴۴ طبع سعيد)

(قوله فيجوز للضرورة) ومثله ما لو منع السلطان اهل مصر ان يجمعوا اضرارا وتعنتا فلهم ان يجمعوا على رجل يصلي بهم الجمعة اما اذا اراد ان يخرج ذلك المصر من ان يكون مصرا لسبب من الاسباب فلا كما في البحر ملخصا عن الخلاصة. (تتمه) في معراج الدراية عن المبسوط البلاد التي في ايدي الكفار بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانهم لم يظهروا فيها حكم الكفر بل القضاة والولاة مسلمون يطيعونهم عن ضرورة او

بدونهما وكل مصر فيه والٍ من جهتهم يجوز له اقامة الجمع والاعياد والحد وتقليد القضاء لاستيلاء المسلم عليهم فلو الولاة كفارا يجوز للمسلمين اقامة الجمعة ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم ان يلتمسوا واليا مسلما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الدین غفر اللہ لہ

ا ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۲۹

## ﴿خطبہ سننے کیلئے کس طرح بیٹھنا چاہئے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خطبہ سننے کیلئے کسطرح بیٹھنا چاہئے؟ بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ پہلے خطبہ میں زیر ناف ہاتھ باندھتے ہیں اور دوسرے خطبہ کے دوران گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہیں، اس طرح کرنا شرعاً کیسا ہے؟ مستفتی: احسان اللہ سواتی

﴿جواب﴾ خطبہ سننے کیلئے جس طرح بیٹھنے میں سہولت ہو بیٹھ سکتا ہے، البتہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ التحیات کیلئے جس طرح بیٹھا جاتا ہے اس طرح ہیئت بنانے کا اہتمام کرے لیکن پہلے خطبہ میں زیر ناف ہاتھ رکھنا اور دوسرے میں گھٹنوں پر شرعاً اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

لما في الهندية: (۱/۱۶۳ طبع قديمی)

اذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبيا أو متربعا أو كما تيسر لانه ليس بصلاة عملا وحقيقة كذا في المضمرات. ويستحب أن يقعد فيها كما يقعد في الصلاة كذا في الدراية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۵۶۱

## ﴿جمعہ کی سنتوں میں کیا نیت کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جمعہ میں جمعہ کی سنتوں کی نیت کرے گا یا ظہر کی سنتوں کی نیت کرے گا؟ مستفتی: نصیر صاحب کشمیری

﴿جواب﴾ جمعہ کی سنتوں میں جمعہ کی نیت کرے یا ظہر کی دونوں صحیح ہے سنت اور نفل نماز میں تو صرف اتنا قصد کافی ہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں وقت کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ تعداد رکعات کی۔

لمافی التنویر وشرحہ:(۱/۴۱۷،طبع سعید)

وکفی مطلق نیة الصلاة وان لم یقل لله لنفل و سنة راتبة و تراویح علی المعتمد.

وفی الشامیة: وکفی ای بان یقصد الصلاة بلاتقیدنفل أوسنة أو عدد.

ولمافی الهدایة:(۱/۹۵،طبع رحمانیه)

ثم ان کانت الصلاة نفلاًیکفیه مطلق النیة وکذااذا کانت سنة فی الصحیح.

ولمافی الکفایة:(۱/۸۷،طبع رشیدیه)

وکذاان کانت سنة فی الصحیح ذکر المصنفؒ فی التجنیس وقال فی السنن یکفیه مطلق النیة علی ظاهرالراویه و هواختیار عامة المشائخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن عفااللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۱۴

## ﴿کسی عذر کی وجہ سے خطبہ اور نماز جمعہ کے درمیان فصل کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید جمعہ کا خطبہ دے رہا تھا خطبہ کے بعد محسوس ہوا کہ وضوٹوٹ گیا ہے، احتیاطاً دوبارہ وضو کیا، پوچھنا یہ ہے کہ نماز جمعہ سے پہلے خطبہ دینا دوبارہ ضروری ہے یا وہی خطبہ کافی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں وہی خطبہ کافی ہے اس جیسے فصل سے خطبہ جمعہ کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ دنیوی کام کی وجہ سے فصل واقع ہو تو مکروہ ہے۔

لما فی التنویر وشرحہ:(۲/۱۶۱-۱۶۲،طبع سعید)

فاذاأتم أقیمت و یکره الفصل بامر الدنیاذکره العینی وفی رد المحتار قوله بامر الدنیاما ینهی عن منکر اوأمر بمعروف فلاوکذاهو ضوء أو غسل لو ظهر أنه محدث أو جنب کما مر بخلاف اکل أو شرب حتی لو طال الفصل أستانف الخطبة کما مر

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن عفااللہ عنہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۸۷

## ﴿خطبہ کا سننا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جیسا کہ جمعہ کے خطبہ کے دوران نماز پڑھنا، ذکر کرنا، قرآن مجید کی تلاوت کرنا کسی کو خاموش کرنا وغیرہ نیک اعمال ممنوع

ہیں، کیا یہی حکم خطبہ عیدین اور خطبہ نکاح میں بھی ہے؟ مستفتی: عبداللہ راشد، اوکاڑہ

﴿جواب﴾ خطبہ جمعہ کا ہو یا عیدین ونکاح کا ہو خاموشی سے سننا ضروری ہے اور اس دوران مذکورہ تمام اعمال ممنوع ہیں۔

لما فی التنویر وشرحہ:(۱۵۹/۲،طبع سعید)

وكل ما حرم في الصلاة حرم فيها أي في الخطبة خلاصة وغيرها فيحرم اكل و شرب وكلام ولو تسبيحا أو رد سلام أو امرا بمعروف بل يجب عليه ان يستمع ويسكت ..... والاصح انه لا باس بان يشير برأسه او يده عند روية منكر والصواب انه يصلي على النبي ﷺ عند سماع اسمه في نفسه ولا يجب تشميت ولا رد سلام به يفتي وكذا يجب الاستماع لسائر الخطب كخطبة نكاح وخطبة عيد وختم على المعتمد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد حسن پورنوی

۸ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۵۴

## ﴿فصل فی العیدین﴾

### ﴿عید کے دن کے مسنون اعمال﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے دن کے مسنون اعمال کون سے ہیں؟

﴿جواب﴾ عیدالفطر کے دن مندرجہ ذیل اعمال مسنون ہیں: (۱) صبح کو بہت سویرے اٹھنا (۲) حسب استطاعت عمدہ لباس پہننا (۳) غسل کرنا (۴) خوشبو لگانا (۵) مسواک کرنا (۶) عیدگاہ میں سویرے جانا (۷) عیدگاہ جانے سے قبل کوئی میٹھی چیز کھانا افضل یہ ہے کہ طاق عدد میں کھجور کھالے (۸) عیدگاہ جانے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرنا (۹) عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا (۱۰) عیدگاہ جانے کے لیے ایک راستہ اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا (۱۱) پیدل جانا (۱۲) راستے میں تکبیر تشریق "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" آہستہ آواز سے پڑھتے ہوئے جانا (۱۳) خوشی کا اظہار کرنا (۱۴) ملاقات کے وقت مبارک باد یا دعائیہ کلمات کہنا۔

لما فی نورالایضاح مع مراقی الفلاح:(ص:۱۱۹،باب العیدین مطبع قدیمی)

وندب في الفطر ثلاثة عشر شيئا، ان ياكل بعد الفجر قبل ذهابه للمصلى شيئا

حلوا وندب ان یکون الماکول تمراً ویغتسل ویستاك ویتطیب ویلبس احسن ثیابه التی یباح لبسها ویؤدی صدقة الفطر ان وجبت علیه قبل خروجه الناس الی الصلوۃ والتبکیر وهو سرعة الانتباه والابتکار وهو المسارعة الی المصلی ثم یتوجه الی المصلی ماشیاً مکبراً سراً ویرجع من طریق آخر.

ولما فی البحر الرائق:(۱۵۸/۲، ۱۵۹،طبع سعید)

وأن یظهر فرحاً ــ والتهنئة بقوله تقبل الله منا ومنکم لاتنکر ــ والخروج الی الجبانة سنة لصلاۃ العید وان کان یسعهم المسجد الجامع.

عید الاضحیٰ میں بھی وہ سب چیزیں مسنون ہیں جو عید الفطر میں ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ عید الفطر میں عیدگاہ جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھانا مسنون ہے اور عید الاضحیٰ میں نہیں، اور عید الفطر میں راستے میں چلتے وقت آہستہ آہستہ تکبیر کہنا مسنون ہے جبکہ عید الاضحیٰ میں کچھ بلند آواز سے۔

لما فی البحر الرائق:(۱۶۳/۲،طبع سعید)

الاحکام المذکورۃ لعید الفطر ثابتة لعید الاضحی صفة وشرطاً ووقتاً ومندوباً لکن هنا یؤخر الاکل عنها ویکبر فی الطریق جهراً.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

یکم رجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۲۱

## ﴿نماز عید، عیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے یا مسجد میں؟﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں عید کی نماز کے لیے کچھ لوگوں نے سرکاری سکول کے ساتھ سرکاری گراؤنڈ مقرر کر رکھا ہے اور کچھ لوگ نماز عید مسجد میں پڑھتے ہیں دونوں طرف علمائے کرام ہیں، مسجد میں پڑھنے والے کہتے ہیں کہ سرکاری گراؤنڈ میں نماز جائز نہیں اور گراؤنڈ میں نماز پڑھنے والے کہتے ہیں کہ مسجد میں نماز عید درست نہیں، اب دونوں میں سے کس کی نماز درست ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں دونوں فریقوں کی نماز درست ہے، البتہ سنت طریقہ یہ ہے کہ عید کی نماز ضعفاء اور معذوروں کے علاوہ سارے محلے والے باقاعدہ عیدگاہ میں جا کر ادا کریں اور سرکاری گراؤنڈ کے ذمہ دار افسران کی طرف سے ممانعت نہ ہو تو عیدگاہ کے حکم میں ہے۔

لما فی الهندیة:(۱۶۵/۱،طبع قدیمی)

والخروج الی الجبانة فی صلاۃ العید سنة وان کان یسعهم المسجد الجامع وعلی هذا

عامة المشائخ هو الصحيح وتجوز اقامة صلاة العيد في موضعين.

ولما في التنوير مع الرد:(۲/۱۶۸-۱۶۹،طبع سعيد)

لم خروجه ماشيا الى الجبانة ... سنة وان وسعهم المسجد الجامع. وفي الشامية: وفي الخلاصة: السنة ان يخرج الامام الى الجبانة ويستخلف غيره ليصلي في المصر بالضعفاء بناء على ان صلاة العيد ين في موضعين جائزة بالاتفاق.

واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ
الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
فتویٰ نمبر: ۴۰۴۵
۲۰ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ

## ﴿ایک ہی جگہ دو مرتبہ نماز عید پڑھنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مرتبہ عید کی نماز ایک مسجد میں تعصب کی وجہ سے دو مرتبہ ہوتی ہے کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟ مستفتی: رضوان اللہ

﴿جواب﴾ دین اسلام میں امت کا آپس میں اتفاق واتحاد انتہائی ضروری اور مطلوب امر ہے، نماز جمعہ خصوصاً نماز عید کو بڑے سے بڑے اجتماع کے ساتھ ادا کرنے کی فقہاء کرام نے تاکید فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز عید آبادی سے باہر کسی بڑے میدان میں ادا کرنے کا حکم ہے تاکہ تمام لوگ ایک ساتھ ایک امام کی اقتداء میں نماز عید ادا کریں، البتہ بڑے بڑے شہروں میں چونکہ یہ ممکن نہیں رہا اس لئے مساجد میں بھی اس کی گنجائش دی گئی ہے۔

لہذا میدان ہو خواہ مسجد ایک ہی جگہ دو مرتبہ نماز عید ادا کرنا جائز نہیں ہے، عموماً صحیح العقیدہ اہلسنت والجماعت اور اہل بدعت کے درمیان اس طرح تفریق وانتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اہل حق کو چاہئے کہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ایک ہی نماز پر دونوں کو جمع کریں، بدعتی کی اقتداء میں بھی نماز ہو جاتی ہے اور تفریق سے بہتر بھی یہی ہے بشرطیکہ مشرک نہ ہو، اور ایسی کوئی صورت نہ بن سکے تو دوسری جگہ نماز عید کا بندوبست کریں ایک ہی جگہ دو مرتبہ نماز عید ادا نہ کریں۔

لما في قوله تعالى سورة الانفال آية: ۴۶

واطيعوا الله ورسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا ط ان الله مع الصابرين

وفي قوله تعالى سورة ال عمران آية: ۱۰۳ ﴿واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا﴾

ولما في البحر الرائق:(۲/۱۵۹ طبع: سعيد كراچی)

وفي التجنيس والخروج الى الجبانة سنة لصلوة العيد وان كان يسعهم المسجد

الجامع عند عامة المشائخ هو الصحيح ......حتىٰ لو صلّىٰ العيد في الجامع و لم يتوجّه الى المصلّىٰ فقد ترك السنّة.

ولما في التنوير مع الدُرّ:(۱۷۵/۲ طبع : سعيد)

(و لا يُصلّيها وحده ان فاتت مع الامام ) و لو بالا فساد اتفاقاً في الأصحّ كما في تيمّم البحر ،وفيها يلغز أي رجل افسد صلاة واجبة عليه ولا قضاء ؟ (و) لو امكنه الذهاب الى امام آخر فعل لأنّها (تؤدىٰ بمصر) واحد (بمواضع ) كثيرة (اتفاقاً) فان عجز صلّىٰ اربعاً كالضحىٰ.

وقال العلامه ظفر احمد العثمانيؒ تحت هذه العبارة في امداد الاحكام:(۷۳۲/۱ ،طبع دار العلوم كراچی)

قلت:قوله ولو أمكنه الذهاب الىٰ امام آخر يشير الىٰ انه لا يصلي في موضع واحد مرتين وكذا اقتصار الفقهاء على بيان الجواز في مواضع عديدة وسكوتهم عن ادائها في مواضع واحد مرتين يدل على ذالك فافهم.

ان عبارات فقہیہ سے یہ معلوم ہوا کہ نماز عید ایک موضع میں مکرر پڑھنا درست نہیں ہاں چند مواضع میں جائز ہے جیسا کہ جمعہ چند مسجدوں میں جائز ہے ایک موضع میں دو مرتبہ نماز عید اداء کرنے کی شریعت میں کوئی اصل ہماری نظر سے نہیں گزری، لہذا اس ابتداع سے بچنا چاہیے خصوصاً جبکہ اس کا منشاء محض نزع وخلاف وتفریق ہو۔(انتھی کلامه)۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۲۱ صفر الخیر ۱۴۲۴ھ | فتویٰ نمبر: ۳۵۴۰

## ﴿عیدین کی نماز کے بعد دعا کا حکم﴾

﴿سوال﴾ عیدین کی نماز کے بعد دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو خطبہ کے بعد کرنی چاہیئے یا نماز کے بعد؟ جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ عن ام عطية قالت أمرنا أن نخرج الحيض يوم العيدين وزوات الخدور فيشهدن جماعة المسلمين ودعوتهم وتعتزل الحيض عن مصلاهن......الخ (مشكوة ص ۱۲۵ ،طبع سعيد)

مندرجہ بالا حدیث سے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز عیدین کے وقت ایک اجتماعی دعا ہوتی تھی لیکن تخصیص کیساتھ یہ نظر سے نہیں گزرا کہ یہ دعا نماز عید کے بعد ہوتی تھی یا خطبہ کے بعد

تاہم عام قاعدہ کے مطابق نمازِ عیدین کے بعد ہی دعا کرنی چاہیئے نہ کہ خطبہ کے بعد، اسی طرح عمومات حدیث سے بھی دعا کا استحباب ثابت ہے لیکن اس کے باوجود نہ کرنے والوں پر طعن وتشنیع کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کو مستحب ہی کے درجہ میں رکھنا چاہیئے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب عفااللہ عنہ

۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:

## ﴿تکبیراتِ تشریق پڑھنا کن لوگوں پر واجب ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام تکبیرات ایام تشریق کے بارے میں کہ مصر، رجال اور جماعت مستحبہ وغیرہ شرط ہیں؟ جیسا کہ امام اعظم کا قول ہے یا مطلقا جن پر نماز فرض ہے ان پر تکبیرات تشریق واجب ہیں جیسا کہ صاحبین کا قول ہے چونکہ اکثر کتابوں میں فتویٰ مختلف دیا گیا ہے اسلئے دلائل سے وضاحت فرمائیں، بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ تکبیرات تشریق اہل مصر یعنی شہر والوں میں سے ہر بالغ، مقیم مرد پر جماعت مستحبہ سے پڑھی گئی ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے پس عورتوں، بچوں مسافروں بستی میں رہنے والوں اور نوافل یا تنہا فرض نماز پڑھنے والوں پر تکبیرات تشریق پڑھنا واجب نہیں ہے، یہی امام اعظم کا مذہب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور اگر پڑھ لیں تو کوئی حرج بھی نہیں ہے بلکہ اختلاف سے نکلنے کے لئے بہتر ہے۔

لمافی بدائع الصنائع:(۱۹۸/۱ طبع سعید)

لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لاجمعۃ ولاتشریق الا فی مصر جامع وقول علیؓ: لاجمعۃ ولاتشریق ولافطر ولااضحی الافی مصر جامع والمراد من التشریق ھو رفع الصوت بالتکبیر ھکذاقال النضر بن شمیل وکان من ارباب اللغۃ فیجب تصدیقہ.

ولمافی اعلاء السنن:(۸-۹/۱۵۵ طبع دارالکتب العلمیۃ بیروت)

والاستدلال بروایۃ ابن أرطاۃ علی اختصاص تکبیر للتشریق بأھل المصر صحیح کما ھو اصل المذھب فافھم." وقال فی الصفحۃ الأخری "ولایجوز حملہ علی صلوۃ العیدلان ذالک مستفاد بقولہ (ولا اضحی ولا فطر) وعلی الثاء لحوم الأضاحی بالمشرقۃ لان ذلک لا یختص بمکان دون مکان فتعین التکبیر مرادا بالتشریق ملخصا.

اسی طرح صاحب ہدایہ کے اسلوب سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے ہاں امام اعظم کا مذہب

راجح ہے کیونکہ انہوں نے امام اعظم کی دلیل کو مؤخر ذکر کیا جو راجح ہونے کی نشانی ہے، نیز اصحاب متون جیسے صاحب کنز اور قدوری وغیرہ نے صرف امام اعظم کا قول ذکر کر کے اسی پر اکتفاء کیا ہے جس سے ان حضرات کا رجحان امام اعظم کے موقف کی طرف معلوم ہوتا ہے رہی یہ بات کہ کتابوں میں فتوے مختلف دیئے گئے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دراصل امام اعظم اور صاحبین کے درمیان تکبیرات تشریق کے مسئلہ میں اختلاف دو طرح کا ہے:

(۱) وقت کے اندر کہ کب سے کب تک تکبیرات تشریق پڑھنا واجب ہے؟

(۲) یہ کہ کن لوگوں پر واجب ہے؟ بعض کتب جیسے شامی وغیرہ میں دونوں نوعیت کا اختلاف ایک ساتھ ذکر کر کے (وعلیہ الاعتماد) کہا ہے جس سے بعض حضرات نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ دونوں نوعیت کے اختلاف میں فتوی صاحبین کے قول پر ہے حالانکہ درست بات یہ ہے کہ وہاں صرف وقت کے مسئلہ کو لیکر (وعلیہ الاعتماد) کہا ہے کہ وقت کے مسئلہ میں فتوی صاحبین کے قول پر ہے، چنانچہ امداد الاحکام میں علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: (۱/۸۰)

"وتوهم منه رجوع قوله وعليه الاعتماد الى مجموع قولهما من بيان الوقت فقط، بدليل ما فى متن الدراية وتجب تكبيرات للتشريق من فجر عرفة عقيب كل فرض ادى بجماعة مستحبة على المقيم بالمصر ومقتديه برجل ومسافر مقتد بمقيم الى عصر العيد وقالا الى عصر اخر ايام التشريق وبه يعمل.

الغرض یہ مسئلہ کہ کن لوگوں پر تکبیرات تشریق واجب ہیں اور کن پر نہیں؟ سو کسی عربی کتاب میں بھی یہ صراحت نہیں ملی کہ اس مسئلہ میں بھی فتوی صاحبین کے قول پر ہے، البتہ البحر الرائق میں صرف السراج الوہاج اور الجوھرہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے لیکن یہ ایک صحیح حدیث اور کئی معتمد حضرات کی ترجیح کا معارض ہے اس لئے قابل حجت نہیں ہے، چنانچہ حدیث "لا جمعة ولا تشريق الخ" سے استدلال کر کے جمعہ وعیدین کو مصر کیساتھ خاص کرنا اور تکبیرات تشریق کو چھوڑنا (جبکہ وہاں تشریق سے مراد بھی تکبیرات تشریق ہی ہیں) حدیث کے ایک حصہ پر عمل اور دوسرے کو چھوڑنا ہے جو صریح ناانصافی ہے اسی طرح صاحب ہدایہ، صاحب خلاصہ، صاحب بدائع اور حضرت ابن امیر حاج جیسے اہل علم حضرات کی ترجیح کو صرف السراج اور الجوھرہ کے مقابلہ میں کیسے چھوڑا جا سکتا ہے پس درست بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وجوب کا فتوی تو علی

الاطلاق نہ دیا جائے، البتہ اختلاف سے نکلنے کے لئے پڑھنے کی ترغیب سب کو دیجائے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۱۴۳۹ھ — فتوی نمبر:

## ﴿نماز عید کے بعد تکبیرات تشریق پڑھنا مستحب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عید کی نماز کے بعد تکبیرات تشریق کہنے کی گنجائش ہے؟ حالانکہ فقہی عبارات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ تکبیرات تشریق ہر اس فرض نماز کے بعد واجب ہیں، جو باجماعت شہر میں ادا کی جائے، اور عید کی نماز واجب ہے نہ کہ فرض۔ مستفتی: ایک معلم

﴿جواب﴾ کتب فقہ کے متون میں ہے، کہ تکبیرات تشریق صرف فرض نماز باجماعت پڑھنے کہ بعد واجب ہیں، نماز عید فرض نہیں ہے، اس لئے عید کی نماز کے بعد تکبیرات تشریق پڑھنا واجب نہیں ہے، البتہ فتاوی میں عید کی نماز کے بعد پڑھنے کی گنجائش دی ہے، بلکہ مستحب قرار دیا ہے، لہذا کوئی پڑھے تو ثواب ملیگا، اور اگر چھوڑ دے تو گناہ نہیں ہوگا۔

لما فی البحر: (۱۶۵/۲، طبع: سعید)

"وقید بالمکتوبة احترازا عن الواجب کصلاة الوتر والعیدین وعن النافلة فلا تکبیر عقبها، وفی المجتبیٰ والبلخیون یکبرون عقب صلاة العید لأنها تؤدی بجماعة فأشبه الجمعةاھ وفی المبسوط أبی اللیث ولو کبر علی أثر صلاة العید لا بأس به لأن المسلمین توارثوا هکذا فوجب ان یتبع توارث المسلمین".

ولما فی التنویر مع الدر: (۱۸۰/۲، طبع: سعید)

"ولا بأس به عقب العید لأن المسلمین توارثوه فوجب اتباعهم وعلیه البلخیون. وفی الشامی تحت (قوله ولا بأس الخ) کلمة لا بأس قد تستعمل فی المندوب کما فی البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم (قوله فوجب) الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح علیه وفی البحر عن المجتبیٰ والبلخیون یکبرون عقب صلاة العید لأنها تؤدی بجماعة فأشبهت الجمعةاھ وهو یفید الوجوب المصطلح علیه".

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۶۵۶

## ﴿ایام تشریق کتنے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایام تشریق کتنے ہیں، اور اگر کوئی شخص نماز کے بعد تکبیر کہنا بھول جائے تو کیا اس پر قضاء ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ذوالحجہ کی تاریخیں ایام تشریق کہلاتی ہیں، عرفہ کے دن یعنی نویں ذی الحجہ کی نماز فجر سے ایام تشریق کی آخری تاریخ یعنی ۱۳ ذی الحجہ کی نماز عصر ہر فرض نماز کے فوراً بعد ایک مرتبہ تکبیر تشریق کہنا واجب ہے، مرد حضرات بلند آواز سے پڑھیں اور خواتین آہستہ آواز کے ساتھ، واجب صرف ایسے نمازیوں پر ہے جن پر جمعہ وعیدین واجب ہے خواتین پر، دیہاتیوں پر واجب نہیں ہے البتہ پڑھنا باعث ثواب ہے، سلام پھیرنے کے فوراً بعد تکبیرات تشریق اداء کرنی چاہیے اگر بات چیت کی یا جان بوجھ کر وضو توڑ ڈالا تو تکبیر تشریق ساقط ہو جائیں گی بعد میں اس کی قضاء نہیں ہے توبہ واستغفار کریں۔

اگر ایام تشریق کے دوران کوئی نماز فوت ہوگئی اور اسی سال ایام تشریق کے دوران اداء کرنے کی توفیق ہوئی تو اس صورت میں بھی فرض نماز کے فوراً بعد تکبیر تشریق کہنا لازم ہے ایام تشریق گذرنے کے بعد تکبیرات پڑھنے کا موقع نہیں رہتا۔

لما فی الهندیه:(۱/۱۵۲، الباب السابع عشر فی صلاة العیدین ،طبع رشیدیه)

اما عدده وما هیته فهو ان یقول مرة واحدة "الله اکبر الله اکبر لااله الاالله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد" ...واما وقته فاوّله عقیب صلاة الفجر من یوم عرفة وآخره فی قول ابی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ عقیب صلاة العصر من آخر ایام التشریق هکذا فی التبیین والفتوی والعمل فی عامة الامصار وکافة الاعصار علی قولهما کذا فی التهذیب ـ ومن نسی صلاة من ایام التشریق فذکرها فی ایام التشریق من تلک السنة قضاها وکبر کذا فی الخلاصة ـ واذا فاتته صلاة قبل هذه الایام قضاها فیها لایکبر وکذا لو فاتته صلاة فی ایام التشریق قضاها فی غیر ایام التشریق او قضاها فی ایام التشریق من قابل لایکبر عقیبها ـ والمرأة تخافت بالتکبیر.

ولما فی بدائع الصنائع:(۱/۱۹۸، طبع سعید)

واما بیان مایجب علیه ـ فلایجب علی النسوان والصبیان والمجانین والمسافرین واهل القری لقول النبی ﷺ لاجمعة ولاتشریق ولافطر ولااضحیٰ الا فی مصر جامع ـ ولیس ذلک الا فی مصر الجامع ولهذا اختص به الجمع والاعیاد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

یکم رجب ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۲۳

## ﴿ایامِ تشریق کی فوت شدہ نماز کی قضاء میں تکبیرِ تشریق پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی آدمی کی ایامِ تشریق میں کوئی نماز فوت ہوگئی ہو اور ان دنوں کے علاوہ میں نماز قضاء کرے تو وہ تکبیرِ تشریق پڑھے گا یا نہیں؟

مستفتی: محمد عمران ایروی

﴿جواب﴾ ایامِ تشریق میں کوئی نماز فوت ہوجائے اور انہی دنوں میں قضاء کا موقع ملے تو تکبیرات بھی پڑھے، ایامِ تشریق گزر جائیں تو تکبیرات پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔

لما فی الشامی:(۱۷۹/۲،طبع: سعید)

(قوله او قضى فيها) والمسألة رباعية فائتة غير العيد قضاها في ايام العيد، فائتة ايام العيد قضاها في غير ايام العيد، فائتة ايام العيد قضاها في ايام العيد من ايام أخر، فائتة ايام العيد قضاها في ايام العيد من عامه ذلك لا يكبر الا في الاخير فقط

ولما فی العالمگیریہ:(۱۵۲/۱،طبع: رشیدیہ)

واذا فاتته صلاة قبل هذه الايام فقضاها فيها لا يكبر، وكذا لو فاتته صلاة في ايام التشريق فقضاها في غير ايام التشريق من قابل لا يكبر عقيبها

ولما فی البدائع:(۱۹۸/۱،طبع: سعید)

وأما بيان حكم التكبير فيما دخل من الصلوات في حد القضاء ... وان فاتته في هذه الايام فقضاها في غير هذه الايام لا يكبر عقيبها بعد

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بندہ شاہ جہان ایروی

۲۹ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۵۳

## ﴿چھوٹے گاؤں میں عید کی نماز مکروہ تحریمی ہے﴾

﴿سوال﴾ ہمارا گاؤں دو گاؤں کے درمیان واقع ہے ان تینوں گاؤں میں کچھ کچھ فاصلہ ہے ان تینوں گاؤں میں جمعہ وعیدین کی شرائط مفقود ہیں، ہمارے گاؤں کے علاوہ باقی دونوں گاؤں میں باقاعدہ جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی ہیں، ہمارے گاؤں والے کچھ ایک مسجد اور کچھ دوسری مسجد میں عیدین اور جمعہ کیلئے جاتے ہیں جبکہ میں نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتا ہوں بلکہ گھر میں ظہر کی نماز ادا کرتا ہوں اور عید کے دن نماز میں شریک ہوتا ہوں عید کے دن نماز میں شرکت صحیح ہے یا نہیں؟ اور عید کی نماز میں نفل کی نیت سے شریک ہوجاؤں تو کیا حکم ہے؟ نیز نماز

عیدین مسجد میں ادا کرتے ہیں عیدگاہ نہیں ہے۔ مستفتی: محمد ولی اللہ ڈیروی

﴿جواب﴾ دیہات میں جسطرح نماز جمعہ صحیح نہیں ہے اسی طرح نماز عید بھی صحیح نہیں ہے چھوٹے گاؤں میں نماز عید مکروہ تحریمی ہے اس لئے کہ اگر عید کی نیت سے پڑھے تو شرائط نہ ہونے کیوجہ سے صحیح نہیں ہے اور اگر نفل کی نیت سے پڑھے تب بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ نفل کی جماعت علی صورت التداعی ہے جو کہ مکروہ ہے۔

لہٰذا آپ عید کی نماز میں بھی شرکت نہ کریں نہ عید کی نیت سے اور نہ نفل کی نیت سے البتہ جہاں جمعہ وعیدین کی شرائط پوری ہوں تو وہاں آپ کا جانا مستحب ہے ضروری نہیں ہے۔

لما فی البحر: (۱۵۷/۲، طبع سعید)

(قوله تجب صلاة العيد على من تجب عليه الجمعة بشرائطها سوى الخطبة)۔

ولما فی الدر المختار: (۱۶۶/۲-۱۶۷، طبع سعید)

تجب صلاتهما فی الاصح علی من تجب علیه الجمعة بشرائطها المتقدمة سوی الخطبة..... وفی القنیة صلاة العید فی القری تکره تحریما أی لانه اشتغال بما لا یصح لان المصر شرط الصحة.

ولما فی الشامی: (۱۶۷/۲، طبع سعید)

(قوله: بما لا یصح): أی علی انه عید والا فهو نفل مکروه لادائه بالجماعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ

۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۱۰۶۴

## ﴿عید الفطر کے دن با آواز بلند تکبیریں پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید الفطر کے دن راستے میں آتے جاتے وقت با آواز بلند تکبیریں پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ عید الفطر کے دن نماز کے لیے جاتے وقت یا نماز سے واپسی لوٹ کر راستے میں تکبیرات آہستہ آواز میں پڑھی جائیں یہی امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے۔

لما فی مراقی الفلاح: (ص ۵۳۱ مطبوعہ قدیمی)

مکبرا سرا وعندهما جهرا قال الحلبی الذی ینبغی ان یکون الخلاف فی استحباب الجهر وعدمه لا فی کراهته وعدمها فعندهما یستحب وعنده الاخفاء افضل.

ولما فی البدائع:(۱/۲۷۹،مطبوعه ایچ ایم ،سعید)

واما فی عید الفطر فلا یجهر بالتکبیر عند ابی حنیفة و عند ابی یوسف ومحمد یجهر.

ولما فی الهندیة:(۱/۱۵۰،طبع رشیدیه)

وفی الفطر المختار من مذهبه انه لا جهر وهو المأخوذ به.

ولما فی الشامیة:(۲/۱۷۰طبع سعید)

وفی شرح المنیة الصغیر:ویوم الفطر لا یجهر به عنده وعندهما یجهر وهو روایة عنه والخلاف فی الافضلیة اما الکراهة فمنتفیة عن الطرفین وقد ذکر الشیخ قاسم فی تصحیحه ان المعتمد قول الامام).

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:ولی اللہ ڈیروی

۲۹ربیع الثانی۱۴۲۸ھ　　　　فتوی نمبر:۶۵۶

## ﴿خطبہ عید میں مقتدیوں کو بلند آواز سے تکبیر نہیں پڑھنی چاہیئے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ جب امام خطبہ عیدین پڑھتا ہے تو مقتدی اس کے ساتھ ساتھ خطبہ میں تکبیریں پڑھتے ہیں باآواز بلند تو کیا ان کا یہ فعل درست ہے؟ یا ان کا خطبہ سننا ضروری ہے اور خود وہ خاموش رہیں۔

مستفتی:محمد ولی اللہ ڈیروی

﴿جواب﴾ جب امام صاحب خطبہ عید پڑھ رہے ہوں تو تمام مقتدیوں پر خطبہ سننا واجب ہے اور اس وقت بلند آواز سے تکبیریں نہ پڑھیں بلکہ خاموش رہیں البتہ دل دل میں اگر پڑھے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے زبان سے پڑھنا منع ہے۔

لما فی مراقی الفلاح :(ص۵۳۵،طبع قدیمی کراچی)

ویکبر القوم معه ویصلون علی النبی ﷺ فی انفسهم المراد انه یسرون به فی انفسهم والظاهر انه متعلق بالتکبیر والصلاة لانه تجب الانصات لجمیعهما.

ولما فی الهندیه :(۱/۱۵۱طبع رشیدیه کوئٹه)

واذاکبر الامام بالخطبة یکبر القوم معه واذاصلی علی النبی ﷺ یصلی الناس فی انفسهم امتثالا لامر وسنة الانصات کذا فی التاتارخانیه قوله فی انفسهم الظاهرانه متعلق بالتکبیر والصلاة لانه یجب الانصات لجمیعهما هذا احد اقوال ثلاثة والثانی انه فرض والثالث واجب والمشهور الوجوب.

ولما فی الدر المحتار:(۳۶/۲،طبع امدادیہ ملتان)

وكذا يجب الاستماع لسائر الخطب كخطبة نكاح وخطبة عيد وختم على المعتمد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ　　　فتویٰ نمبر:۶۵۱

## ﴿عیدین کی اجتماعی دعا خطبہ سے پہلے بہتر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدین کی اجتماعی دعا خطبہ کے بعد ہونی چاہیے یا خطبہ سے پہلے؟　　　مستفتی: عبداللہ کراچوی

﴿جواب﴾ عیدین کی اجتماعی دعا نماز کے بعد خطبہ سے پہلے ہونی چاہیے، اس لئے کہ احادیث میں نمازوں کے بعد دعا کی ترغیب آئی ہے لہٰذا عید کی نماز بھی چونکہ نماز ہے اس لئے نماز سے فراغت کے بعد دعا کا موقع ہے خطبہ کے بعد تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔

لما جاء فی المشکوۃ:(ص۱۲۵،طبع سعید)

وعن ام عطيه قالت امرنا ان نخرج الحيض يوم العيدين و ذوات الخدور فيشهدن جماعة المسلمين ودعوتهم وتعتزل الحيض عن مصلاهن قالت امرأة يارسول الله احدنا ليس لها جلباب قال لتلبسها صاحبتها من جلبابها(متفق عليه).

ولما فی المشکوۃ:(ص۸۸،طبع سعید)

وعن المغيرة بن شعبة ان النبي ﷺ كان يقول في دبر كل صلوة مكتوبة لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد و هو على كل شيء قدير اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطي لما منعت ولا ينفع ذا الجد منك الجد(متفق عليه)

ولما فی الدر المختار:(۲۴۶/۲،مکتبۃ امدادیہ)

ويكره تأخير السنة الا بقدر "اللهم أنت السلام" الخ قال الحلواني:لا بأس بالفصل واختاره الكمال ،قال الحلبي: ان اريد بالكراهة التنزيهية ارتفع الخلاف قلت:وفي حفظي حمله على القليلة ،ويستحب أن يستغفر ثلاثا ويقرأ آية الكرسي والمعوذات ويسبح ويحمد ويكبر ثلاثا وثلاثين ،ويهلل تمام المائة ويدعو ويختم بسبحان ربك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۱۱۱

## ﴿عیدین میں ایک دوسرے کو مبارک باد دینے میں کوئی حرج نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل عیدین

کے موقع پر عام طور پر لوگ ایک دوسرے کو عید مبارک کے الفاظ کہتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ عیدین کے موقع پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو یہ کہے کہ "عید مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ کے روزے، تراویح وغیرہ قبول فرمائے اور اللہ تعالیٰ آپ کی قربانی قبول فرمائے" تو یہ عبادت کرنے پر حوصلہ افزائی ہے اور اعمال صالحہ کی قبولیت کی دعا ہے، شرعاً یہ عمل مستحب ہے اور آثار صحیحہ سے ثابت ہے، اسمیں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما في التنوير وشرحه:(۱۶۹/۲،طبع سعيد)

والتهنئة بتقبل الله منا ومنكم لا تنكر(وفي الشامية)والتهنئة وانما قال ذلك لانه لم يحفظ فيها شئي عن ابى حنيفة واصحابه وذكر في القنية انه لم ينقل عن اصحابنا كراهة وعن مالك انه كرهها وعن الاوزاعي انها بدعة وقال المحقق ابن امير حاج بل الاشبه انها جائزة مستحبة في الجملة ثم ساق آثارا باسانيد صحيحة عن الصحابة في فعل ذلك ثم قال والمتعامل في البلاد الشامية والمصرية عيد مبارك عليك ونحوه وقال يمكن ان يلحق بذلك في المشروعية والاستحباب لما بينهما من التلازم فان قبلت طاعته في زمان كان ذلك الزمان عليه مباركا على انه قد ورد الدعاء بالبركة في امور شتى فيوخذ منه استحباب الدعاء بها هنا ايضا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد حسن پورلوی

۲۳ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۳۶

## ﴿محلہ در محلہ نماز عید کی ادائیگی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں عید کی نماز ہر محلہ کی مسجد میں الگ الگ ادا ہوتی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد امین پشاور

﴿جواب﴾ عیدین کی نماز عیدگاہ میں ادا کرنا زیادہ پسندیدہ ہے تاکہ اجتماع بڑا ہو، الگ الگ مساجد میں قائم کرنے کی اگرچہ گنجائش ہے لیکن اس طرح کرنے سے بڑے اجتماع کا انعقاد نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ بھی مطلوب ہے، اس لئے الگ الگ مساجد میں صلوٰۃ العید ادا کرنا مناسب نہیں ہے، ہاں کوئی وجہ ہو مثلاً: بڑے شہروں میں اتنا بڑا کوئی میدان نہیں ہوتا جس میں شہر کے تمام لوگ نماز عید ادا کر سکیں اور باہر جنگل میں تمام لوگوں کیلئے نکلنے میں بھی حرج عظیم ہے اس لئے شہر کی جامع مساجد میں ادا کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لما فی ردالمحتار:(۲/ ۲۹،طبع امدادیه)

وفی الخلاصة و الخانية:السنة أن يخرج الامام الیٰ الجبانة،ويستخلف غيره ليصلی فی المصر بالضعفاء بناء علی أن صلاة العيدين فی موضعين جائزة بالاتفاق ، ولن لم يستخلف فله ذلك.

ولمافی الدر المختار:(۲/ ۲۹،طبع:امدادیه)

ثم خروجه ماشيا الیٰ الجبانة وهی المصلی العام ، والواجب مطلق التوجه (والخروج اليها ) أی الجبانة لصلاة العيد (سنة وان وسعهم المسجدالجامع )هو الصحيح.

ولمافی حلبی کبیر:(ص ۵۷۲،طبع سهيل اکیڈمی)

الخروج الیٰ المصلی وهی الجبانة سنة وان كان يسعهم الجامع وعليه عامة المشايخ لماثبت انه عليه الصلاة والسلام كان يخرج يوم الفطر ويوم الاضحی الیٰ المصلی فان ضعف القوم عن الخروج امر الامام من يصلی بهم فی المسجد روی ذلك عن علی وفی جامع الفقه ومنية المفتی والذخيرة يجوز اقامتها فی المصر و فنائه فی موضعين فاكثر.

ولما خلاصة الفتاوی:(۱/ ۲۱۳،طبع رشیدیه)

والسنة ان يخرج الامام الیٰ الجبانة ويستخلف غيره ليصلی فی المصر بالضعفاء والمرضی بناء علی ان صلوة العيد فی موضعين جائزة بالاتفاق وان لم يستخلف له ذلك.

ولمافی البحر الرائق:(۲/ ۱۵۹،طبع سعید)

وفی التجنيس : والخروج الیٰ الجبانة سنة لصلاة العيد وان كان يسعهم المسجد الجامع عند عامة المشايخ هو الصحيح اه.وفی المغرب الجبانة المصلی العام فی الصحراء...... الیٰ قوله وان كانت صلاة العيدواجبة حتی لوصلی العيدفی الجامع ولم يتوجه الی المصلی فقدترك السنة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد ادریس چارسدوی

۹/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۳۷

## ﴿عیدگاہ جانے سے پہلے میٹھی چیز کھانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں عیدگاہ جانے سے پہلے کھیر یا میٹھے چاول کھانے کا عام رواج ہے، بعض لوگ سنت بتاتے ہیں کیا واقعی یہ سنت ہے؟

﴿جواب﴾ عیدالفطر کے دن عیدگاہ جانے سے پہلے طاق عدد میں چھوارے کھانا مستحب ہے چھوارے نہ ملیں تو چاول یا کوئی بھی میٹھی چیز کھالے تو زیادہ بہتر ہے، ویسے بھی نماز عید سے

پہلے کچھ بھی اس نیت سے کھالے تو بھی اس نیت کا ثواب ملے گا لیکن کچھ نہ کھانے سے بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا اور عید الاضحیٰ کے دن قربانی کے گوشت تک کے آنے تک انتظار کرنا مستحب ہے لیکن اس کے خلاف کرنے کی صورت میں یعنی قربانی کا گوشت آنے سے پہلے یا نماز سے بھی پہلے کچھ کھانے سے گناہ نہیں ہوگا البتہ وہ فضیلت حاصل نہ ہوگی۔

لمافی الحلبی الکبیر:(ص۵۶۶،طبع سهیل اکیڈمی)

ویستحب یوم الفطر ان یاکل شیئا قبل الصلوة لماروی انس کان علیه الصلوة والسلام لا یخرج یوم الفطرحتی یاکل تمرات ویاکلهن وترارواه البخاری فلذاینبغی ان یکون الماکول تمراان وجد والا فشیئا حلوا.

ولمافی البحر الرائق :(۱۵۸/۲،طبع سعید)

لکن یوخر الاکل عنها للاتباع فیهما وهو مستحب ولا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراهة اذ لا بد لها من دلیل خاص فلذا کان المختارعدم کراهة الاکل قبل الصلوة ۔

ولمافی الدرالمختار:(۴۸/۲،طبع امدادیه)

وندب یوم الفطر اکله حلوا وترا ولو قرویا،قبل خروجه الیٰ الصلوة..... الیٰ قوله قلت: فالظاهر ان التمر افضل کما اقتضاه هذالخبر فان لم یجد یاکل شیئا حلوا ولو قرویا.....ان ذلک لیس من سنن الصلاة بل من سنن الیوم لان فی الاکل مبادرة الیٰ قبول ضیافة الحق سبحانه.وهکذافی الحلبی الکبیر:(ص۵۶۶،طبع سهیل اکیڈمی)

ولمافی الشامیة:(۱۶۳/۲،طبع:امدادیه)

ویندب تاخیر اکله عنها ای یندب الامساك عما یفطر الصائم الیٰ ان یصلی فان الاخبار عن الصحابة تواترت فی منع الصبیان عن الأکل والاطفال عن الرضاع غداة الاضحی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد ادریس چارسدوی عفااللہ عنہ

۵/جمادی الثانی۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۵۷۲

## ﴿حکم اداء العیدین فی القریة الصغیرة﴾

## ﴿چھوٹے گاؤں میں عیدین کا حکم﴾

﴿سوال﴾ الیٰ العلماء الکرام مد ظلهم السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته وبعد هل یجوز ان یصلی الناس صلاة العیدین فی قریة لا تصح فیها الجمعة فان

كانوا يصلونها من الزمن القديم فما قولكم في المنع ؟بينوا توجروا.

﴿جواب﴾ اقامة العيدين في قرية لا تصح فيها الجمعة مكروه تحريما لان شرائطها شرائط الجمعة وجوبا واداءً الا الخطبة فانها سنة في العيدين وللمنع مراتب اذا علم انه لا تكون فتنة ويقبله الناس فليعمل بقوله عليه السلام (من رآى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذالك اضعف الايمان)

لما في الدر المختار: (۱٦٧/٢، طبع سعيد)

وفي القنية: صلاة العيد في القرى تكره تحريما: أي لأنه اشتغال بما لا يصح لان المصر شرط الصحة.

ولما في البحر الرائق: (۱٥٨/٢، طبع سعيد)

وفي القنية: صلاة العيد في الرساتيق تكره كراهة تحريم اه لانه اشتغال بما لا يصح لان المصر شرط الصحة.

ولما في بدائع الصنائع: (٢٧٥/١، طبع سعيد)

واما شرائط وجوبها وجوازها فكل ما هو شرط وجوب الجمعة وجوازها فهو شرط وجوب صلاة العيدين وجوازها من الامام والمصر والجماعة والوقت الا الخطبة فانها سنة.

ولما في مرقاة المفاتيح: (٣٢٥/٩ـ٣٢٦، طبع رشيديه)

ثم اعلم أنه اذا كان المنكر حراما وجب الزجر عنه واذا كان مكروها ندب والامر بالمعروف ايضا تبع لما يؤمر به فان وجب فواجب وان ندب فمندوب...... وشرطهما ان لا يؤدي الى الفتنة كما علم من الحديث وان يظن قبوله فان ظن أنه لا يقبل فيستحسن اظهار الشعائر الاسلام.

الجواب صحيح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: معراج الدین

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۹۶

## ﴿بعد نماز عید و جمعہ مصافحہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ بعض لوگ نماز عید، نماز جمعہ کے بعد مسجد میں مصافحہ کرنا سنت سمجھتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ عمل از روئے شرع کیسا ہے؟ مستفتی: زاہد صاحب اورنگی ٹاؤن

﴿جواب﴾ مصافحہ کے لیے شریعتِ مطہرہ نے ابتداءِ ملاقات کا وقت تجویز کیا ہے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا سنت رسول ﷺ اور باعث اجر وثواب ہے، رہا کسی نماز کے بعد مصافحہ

کرنے کا مسئلہ تو اگر کوئی نماز کے بعد دوسرے ساتھی سے ملتا ہے اور ملاقات سمجھ کر مصافحہ بھی کر لیتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن نماز کے بعد مصافحہ کرنے کی عادت بنالینا یا ثواب وسنت سمجھنا اور نہ کرنے والوں کو برا سمجھنا کسی طرح سے جائز نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بدعت ہے، عید کے دن مصافحہ اور معانقہ ہمارے معاشرے میں خوشی کے اظہار کے طور پر رواج بنا ہوا ہے اس کو کوئی بھی شرعی حکم سمجھ کر نہیں کرتا اس لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لمافی الحدیث:( رواه الترمذی واحمد)

ما من مسلمین یلتقیان فیتصافحان الا غفر لهما قبل ان یتفرقا"

ولمافی الشامیة:(۶/۳۸۱مکتبه ایچ ایم سعید)

" قوله کما افاد النووی فی اذکاره" حیث قال اعلم ان المصافحة مستحبة عند کل لقاء واما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد الصبح والعصر فلا اصل له فی الشرع علی هذا الوجه ..... ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط انه تکره المصافحة بعد اداء الصلاة بکل حال..... وقال ابن الحاج من المالکیة فی المدخل انها من البدع وموضع المصافحة انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوت فحیث وضعها الشرع یضعها فینهی عن ذالک ویزجر فاعله لما اتی به من خلاف السنة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۱۰ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۴۳

## ﴿عیدین سے متعلق چند مسائل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام ان چند مسائل کے بارے میں کہ یکم ذی الحجہ سے لیکر دس/۱۰ ذی الحجہ تک بال اور ناخن نہ لینا مسنون ہے یا مستحب؟ نیز اسمیں قربانی کرنے والے اور فقراء سب برابر ہیں یا یہ حکم صرف صاحب نصاب (قربانی کرنے والے) حضرات کے ساتھ خاص ہے؟ اور کیا عید الفطر میں نماز عید کے لئے نکلنے سے پہلے کوئی میٹھی چیز کھانا اور عید الاضحیٰ میں قربانی کے گوشت سے ابتداء کرنا اور اس وقت تک کچھ نہ کھانا پینا مسنون ہے؟ بعض حضرات سے سنا ہے کہ عید الاضحیٰ کے دن فجر سے لیکر قربانی کے گوشت کے تیار ہونے تک روزہ ہوتا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ڈھائی تین گھنٹے کا بھی کوئی روزہ ہوتا ہے صحیح بات کیا ہے؟

﴿جواب﴾ یکم ذی الحجہ سے لیکر دس ذی الحجہ تک بال اور ناخن نہ لینا صرف قربانی کرنے والوں کے لئے مستحب ہے سب کے لئے یہ حکم نہیں ہے البتہ چالیس دن تک کسی نے بال یا ناخن

کاٹنے میں غفلت کی اور اب یہ ایام شروع ہو گئے تو اس شخص کے لئے کاٹنے کا حکم ہے اس لئے کہ مزید تاخیر کرنا گناہ ہے عید الفطر کے دن نماز عید کے لئے نکلنے سے پہلے کوئی بھی چیز کھالینا مسنون ہے میٹھی چیز کھانا مزید مستحب ہے پھر افضل یہ ہے کہ طاق عدد میں کھجور کھالے اور عید الاضحیٰ کے دن نماز عید سے فراغت تک کسی بھی چیز کے کھانے سے پرہیز کرنا مستحب ہے لوگ اس کو اگر چہ روزہ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ روزہ نہیں ہے بلا شبہ امساک ہے اور اس حکم میں قربانی کرنے والے حضرات اور غرباء سب برابر ہیں۔

لما فی سنن النسائی:(۱/۲۲۸،طبع قدیمی)

عن حفصة قالت : اربع لم یکن یدعهن النبی ﷺ صیام عاشورا(ای صیام عشر ذی الحجه)وثلثة ایام من کل شهر.....الخ.

ولمافی معارف السنن:(۴/۲۵۰،طبع سعید)

قال ابن قدامة فی المغنی:(۲/۲۲۹)السنة ان یاکل فی الفطر قبل الصلوٰة ولا یاکل فی الاضحی حتّی یصلی وهذا قول اکثر اهل العلم.....وبالجملة یستحب الامساک الیٰ الصلوٰة یوم الاضحی وان لم یمسک فلا کراهة فیه اصلاً کما هو مصرح فی البحر وفی شرح الدر المختار لابن عابدین ویدل علیه کلام صاحب البدائع.....والادب ان لا یذوق شیئاً الیٰ وقت الفراغ من الصلوٰة حتّی یکون تناوله من القرابین ثم ان ظاهر الحدیث یدل علیٰ ان الامساک یستحب لکل رجل یضحی او لا.

ولمافی التنویر وشرحه:(۲/۱۶۸،طبع سعید)

(وندب یوم الفطر أکله)حلوا وترا ولو قرویا(قبل)خروجه الیٰ(صلاتها واستیاکه الخ.

ولمافی الشامیة :(۲/۱۶۸)

(قوله وندب یوم الفطر)والصحیح ان الأکل سنة لخصوص الرجال..... وانما سماه مستحباً لاشتمال السنة علیٰ المستحب(قوله حلوا)ویستحب کون ذالک المطعوم حلوا لمافی البخاری..... قلت:فالظاهر ان التمر افضل کما اقتضاه هذا الخبر فان لم یجد یاکل شیئاً حلوا.

ولمافی الشامیة:(۲/۱۸۱،طبع سعید)

ومما ورد فی صحیح مسلم قال رسول الله ﷺ:"اذا دخل العشر واراد بعضکم ان یضحی فلا یاخذن شعرا ولا یقلمن ظفرا" فهذا محمول علیٰ الندب دون الوجوب بالاجماع فظهر قوله :ولا یجب التاخیر الا ان نفی الوجوب لا ینافی الاستحباب فیکون مستحباً الا ان استلزم الزیادة علیٰ وقت اباحة التاخیر ونهایته ما دون الاربعین فلا یباح فوقها .قال فی القنیة:الافضل ان یقلم اظفاره ویقص شاربه ویحلق عانته

وينظف بدنه بالاغتسال في كل اسبوع والافلي خمسة عشر يوماً ولا عذر في تركه وراء الاربعين ويستحق الوعيد فالاول افضل والثاني الاوسط والاربعون الابعد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: خالد الرحمٰن کرکی

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ فتوی نمبر: ۲۳۲۱

## ﴿عیدین کے دن اشراق کی نماز پڑھنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مرد اور عورت کے لئے کیا حکم ہے کہ وہ عیدین کے دن اشراق کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: بھائی عبدالستار حیدری

﴿جواب﴾ اشراق وچاشت کے نوافل نماز عید سے فارغ ہو کر گھر میں کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، نماز عید سے پہلے گھر میں بھی نہیں پڑھنا چاہیے، مرد حضرات کے علاوہ خواتین کے لئے بھی یہی حکم ہے۔

لما في البحر الرائق:(۱۶۰/۲ طبع: سعيد)

والخلاصة والافضل ان يصلي اربع ركعات بعدها واطلقه فشمل صلاة الضحى وشمل من يصلي صلاة العيد اماما كان او غيره ومن يصليها كما في سراج الوهاج وبهذا قال في الخلاصة النساء اذا اردن ان يصلين الضحى يوم العيد بعد ما يصلي الامام في الجبانة.

ولما في مراقي الفلاح:(ص:۵۲۱،طبع: قديمي)

حتى يكره للنساء ان يصلين الضحى يوم العيد قبل صلاة الامام كما في النهر........والخلاصة يستحب ان يصلي بعد صلاة العيد اربع ركعات لحديث عليؓ انه ﷺ قال: من صلى بعد العيد اربع ركعات كتب الله بكل نبت زبت وبكل ورقة حسنة "كذا في الشرح ويحمل على الصلاة في البيت.

ولما في تاتارخانية :(۷۵/۲،طبع: قديمي)

وفي "المزاد" وان حب ان يصلي فيه بعدها صلى اربعا ،هكذا قال صاحب الكتاب ،قال ان مشايخنا قالو: ان المستحب ان يصلي اربعا بعد الرجوع الى منزله كي لا يظن ظان انه هو السنة المتواترة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: شاہ جہان ڈیروی

۱۴ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ فتوی نمبر: ۳۲۵۰

# ﴿فصل فی متفرقات الصلوٰۃ﴾

## ﴿پانچ نمازوں کی فرضیت سے پہلے نمازوں کی تفصیل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ شب معراج میں یہ پانچوں نمازیں فرض ہوئیں تو کیا اس سے پہلے بھی نماز تھی یا نہیں؟ براہ کرم تفصیل بتادیں۔

﴿جواب﴾ پانچوں نمازیں تو شب معراج میں یعنی رجب کی ستائیسویں تاریخ کو ہجرت سے ایک سال پہلے فرض ہوئیں۔اس سے پہلے آپ ﷺ کا صبح وشام دو،دو رکعت نماز پڑھنے کا معمول تھا۔اور رات کو تہجد پڑھنے کا بھی اہتمام فرماتے تھے جس میں رکعات کی تعداد کی تعیین نہیں تھی۔یہ تینوں نمازیں راجح قول کے مطابق فرض تھیں۔پانچ نمازوں کے حکم کے ساتھ آپ ﷺ اور تمام امت سے تہجد کی نماز کی فرضیت منسوخ ہوگئی ہے۔یہی اکثر محققین کا قول ہے۔

**لما فی الدر مع الرد:۱/۳۵۲طبع سعید**

فرضت فی الاسراء.....وكانت قبله صلاتين قبل طلوع الشمس وقبل غروبها شمنی۔

(قوله فرضت فی الاسراء الخ)انهم اختلفوا فی ای سنة كان الاسراء بعد اتفاقهم علی انه كان بعد البعثة.فجزم جمع بانه كان قبل الهجرة بسنة,ونقل ابن حزم الاجماع عليه،......وجزم الحافظ عبد الغنی المقدسی فی سيرته بانه ليلة السابع والعشرين من رجب ،وعليه عمل اهل الامصار.

**ولما فی العمدة القاری:۴/۸۷ طبع رشيديه**

فرضت الصلوة ركعتين ،ای قبل الاسراء،لان الصلوة قبل الاسراء كانت صلوة قبل غروب الشمس،وقبل طلوعها،ويشهدله قوله تعالی :(وسبح بالعشی والابكار).

**ولما فی معارف السنن:۲/۱۰۵ طبع سعيد**

قال شيخنا:والوجه عندی:ان رسول الله ﷺ كان يصلی الفجر والعصر قبل فريضة الخمس.......وقد قالوا بانه ﷺ كان يصليهما قبل الاسراء،ولكنهم اختلفوا فی افتراضهما:فالاكثر الی عدم افتراضهما واختار بعض افتراضهما قال شيخنا: اذا اتحد كيفية ادائهما قبل الاسراء، وبعده فاذن يشكل وجه الفرق بين الفرضية وعدمها،فالاولی ان يقال بفرضيتهما قال : وبه اقطع

**ولما فی البنايه:۲/۷،طبع: حقانيه**

وذكر الحربی ان الصلوة قبل الاسراء كانت قبل غروب الشمس،وقبل طلوعها،قال الله تعالی وسبح بحمد ربک بالعشی والابكار۔

ولما في التفسير المظهري: ۵/۲۶۷، طبع رشيديه

كانت صلوة الليل فريضة على النبي ﷺ في الابتداء وعلى امته لقوله تعالى يا ايها المزمل قم الليل الا قليلا ثم نزل التخفيف فصار الوجوب منسوخا في حق الامة بالصلوة الخمس وبقي الاستحباب قال الله تعالى فاقرء وا ما تيسر منه.......المختار عندي ان افتراض قيام الليل نسخ عن النبي ﷺ ايضا وكان له تطوعا.

ولما في روح المعاني: ۲۹/۱۴۲، طبع رشيديه

ثم نسخ وجوب القيام على الامة مطلقا بالصلوة الخمس ......فعن مقاتل وابن كيسان انه كان فرضا بمكة قبل ان تفرض الصلوات الخمس ثم نسخ بهن الا ما تطوعوا به.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۶ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۱۶

## ﴿فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد کا ثبوت احادیث سے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا پانچوں اوقات کی فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد کسی حدیث سے ثابت ہے؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد ایسی صحیح، مشہور اور متواتر حدیث سے ثابت ہے، جسکا تواتر کے ساتھ روایت ہونا عملی پر طور بحمدللہ آج تک جاری ہے، البتہ علم دین سے دور اور لاتعلق عام لوگ صرف صحاح ستہ یا دیگر کتب احادیث میں لکھی ہوئی احادیث کو احادیث جانتے ہیں، آپ ﷺ کے ارشاد گرامی "صلوا کما رأیتمونی أصلی" "تم لوگ نماز ایسی پڑھو، جس طرح میری نماز کا تم مشاہدہ کر رہے ہو، اس ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے ہزاروں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ علیہ السلام کی نماز کا مشاہدہ کیا، پھر لاکھوں تابعین نے صحابہ کرام کی نماز کا مشاہدہ کیا، اس کے بعد کروڑوں تبع تابعین نے تابعین کرام کی نماز کا مشاہدہ کیا، اس طرح ہر دور کے مسلمانوں نے اپنے بڑوں کی نمازوں کا مشاہدہ کیا، اور آج تک یہی سلسلہ جاری ہے، یعنی فرض نماز کی رکعتوں کی تعداد کی سند آپ ﷺ تک اس قدر مضبوط اور معروف طریقہ سے پہنچی ہے، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، تو یہ سب سے بڑی حدیث ہے ہاں جاہل لوگ کتب میں لکھی ہوئی احادیث کو ہی حدیث جانتے ہیں۔ جبکہ کتب احادیث میں بھی متفرق طور ایسی بہت ساری احادیث ہیں، جن سے نمازوں کی رکعتوں کی تعداد واضح

ہوتی ہے، بطور نمونہ چند احادیث ذیل میں درج کرتے ہیں۔

لما فی جامع الاصول :(۲۶/٦، طبع: دار الکتب العلمیۃ بیروت)

وفی روایۃ أبی داؤد عن قیس بن عمر قال: "رأی رسول اللہ ﷺ رجلاً یصلی بعد صلاۃ الصبح رکعتین، فقال رسول اللہ ﷺ: صلاۃ الصبح رکعتان، فقال الرجل: انی لم أکن صلیت الرکعتین اللتین قبلھما، فصلیتھما الآن، فسکت رسول اللہ ﷺ".

ولما فی المشکاۃ:(ص،۸۰، باب القراءۃ فی الصلوۃ، طبع: سعید)

"وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال کان النبی ﷺ یقرأ فی الفجر یوم الجمعۃ "بآلم تنزیل" فی الرکعۃ الأولیٰ وفی الثانیۃ "ھل أتیٰ علی الانسان." متفق علیہ.

ولما فی شرح معانی الأثار للطحاوی(۱۲٦/۱، باب وقت الظھر، طبع: سعید)

"عن عائشۃ رضی اللہ عنھا قالت أوّل ما فرضت الصلوۃ رکعتین فلما قدم النبی ﷺ المدینۃ وصل الی کل صلوۃ مثلھا غیر المغرب فانہ وتر وصلوۃ الصبح لطول قرائتھا وکان اذا سافر عاد الی الصلوۃ الأولیٰ".

ولما فی السنن الکبری للبیھقی:(۲/۱٦۵، طبع: دار الحدیث القاھرۃ)

"عن عبداللہ بن أوفیٰ قال: کان النبی ﷺ یصلی بنا الظھر حین تزول الشمس وکان یطیل الرکعۃ الأولی من الظھر فلا یزال یقرأ قائماً ما دام یسمع خفق نعال القوم، ویجعل الرکعۃ الثانیۃ أقصر من الأولی والثالثۃ أقصر من الثانیۃ والرابعۃ أقصر من الثالثۃ وکان یصلی بنا العصر قدر ما یسیر السائر فرسخین أو ثلاثۃ وکان یطیل الرکعۃ الأولیٰ من العصر والثانیۃ أقصر من الأولی والثالثۃ أقصر من الثانیۃ، والرابعۃ أقصر من الثالثۃ وکان یصلی بنا المغرب حین یقول القائل: غربت الشمس وقائل یقول لم تغرب وکان یطیل الرکعۃ الأولی من المغرب والثانیۃ أقصر من الأولی والثالثۃ أقصر من الثانیۃ وکان یؤخر العشاء الآخرۃ شیئاً".

ولما فی جامع الاصول :(۵/۲٦۲، طبع: دار الکتب العلمیۃ بیروت)

عن عبد اللہ الصنابحی قال: "قدمت المدینۃ فی خلافۃ أبی بکر الصدیق فصلیت وراءہ المغرب فقرأ فی الرکعتین الأولیین بأم القرآن سورۃ من قصار المفصل ثم قام فی الثالثۃ فدنوت منہ حتی ان ثیابی لتکاد أن تمس ثیابہ فسمعتہ قرأ بأم القرآن ــــــ أخرجہ الموطا.

ولما فی سنن الکبری للبیھقی :(۲/۱٦۳، طبع: دار الحدیث)

"عن جابر بن سمرۃ قال: شکا أھل الکوفۃ سعدا الی عمر فعزلہ واستعمل علیھم عمارا فشکوا حتی ذکرو أنہ لا یحسن یصلی، فأرسل الیہ فقال یا أبا اسحاق ان ھؤلاء یزعمون أنک لا تحسن تصلی، قال: أما أنا واللہ فانی کنت أصلی بھم صلاۃ رسول اللہ ﷺ ما أخرم عنھا أصلی صلاۃ العشاء فارکد فی الأولیین وأحذف فی

الأخريين، قال: "ذاك الظن بك يا ابا اسحاق".

ولما في جامع الاصول: (۶/۶۳، الفرع الثالث في القراءة في الوتر، أيضاً)

عن علي بن طالب رضي الله عنه قال: "كان رسول الله ﷺ يوتر بثلاث، يقرأ فيهن بتسع سور من المفصل، يقرأ في كل ركعة بثلاث سور آخرهن ﴿قل هو الله أحد﴾" اخرجه الترمذي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۰۳

## ﴿نمازی کی رکعات میں شک کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے متعلق کہ ایک آدمی کو نماز کے دوسرے قعدے میں تشہد پڑھنے کے بعد شک ہوتا ہے کہ یہ قعدہ اولی ہے یا قعدہ ثانیہ اور بسا اوقات رکعات میں شک ہوتا ہے کہ یہ رکعت تیسری ہے یا چوتھی اور اس طرح کا شک عموماً اس کو ہوتا رہتا ہے اس کو اپنی نماز کس طرح مکمل کرنی چاہیے وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: عبدالمالک کراچی

﴿جواب﴾ دوران نماز رکعتوں کی تعداد وغیرہ میں نمازی کو شک ہو جائے اور کسی ایک جانب غالب گمان نہیں ہو رہا تو ایسی صورت میں ضابطہ یہ ہے کہ یقینی جانب کو اختیار کرے تاکہ نماز میں کمی آنے کا شک باقی نہ رہے اضافہ ہونے کا اگرچہ شک باقی رہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ نقصان دہ نہیں ہے البتہ اخیر میں سجدہ سہو کرے لہٰذا اگر دوران قعدہ شک ہوا کہ یہ آخری قعدہ ہے یا قعدہ اولی؟ تو ایسی صورت میں بھی مذکورہ بالا ضابطہ پر عمل کرے اور اس قعدہ کو قعدہ اولی ہی سمجھے اور بقیہ نماز پوری کرے اور آخر میں سجدہ سہو بھی کرے اس طرح کرنے سے یقینی جانب کو اختیار کرنا ہوا اس لیے کہ دوران قعدہ شک ہوا تو دراصل اس قعدہ کے اخیرہ ہونے میں شک ہے لیکن قعدہ اولی ہونا تو یقینی ہے۔

اسی طرح دوران رکعت شک ہوا کہ یہ تیسری ہے یا چوتھی؟ تو تیسری یقینی ہے البتہ اس رکعت کا چوتھی ہونا شک میں ہے اس لیے اس کو تیسری ہی سمجھے اور ایک رکعت مزید پڑھے تاکہ چوتھی بھی یقینی ہو جائے لیکن اس صورت میں چوتھی رکعت کے لیے اٹھنے سے پہلے التحیات للہ...... عبدہ ورسولہ تک قعدہ ضرور کرے ہو سکتا ہے یہ تیسری رکعت چوتھی رکعت ہو جس کے بعد قعدہ اخیرہ

فرض ہے اب زیادہ سے زیادہ سلام میں تاخیر ہوگی اور بھول کی وجہ سے ایسے نقصان کی تلافی سجدہ سہو سے ہو جاتی ہے لہذا اخیر میں سجدہ سہو ہر دونوں صورتوں میں کرے۔

لما فی تنویر الابصار ۲/۹۳ طبع سعید)

(وان كثر)شكه (عمل بغلب ظنه ان كان )له ظن للحرج (والا أخذ بالأقل)التيقنه (وقعد في كل موضع توهمه موضع قعوده)ولو واجبا لئلا يصير تاركا فرض القعود أو واجبه.....(وجب عليه سجود السهو في )جميع(صور الشك)سواء عمل بالتحرى أو بنى على الاقل فتح لتاخير الركن.

ولما فی الردالمحتار ۲/۹۳ طبع سعید)

(قوله وان كثر شكه)بان عرض له مرتين على ما عليه اكثرهم(قوله للحرج)أى في تكليفه بالعمل باليقين (قوله والا)أى وان لم يغلب على ظنه شيء فلو شك انها اولى الظهر أو ثانية يجعلها الاولى ثم يقعد لاحتمال انها الثانية ثم يصلى ركعة ثم يقعد لما قلنا ثم يصلى ركعة ويقعد لاحتمال انها الرابعة ثم يصلى اخرى ويقعد لما قلنا فياتى باربع قعدات قعدتان مفروضتان وهما الثالثة والرابعة وقعدتان واجبتان .ولو شك انها الثانية أو الثالثة اتمها وقعد ثم صلى اخرى وقعد ثم الرابعة وقعد.

ولما فی المبسوط للسرخسی ۱/۲۱۹)

وان لقى غير مرة تحرى الصواب واتم الصلوة على ذلك لحديث ابن مسعود رضى الله عنه قال رسول الله ﷺ من شك في صلوته فليتحر الصواب ولانا لو امرناه بالاستقبال يقع في الشك ثانيا وثالثا اذا صار ذلك عادة له فيتعذر عليه المضى في الصلوة فلهذا تحرى وشهادة القلب في التحرى تكفي عندنا لقوله ﷺ المؤمن ينظر بنور الله وان لم يكن اخذ بالاقل لحديث عبد الرحمن بن عوف رضى الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من شك في صلوته فلياخذ بالاقل وليصل حتىٰ يشك في الزيادة كما يشك في النقصان ولأنه متيقن بوجوب الاداء عليه فلايترك هذااليقين الا بيقين مثله ثم يسجد للسهو بعد السلام عندنا

ولما فی خلاصة الفتاوی ۱/۱۶۹ طبع رشیدیه)

وان وقع ذلك غير مرة يتحرى واخذ ما ركن اليه قلبه فان وقع تحريه على انه صلى ركعة اضاف اليها اخرى ان كانت الصلوة ذات ركعتين ثم يقعد ويسلم ويسجد للسهو ه ان وقع تحريه على انه صلى ركعتين يقعد ويسلم ويسجد لسهوه وان لم يقع تحريه على شيء ياخذ بالاقل وفي صلوة الفجر يجعل كانه صلى ركعتين فيقعد ثم يضيف اليها اخرى ثم يقعد ويسلم ويسجد لسهوه ويقعد ويسلم .وان وقع في ذوات الاربع شك انها الاولى ام الثانيه عمل بالتحرى فان لم يقع تحريه على شيء يبنى على الاقل فيجعلها الاولى ثم يقعد ثم يقوم فيصلى ركعة اخرى ويقعد ثم يقوم

فيصلى ركعة اخرى ويقعد ثم يقوم فيصلى ركعة اخرى ويقعد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۱۲ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۲۳۰

## ﴿گاڑی آنے کے خیال سے نماز توڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جمعہ کے دن سفر پر جارہا تھا اسٹیشن کی مسجد میں آکر امام سے کہنے لگا کہ ہم دو بجے والی گاڑی میں جارہے ہیں لہذا آپ مختصر نماز وخطبہ اور مختصر نماز پڑھا دو، نماز شروع ہونے پر دوسری رکعت میں اس شخص کو گاڑی آنے کا خیال ہوا تو اس نے نماز توڑ کر باہر نکل آیا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

پوچھنا یہ ہے کہ امام سے مختصر نماز وخطبہ کا تقاضہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے لئے گاڑی آنے کے خیال سے نماز توڑنا جائز ہے یا نہیں؟ اور امام کو اس کا مطالبہ پورا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ایسی حالت میں کہ اگر کسی مقتدی کو بے اطمینانی اور ضروری حاجت ہو تو وہ شخص امام سے تخفیف قراءت وخطبہ کی درخواست کرسکتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہیے کیونکہ جماعت میں حاجت مند بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے امام کو چاہیے کہ اپنے مقتدیوں کا خیال رکھے اور ایسے موقع پر نماز کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے ہلکی نماز پڑھائے، باقی رہا یہ کہ نماز شروع کر کے توڑنا، سو اگر کسی کے مالی نقصان کا اندیشہ ہو یا گاڑی نکل جانے کا تو ایسی صورت میں نماز توڑنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ بعد میں اطمینان سے پڑھ لے۔

لما فی اعلاء السنن: (۲۹۹/۲ طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

عن أبي مسعود الأنصاري يقال: جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم — فقال يا أيها الناس ان منكم منفرين، فأيكم أم الناس فليوجز فان من ورائه الكبير، والضعيف وذا الحاجة، كذا في المشكوة ثم قال أم قومك، فمن أم قوما فليخفف فان فيهم الكبير وان فيهم المريض وان فيهم الضعيف وان فيهم ذا الحاجة أى المستعجلة (مرقاة).

ولما فی الشامی: (۵۲/۲ طبع سعید)

يقطعها لعذر احراز الجماعة كما لو ندت دابته أو فار قدرها أو خاف ضياع درهم من ماله أو كان في النفل فجيئ بجنازة وخاف فوتها قطعه لامكان قضائه. (قوله أو

خاف ضياع درهم من ماله) قال في الظهيرية لم يفصل في الكتاب بين المال القليل والكثير، عامة المشايخ قدروه بدرهم، قال شمس الأئمة السرخسي هذاحسن لو لا ما ذكره في الكتاب الحوالة والكفالة أن للطالب حبس غريمه بالدانق فما فوقه فاذا جاز حبس المسلم بالدانق فجواز قطع الصلاة مع تمكنه من قضائها أولى.

ولما في الهندية:(۱/۹۶مطبع قديمي)

وينبغي للامام أن لا يطول بهم الصلاة بعدالقدرالمسنون وينبغي له أن يراعي حال الجماعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۲۲

## ﴿ٹرین نکل جانے کے خوف سے نماز توڑنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی ٹرین سے سفر کے دوران اسٹیشن پر نماز کے لئے اترے اور اچانک گاڑی چل پڑے تو کیا گاڑی کے نکل جانے کے خوف سے اس کے لئے نماز توڑنا جائز ہوگا؟ مستفتی: ایک مسلم

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں نماز توڑنا جائز ہے اور اس طرح نوبت پیش آنے کا اندیشہ ہو تو گاڑی کے اندر نماز پڑھنی چاہیے باہر پڑھنا مناسب نہیں ہے۔

لما في فتاوى عالمگيريه ۱/۱۰۹ مطبع رشيديه كوئٹه

رجل قام الى الصلاة فسرق منه شئ قيمته درهم له ان يقطع الصلاة ويطلب السارق سواء كانت الفريضة او تطوعا لان الدرهم مال امرأة تصلي ففارقدرها جاز لها قطع الصلاة لاصلاحها وكذا المسافر اذا ندت دابته او خاف الراعي على غنمه الذئب.

ولما في المبسوط للسرخسي ۲/۳ طبع دارالمعرفة بيروت

قال ومن خاف فوت شئ من ماله وسعه ان يقطع صلاته ويستوثق من ماله وكذالك اذا انقلبت سفينته او راى سارقا يسرق شيئا من متاعه لان حرمة المال كحرمة النفس فكما يسعه ان يقطع صلاته اذا خاف على نفسه من عدو او سبع فكذا لك اذا خاف على شئ من ماله ولم يفصل في الكتاب بين القليل والكثير.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفر اللہ لہ ولوالدیہ

۱۷ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۱۱

## ﴿سائیکل چوری ہونے کی صورت میں نماز توڑنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی بندہ مسجد میں فرض

نماز پڑھ رہا ہو اور اس کی سائیکل باہر کھڑی ہو اور کوئی چور آ کر اس سائیکل کو چوری کرے، تو کیا نمازی فرض نماز توڑ کر چور سے اپنی سائیکل واپس لینے کی کوشش کر سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بلا وجہ نماز توڑنا گناہ ہے، کوئی خاص وجہ اگر ہو تو جائز ہے، لھذا سائیکل چوری ہونے کا دوران نماز اگر احساس ہو جائے تو ایسی صورت میں نماز فرض ہو خواہ نفل توڑنا جائز ہے تاکہ سائیکل چوری ہونے سے بچا سکے۔

لما فی الشامی:(۲/۵۲،طبع: سعید)

نقل عن خط صاحب البحر على هامشه ان القطع يكون حراما ومباحا ومستحبا وواجبا ،فالحرام بغير عذر والمباح اذا خاف فوت مال ،والمستحب القطع للاكمال، والواجب لاحياء النفس.

ولما فی البحر الرائق:(۱/۷۱،طبع: سعید)

وقيدنا بكون الابطال حراما بغير عذر لانه لو كان لعذر فانه جائز كالمرأة اذا فار قدرها والمسافر اذا ندت دابته أو خاف فوت درهم من ماله.

ولما فی الهندیه:(۱/۱۰۹ طبع: رشیدیه)

رجل قام الى الصلوة فسرق منه شئى قيمته درهم له ان يقطع الصلاة ويطلب السارق سواء كان فريضة أو تطوعا لان الدراهم مال.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان غفرلہ ولوالدیہ

۳۰ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۷۲

## ﴿بغیر عذر کے گھر میں فرض نماز پڑھنا گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! ہم ایک دیہات میں رہتے ہیں جسمیں میں مسجد نہ ہونے کی وجہ سے سارے گاؤں والے اپنے گھروں میں انفرادی طور پر نماز پڑھتے تھے اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گاؤں میں مسجد تعمیر ہو گئی جسمیں پانچ وقتہ نمازوں کا بندوبست ہو گیا ہے، میں الحمدللہ پانچ وقتہ نماز کا پابند آدمی ہوں لیکن کچھ تو میری طبیعت میں انفرادیت ہے اور بعض اوقات مسجد میں لوگ دنیاوی باتیں کرتے ہیں جو مجھے بالکل ناپسند ہے دوسرا یہ کہ عرصہ دراز سے گھر میں نماز پڑھنے کی عادت سی ہو گئی ہے جسکی وجہ سے میں اب بھی مسجد جانے کے بجائے گھر ہی میں نماز پڑھتا ہوں تو آپ حضرات سے یہ التماس ہے کہ کیا میرا یہ عمل شریعت کی رو سے غلط تو نہیں ہے؟

﴿جواب﴾ احادیث میں بغیر عذر کے گھر میں نماز پڑھنے اور جماعت ترک کرنے پر سخت

وعید وارد ہوئی ہیں اس لئے فقہاء کرام نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے اسکے علاوہ جماعت کے ساتھ نماز کا ثواب اکیلے پڑھنے کی بلنسبت ستائیس گنا زیادہ ہے لہذا بلا عذر گھر پر نماز پڑھنا شریعت کی رو سے غلط ہے اور گناہ ہے۔

لما فی صحیح مسلم: (ص ۲۳۱ طبع:قدیمی)

عن ابی هريرةؓ ان رسول الله ﷺ قال صلاة الجماعة افضل من صلاة احدكم وحده بخمسة وعشرين جزء وعن ابی هريرةؓ أنّ رسول الله ﷺ فقد أناسافی بعض الصلوات فقال لقدهممت أ ن آمر رجلا يصلی بالناس ثم أخالف الی رجال يتخلفون عنها فآمر بهم ليحرقوا عليهم بحزم الحطب بيوتهم ولوعلم احدهم انه يجد عظما سمينا لشهدها يعنی صلاة العشاء.

ولمافی التنوير مع الدر: (۵۵۲/۱،طبع: سعيد)

(والجماعة سنة موكدة للرجال)قال الزاهدی ،ارادوا بالتاكيد الوجوب الا فی جمعة وعيد فشرط قال الشامیؒ توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الآتی وبيان ان المراد بهما واحد اخذا من استدلالهم بالاخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة و فی النهر عن المفيد الجماعة واجبة و سنة لوجوبها بالسنة ـــ وقال فی شرح المنية والاحكام تدل علی الوجوب من ان تاركها بلا عذر يعزر و ترد شهادته و يأثم الجيران بالسكوت عنه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: علی حیدر چارسدوی

۲۳ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۳۹

## ﴿عورت کا پنج وقتہ نماز و جمعہ اور عیدین کیلئے مسجد یا عیدگاہ جانا منع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت پنج وقتہ نماز اور جمعہ وعیدین کیلئے مسجد یا عیدگاہ جاسکتی ہے کہ نہیں؟ نیز اسمیں جوان یا بوڑھی عورت کی کوئی تخصیص ہے کہ نہیں؟ اگر ہے تو کس نماز کیلئے تخصیص ہے؟ اسی طرح عورتوں کا اکٹھے ہوکر گھر میں نماز جماعت سے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

مستفتی: عبدالمالک گلزار کالونی

﴿جواب﴾ فتنہ وفساد کے عام ہونے کی وجہ سے عورتوں کا جماعت میں شریک ہونے کیلئے پنجوقتہ نماز اور جمعہ وعیدین کیلئے مسجد یا عیدگاہ جانا ممنوع اور مکروہ ہے اور یہ ممانعت جوان اور بوڑھی سب کیلئے ہے کیونکہ احادیث میں عورت کی تاریک اور بند کوٹھری کی نماز مسجد نبوی ﷺ کی نماز سے کئی درجہ افضل اور بہتر بتلایا ہے، اسی طرح عورتوں کا اکٹھے ہوکر گھر میں نماز جماعت سے پڑھنا بھی مکروہ تحریمی ہے لہذا عورتیں الگ الگ اپنی نماز پڑھیں گی۔

[نوٹ] صرف تراویح میں حافظ کو قرآن مجید یاد رکھنے کی غرض سے صرف گھر کی عورتوں کو تراویح پڑھانے کی گنجائش ہے۔

(ماخذہ: دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی، فتویٰ نمبر: ۱۲۴۱/۳۷، مؤرخہ: ۲۷/۳/۱۴۳۱ھ)

لما فی الصحیح للمسلم: (۱/۱۸۳، باب خروج النساء الی المساجد، طبع قدیمی)

حدثنا عبدالله بن مسلمة ـــ عن عمرة بنت عبدالرحمن انها سمعت عائشة زوج النبی ﷺ تقول لو أن رسول الله ﷺ رأی ما احدث النساء لمنعهن المسجد کما منعت نساء بنی اسرائیل قال: فقلت لعمرة أنساء بنی اسرائیل منعن المسجد، قالت: نعم.

ولما فی الترغیب والترهیب: (۱/ ۲۰۲، طبع حقانیه)

عن أم حمید امرأة ابی الساعدی جاءت الی النبی ﷺ فقالت: یا رسول الله انی احب الصلوٰة معک ـــ وصلاتک فی مسجد قومک خیر من صلاتک فی مسجدی، قال: فأمرت فبنی لها مسجد.

ولما فی التنویر وشرحه: (۱/۵۶٦، طبع سعید)

(ویکره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعید ووعظ (مطلقاً) ولو عجوزاً لیلاً (علی المذهب) المفتیٰ به لفساد الزمان.

وفی الشامیة: (قوله ولو عجوزاً لیلاً) بیان للاطلاق أی شابة أو عجوزاً نهاراً أو لیلاً.

ولما فی الهندیة: (۱/ ۸۵، الفصل الثالث، باب الامامة، طبع رشیدیه)

ویکره امامة المرءة للنساء فی الصلوات کلها من الفرائض والنوافل الا فی صلوة الجنازة، هکذا فی النهایة.

ولما فی التنویر وشرحه: (۱/۵۶٦، باب الامامة، طبع سعید)

(و) یکره تحریما (جماعة النساء) ولو فی التراویح فی غیر صلوة الجنازة.

ولما فی بدائع الصنائع: (۱/۱۵۷، فصل فی بیان ما یصلح للامامة فی الجملة)

الا أن جماعتهن مکروهة عندنا ..... ویروی فی ذلک احادیث لکن تلک کانت فی ابتداء الاسلام ثم نسخت بعد ذلک.

ولما فی الهدایة: (۱/۱۲۵)

ویکره للنساء أن یصلین وحدهن الجماعة لأنها لا تخلو عن ارتکاب محرم وهو قیام الامام وسط الصف فیکره کالعراة.

ولما فی کنز الدقائق: (۱/ ۲۸) وکره امامة العبد ـــ وجماعة النساء ـــ الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: جمل خان

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

فتویٰ نمبر: ۲۶۸۴

## ﴿بٹوہ یا موبائل فون میں محفوظ تصاویر کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جاندار کی تصویر بٹوہ میں جیب کے اندر رکھ کر اور موبائل فون میں تصویر محفوظ کر کے نماز پڑھنے سے نماز میں فرق آئے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بٹوہ کے اندر تصویر رکھ کر نماز پڑھنے سے اور موبائل فون میں محفوظ تصویر کے ساتھ نماز پڑھنے سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ اس میں تصویر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۲/۲۷،طبع سعید)

رجل فی یده تصاویر وهو یؤم الناس لاتكره امامته لانها مستورة بالثياب فصار كصورة فی نقش خاتم وهو غير صحيح ا ه وهو يفيد ان المستبين فی الخاتم تكره الصلاة معه ويفيد انه لايكره أن يصلی ومعه صرة أو كيس فيه دنانير أو دراهم فيها صور صغار لاستتارها ويفيد أنه لوكان فوق الثوب الذی فيه صور ثوب ساترله فانه لايكره أن يصلی فيه لا ستتارها بالثوب الأخر والله سبحانه اعلم.

ولمافی الدر المختار:(۲/۴۱۸،طبع امدادیه)

لايكره لوكانت تحت قدميه أو محل جلوسه لانها مهانة أو فی يده عبارة الشمنی "بدنه" لانها مستورة بثيابه أوعلی خاتمه بنقش غيرمستبين قال فی البحرومفاده كراهة المستبين لا المستتر بكيس أو صرة أو ثوب اخر، قال الشامی تحت هذا القول: بأن صلی ومعه صرة اركيس فيه دنانير أو دراهم فيها صور صغار فلا تكره لاستتارها.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم :صلاح الدین چترالی

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۱۵

## ﴿شیشے میں نظر آنے والی صورت عکس ہے تصویر نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کی الماریوں میں جو کہ قبلہ کی جانب میں ہے، کالے شیشے لگے ہوئے ہیں، جس میں سامنے کھڑے ہونے والے نمازیوں کا عکس صاف نظر آتا ہے، ایسی جگہ پہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ عکس صاف نظر آرہا ہو۔　　　　مستفتی: مولانا عبدالہادی، ملیر: ۱۵، کراچی

﴿جواب﴾ نمازی کے سامنے تصویر ہو تو نماز مکروہ تحریمی ہو جاتی ہے، لیکن عکس تصویر کے حکم میں نہیں ہے، اس سے نماز مکروہ نہیں ہوتی، البتہ اپنے اختیار سے دوران نماز عکس کو دیکھنا خشوع خضوع کے لئے مخل ہے، جس سے نماز مکروہ تنزیہی ہو جاتی ہے، دوران نماز ویسے بھی نظروں

کو جھکا کر رکھنے کا حکم ہے اور سامنے عکس نظر آئے تو ایسی صورت میں اس کا زیادہ اہتمام ہونا چاہیے، تاکہ خشوع خضوع میں خلل نہ آئے اور مساجد کے ذمہ دار لوگوں کو چاہیے کہ مسجد کی زینت سے زیادہ مقصودی چیز کو اہمیت دیا کریں، لہٰذا ایسے شیشے یا نقش ونگار جس سے عبادت میں خلل آنے کا اندیشہ ہو سے گریز کریں۔

لما فی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص: ۳۵۲،طبع: قدیمی

"ولكل عضو وطرف حظ من العبادات وبرؤية ما يفوت الخشوع ويفرق الخاطر ربما يكون التغميض اولى من النظر".

وفیه ایضا،ص: ۳۶۰

وتكره بحضرة كال مايشغل البال كزينة وبحضرة مايخل بالخشوع".

ولما فی ردالمحتار، ۱/۶۸۵،طبع: سعید

"(لانه يلهى المصلى )اى فيخل بخشوعه من النظر الىٰ موضع سجوده ونحوه،وقد صرح فى البدائع فى مستحبات الصلاة انه ينبغى الخشوع فيهاويكون منتهى بصره الىٰ موضع سجوده الخ كذافى صرح الاشباه ان الخشوع فى الصلاة مستحب والظاهرمن هذاان الكراهة تنزيهية "ــــــــ"قوله : ظاهر التعليل بانه يلهى المصلى ـــــ فيفيدان المكروه جدار القبلة بتمامه ؛لان علة الالهاء لاتخص الامام بل بقية اهل الصف الاول كذالك ولذاقال فى الفتاوىٰ الهندية : وكره بعض مشايخنا النقش على المحراب وحائط القبلة لانه يشغل قلب المصلى".

والله اعلم بالصواب: کمیل الدین کلکتی

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۶۴۰

۵ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ

## ﴿جیب میں پوشیدہ تصاویر کے ساتھ نماز پڑھنے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ٹریول ایجنسی میں ملازم ہے جو کہ لوگوں کے شناختی کارڈ یا پاسپورٹ اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے چونکہ حالات پر امن نہیں جسکی وجہ سے دوران نماز بھی جیب میں محفوظ رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے الگ رکھنے کی صورت میں دوران نماز بار بار خیال کاغذات کی طرف جاتا ہے اور یکسوئی نہیں رہتی لہٰذا اس مجبوری کی وجہ اپنے پاس دوران نماز تصویر والے کاغذات رکھنا شرعا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ دوران نماز تصویر اگر جیب میں پوشیدہ بغرض حفاظت رکھی ہے تو اس کی گنجائش ہے۔

لما فی حلبی:(۳۱۲،طبع نعمانیه)

ویکره التصاویر علی الثوب صلی فیه اولم یصل اما اذا کانت فی یده وهو یصلی فلاباس به لانه مستور بثیابه.

ولما فی البحر الرائق:(۲/ ۲۷،طبع سعید)

وفی المحیط رجل فی یده تصاویر وهو یوم الناس لا تکره امامته لانها مستورة باثیاب فصار کصورة فی نقش خاتم وهو غیر مستبین اه الی قوله:لایکره أن یصلی ومعه صرة الذی فیه صورة ثوب أو کیس فیه دنانیر او دراهم فیها صورة صغار لاستتارها ویفید انه لو کان فوق الثوب ساتر له فانه لایکره أن یصلی فیه لاستتارها بالثوب الآخر والله سبحانه اعلم.

ولما فی الدرالمختار:(۱/ ۶۴۸،طبع سعید)

ولو کانت تحت قدمیه أو فی یده) عبارة الشمنی "بدنه" لأنها مستورة بثیابه(أو علی خاتمه) بنقش غیر مستبین قال فی البحر:ومفاده کراهة المستبین لا المستتر بکیس أو صرة أو ثوب آخر وأقره المصنف.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد ادریس چارسدوی

۱۳/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۵۳

## ﴿دورانِ نماز ٹوپی سر سے گر جائے تو کیا کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران نماز اگر سر سے ٹوپی گر جائے تو اٹھانے کا کیا طریقہ ہے؟

مستفتی:عبدالغفار

﴿جواب﴾ اگر ٹوپی سر کے قریب گری ہو تو بغیر عمل کثیر کے ایک ہاتھ سے اٹھا کر پہننا نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہے۔

لما فی التنویر وشرحه:(۱/ ۶۴۱،طبع )

ولو سقطت قلنسوته فاعادتها افضل الا اذا احتاجت لتکویر أو عمل کثیر قال العلامة ابن عابدین الشامی رحمه الله تعالیٰ تحت هذه المسئلة(ولو سقطت قلنسوته)هی مایلبس فی الرأس کما فی شرح المنیة الی أن قال:والظاهر أن أفضلیة اعادتها حیث لم یقصد بترکها التذلل علی مامر.

ولما فی حلبی کبیر:(ص ۳۸۳،طبع نعمانیه)

أن رفع القلنسوة أو العمامة بعمل قلیل اذ سقطت أفضل من الصلوٰة مع کشف الرأس بخلاف مالو انحلت العمامة أو احتاج فی رفعها الی عمل کثیر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:صلاح الدین چترالی

۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۳۵۱

## ﴿ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غفلت کیوجہ سے ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر مکروہ ہے تو مکروہ تحریمی یا تنزیہی؟ اور جو نمازیں ایسی پڑھی ہیں ان کے اعادہ کا حکم ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: مولانا دلاور صاحب

﴿جواب﴾ ننگے سر نماز پڑھنا اگر عجز وانکساری کی غرض سے ہو تو شرعاً پسندیدہ اور باعث ثواب ہے اور اگر غفلت کیوجہ سے کبھی ننگے سر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اس صورت میں یہ مکروہ تنزیہی ہے اور ننگے سر پڑھی ہوئی نمازیں واجب الاعادہ نہیں، تاہم ننگے سر نماز پڑھنے کی عادت بنانے سے کراہت میں شدت آسکتی ہے اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ نماز جیسی عظیم الشان عبادت میں بھی لاپرواہی اور غفلت برتنا بڑی کوتاہی اور نااہلی کا ثبوت ہے اور اس سے براہ راست صحت نماز پر اثر پڑھتا ہے، اگرچہ واجب الاعادہ نہیں ہے۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته:(۹۶۷/۲طبع رشیدیه)

والصلاة حاسرا(كاشفا)رأسه للتكاسل ولا بأس به بقصد التذلل لأن مبنى الصلاة على الخشوع ـ والكراهة هنا تنزيهية اتفاقا.

لمافی شرح الوقاية :(۱۹۷/۱طبع امدادیه)

صلاته حاسرلرأسه للتكاسل أو للتهاون بها ليس المراد بالتهاون الاهانة بالصلاة فانها كفر بل المراد قلة رعايتها ومحافظة حدودها وفي الحاشية والظاهر ان الكراهة ههنا تنزيهية ووجهها يوخذ من قوله تعالى في شان المنافقين" اذاقاموا الى الصلاة قاموا كسالى"

لمافی کتاب التجنیس والمزید:(۵۳۸/۱طبع ادارة القرآن)

اذاصلى رجل وهو مكشوف الرأس وهو يجد العمامة ان كان ذالك تهاونا بحال الصلاة يكره وان كان تذللا وتضرعا لله تعالى يستحب له ذالك لأن مبنى الصلاة على الخشوع.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۴۰۴۱

## ﴿نماز میں شناختی کارڈ گرنے اور اس کے اٹھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کی جیب سے

دوران نماز شناختی کارڈ گر گیا جسمیں تصویر بھی ہوتی ہے اب یہ آدمی نماز کے دوران شناختی کارڈ کو اٹھائیگا یا اسکے ہوتے ہوئے نماز پڑھیگا، نماز پر کوئی اثر ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: محمد وقاص صوابی

﴿جواب﴾ نماز کے دوران اگر آدمی کی جیب سے شناختی کارڈ یا کوئی تصویر والی چیز گر جائے تو اسکو دوران نماز اس طریقے سے اٹھائے کہ دوسرا آدمی اسکو نماز سے باہر نہ سمجھے تاکہ عمل کثیر کا ارتکاب نہ ہو جائے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور اگر نہیں اٹھایا تو نماز میں کراہت ضرور آئیگی اور یہ کراہت تنزیہی ہوگی۔

لما فی منیة المصلی:(ص ۲۱۲،طبع نعمانیه)

وکذا یفسدها العمل الکثیر مما لیس من اعمالها ولم یکن لاصلاحها وکل عمل لا یشک بسببه الناظر الی المصلی انه فی الصلاة بل یظن ظنا غالبا انه لیس فی الصلاة فهو عمل کثیر وما کان دون ذلک بان یشتبه علی الناظر ویتردد فی کونه فی الصلاة ام لا فهو عمل قلیل.

ولما فی رد المحتار :(۶۴۸/۱ایچ ایم سعید)

(لا المستتر بکیس او صرة)بان صلی ومعه صرة او کیس فیه دنانیر او دراهم فیها صور صغار فلا تکره لاستتارها ومقتضاه انها لو کانت مکشوفة تکره الصلاة مع ان الصغیرة لا تکره الصلاة معها لکن یکره کراهة التنزیه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۸ صفر ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۳۳۷

﴿دوران نماز قطرہ آنے کے وسوسہ سے وضو اور نماز کا اعادہ ضروری نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز پڑھنے کی نقل و حرکت میں بسا اوقات یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ قطرہ آگیا نماز سے فراغت کے بعد دیکھتا ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوتا، البتہ بعض اوقات واقعتاً تری نظر آتی ہے، ایسے وضوء اور نماز کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ نماز کی حالت میں ایسا خیال آجائے تو محض وہم کی وجہ سے نماز نہ توڑے نماز جاری رکھیں۔

لما فی الدر المختار؛(۱۵۰/۱،طبع سعید)

ولو ایقن بالطهارة وشک بالحدث او بالعکس اخذ بالیقین.

ولما فی التاتارخانیة (۱/۱۰۹ طبع قدیمی)

واما اذا کان یری ذلک کثیرا لم یلتفت ومضی لانه من الوساوس.

ہاں غالب گمان قطرہ آنے کا ہوجائے تو نماز چھوڑ کر دوبارہ وضوء بنالے، البتہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دیکھا کہ واقعی تری آئی تھی جس سے یقین ہوگیا کہ دوران نماز قطرے کا جو احساس ہوا تھا وہ محض خیال یا وہم نہیں تھا واقعی قطرہ تھا تو ایسی نماز کا بھی اعادہ ضروری ہے، بعض لوگوں کو وہم کا مرض ہوتا ہے یعنی قطرے کا احساس ہوتا ہے جب دیکھتے ہیں تو اکثر کچھ نہیں ہوتا، ایسے آدمی کو چاہیے کہ وضوء سے پہلے قطرے خشک کرنے کا اہتمام کرے پھر وضوء بنالے۔

لما فی الدر المختار مع رد المحتار: (۱/۳۴۴-۳۴۵، طبع سعید)

یجب الاستبراء بمشی او تنحنح او نوم علی شقه الایسر ویختلف بطباع الناس. واما نقس الاستبراء حتی یطمئن قلبه بزوال الرشح فرض وهو المراد هنا بالوجوب.

وضوء کرنے کے بعد تہہ بند کو پانی کی چھینٹیں ماریں، اس سے کپڑے کی تری کا احساس ہوگا اور قطرے کے احساس کا وہم جاتا رہیگا۔

لما فی التاتارخانیة: (۱/۱۱۰، طبع قدیمی)

ومن توضاء ورأی البلل سائلا من ذکره نقض وضوء ه فان کان الشیطان یریه به کثیرا ولا یستیقن انه بلل ماء أو بول مضی فی صلاته ولا یلتفت الی قال شیخ الاسلامؒ الحیلة فی قطع هذه الوسوسة أن ینضح فرجه بالماء فاذا أراه الشیطان ذلک أحاله علی الماء قالوا: هذا الاحتیال انما ینفعه اذا کان العهد قریبا بحیث لم یجف البول فاما اذا مضی علیه ثم رأی بللا فانه یعید الوضوء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۷ ذیقعدہ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۵۸

## ﴿نماز میں بجتے ہوئے موبائل فون کو بند کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ نماز کے دوران اگر جیب میں رکھا ہوا موبائل بجنا شروع ہوجائے، کیا ایسی صورت میں بٹن دبا کر اسے بند کیا جاسکتا ہے؟ نیز بٹن دبانے کی صورت میں بھی اگر گھنٹی بجتی رہے تو کیا اسے جیب سے باہر نکال کر بھی بند کیا جاسکتا ہے؟ ایسا کرنا عمل کثیر میں شمار ہوکر

مفسدِ صلوٰۃ تو نہیں ہوگا؟ مستفتی: صلاح الدین

﴿جواب﴾ دورانِ نماز اگر موبائل کی گھنٹی بجے تو اُسکے بند (Off) کرنے کی صورتیں مختلف ہیں: (۱) جیب میں ہاتھ ڈالے بغیر ہی گھنٹی بند کرلے (۲) جیب میں ہاتھ ڈال کر تاہم عمل قلیل کے ساتھ بند کردے (۳) اِس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو کہ جیب سے اُسے نکالا جائے اور بٹن دیکھ کر بند کیا جائے۔

ان تینوں صورتوں میں اگر عملِ قلیل کے ساتھ بٹن بند کرلے تو نماز میں کوئی فرق نہیں پڑے گا یعنی ایک ہاتھ کو استعمال کرتے ہوئے اس طور پر بند کرلے کہ دُور سے دیکھنے والے کا ظن غالب نمازی کے بارے میں یہ نہ ہو کہ یہ شخص نماز میں نہیں ہے ورنہ نماز ہی ٹوٹ جائیگی۔

لمافی فتح القدیر:(۱/۴۱۳،طبع رشیدیه)

لا ان كمسح او شرب اوتعمم او حكّ او مشى او نتف اقلّ مماعينّاه او غيرمتدارك اولم يتناول القارورة بل كان في يده فسح بها او نزع اللجام او القميص اوساق برجل واحدة لا تفسد وقولهم اذا دفع المار تفسد يجب ان يحمل على التكرر دون فترة ليكون عملا كثيرا فالدفعة الواحدة عمل قليل.

ولمافی الكبيری:(ص ۴۲۱،طبع سهيل اكيڈمی)

وكذا يفسدها العمل الكثير ماليس من اعمالها ولم يكن لاصلاحها وكل عمل لايشك الناظر الى المصلى انه فى الصلوٰة بل يظن ظنا غالبا انه ليس فى الصلوٰة فهو عمل كثير وماكان دون ذلك بان يشتبه على الناظر ويتردد بكونه فى الصلوٰة ام لا فهو قليل وقال بعضهم كل عمل يعمل باليدين عرفا وعادة فهو كثير ولو قدر انه عمله بيد واحدة وماكان يعمل فى العادة بيد واحد فهو قليل مالم يتكرر (صفحه ۴۲۱).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۸۱

﴿مساجد میں ہیٹر کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے اپنے علاقے کی مسجد میں شدتِ سردی کی وجہ سے سامنے اور دونوں جانب ہیٹر دیواروں میں نصب کئے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ نمازی کے سامنے ہیٹر ہوتے ہوئے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتی ہے

تو کراہت کے ساتھ یا بلا کراہت؟ اور کیا اس میں مجوسیوں کے ساتھ مشابہت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ شدتِ سردی کی وجہ سے مساجد میں ہیٹر لگانے سے نماز میں کوئی فرق نہیں آتا، بلا کراہت جائز ہے اگر چہ ہیٹر سامنے ہو اور اس میں مجوسیوں کے ساتھ مشابہت بھی نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر والرد:(۱/۶۵۱-۶۵۲،طبع سعید)

لا یکرہ (صلاۃ الی ظہر قاعد)...... ولا الی (مصحف أو سیف مطلقاً أو شمع أو سراج) أو نار توقد. وفی الشامیۃ: وفی شرح المنیۃ: وجہ عدم الکراہۃ أن کراہۃ أستقبال بعض الأشیاء باعتبار التشبہ بعبادہا والمصحف والسیف لم یعبدہما أحد واستقبال أہل الکتاب للمصحف للقرآءۃ منہ لا للعبادۃ...... (قولہ أو شمع)...... وعدم الکراہۃ ہو المختار کما فی غایۃ البیان ---- ونصہ: ألصحیح أنہ لا یکرہ أن یصلی وبین یدیہ شمع أو سراج لأنہ لم یعبدہما أحد والمجوس یعبدون الجمر لا النار الموقدۃ.

ولما فی الھندیۃ:(۱/۱۰۸،طبع رشیدیہ)

ولو توجہ الی قندیل أو الی اراج لم یکرہ کذا فی محیط السرخسی وھو الأصح.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۶ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۹۲۶

## ﴿کبڑا شخص رکوع کس طرح ادا کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بوڑھا ہو چکا ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے اس کی کمر جھک چکی ہے اب وہ رکوع کس طرح کرے گا؟

﴿جواب﴾ اگر کسی شخص کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے اتنی جھک گئی ہو جیسے وہ رکوع میں ہے تو رکوع کے لئے صرف سر جھکا دینا کافی ہے۔

ولما فی حلبی الکبیر:(ص۲۸۰، سہیل اکیڈمی)

رجل احدب بلغت حدوبتہ الرکوع یخفض رأسہ فی الرکوع تحقیقاً للانتقال من القیام الی الرکوع و لیس علیہ غیر ذلک کذا قالوا.

ولما فی العالمگیریہ:(۱/۷۰،رشیدیہ)

والاحداب اذا بلغت حدوبتہ الرکوع یشیر برأسہ للرکوع کذا فی الخلاصۃ والتجنیس.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۵۹۵

## ﴿سنتوں اور عیدین کے بعد دعا مانگنے کے حکم میں فرق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ علمائے دیوبند سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کو بدعت کہتے ہیں کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے ثابت نہیں ہے جبکہ عیدین کی نماز کے بعد دعا کے جواز کے قائل ہیں جبکہ اصلی بہشتی زیور کامل گیارھواں حصہ ''عیدین کی نماز کا بیان'' میں لکھا ہے کہ عیدین کے بعد دعا ثابت نہیں لیکن مانگ سکتے ہیں، وجہ فرق یا ترجیح کیا ہے؟

مستفتی: محمد سیف اللہ عادل اسلام آباد

﴿جواب﴾ سنن ونوافل کے بعد دعا سے انکار نہیں ہے لیکن امام کے ساتھ بہ ہیئت اجتماعیہ دعا مانگنا یہاں تک کہ سنتوں سے فارغ ہو کر اس اجتماعی دعا کا باقاعدہ انتظار بھی کیا جاتا ہے اس طرح کی اجتماعی دعا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں لہٰذا سنتوں کے بعد رائج نہج پر اجتماعی دعا بدعت ہے اور اسکی کوئی اصل نہیں ہے، البتہ عیدین کی نماز کے بعد اجتماعی دعا مسنون ہے اور بخاری وترمذی شریف کی روایتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور بہشتی زیور میں جو مسئلہ لکھا ہوا ہے وہ بالکل صحیح ہے کہ عیدین میں خطبہ کے بعد تو دعا مانگنا ثابت نہیں البتہ نماز عید کے بعد خطبہ سے پہلے دعا مسنون ہے اور بخاری وترمذی شریف کی روایت میں اگرچہ نماز یا خطبہ کے بعد کی کوئی تعیین نہیں لیکن دیگر نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے نماز کے بعد ہی دعا کا محل ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لیے عیدین کی نماز کے بعد دعا مانگ سکتے ہیں۔

لما فی البخاری:(۱/۱۳۲،باب اعتزال الحیض المصلی طبع قدیمی)

عن محمد قال قالت أم عطية أمرنا ان نخرج فنخرج الحيض والعواتق وذوات الخدور فاما الحيض فيشهدن جماعة المسلمين ودعوتهم ويعتزلن مصلاهم.

ولما فی الترمذی:(۱/۷۰،باب فی خروج النساء فی العیدین طبع فاروقی ملتان)

عن ام عطية ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يخرج الابكار والعواتق وذوات الخدور والحيض فى العيدين فاما الحيض فيعتزلن المصلى ويشهدن دعوة المسلمين.

ولما فی المشکوٰۃ:(۱/۸۹،باب الذکر بعد الصلاۃ،طبع سعید)

الفصل الثانی:عن ابی امامة قال قيل يا رسول الله اى الدعاء اسمع قال جوف الليل

الآخر ودبر الصلاة المكتوبات (رواه الترمذي).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۱۳

## ﴿نماز میں شک کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آدمی کو نماز میں شک ہو جائے اور تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کے بقدر خاموش رہے اور سوچتا رہے تو کیا حکم ہے؟ سجدہ سہو ہوگا یا نہیں؟

مستفتی: رحمان الدین

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ اگر شک ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ نماز کے افعال سے نہیں نکلا بلکہ نماز کے افعال میں سے کسی فعل کے اندر مشغول بھی ہے اور سوچ بھی رہا ہے مثلاً: رکوع یا سجود میں دیر تک تسبیح پڑھتا رہا اور اگلے رکن کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی یا آخری قعدہ میں تشہد کے بعد دعاؤں میں مشغول ہو گیا اور سوچ بھی رہا ہے جسکی وجہ سے سلام میں تاخیر ہوگئی ہے تو ایسی صورت میں سجدہ سہو نہیں ہوگا، لیکن اگر شک کی وجہ سے وہ ایسی سوچ میں پڑ گیا کہ بالکل خاموش ہی ہو جائے اور تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کے بقدر خاموش رہے تو ایسی صورت میں تاخیر رکن یا تاخیر واجب کی وجہ سے سجدۂ سہو ہوگا۔

لما في حلبي كبيري (ص ۴۰۱ طبع نعمانيه كوئٹه)

وكذا ان شك أنه في الظهر أو في العصر مثلا أو شك أنه صلى ثلاثا أو أربعا وشغله عن التسليم ونحو ذلك أو فرغ من الفاتحة وتفكر أي سورة يقرأ وطال تفكره يجب عليه سجود السهو ثم الاصل في حكم التفكر أنه ان منعه عن اداء ركن كقراءة آية أو ثلاث أو ركوع أو سجود أو عن أداء واجب كالقعود يلزمه السهو لاستلزام ذلك ترك الواجب وهو الاتيان بالركن أو الواجب في محله وان لم يمنعه عن شئ من ذلك بأن كان يؤدي الأركان ويتفكر لا يلزمه السهو.

ولما في المحيط (۲/۲۱۱ طبع ادارة القرآن)

وعن الحسن عن أبي حنيفةؒ اذا لم يقرأ في الأخريين من الظهر أو العصر أو العشاء ولم يسبح فقد أساء ان كان متعمدا وان كان ساهيا فعليه سجود السهو.

ولما فيه أيضا: (۲/۲۲۰ طبع ادارة القرآن)

وجه الاستحسان أنه أخر واجبا أو ركنا ساهيا لا بسبب اقامة السنة بل بسبب

التفکر والتذکر لیس من اعمال الصلاۃ فیلزمہ سجود السہو کما لو زاد رکوعا أو سجدۃ فی صلاتہ بخلاف ما اذا طال الرکوع أو السجود أو القیام ساھیا حیث لا یلزم سجود السہو لأن التاخیر حصل بفعل من افعال الصلاۃ ساھیا وذلک سنۃ ان لم یکن واجبا وتاخیر الرکن أو الواجب متی کان بسبب فعل من افعال الصلاۃ ساھیا لا یوجب سجدۃ السہو.

ولما فی الدر مع الرد:(۹۲/۲ طبع سعید)

(و)اعلم (اذا شغلہ ذالک)الشک فتفکر(قدر اداء رکن ولم یشتغل حالۃ الشک بقرأۃ ولا تسبیح)ذکرہ فی الذخیرۃ(وجب علیہ سجود السہو فی)جمیع(صور الشک).

وفی الشامیۃ:ومثلہ ما فی الذخیرۃ من أنہ لو کان فی رکوع أو سجود فطول فی تفکرہ وتغیر عن حالہ بالتفکر فعلیہ سجود السہو استحسانا لأنہ وان کان تفکرہ لیس الا اطالۃ القیام أو الرکوع أو السجود وھذہ الاذکار سنۃ لکنہ اخر واجبا أو رکنا لا بسبب اقامۃ السنۃ بل بسبب التفکر ولیس التفکر من اعمال الصلاۃ.

قلت والحاصل أنہ اختلف فی التفکر الموجب للسہو فقیل ما لزم منہ تاخیر الواجب أو الرکن عن محلہ بأن قطع الاشتغال بالرکن أو الواجب قدر اداء رکن وھو الاصح.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:طاہر زمان راولپنڈی

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۰۱۳

## ﴿نماز میں فاتحہ پر اکتفاء کرنا کیسا ہے؟نیز نماز جنازہ میں کونسا درود پڑھنا اولیٰ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ:

(۱) نماز میں کتنی قراءت فرض ہے؟اگر صرف فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے تو نماز ادا ہوگی یا نہیں؟

(۲) نماز جنازہ میں کونسا درود پڑھنا چاہیئے نماز والا یا جو عام طور پر جنازہ میں پڑھا جاتا ہے،نیز (اس میں وبارک علی محمد) کے الفاظ ہیں یا نہیں؟　　　مستفتی:مختار احمد ڈی آئی خان

﴿جواب﴾(۱) فرض نماز کی پہلی دو رکعتوں اور باقی تمام نمازوں کی تمام رکعتوں میں مطلق قراءت فرض ہے،سورۃ فاتحہ کیساتھ کسی چھوٹی سورۃ یا جو اس کے قائم مقام ہو مثلاً:ایک بڑی آیت جو چھوٹی سورۃ کے برابر ہو ملانا واجب ہے،لہٰذا اگر کسی نے صرف فاتحہ یا صرف سورۃ پر اکتفاء کیا تو قراءت کا فرض ادا ہو جائے گا لیکن ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ رہے گی۔

لما فی الدر المختار مع الشامیہ:(۴۵۸/۱-۴۵۹ طبع سعید کراچی)

(وضم)اقصر(سورۃ)کالکوثر او ما قام مقامھا وھو ثلاث آیات قصار نحو ثم نظر ثم عبس

وبسر ثم ادبر واستكبر وكذا كانت الاية او الايتان تعدل ثلاثا قصارا ذكره الحلبي في (الاوليين من الفرض) وهل يكره في الاخريين؟ المختار لا.

وفي الشامية: (قوله في الاوليين) تنازع فيه قرأة وضم في قول المصنف قرأة فاتحة الكتاب وضم سورة لان الواجب في الاوليين كل منهما فافهم.

لما في الهندية: (۱/ ۷۱، طبع: رشيديه كوئٹه)

وتجب قرأة الفاتحة وضم السورة او مايقوم مقامها من ثلاث آيات قصار او آية طويلة في الاوليين بعد الفاتحة كذا في النهر الفائق.

لما في البحر: (۱/ ۲۹۵-۲۹۶، طبع سعيد كراچى)

(قوله وواجبها قرأة الفاتحة وضم سورة) وعند الائمة الثلاثة سنة ولنا رواية الترمذي مرفوعا لا صلٰوة لمن لم يقرأ بالحمد وسورة في فريضة او غيرها واطلق السورة واراد بها ثلاث آيات لان اقل سورة في كتاب الله تعالى ثلاث آيات قصار كسورة (انا اعطيناك الكوثر) ولم يرد السورة بتمامها بدليل ماسيأتي صريحا في كلامه وهذا الضم واجب في الأوليين من الواجب وفي جميع ركعات النفل والوتر كالفاتحة.

(۲) نماز جنازہ میں درود ابراہیمی پڑھنا اولیٰ ہے، جسمیں (وبارک علی محمد) کے الفاظ موجود ہیں البتہ دوسرا درود جو نماز جنازہ میں پڑھا جاتا ہے وہ بھی بعض روایات سے ثابت ہے۔

لما في بدائع الصنائع: (۱/ ۳۱۳، طبع سعيد)

واذا كبر الثانية يأتي بالصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم وهي الصلاة المعروفة وهي أن يقول اللهم صلى على محمد وعلى آل محمد الى قوله انك حميد مجيد.

لما في فتح القدير مع الهداية (۲/ ۱۲۵، طبع رشيديه كوئٹه)

ويصلي بعد التكبيرة الثانية كما يصلي في التشهد وهو الاولى.

لما في الدر مع الرد: (۲/ ۲۱۲، طبع سعيد)

(ويصلي على النبي صلى الله عليه وسلم) كما في التشهد (بعد الثانية) وفي الشامية: (قوله كما في التشهد) اى المراد الصلٰوة الابراهيمية التي يأتي بها المصلي في قعدة التشهد.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی

۲۲ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۹۰۹

## ﴿مسجد میں داخل ہونے کی دعا کا محل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں داخل ہونے کی دعا وقف مسجد میں داخل ہوکر پڑھی جائے گی یا جہاں نماز پڑھی جاتی ہے وہاں داخل ہوکر پڑھی جائے گی؟

﴿جواب﴾ مسجد میں داخل ہونے کی دعا مسجد کے اس حصے میں داخل ہوکر پڑھی جائے گی

جو حصہ نماز کے لیے مخصوص ہے، چنانچہ مسجد کے دیگر احکام بھی اسی حصے پر جاری ہوتے ہیں، مثلاً جنبی وحائضہ کا داخل نہ ہونا، معتکف کا بلاضرورت مسجد سے باہر قدم نہ رکھنا وغیرہ۔

لمافی الصحیح لمسلم :(۲۴۸/۱،طبع قدیمی)

اذا دخل أحدکم المسجد فلیقل اللّٰھمّ افتح لی ابواب رحمتک، واذا خرج فلیقل اللّٰھمّ انی أسئلک من فضلک.

ولمافی ردالمحتار:(۶۵۷/۱،طبع سعید)

قوله کفناء مسجد هو المکان المتّصل به لیس بینه وبینه طریق.

ولمافی الشامی:(۳۵۶/۴،سعید)

أنّه اذا بنی مسجداً وأذن للنّاس بالصّلاة فیه جماعة فانّه یصیر مسجداً

ولما فی الفتاویٰ الهندیة:(۱۲۱/۱،طبع قدیمی)

وفناء المسجد له حکم المسجد،حتّٰی لو قام فی فناء المسجد واقتدیٰ بالامام صحّ اقتدٰؤه، وان لم تکن الصّفوف متّصلة ولاالمسجد ملآن.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عابداللہ چترالی

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۸۵

## ﴿بغیر سلام کے نماز توڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک امام صاحب نے چار رکعتوں والی نماز میں قعدہ اخیرہ کیا، لیکن قعدہ اخیرہ کو پہلا قعدہ سمجھ کر پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہوگیا، اور نماز توڑ دی، تو ایسی صورت میں مسبوق نمازیوں کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ چونکہ امام نے مشروع اور واجب طریقہ سے ہٹ کر بغیر سلام کے یوں ہی نماز توڑ دی، لہذا تمام نمازیوں کی نماز واجب الاعادہ ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۵۹۹/۱،طبع سعید)

(ولوقام امامه لخامسة فتابعه،ان بعدالقعود)ای قعودالامام القعدة الاخیرة(تفسد)ای صلاة المسبوق لانه اقتداء فی موضع الانفراد،ولان اقتداء المسبوق بغیره مفسد.

ولمافی البحر الرائق:(۳۷۸/۱،طبع سعید)

ولوقام الامام الی الخامسة فی صلاة الظهر فتابعه المسبوق ان قعدالامام علی رأس

الرابعة تفسد صلاة المسبوق وان لم يقعد لم تفسد حتى يقيد الخامسة بالسجدة.

ولما في الدر:(۱/۴۵۶-۴۵۷،طبع سعيد)

(ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو ان لم يسجد له، وان لم يعدها يكون فاسقا آثما، وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد طارزئی

۱۱ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ

فتویٰ نمبر: ۲۸۴۲

## ﴿مسجد سے متصل راستے میں اور نجس زمین پر نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے مسجد سے متصل راستے میں نماز پڑھی جبکہ مسجد میں گنجائش نہ ہو تو ایسی صورت میں بغیر مصلی کے نماز درست ہو جائیگی یا نہیں؟ اسطرح اگر مسجد سے باہر نجس جگہ پر مصلی بچھا کر نماز پڑھی تو ایسی صورت میں نماز کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: محمد ادریس چارسدوی

﴿جواب﴾ مسجد کے اندر گنجائش نہ ہونے کی صورت میں راستے میں صف یا مصلی بچھا کر نماز پڑھنا درست ہے بشرطیکہ نماز سے فارغ ہوتے ہی آنے جانے والوں کا راستہ چھوڑ دے اور جہاں تک نجس زمین پر نماز پڑھنے کا مسئلہ ہے تو زمین اگر خشک ہوگئی ہو تو خشک ہونا اس کی پاکی ہے اور اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں، البتہ نجس پانی یا دوسری کوئی تر نجاست اس قدر ہو کہ جائے نماز کو بھی ناپاک کردے تو اس صورت میں نماز نہیں ہوگی۔

لما في الشامي (۱/۵۸۶ مطلب الكافي للحاكم جمع كلام محمد طبع سعيد)

وكذا لو اصطفوا على طول الطريق صح اذا لم يكن بين الامام والقوم مقدار ما تمر فيه العجلة وكذا بين كل صف وصف كما في الخانية وغيرها (قوله عند اتصال الصفوف) تحت قوله اي في الطريق او على جسر النهر فانه مع وجود النهر او الطريق يختلف المكان وعند اتصال الصفوف يصير المكان واحدا حكما فلا يمنع.

ولما في الهندية:(۱/۴۲،طبع رشيديه)

الارض او الشجر اذا اصابته النجاسة فاصابه المطر ولم يبق لها اثر يصير طاهرا ---

وايضا في الهندية الجفاف وزوال الاثر: الارض تطهر باليبس وذهاب الاثر للصلاة ولا للتيمم هكذا في الكافي ولا فرق بين الجفاف بالشمس والنار والريح والظل

لمافی الکبیری غنیة المستملی:(ص ۱۶۴،طبع نعمانیه کوئٹه)

وذکر فی المحیط عن شمس الایمة السرخسی الارض اذا جلت ای بعد اصابة النجاسة ولم یتبین اثر النجاسة فیها تطهر سواء وقع علیها الشمس او لم تقع.

ولما فی الشامی:(۱/۶۲۵،مطلب فی التشبه باهل الکتاب طبع سعید)

قوله ویفسدها سجوده علی نجس ای بدون حائل اصلا.

الجوب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد امین چارسدوی

۲۷صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۹۲۱

## ﴿غیر ملکی استعمال شدہ کپڑوں کو دھوئے بغیر نماز پڑھنا﴾

﴿سوال﴾ آجکل لنڈا بازار میں غیر ملکی استعمال شدہ کپڑے مثلاً سویٹر کوٹ وغیرہ فروخت ہوتے ہیں بظاہر ان پر کوئی نجاست نظر نہیں آتی لیکن یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ پاک ہونگے یا نہیں ایسے کپڑوں کو دھوئے بغیر ان میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟　　　مستفتی تنویر احمد

﴿جواب﴾ ان کپڑوں پر اگر بظاہر کوئی نجاست نہ ہو تو یہ کپڑے پاک ہیں ان کو دھوئے بغیر پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، محض شبہ کی بنیاد پر ناپاکی کا حکم نہیں لگایا جائیگا، البتہ دھو کر استعمال کرنے میں زیادہ احتیاط ہے۔

لمافی التنویر مع الدر والرد:(۱/۲۰۵،سعید)

مایخرج من دار الحرب......وان شک فغسله افضل.(قوله فغسله افضل)لأن الأخذبما هو الوثیقة فی موضع الشک افضل اذلم یؤد الی الحرج ومن هنا قالوا لاباس بلبس ثیاب اهل الذمة والصلاة فیها الا الازار والسراویل فانه تکره الصلاة فیها لقربهما من موضع الحدث وتجوز لان الاصل الطهارة وللتوارث بین المسلمین فی الصلوة بثیاب الغنائم قبل الغسل وتمامه فی الحلیة.

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص ۲۰،قدیمی)

الیقین لا یزول بالشک......ان الاصل طهارة الثوب.

ولما فی نور الانوار:(ص ۲۲۲،طبع امدادیه)

والاحتجاج باستصحاب الحال......وحاصله ابقاء ما کان علی ما کان......وعندنا هو لیس بحجة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:ریاض الرحمٰن

۲۳/۱/۱۴۲۸ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۰۷۰

﴿ستر ڈھانکنے کیلئے کپڑا نہ ہو تو نماز بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ننگا ہے، جسکے پاس اتنا بھی کپڑا نہیں ہے کہ جس سے وہ اپنا ستر ڈھانک سکے تو کیا اسکے لئے بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا لازمی ہے یا وہ بیٹھ کر نماز ادا کر سکتا ہے؟۔ مستفتی: ایک طالب علم

﴿جواب﴾ ننگے شخص کے لئے بیٹھ کر نماز ادا کرنا افضل ہے، اور وہ رکوع اور سجدہ بھی اشارے سے ادا کرے، تاہم اگر کسی نے کھڑے ہو کر ادا کر لی، تو اسکی نماز ہو جائیگی، لیکن خلاف اولیٰ ہے۔

لما فی الهدایه :(۹۱/۱،طبع رحمانیه)

ومن لم یجد ثوبا صلی عریانا قاعدا یؤمی بالرکوع والسجود .هکذا فعله اصحاب رسول الله ﷺ ،فان صلی قائما اجزاه ـ الاان الاول افضل.

ولما فی التنویر مع الدر :(۴۱۰/۱،۴۱۱،طبع سعید)

(وعادم ساتر)... یصلی قاعدا مومیا برکوع وسجود .وهو افضل من صلاته )قاعدا یرکع ویسجدوقائما) بایماء او (برکوع وسجود )لان الستر اهم من اداء الارکان.

ایضا فی الشامی :(قوله لان الستر اهم الخ)ای لانه فرض فی الصلاة وخارجها، والارکان فرائض الصلاة لاغیر وقد اتی ببدلها ،وانما جاز القیام لانه وان ترک فرض الستر فقد کمل الارکان الثلاثه بدائع ،واراد بالارکان الثلاثة القیام والرکوع والسجود، وظاهره انه لایجوز الایماء قائما ،لان فیه ترک فرض الستر بلاتکمیل للثلاثه ،ومن هنا نشأترجیح صاحب البحر والحلیة لظاهر ما مر عن الهدایة.

ولما فی الفقه الاسلامی :(۸۲۲/۲،طبع رشیدیه)

ویسقط القیام ایضا عند جمهور الفقهاء غیر الشافعیة للعریان ،فانه یصلی قاعدا بالأیماء اذالم یجد ساترا یستر به عورته.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ روغانی

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۹۲

﴿جہاز میں نماز اور لاؤڈ سپیکر پر نماز میں اختلاف کی وجہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہوائی جہاز میں نماز ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز دوران نماز لاؤڈ سپیکر کا استعمال صحیح ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ مذکورہ

دونوں مسئلوں کے بارے میں عدم صحت کا قول بعض کتابوں میں نظر سے گزرا ہے وضاحت امر مطلوب ہے۔ مستفتی: عبداللہ گوادر

﴿جواب﴾ (۱) عام اہل علم کے نزدیک ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا جائز ہے، بعض علماء نے عدم جواز کا جو قول کیا ہے، وہ اس بناء پر ہے کہ فقہاء نے سجدہ کی تعریف ''وضع الجبهة على الارض'' سے کی ہے یعنی پیشانی کا زمین پر یا اس چیز پر جو زمین پر قائم ہو ٹیکنا جبکہ جہاز کی اڑان کے وقت یہ صورت محقق نہیں ہوتی کیونکہ جہاز کو ہوا پر قرار نہیں اور نہ ہوا کو زمین پر قرار حاصل ہے۔ یہاں پر عدم جواز کے قول کرنے والے علماء کو ایک گونہ التباس ہوا ہے، وہ اس طرح سے کہ تعریف سجدہ میں لفظ ارض کو انہوں نے قید احترازی سمجھا ہے، حالانکہ بسا اوقات فقہاء کی تعریفات میں استعمال شدہ الفاظ تغیر و تبدل زمانہ کیوجہ سے محض قیودات اتفاقیہ رہ جاتی ہیں، چونکہ عہد فقہاء میں نہ تو جہاز کا وجود تھا، اور نہ ہی تصور تھا، اس لئے اس دور کے لحاظ سے سجدہ کی تعریف میں لفظ ارض کی صراحت ہے، جس کو اس وقت قید اتفاقی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

**كما قال المفتى محمد تقى العثمانى دامت بركاتهم فى اصول الافتاء:**

جواز الصلاة فى الطائرة قد افتى بعض علماء زماننا بعدم جواز الصلاة وعللوا ذالك بان السجود لا يتحقق فيها لكون السجود عرفه الفقهاء بوضع الوجه على الارض على وجه التذلل فيشترط لتحقق السجود ان يكون وضع الجبهة على الارض او على ما يستقر عليها فان الطائرة ليست ارضا ولا مستقرة عليها عند طيرانها، لانها لا تستقر على الهواء ولا الهواء تستقر على الارض، وان هذا الدليل مبنى على تعريف الفقهاء للسجود ولا شك ان الفقهاء لما عرفوا السجود لم يتصوروا الطائرات لكونها غير موجودة، ولا متصورة فى عهدهم فانهم حين استعملوا لفظ الارض لم يقصدوا بذلك لخراج الطائرة وانما عبروا بلفظ الارض عن الفرش الذى يسلك عليه الناس ويعتبروا موطنا للاقدام والذى لا ينفصل بثقل الجبهة، ولما كانت هذه الاوصاف لا تتصور فى عهد الفقهاء الا فى الارض، عرفوا السجود بوضع الجبهة على الارض ولكنه تبين بعد حدوث الطائرات ان هذه الاوصاف المطلوبة للسجود موجودة باسرها فى فرش الطائرات ايضا، وحينئذ لا يصح الاستدلال بلفظ الارض فى تعريف السجود على عدم جواز السجود عليها.

(۲) نماز میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے بارے میں سابقہ علماء عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے کہ اس کے استعمال سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، تو علماء کا یہ سابقہ فتویٰ بھی اس بناء پر تھا، کہ اس آلہ کی آواز کو علماء امام کی اصلی آواز نہیں، بلکہ صدائے بازگشت سمجھ رہے تھے، جس کی بناء پر ان

کو فساد نماز کا فتوی دینا پڑا، کیونکہ نماز میں کسی ایسے شخص کی آواز کا اتباع کرنا جو داخل نماز نہ ہو مفسد نماز ہے۔ اب جب کہ یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ اس آلہ کی آواز بعینہ امام کی آواز ہے، تو اب اگر کوئی ضرورت اور حاجت کیوقت اسے استعمال کرے تو علماء کرام جواز کا فتوی دے رہے ہیں، تاہم یہ بات واضح رہے کہ نمازیوں کی حد تک اس کی آواز محدود رہنی چاہیئے۔

واللہ اعلم بالصواب: سعید احمد　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۸۹۹　　　۱۴۲۸ھ

## ﴿سمندری جہاز میں نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں بحری جہاز میں ملازم ہوں اور جہاز ہمیشہ دور ممالک میں پھرتا رہتا ہے کبھی ایک جگہ دس پندرہ دن، مہینہ دو مہینے ٹھہرتا ہے لیکن معلوم نہیں ہوتا کہ کب وہاں سے روانہ ہوگا ہمیں چھ سات ماہ یا بعض اوقات سال بعد گھر جانے کا اتفاق ہوتا ہے ایسی صورت میں ہم پوری نماز پڑھیں یا قصر پڑھیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جب تک آپ اپنے گھر نہیں پہنچتے اس وقت تک آپ قصر پڑھتے رہیں کیونکہ جب جہاز کسی بندرگاہ پر ٹھہرتا ہے اور دس پندرہ دن یا مہینہ دو مہینے ٹھہرا رہتا ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ کب روانہ ہوگا تو آپ مسافر ہیں اور مسافر کیلئے قصر کا حکم ہے ہاں اگر کسی بندرگاہ پر جہاز ٹھہرے اور یقین ہو کہ پندرہ دن ٹھہرا رہیگا اور آپکا قیام باہر کسی آبادی میں ہو تو ایسی صورت میں پوری نماز پڑھیں اسلئے کہ سمندر میں اقامت کی نیت معتبر نہیں ہے۔

لمافی الهندية:(۱۳۹/۱ ،طبع رشيديه)

ونية الاقامة انما تؤثر بخمسة شرائط ترك السير حتى لونوى الاقامة وهويسيرلم يصح وصلاحية الموضع حتى لونوى الاقامة فى براوبحراوجزيرة لم يصح واتحادالموضع والمدة والاستقلال بالرأى كذافى معراج الدراية.

ولمافى الشامية:(۲/۶۰۹ ،طبع امداديه)

والحاصل ان شروط الاتمام ستة:النية والمدة واستقلال الرأى وترك السير واتحادالموضع وصلاحيته.قهستانى.

واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۸۸۷　　　۱۴ جمادی الاولی ۱۴۲۸ھ

## ﴿سودخور کی نماز کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سودخور کی نماز قبول نہیں ہوتی تو کیا اس کو نماز نہیں پڑھنی چاہیئے؟
مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ سودخور کی عبادات قبول نہیں ہوتیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نماز بھی چھوڑ دے بلکہ نماز اس پر بہرحال لازم ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ کسی نہ کسی وقت نماز اسے اس برے فعل یعنی سودخوری سے روک دے گی اور اس پر لازم ہے کہ وہ سود چھوڑ دے۔

لمافی قوله تعالیٰ: (سورة العنكبوت آیت ۴۵)

أقيموا الصلوٰة وفيه: ان الصلوٰة تنهىٰ عن الفحشاء والمنكر..... الأية.

ولمافی قوله تعالیٰ: (سورة البقرة آیت ۲۷۵)

احل الله البيع وحرم الربوا..... الأية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین غفرلہ

۲۰ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۶۷

## ﴿ڈیوٹی یا نیند کی وجہ سے نماز کو قضاء کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کی نوکری رات کی ہے اس کی وجہ سے اور گھریلو کام مثلاً گھر والوں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا وغیرہ اور اس طرح کے کاموں کی وجہ سے نیند پوری نہیں ہوتی جسکی وجہ سے وہ نیند سے اٹھ کر ٹھیک وقت پر نماز نہیں پڑھتے، اٹھانے سے بھی نہیں اٹھتے تو نماز قضاء ہو جاتی ہے کیا اس کا گناہ ہے؟ اور اس کو کیا کرنا چاہیے؟
مستفتی: عابد بیگ

﴿جواب﴾ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو کسی بھی حالت میں معاف نہیں ہوتی ہر حال میں پڑھنا فرض ہے۔ نوکری وغیرہ کی وجہ سے اس کو قضاء کرنا یا نیند کی وجہ سے قضاء کرنے کو معمول بنالینا گناہ کبیرہ ہے۔ ڈیوٹی اور آرام کو کوئی ایسی ترتیب دے کہ نماز قضاء نہ ہو پائے ورنہ نوکری چھوڑ دے، دوسری جگہ تلاش کرے۔

لما حاشية الطحطاوی: (ص ۲۴۰، طبع: قدیمی)

والتاخير بلا عذر كبيرة لا تزول بالقضاء بل بالتوبة أو الحج فالقضاء مزيل لاثم

الترك لا لاثم التاخير.

ولما فی فتح القدير :(۵۰۲/۱،طبع:رشيدية)

"من نام عن صلوة أو نسيها فليصلها اذا ذكرها لا كفارة لها الا لذالك".

ولما فی المشكوة:(۵۹/۱،طبع:سعيد)

عن ابی الدرداءؓ قال اوصانی خليلی ان لا تشرك با الله شيئا وان قطعت وحرقت ولا تترك الصلوة مكتوبة متعمداًفمن تركها متعمداً فقد برئت منه الذمة.

ولما فی المرقاة المفاتيح:(۲۷۳/۲،طبع:رشيدية)

(فمن نام)يعنيتكاسلاًاو تهاوناً من غير ضرورة،(فلانامت عينه ومن نام فلا نامت عينه)التكرير للتاكيد،أو لاختلاف أحوال النائم.قال ابن حجر :وفی هذا التحريم النوم قبل صلوة .وهو محمول عندنا علی التفصيل .هو انه تارة ينام قبل الوقت وتارة بعد دخوله .فی الثانی ان علم أو ظن ان نوم يستغرق الوقت لم يجز له النوم الا ان وثق من غيره انه يوقظ بحيث يدرك الصلوة كاملة فی الوقت وكذا فی الاول عند جماعات من اصحابنا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: تنویرالرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۵۴

## ﴿زلزلہ وغیرہ خوف کے اوقات میں نماز کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا زلزلہ کے وقت بھی اجتماعی نماز پڑھی جائے یا لوگ اکیلے اکیلے پڑھیں؟

﴿جواب﴾ زلزلہ یا دوسری آفات مثلاً چاند گرہن، آندھی، طوفان، کڑک وغیرہ میں اجتماعی نماز نہیں پڑھی جائے گی بلکہ لوگ گھروں میں یا مسجدوں میں اکیلے اکیلے پڑھیں گے۔

لما فی الشامية:(۱۸۳/۲،طبع سعيد)

(صلی الناس فرادی)فی منازلهم تحرزاعن الفتنة(كالخسوف)للقمر(والريح)الشديدة (والظلمة)القوية نهارا والضوء القوی ليلا(والفزع)الغالب ونحوذلك من الآيات المخوفة كالزلازل والصواعق والثلج والمطر الدائمين وعموم الأمراض الخ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۱

## ﴿تشہد میں شہادت کی انگلی اٹھانے کا درست طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل لوگ تشہد میں

شہادت کی انگلی مختلف طریقوں سے اٹھاتے ہیں ان میں سے کون سا طریقہ زیادہ بہتر ہے؟

﴿جواب﴾ اشارہ کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ تشہد پڑھتے ہوئے کلمہ توحید پر جب پہنچ تو سیدھے ہاتھ کی چھوٹی اور ساتھ والی دونوں انگلیوں کو بند کریں اور درمیان والی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنالیں، شہادت کی انگلی اپنے حال پر چھوڑ دیں اور کلمہ نفی یعنی "ان لا" پر شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ کریں اور "الا اللہ" پر واپس رکھ لیں اور قعدہ کے اخیر تک حلقہ بندھا رہے۔

لما فی رسائل ابن عابدین:(۱/۱۳۲، طبع عثمانیة)

والصحیح المختار عند جمهور اصحابنا انه یضع کفیه علی فخذیه ثم عند وصوله فی کلمة التوحید یعقد الخنصر والبنصر و یحلق الوسطی والابهام و یشیر بالمسبحة رافعا لها عند النفی و واضعا لها عند الاثبات ثم یستمر علی ذلک لانه ثبت العقد عند الاشارة بلاخلاف و لم یوجد امر بتغییره فالاصل بقاء الشیء علی ماهو علیه.

لما فی السعایة:(۲/۲۲۱،باب صفة الصلاة،طبع سهیل)

والصحیح المختار عند جمهور اصحابنا ان یضع کفیه علی فخذیه ثم عند وصوله فی کلمة التوحید یعقد الخنصروالبنصر ویحلق الوسطی والابهام و یشیر بالمسبحة رافعا لها عند النفی واضعا لها عند الاثبات ثم یستمر علی ذلک لانه ثبت العقد عند ذلک بلاخلاف و لم یوجد امر بتغییره فالاصل بقاء علی ما هو علیه و استصحابه الی آخر امره وماله الیه هذاانتهی۔

واللہ اعلم بالصواب: جلال الدین خرسند
فتویٰ نمبر:۳۶۶۳

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ
۵ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

## ﴿تشہد سے پہلے تعوذ اور جلسہ استراحت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قعدۂ اولی اور قعدۂ اخیرہ میں تشہد سے پہلے تعوذ (یعنی اعوذ باللہ الخ) مشروع ہے یا نہیں؟ نیز دوسری اور چوتھی رکعت کیلئے اٹھنے سے پہلے قعدہ استراحت (یعنی تھوڑی دیر کیلئے بیٹھنے کا) شرعی حکم کیا ہے جیسا کہ آج کل بعض لوگ اسکا بہت اہتمام کرتے ہیں؟

مستفتی: ایک متعلم

﴿جواب﴾ تعوذ قرأت سے پہلے وسوسہ کو دور کرنے کیلئے مشروع کی گئی ہے اسلئے قعدہ میں دوبارہ پڑھنا نہ مشروع ہے اور نہ پڑھنے کی اجازت ہے۔

لما فی السعایة:(۲/۲۱۲،باب صفة الصلاة، طبع سهيل)

وسادسها ان لا يتعوّذ فيها لانه شرع فی اول القراءة لدفع الوسوسة فلا يتكرر الاهتبدل المجلس كما لو تعوّذ و قراء ثم سكت قليلا و قراء۔

ولما فی الرد:(۱/۴۸۹،كتاب الصلاة، طبع سعيد)

وحاصله أنه اذا أراد أن يأتی بشی من القران كالبسملة والحمدلة ، فان قصدبه القرائة تعوّذ قبله و الا فلا ، كما لو أتی بالبسملة فی افتتاح الكلام كالتلميذ حين يبسمل فی أول درسه للعلم فلا يتعوّذ، و كما لو قصد بالحمدلة الشكر، و كذا اذا تكلم بغير ما هو من القرآن فلا يسن للتعوّذ بالأولی.

رہا قعدہ استراحت کا مسئلہ تو اس پر مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے درس ترمذی میں سیر کن بحث کی ہے جسکا خلاصہ یہ ہے۔

"فكان اذا كان فی وتر من صلوته لم ينهض حتی يستوی جالساء" اس باب سے امام ترمذیؒ کا مقصود جلسۂ استراحت کو ثابت کرنا ہے، حدیث باب جلسۂ استراحت کی اصل اور اس کے ثبوت میں واحد حدیث ہے، چنانچہ اس سے استدلال کر کے امام شافعیؒ پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے فراغت کے بعد جلسۂ استراحت کو مسنون قرار دیتے ہیں، اس کے برخلاف امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک جلسۂ استراحت مسنون نہیں اس کے بجائے سیدھا کھڑا ہو جانا افضل ہے، البتہ حنفیہ کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ عمل جائز ہے چنانچہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی اور تیسری رکعت میں جلسۂ استراحت کی مقدار بیٹھ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں۔

بہر حال جلسۂ استراحت کے مسئلہ میں جمہور ایک طرف ہیں اور امام شافعیؒ ایک طرف، جمہور کا استدلال صحیح بخاری میں "مسئی فی الصلاة" کی حدیث سے ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اس میں آنحضرت ﷺ نے حضرت خلاد بن رافعؓ کو نماز کا صحیح طریقہ بتاتے ہوئے سجدہ کی تعلیم کے بعد فرمایا: "ثم ارفع حتی تستوی قائماً ثم افعل ذلك فی صلوتك كلها" اس میں آپ ﷺ نے دوسرے سجدہ کے بعد نماز کی ہر رکعت میں سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا اور بیٹھنے کا ذکر نہیں فرمایا، قعدہ اولی اور اخیرہ والی رکعتوں کو خارج کرنے کے بعد ظاہر ہے یہ حکم پہلی اور تیسری رکعت پر ہی لگے گا۔

جمہور کا اپنے مسلک پر دوسرا استدلال اگلے باب (یعنی ترمذی) میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہے "کان النبی ﷺ ینھض فی الصلاۃ علی صدور قدمیہ" لیکن اس حدیث کی سند پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں خالد بن الیاس ضعیف ہے، چنانچہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: "و خالد بن الیاس ضعیف عند اھل الحدیث"

شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہونے کے باوجود تعامل صحابہ کرامؓ سے مؤید ہے اس لئے قابل قبول ہے۔

چنانچہ مصنف ابن شیبہؒ میں حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ "عن عبد الرحمٰن بن یزید قال: کان عبد اللہ ینھض فی الصلاۃ علی صدور قدمیہ" اور یہی مضمون ابن ابی شیبہؒ نے حضرت عمر، علی، ابن عمر، ابن زبیرؓ کے بارے میں بھی نقل کیا ہے اور امام شعبیؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے، "ان عمر و علیا و اصحاب رسول اللہ ﷺ کانوا ینھضون فی الصلاۃ علی صدور اقدامھم"

جہاں تک حضرت مالک بن حویرث کی روایت باب کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیان جواز یا حالت عذر پر محمول ہے، یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ آخری عمر میں متبدن ہو گئے تھے، ہو سکتا ہے کہ یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہو ورنہ اگر یہ سنت صلوۃ ہوتی تو ہر گز صحابہ کرام اسے نہ چھوڑتے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ — واللہ اعلم بالصواب: جلال الدین خرسند تاجکی

۱۷ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۴۶

## ﴿جلسہ استراحت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ زید نے چار رکعت کی نیت باندھی پھر ایک رکعت پڑھ کے تھوڑا سا بیٹھ گیا اور پھر کھڑا ہو گیا، کیا زید پر سجدہ سہو لازم ہوا؟ نیز اس نے التحیات کو مکرر پڑھا۔ کیا اس وجہ سے بھی اس پر سجدہ سہو لازم ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں زید جو ایک رکعت پڑھ کے بیٹھ گیا تو اس صورت میں قیام (جو کہ رکن ہے) میں تاخیر پائی گئی پھر یہ تاخیر اگر اتنی مدت ہو جتنی مدت میں رکن نماز یعنی رکوع،

سجدہ وغیرہ ادا کیا جاسکے جو تین تسبیحات کے وقفے میں ہوتا ہے تو اس پر سجدہ سہو لازم ہے، اگر تاخیر اس سے کم ہے تو سجدہ سہو لازم نہیں ہے۔

لمافی الھندیة: (۱۲۶/۱ مطبع رشیدیه)

ولا یجب السجود الا بترك واجب او تاخیرہ او تاخیر رکن او تقدیمه او تکرارہ او تغییر واجب بان یجهر فیما یخافت وفی الحقیقة وجوبه بشئی واحد وهو ترك الواجب كذا فی الكافی.

ولمافی حاشیة الطحطاوی: (ص ۲۵۲، باب فی سجود السهو مطبع قدیمی)

وتاخیر القیام للثالثة بزیادة قدر اداء رکن ولو ساكتا.

ولمافی الردعلی الدر: (۱۶۲/۲ مطبع امدادیه)

فی واجبات الصلوٰة وترك قعود قبل ثانیة اورابعة وکل زیادة تتخلل بین الفرضین وقال ابن عابدینؒ تحته وكذا القعدة فی آخر الرکعة الاولیٰ او الثالثة فیجب ترکها ویلزم من فعلها ایضاً تاخیر القیام الیٰ الثانیة او الرابعة عن محله وهذا اذا كانت القعدة طویلة اما الجلسة الخفیفة التی استحبها الشافعیؒ فترکها غیر واجب عندنا بل هو الافضل.

اگر یہ تشہد قعدۂ اخیرہ کا ہے تو اس صورت میں تکرار تشہد سے سجدہ لازم نہیں ہوا کیونکہ اس صورت میں کوئی تاخیر رکن اور واجب نہیں پائی گئی۔

کماقال ابراهیم الحلبیؒ: (ص ۴۹۷، باب سجود السهو مطبع نعمانیه)

وان قرء الفاتحة فی احدی الاخرین مرتین اوضم فیهما الیها سورة وكذا لو قرء السورة دون الفاتحة لوقرء التشهد مرتین فی القعدة الاخیرة او التشهد قائما او راكعا او ساجداً لا سهو علیه كذا فی المختار علی ما ذكره الاسبیجانی اما تكرار الفاتحة وضم السورة فلان الاخرین محل للقرأة مطلقاً ولم یلزم منه ترك الواجب ولا تاخیره اما التشهد فلانه ثناء والقیام والركوع والسجود محل للثناء.

اور اگر قعدہ اولیٰ کا تشہد ہے تو اس صورت میں تاخیر رکن (جو کہ قیام ہے) کی وجہ سے سجدہ سہو لازم ہوا تاہم اسکے لئے الگ سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ دونوں بھول کے لئے ایک ہی سجدہ کافی ہوگا۔

ولمافی حاشیة الطحطاوی: (ص ۲۵۱ مطبع قدیمی)

(وان تكرر) سواء كان من جنس او جنسین فلا یجب علیه اكثر من سجدتین بالاجماع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ  واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۴۲۷/۳/۱۷ھ  فتویٰ نمبر: ۱۳۹

﴿جہاز میں نماز پڑھنے سے نماز اداء ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے سے نماز ادا ہو جاتی ہے یا واجب الاعادہ ہے کیونکہ بعض علماء کے متعلق سنا ہے کہ وہ عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، شرعی مسئلہ سے آگاہ فرمائیں؟ مستفتی: حاجی محمد دین ابو بکر مسجد

﴿جواب﴾ زمین کی طرح ہوائی جہاز میں بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے، چنانچہ شریعت نے نہ صرف خانۂ کعبہ بلکہ اس کے مقابل آنے والی پوری فضاء کو قبلہ کا درجہ اسی لئے دیا ہے تاکہ اونچی سے اونچی اور بلند سے بلند جگہ سے بھی نماز ادا کی جاسکے، شروع میں بعض علماء نے ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کو ممنوع قرار دیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان بعض علماء کی نظر میں فقہا کرام کی تعریف کے مطابق سجدے کا تحقق نہیں ہوتا فقہاء نے سجدے کی تعریف "وضع الجبهة على الارض او على مايستقر عليها" سے کی ہے یعنی زمین یا زمین پر ٹکی ہوئی چیز پر پیشانی رکھنے کو سجدہ کہتے ہیں۔ ہوائی جہاز نہ زمین ہے اور نہ اڑتے وقت زمین پر ٹکا ہوا ہوتا ہے لہٰذا اس تعریف کی رو سے جہاز میں سجدے کا تحقق ممکن نہیں لیکن دیگر عام علماء کی تحقیق کے مطابق فقہاء نے "ارض" بول کر ایسی جگہ مراد لی ہے (اپنے زمانے کے اعتبار سے) جس میں باآسانی چلا پھرا جاسکے اور ہوائی جہاز کی مثال سامنے نہ تھی، لہٰذا جمہور علماء کے نزدیک جہاز میں نماز پڑھنا درست ہے اور واجب الاعادہ نہیں ہے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۰/۳/۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۵

﴿ریل گاڑی میں نماز کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ریل کے سفر کے دوران بعض لوگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے ہیں جبکہ ریل کے فرش پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی جگہ موجود ہوتی ہے اس کے باوجود بھی اگر کوئی اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھے گا تو ایسی صورت میں نماز کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عبدالرحیم

﴿جواب﴾ چونکہ فرض نماز میں قیام ضروری ہے اس لئے کسی شدید عذر کے بغیر بیٹھ کر نماز

پڑھنا جائز نہیں ہے، قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنے سے نماز کو لوٹانا لازم ہوگا، البتہ اگر سر چکرانے یا گر جانے کا خطرہ ہو تو بیٹھ کر پڑھنا بلا اعادہ جائز ہے، فقہاء کرام نے کشتی کے سفر میں گرنے، سر چکرانے کا اعتبار کیا ہے ریل گاڑی میں بھی یہ خطرہ تو رہتا ہے اس لئے ریل میں بیٹھ کر نماز ہو جاتی ہے لیکن قبلہ رخ کر کے نماز پڑھنا ضروری ہے، سیٹ قبلہ رخ ہے تو نماز ہو جائیگی، قبلہ رخ نہیں ہے تو سیٹ سے نیچے اتر کر فرش پر قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے۔

لمافی التنویر و شرحہ:(۱۳۲/۲،طبع امدادیہ)

(ومنها القيام الىٰ ان قال (لقادر عليه) قال الشامي تحت قوله (لقادر عليه) فلو عجز حقيقة وهو ظاهر أو حكماً كما لو حصل له به ألم شديد أوخاف زيادة المرض وكا لمسائل الأتية في قوله: وقد يتحتم القعودالخ.فانه يسقط...... الىٰ أن قال الصلاة في السفينة الجارية فانه يصلي فيها قاعداً مع القدرة على القيام عند الامام.

ولمافی حلبی کبیر:(ص ۲۶۱ طبع سہیل اکیڈمی)

من الفرائض القيام ولو صلى الفريضة قاعداً مع القدرة على القيام لا تجوز صلاته.

| الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی |
|---|---|
| ۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۲۵۵ |

## ﴿نمازیوں کے قریب بلند آواز سے تلاوت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں نمازیوں کے قریب بلند آواز سے تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس سے ان کو تشویش بھی ہوتی ہو۔

﴿جواب﴾ تلاوت کرنے والا نمازیوں کے قریب آکر بلند آواز سے اگر تلاوت کرے جس سے ان کی نماز میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ ناجائز ہے، نیز مفتی بہ قول کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کا سننا مطلقاً واجب ہے، اور ایسی صورت میں ترک واجب کا گناہ تلاوت کرنے والے پر ہی ہوگا کیونکہ وہی اس کا سبب بنا ہے، البتہ اگر پہلے سے کوئی تلاوت میں مشغول ہو تو نمازی کو چاہیئے کہ مسجد کے کسی دوسرے کونے میں نوافل اور سنن ادا کرے ورنہ ترک سماع کیوجہ سے نمازی گنہگار ہوگا۔

لما فی الدر المختار:(۵۴۶/۱،طبع سعید)

(فروع)يجب الاستماع للقراءة مطلقا لان العبرة لعموم اللفظ، وقال ابن عابدين تحت

(قوله يجب الاستماع للقراءة مطلقا) اى فى الصلوة وخارجها لان الآية وان كانت واردة فى الصلوة على ما مر ،فالعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب ،ثم هذا حيث لا عذر ولذا قال فى القنية :صبى يقرء فى البيت واهله مشغولون بالعمل يعذرون فى ترك الاستماع ان افتتحوا العمل قبل القراءة والا فلا ،وكذا قراءة الفقه عند قراءة القرآن ،وفى الفتح عن الخلاصة : رجل يكتب الفقه وبجنبه رجل يقرء القرآن فلايمكنه استماع القرآن فالاثم على القارى .

ولما فى فتح القدير :۱/ ۳۵۰،۳۵۱

عن معاوية بن قره قال : سألت بعض اشياخنا من اصحاب رسول الله ﷺ ،احسبه قال عبد الله بن مغفل : كل من سمع القرآن وجب عليه الاستماع والانصات .....وفى كلام اصحابنا ما يدل على وجوب الاستماع فى الجهر بالقرآن مطلقا .

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب :محمد طیب

۲۶صفرالمظفر ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۰۲۶

## ﴿نمازی کے سامنے سے جان بوجھ کر گزرنا سخت گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے لاعلمی کیوجہ سے یا جان بوجھ کر گزرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: اکرم بلوچ

﴿جواب﴾ نمازی کے سامنے سے قصداً گزرنا سخت گناہ ہے، چنانچہ حدیث مبارک میں ہے کہ اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والا جان لیتا کہ اس کا وبال کس قدر سخت اور سنگین ہے تو برسوں کھڑا رہتا اور نمازی کے آگے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا، دوسری روایت میں ہے کہ اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو اس گناہ کا اندازہ ہو جائے تو وہ زمین میں دھنس جانے کو اس گناہ کے مقابلہ میں اپنے لئے زیادہ آسان سمجھے گا، اس لئے نمازی کے آگے سے گزرنے سے گریز کرنا لازم ہے۔

لما فى صحيح البخارى: ۱/ ۷۳،طبع قديمى۔

عن بسر بن سعيد ان زيد بن خالد ارسله الى ابى جهيم يسأله ما ذا سمع من رسول الله ﷺ لو يعلم المار بين يدى المصلى ماذا عليه لكان ان يقف اربعين خيرا له من ان يمر بين يديه قال ابو النضر لاادرى قال اربعين يوما او شهرا او سنة.

ولما فى مشكوة المصابيح: ۷۴،طبع سعيد۔

عن ابى هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ لو يعلم احدكم ماله فى ان يمر بين يدى اخيه

معترضا فی الصلوۃ کان لان یقیم مائۃ عام خیر لہ من الخطوۃ التی خطا رواہ ابن ماجۃ.

وعن کعب الاحبار قال لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیہ لکان ان یخسف بہ خیرا لہ من ان یمر بین یدیہ وفی روایۃ اھون علیہ رواہ مالک.

ولما فی الشامی:۶/۱۸۰ طبع سعید۔

(قولہ بالحدیث) وھو قولہ علیہ الصلاۃ والسلام رفع عن امتی الخطأ والنسیان معناہ رفع مأثم الخطأ اتقانی.

ولما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ:۲/۹۲۶ طبع رشیدیۃ۔

قال الحنفیۃ یکرہ تحریما المرور بین یدی المصلی ویأثم المار فی موضع سجود المصلی اذا اتخذ سترۃ دون ان یکون بینھما حائل کعمود او جدار.

ولما فی حلبی کبیر:۳۶۶ طبع سھیل۔

ویکرہ المرور بین یدی المصلی اذا لم یکن عندہ ای عند المصلی حائل یحول بینہ وبین المار نحو السترۃ ای العصا المرکوزۃ امامہ او الاسطوانۃ او نحوھما من شجرۃ او آدمی او دابۃ او غیر ذلک......ثم انما یکرہ المرور بین یدیہ عند عدم الحائل اذا کان فی موضع سجودہ فی الاصح.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عمر فاروق لاہوری

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر:۳۶۸۵

## ﴿نمازی کے سامنے سے گزرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ نمازی کے سامنے سے کتنے فاصلہ سے گزرنا جائز ہے نیز چھوٹی مسجد اور بڑی مسجد میں کوئی فرق ہے یا دونوں کا ایک حکم ہے؟ اگر فرق ہے تو بڑی مسجد کی حد کیا ہے؟

﴿جواب﴾ بڑی مسجد اور صحرا میں دو صف چھوڑ کر گزرنے کی گنجائش ہے جبکہ چھوٹی مسجد میں نمازی کے سامنے سے گزرنے کی گنجائش نہیں ہے جو مسجد شرعی گز (جو کہ ایک ہاتھ ہے) کے حساب سے چالیس گز یا اس سے زائد ہو وہ بڑی مسجد کے حکم میں ہے اور جو چالیس گز سے کم ہو وہ چھوٹی مسجد کے حکم میں ہے۔

لما فی اعلاء السنن:(۵/۸۰ طبع دار الکتب بیروت)

"وقیل مقدار صفین او ثلثۃ اذرع" وبعد أسطر قال: قلت یشھد لتقییدہ بثلثۃ اذرع حدیث نافع المذکور قریبا فی الباب السابق واستحسنہ شیخنا کما حکاہ عنہ بعض الناس فی مسودۃ (کتابہ) قال وھو الأرجح نظرا الی العلۃ ایضا وھو عدم تضرر المصلی والمار فان المصلی ینقطع خشوعہ اذا کان اقل منہ والمار یتضرر منہ اذا کان اکثر منہ. قلت

وهو يقرب مما اختاره فخر الاسلام وصححه في (النهاية) وقواه المحقق في (الفتح):
أنه كان بحال لو صلى صلوٰة الخاشعين نحو ان يكون بصره في موضع سجوده وفي حجره في قعوده لايقع بصره على المار لايكره .ه وقد جربت ذلك فظهر لي أنه اذا كان في قيامه في موضع السجود لايجاوز ثلثة اذرع ، فالتقدير بذلك موافق للأثر والمختار أجلة الفقهاء من أصحابنا.

ولمافي ردالمحتار:(۲/۳۹۸مطبع امدادیه)

(ومسجد صغير) هو اقل من ستين ذراعا وقيل من أربعين وهو المختار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم: عبدالوہاب عفااللہ عنہ

۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:

## ﴿نمازی کے سامنے سے گزرنے کی صورت﴾

﴿سوال﴾ نمازی اگر اونچی جگہ یا نیچی جگہ نماز پڑھ رہا ہے تو اسکے سامنے سے سترہ کی اونچائی کے برابر بلندی سے یا اتنی مقدار نیچے سے گزرنا جائز ہے کہ نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو پھر نمازی کے سامنے سے بلندی یا نیچے سے گزرنے کی جائز حد کیا ہوگی؟

﴿جواب﴾ صحرا میں نمازی کے سامنے سے اتنے فاصلے سے گزرنا جائز ہے کہ نمازی آدمی خشوع کی حالت میں نماز پڑھ رہا ہو اور اسکی نگاہ سجدے کی جگہ ہو تو گزرنے والے پر اسکی نگاہ نہ پڑے، اس فاصلے کا اندازہ فقہاء کرام نے تین صفوں کی مقدار سے کیا ہے کہ نمازی کے سامنے دو صفیں چھوڑ کر تیسری صف سے آدمی گزر سکتا ہے اور مسجد میں مطلقاً نمازی کے سامنے سے گزرنے سے آدمی گنہگار ہوگا، البتہ مسجد کبیر صحرا کے حکم میں ہے۔

اگر نمازی اونچی جگہ یا نیچی جگہ نماز پڑھ رہا ہے تو اسکے سامنے سے گزرنے کیلئے سترہ کی اونچائی کی مقدار کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ محاذاۃ اعضاء کا اعتبار ہے یعنی اگر گزرنے والے کے اعضاء نمازی کے اعضاء کے محاذی ہوں مثلاً اگر نمازی اونچی جگہ پر نماز پڑھ رہا ہے تو گزرنے والے کا سر نمازی کے پاؤں کے برابر نہ ہو اور اگر نمازی نیچی جگہ نماز پڑھ رہا ہے تو گزرنے والے کے پاؤں نمازی کے سر کے محاذاۃ میں نہ آئیں تو گزرنا جائز ہے ورنہ گزرنا جائز نہیں۔

شرح منیہ نے بہت سے اقوال نقل کرکے نہایہ کے قول کو ترجیح دی ہے عبارت اسکی یہ ہے:

وفي النهاية الاصح انه ان كان بحال لو صلى صلوٰة الخاشعين بأن يكون بصره حال

قیامه الیٰ موضع سجوده لایقع بصره علی المار لا یکره وماصححه فی الکافی مختار السرخسیؒ وماصحح فی الهدایة مختار فخر الاسلام ورجحه فی النهایة بانه اذا صلی علی الدکان وحاذی اعضاء المار اعضاءه یکره المرور علی ما ذکر فی الهدایة وغیرها وان کان المار اسفل وهو لیس بموضع سجوده یعنی انه لو کان علی الارض لم یکن سجوده فیه لان الفرض انه یسجد علی الدکان فکان موضع سجوده دون محل المرور ضرورة ومع ذالک تثبت الکراهة اتفاقا۔۔۔الخ والذی یظهر ترجیح مااختاره فی النهایة من مختار فخر الاسلام۔الخ۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۹

## ﴿نمازی کے سامنے سے گزرنے کی مختلف صورتیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا شخص گزر جائے یا کوئی شخص نمازی کے سامنے ہاتھ رکھے اور دوسرا شخص گذر جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ اور کتنی صفیں چھوڑ کر گزرنا جائز ہے؟

مستفتی: محمد کاشف ایاز مسجد ڈیفنس کراچی

﴿جواب﴾ بغیر سترہ کے نمازی کے سامنے سے گزرنا جائز نہیں ہے، البتہ بغیر سترہ کے کوئی صحرا یا بڑی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے تو دو صف چھوڑ کر تیسری صف میں گزرنے کی گنجائش ہے چھوٹی مسجد میں نمازی کے سامنے سے گزرنے کی گنجائش نہیں ہے خواہ فاصلہ زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

نمازی کے سامنے کوئی شخص کھڑا یا بیٹھا ہو تو یہ سترہ کے حکم میں ہے گزر سکتے ہیں، اور صرف ہاتھ کسی کا کھڑا ہو نمازی کے سامنے تو ہاتھ بھی کافی ہے مکمل بدن کا سامنے ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار: (۱/۶۳۴، ایچ ایم سعید)

(قوله الی حائط القبلة) ای من موضع قدمیه الی الحائط ان لم یکن له سترة فلو کانت لا یضر المرور وراء ها.

ولمافی الهندیة: (۱/۱۰۴ مطبع رشیدیه)

قال مشایخنا اذا صلی رامیا ببصره الی موضع سجوده فلم یقع بصره علیه لم یکره وهو الاشبه الی الصواب کذا فی النهایة هذاحکم الصحراء فان کان فی المسجد ان کان بینهما حائل کانسان او اسطوانة لا یکره وان لم یکن بینهما حائل والمسجد صغیر

کرہ فی ای مکان کان والمسجد الکبیر کالصحراء کذا فی الکافی۔

ولما فی الشامی:(۶۳۶/۱،طبع سعید)

(تتمة)..... اراد المرور بین یدی المصلی فان کان معه شیء یضعه بین یدیه ثم یمر ویاخذه.

ولو مر اثنان یقوم احدهما امامه ویمر الاخر ویفعل الآخر هکذا یمران.

ولما فی اعلاء السنن:(۸۰/۵،دارالکتب العلمیه بیروت)

وقیل مقدار صفین اوثلاثة اذرع.....قلت یشهد لتقییده بثلاثة اذرع حدیث نافع المذکور قریبا فی الباب السابق واستحسنه شیخنا کما حکاه عنه بعض الناس فی مسودة "کتابه" قال:وهو الارجح نظرا الی العلة ایضا ،وهو عدم تضرر المصلی والمارفان المصلی ینقطع خشوعه اذا کان اقل منه ،والمار یتضرر اذاکان اکثرمنه.

ولمافی رد المحتار:(۶۳۴/۱، ایچ ایم سعید)

قوله ومسجد صغیر هو اقل من ستین ذراعا،وقیل من اربعین وهو المختار.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ ۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۴صفر الخیر ۱۴۳۱ھ ۔۔۔ فتوی نمبر:۲۴۲۲

## ﴿نمازی کے سامنے سے گزرنا منع ہے ہٹنا منع نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھار مسجد میں ہمارے پیچھے کوئی شخص نماز پڑھتا ہے، اور ہم بالکل اس کے سامنے ہوتے ہیں، تو کیا ہمارے لئے اس کے سامنے سے گزرنے کی گنجائش ہے؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں نوازش ہوگی۔

﴿جواب﴾ اگر نمازی بالکل آپ کے پیچھے ہوکر نماز پڑھتا ہو، تو آپ کیلئے سامنے سے ہٹنے کی اجازت ہے، کیونکہ اس پر سامنے سے گزرنے کا اطلاق نہیں ہوتا۔

لما فی فتح الباری:(۷۷۰/۱ طبع: رشیدیه)

ظاهر الحدیث أن الوعید المذکور یختص بمن مرّ لابمن وقف عامدا مثلاً بین یدی المصلی أو قعد أو رقد لکن ان کانت العلة فیه التشویش علی المصلی فهو فی معنی المار.

ولما فی الهندیة:(۱۱۶/۱،طبع: قدیمی کتب خانه)

ولو مر اثنان یقوم أحدهما أمامه ویمر الآخر ویفعل الآخر هکذا ویمرّان کذا فی القنیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ ۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۸ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ ۔۔۔ فتوی نمبر:۳۷۵۲

## ﴿سجدہ شکر کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سجدہ میں پڑ کر کچھ دعا مانگتے ہیں کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ نماز کے متصل بعد اس طرح کا سجدہ کرنا مکروہ ہے البتہ نعمت کے حصول پر یا کسی بڑی پریشانی سے نجات کے موقع پر سجدہ شکر ادا کرنا مستحب ہے۔

لمافی الدر مع الرد:(۱۱۹/۲،طبع سعید)

وسجدة الشكر:مستحبة به يفتى، لكنها تكره بعد الصلاة لان الجهلة يعتقدونها سنة اوواجبة وكل مباح يودى اليه فمكروه وفي الرد:(قوله وبه يفتى) ......الىٰ ان قال والاظهر انها مستحبة كما نص عليه محمدؒ لانها قد جاء فيها غير ما حديث وفعلها ابوبكر وعمر وعلىؓ فلا يصح الجواب عن فعله ﷺ بالنسخ كذا في الحلية ملخصا وتمام الكلام فيها.

ولما في اخر شرح المنية:(ص۶۱۷،طبع سهيل اكيڈمی)

وقد وردت فيه روايات كثيرة عنه عليه الصلاة والسلام فلا يمنع عنه لما فيه من الخضوع، وعليه الفتوى .وفي فروق الاشباه: سجدة الشكر جائزة عنده لا واجبة هو ماروى عنه انها ليست مشروعة وجوبا وفيهامن القاعدة الاولى والمعتمد ان الخلاف في سنيتها لا في الجواز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی
فتوی نمبر: ۸۲۳

## ﴿سجدہ شکر ادا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ نماز و دعا سے فارغ ہونے کے بعد الگ سے ایک سجدہ کرتے ہیں کیا انکا ایسا کرنا از روئے شریعت ٹھیک ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ کسی نعمت کے حاصل ہونے یا مصیبت ٹل جانے کے بعد اگر کوئی شخص اللہ تعالی کا شکر ادا کرنے کے واسطے سجدہ کرلے تو یہ جائز ہے، اسے سجدہ شکر کہا جاتا ہے اور شرعا اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ نماز ادا کرنے کے بعد جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے سجدہ کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے کیونکہ اس سے یہ اندیشہ ہے کہ جاہل لوگ اسکی مستقل عادت بنالینگے یا نماز کا حصہ شمار کرینگے لہذا اس موقع پر نہ کریں۔

لما في التنوير مع الدر والرد:(۱۱۹/۲، طبع سعيد)

وسجدة الشكر مستحبة، به يفتى لكنها تكره بعد الصلاة لأنّ الجهلة يعتقدونها سنة أو واجبة، وكل مباح يودي اليه فمكروه ،قال الشاميّ تحته (قوله سجدة الشكر) وهي لمن تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالى مالا أو ولدا أو اندفعت عنه نقمة ونحو ذالك يستحب له أن يسجد لله تعالى شكرا مستقبل القبلة يحمد الله فيها و يسبحه ثم يكبر فيرفع رأسه كما في سجدة التلاوة (لكنها تكره بعد الصلاة)الضمير للسجدة مطلقا قال في شرح المنية آخر الكتاب عن شرح القدوري للزاهدي ،أما بغير سبب فليس بقربة ولا مكروه، وما يفعل عقيب الصلاة فمكروه لأنّ الجهال يعتقدونها سنة أوواجبة وكل مباح يودي اليه فمكروه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: علی حیدر چارسدوی

۶ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ
فتویٰ نمبر: ۳۳۳۷

## ﴿مختلف اعذار کی بناء پر نماز توڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے یہ مسئلہ سنا ہے کہ بعض اعذار کی بناء پر وقتی طور پر نماز توڑ دینا ضروری ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ وہ کون کونسے اعذار ہیں جنکی وجہ سے نماز توڑ دینے کی اجازت ہے ؟
مستفتی: محمد عظیم

﴿جواب﴾ بغیر ضرورت کے نماز توڑ دینا گناہ ہے، البتہ جہاں ضرورت پیش آجائے تو اس وقت اسکی اجازت ہے، مندرجہ ذیل اعذار کی بناء پر وقتی طور پر نماز توڑ دینے کی گنجائش ہے خواہ نماز فرض ہو یا نفل۔

(۱) والدین میں سے کسی ایک کو واقعی مدد کی ضرورت پڑی اور وہ مدد کے لئے پکاریں تو نماز توڑ کر ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔

(۲) کسی کے پانی میں ڈوبنے یا چھت سے گر جانے یا آگ میں جلنے کا اندیشہ ہو اور وہ مدد کے لیے پکارے تو نماز توڑ کر اسکی مدد کرنا ضروری ہے ۔

(۳) دوران نماز ایک درہم کے بقدر مال کے ہلاک وضائع ہونیکا اندیشہ ہو تو نماز توڑنے کی گنجائش ہے۔

(۴) چولہے میں ہانڈی کے جوش مارنے اور ابلنے کی وجہ سے سالن کے ضائع ہونیکا اندیشہ

ہو،تو عورت کے لئے نماز توڑنے کی اجازت ہے۔

(۵)مسافر کی سواری بھاگنے لگے یا چرواہے کو اس بات کا ڈر ہو کہ بھیڑیا آکر بکریوں کو کھا جائے گا تو نماز توڑنے کی اجازت ہے۔

(۶)کسی نابینا آدمی کے کنویں وغیرہ میں گر جانے کا خطرہ ہو یا بچے کا چولہے وغیرہ کی طرف لپک کر جلنے کا اندیشہ ہو(۷)مذکورہ بالا صورتیں بطور مثال بتائی گئی ہیں،لہٰذا ان جیسے مواقع ہوں تو نماز توڑنے کی گنجائش ہے۔

لما في الهندية:(۱۰۹/۱،طبع رشيديه كوئٹه)

المصلي اذا دعا احد ابويه لايجيب ما لم يفرغ من صلاته الا أن يستغيث به لشئي لان قطع الصلاة لايجوزالا لضرورة وكذا الاجنبي اذا خاف أن يسقط من سطح او تحرق النارأويغرق في الماء واستغاث بالمصلي وجب عليه قطع الصلاة. رجل قام الىٰ الصلاة فسرق منه شئي

قيمته درهم له أن يقطع الصلاة و يطلب السارق سواء كانت فريضة أوتطوعالان الدرهم مال امرأة تصلي ففار قدرها جازلها قطع.....الصلاة لاصلاحها. وكذا المسافراذا ندت دابته اوخاف الراعي على غنمه الذئب، ولو رأىٰ أعمى عند البئر فخاف عليه أن يقع فيهاقطع الصلاة لأجله ولو جاء ذمي فقال للمصلي أعرض على الاسلام يقطع وان كان في الفريضة.

ولما في الدرالمختار:(۵۱/۲،طبع سعيد)

ولو دعاه أحد أبويه في الفرض لا يجيبه الا أن يستغيث به.

وفي الشامية تحته (الا ان يستغيث به) أي يطلب منه الغوث والاعانة وظاهره ولو في أمرغير مهلك واستغاثة غير الابوين كذلك.

والحاصل أن المصلي متى سمع أحدا يستغيث وان لم يقصده بالنداء أو كان أجنبيا وان لم يعلم ما حلّ به أو علم وكان له قدرة على اغاثته وتخليصه وجب عليه اغاثته وقطع الصلاة فرضا كانت أو غيره قوله (لا يجيبه) عبارة التجنيس عن الطحاوي :لا بأس أن لايجيبه:قال ح وهي تقتضي أن اجابته افضل تامل قلت :ومقتضاه أن اجابته خارج الصلاة واجبة ايضا بالاولى والظاهرأن محله اذا تاذى منه بترك الاجابة لكونه عقوقا تامل.هذا وذكر الرحمتي ما معناه :انه لما كان برّالوالدين واجبا وكان مظنة أن يتوهم انه اذا ناداه احدهما يكون عليه باس في عدم اجابته دفع بذلك بقوله "لا باس" ترجيحا لامرالله تعالىٰ بعدم قطع العبادة لان نداء ه له مع علمه بانه في الصلاة معصية ولاطاعة لمخلوق في معصية الخالق فلا تجوز اجابته بخلاف ما اذا

لم يعلم انه في الصلاة( فانه يجيبه لما علم في قصة جريج الراهب ودعاء أمه عليه وما ناله من العناء لعدم اجابته لها فليس كلمة "بأس "هنا لخلاف الأولى لأن ذلك غير مطرد فيها بل قدتاتى بمعنى يجب والظاهرأن هذا منه نقل عن خط صاحب البحر على هامشه ان القطع يكون حراما ومباحا ومستحبا وواجبا ،فالحرام لغير عذر والمباح اذا خاف فوت مال والمستحب القطع للاكمال والواجب لاحياء نفس.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر ۱۳۳۵

## ﴿کون کون سی صورتوں میں نماز توڑنے کی گنجائش ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وہ کون کون سی صورتیں ہیں کہ جن میں نماز توڑنے کی اجازت ہے؟ کسی بھی وجہ سے نماز توڑ سکتے ہیں؟ اور اس میں فرض نماز اور نفل وغیرہ میں فرق ہے یا اس حکم میں تمام نمازیں برابر ہیں؟ مستفتی: ایک حعلم

﴿جواب﴾ نماز فرض ہو خواہ نفل شروع کرنے کے بعد بلا وجہ توڑنا حرام ہے، اور سخت گناہ ہے، البتہ کوئی وجہ ہو تو نوعیت کے اعتبار سے یہ حکم بھی مختلف ہوتا ہے، یعنی کبھی مباح، کبھی مستحب، اور کبھی توڑنا واجب ہوتا ہے، فقہائے کرام نے اس کے لیے ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ بغیر کسی عذر کے توڑنا حرام ہے، اپنا یا کسی غیر کا مال ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اسکی حفاظت کے لیے نماز توڑنا مباح یعنی جائز ہے، اور نماز کو کمال درجہ کے ساتھ ادا کرنے کے لیے مثلاً انفرادی نماز پڑھ رہا ہے اس دوران جماعت شروع ہوئی تو نماز توڑنا مستحب ہے، اور اپنی ذات یا کسی دوسرے کی جان بچانے کی خاطر نماز توڑنا واجب ہے۔

لما في الشامي:(۲/۵۲، طبع سعيد)

أنتسه أنقل عن خط صاحب البحر على هامشه ان القطع يكون حراماً ومباحاً ومستحباً وواجباً. فالحرام لغير عذر والمباح اذا خاف فوت مال، والمستحب القطع للاكمال، والواجب لاحياء نفس.

ولما في الهنديه:(۱/۱۰۹ طبع رشيديه).

رجل قام الى الصلاة فسرق منه شئي قيمته درهم له ان يقطع الصلاة ويطلب السارق سواء كانت فريضة او تطوعاً لان الدرهم مال.

ولما في الشامي:(۲/۵۱ طبع سعيد).

جاز نقض الصلاة منفرداً لاحراز الجماعة وظاهر التعليل الاستحباب.....لان صلاة

الجماعة تفضل صلاة الفذ بخمس وفي رواية بسبع وعشرين درجة.

مندرجہ بالا ضابطہ سے نماز توڑنے کی اکثر صورتوں کا حکم معلوم ہو جاتا ہے تاہم حالات اور کیفیات کے اعتبار سے یہ حکم چونکہ مختلف ہوتا رہتا ہے اس لیے چند صورتوں کی مزید وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، مثلاً دوران نماز کسی مصیبت زدہ کی پکار کو سنا کہ وہ مدد کے لیے پکار رہا ہے اور نمازی کو غالب گمان ہو کہ وہ اس مصیبت زدہ کی مدد کر سکتا ہے اور اسکو خلاصی دلوانے پر اسکو قدرت حاصل ہے تو ایسی صورت میں مدد کرنے کے لیے نماز توڑنا واجب ہے نماز فرض ہو یا نفل، اور پکارنے والا کوئی بھی ہو، خاص نمازی کو پکارا ہو یا کسی کو بھی ایسی صورت میں مدد کرنا واجب ہے۔

لما في الشامي:(۲/۵۱ طبع سعيد).

والحاصل ان المصلي متى سمع احداً يستغيث وان لم يقصده بالنداء، او كان اجنبيا وان لم يعلم ماحل به او علم وكان له قدرة على اغاثته وتخليصه وجب عليه اغاثته وقطع الصلاة فرضاً كانت او غيره.

والدین میں سے کوئی ایک بلائے اور ان کو علم ہو کہ بیٹا نماز میں ہے تو نفل نماز توڑنا مستحب ہے، فرض نماز میں ہو اور اندازہ ہو کہ والدین کو کوئی تکلیف ہے مدد کے لیے پکار رہے ہیں تو نماز توڑنا واجب ہے، اور اندازہ ہو کہ والدین کسی خاص تکلیف میں نہیں ہیں یا انکی مدد کے لیے اور بھی حاضر ہو سکتے ہیں تو فرض نماز توڑنا درست نہیں ہے۔

لما في الشامي:(۲/۵۱: طبع سعيد).

ولو دعاه احد ابويه في الفرض لايجيبه الا ان يستغيث به وفي النفل ان علم انه في الصلاة فدعاه لا يجيبه والا اجابه.

ولما في حاشية الطحطاوي على الدر:(۱/۲۹۸ طبع رشيديه).

ولو دعاه احد ابويه في الفرض لايجيبه......(قوله لايجيبه) ظاهره حرمة الاجابة علم انه في الصلاة اولا(قوله لا ان يستغيث به) اى يطلب منه الغوث والاعانة وظاهره ولو في امر غير مهلك واستغاثه غير الابوين كذلك (قوله لايجيبه) عبارة البحر عن الولوالجية وهو الذي سبق للشرح لاباس ان لايجيبه وهي تقتضي ان الاجابة افضل.(قوله والا اجابه)الظاهر منه الوجوب لانه حيث كان الاولى حال العلم الاجابة فعند عدمه تجب.

ولما في الشامي ايضاً.

قلت: ومقتضاه ان اجابته خارج الصلاة واجبة ايضاً بالاولى، والظاهر ان محله اذا

تاذی منه بترك الاجابة لكونه عقوقاً.

نفل نماز پڑھتے ہوئے یا قضا لوٹاتے ہوئے نماز جنازہ شروع ہوجائے اور فوت ہونے کا اندیشہ ہوتو نماز توڑنا بہتر ہے اور بعد میں اسکی قضا کرلے۔

لما فی الدر المختار:(۵۱/۲ طبع سعید).

(یقطعها) لعذر احراز الجماعة.....اوکان فی النفل فجئی بجنازة وخاف فوتها قطعه لامکان قضائه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفااللہ عنہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۰۶

## ﴿فرض نمازوں میں ختم قرآن کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد کے امام صاحب کا معمول یہ ہے کہ رمضان المبارک کے علاوہ بھی جہری فرض نمازوں میں قرآن کریم مقدار مسنون اور مقتدیوں کے تحمل کی رعایت رکھتے ہوئے الم سے پڑھتے ہیں اور اسطرح قرآن کریم پورا بھی ہوجاتا ہے، سوال یہ ہے کہ امام صاحب کا یہ مذکورہ عمل شرعاً کیسا ہے؟ نیز فرائض میں ختم القرآن کی کیا حیثیت ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ کے مطابق مذکورہ امام صاحب کا طریقہ فی نفسہ جائز ہے لیکن مسنون نہیں ہے مسنون طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے یہ منقول ہے کہ فجر اور ظہر میں طوال مفصل یعنی سورۃ حجرات سے سورۃ بروج کے آخر تک، عصر اور عشاء میں اوساط مفصل یعنی سورۃ بروج سے سورۃ بیّنہ تک اور مغرب میں قصار مفصل یعنی سورۃ بیّنہ سے سورۃ ناس کے آخر تک قرأت کی جائے، مسنون طریقہ کے مطابق نماز پڑھانا افضل اور زیادہ باعث اجر وثواب ہے جبکہ فرائض میں ختم القرآن کرنے سے سنت سے ثابت ترتیب سے اعراض لازم آتا ہے زیادہ فضیلت کا عمل ہوتا تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کے عمل سے بھی ثابت ہوتا، اسلئے عام حالات میں فرض نمازوں میں مسنون طریقہ کے مطابق قراءت کرنی چاہیے کبھی کبھار کسی دوسری جگہ سے پڑھنے میں بھی مضائقہ نہیں، البتہ اس مسنون طریقہ کو مستقل طور پر ترک کردینا خلاف اولیٰ ہے، اس سے بچنا چاہئے، نیز فرائض میں ختم قرآن کی صورت میں درمیان میں

آیات سجدہ بھی آئیں گی اور امام صاحب اگر چہ نماز شروع کرنے سے قبل سجدہ تلاوت کے بارے میں اعلان کر چکے ہونگے لیکن اعلان کے بعد آنے والے مقتدی سجدہ تلاوت کا اعلان نہ سننے کی وجہ سے سجدہ کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہونگے اب امام صاحب تو سجدہ میں جبکہ یہ لوگ رکوع میں جائیں گے تو ایسی صورت میں جماعت کی نماز میں خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ ہے، لہٰذا اس طرح ختم القرآن کی فضیلت نسبتاً زیادہ معلوم نہیں ہو رہی اگر چہ جائز ہے۔

لما فی الدر المختار:(۱/۵۳۹،طبع سعید)

ويُسنّ (فی الحضر)لامام ومنفرد.....(طوال مفصل) من الحجرات الیٰ اٰخر البروج (وفی الفجروالظهر) منها الیٰ اٰخر لم یکن (اوساط فی العصر والعشاء )باقیه (قصاره فی المغرب أی فی کل رکعة سورة ممّا ذکره الحلبی واختاره فی البدائع عدم التقدیر وانه یختلف بالوقت والقوم والامام.

ولما فی الشامية:(۱/۵۴۱،طبع سعید)

عن عمرؓ انه كتب الیٰ ابی موسیٰ الاشعریؓ ان اقرأ فی الفجر والظهر بطوال المفصل وفی العصر والعشاء باوساط المفصل وفی المغرب بقصار المفصل قال فی الكافی: وهو كالمروی عن النبیعلیه السلام لان المقادیر لا تعرف الا سماعا.

ولما فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص۱۴۴،طبع قدیمی)

وقد ترك الحنفية الا النادر منهم هذه السنة ولازم عليها الشافعيةالا القليل فظن جهلة المذهبين بطلان الصلاة بالفعل والترك فلا ينبغی الترك والملازمة دائما.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۰ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۳۲

## ﴿گرمی کی وجہ سے رومال، کپڑے پر سجدہ کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمین (فرش) کی گرمائش سے بچنے کیلئے سجدہ کی جگہ کوئی کپڑا وغیرہ رکھ دے تو اسکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: حامد بھائی ڈیفنس

﴿جواب﴾ زمین کی گرمی سے بچنے کے لئے کپڑے وغیرہ پر سجدہ کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

لما فی البزازية:(۶/۳۵۳)

صلی علی الارض وسجد علی خرقة يتقی بها حر الارض أو بردهالا یکره وعن الامامؒ انه فعل ذلک فی المسجد الحرام فنهاه واحد فقال من این أنت فقال من خوارزم فقال الامام جاء النكير من ورائی ای یحسل علم الفقة من هذا الیٰ الخوارزم لا العکس ثم قال

أتصلون على البردى فقال نعم قال تجوز الصلوٰة على الحشيش ولا تجوز على الخرقة دل أن ارشادالجا هل ينبغي أن يكون على وجه يزيل شبهته ......با لحجة الها لفة لا بمجرد المنع وبيان المسئلة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمٰن عفااللہ عنہ

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۲۱

## ﴿نماز کے دوران قرآن کی آیت سن کر آمین کہنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک امام صاحب نے نماز کے دوران جب آیت "فانصرنا على القوم الكافرين" تلاوت کی تو زبان پر بے اختیار تین مرتبہ "امیـن" جاری ہوا، پوچھنا یہ ہے کہ کیا نماز صحیح ہوئی یا نہیں نیز اگر یہی آیت امام صاحب سے سن کر مقتدی غیر اختیاری طور پر "امین" کہے تو اسکی نماز کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ لفظ امین چونکہ دعا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ ہر دعا جو قرآن وحدیث سے ثابت ہو نماز میں پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی بلکہ نوافل میں پڑھنا افضل ہے، فرائض کے قعدہ اخیرہ میں مسنون دعائیں اور ولا الضالین کے بعد امین کہنا بھی سرّاً مسنون ہے، اسکے علاوہ کسی اور موقع پر آمین کہنا درست نہیں لہٰذا قصداً ایسا کرنا مکروہ ہوگا اگرچہ نماز فاسد نہیں ہوگی۔

لمافي الهندية: (۱۰۸/۱، طبع رشيديه)

ولا بأس للمتطوع المنفرد أن يتعوذ من النار ويسئل الرحمة عند آية الرحمة ويستغفروان كان في الفرض يكره.

ولما في المنية: (ص ۳۵۸)

ولا بأس للمتطوع المنفرد أن يتعوذ من النار أو يستغفر وان كان في الفرض يكره واما الامام والمقتدى فلا يفعل ذلك.

ولما في التنوير وشرحه: (۲۶۶/۲، طبع امداديه)

فان قرأ كره تحريما بل يستمع وينصت وان قرأ الامام آية ترغيب أو ترهيب وكذاه الامام لا يشتغل بغير القرآن وماورد حمل على النفل منفرداً كمامر.

وفي الشامية: قوله آية ترغيب: اى في ثوابه تعالىٰ أو ترهيب: اى تخويف من عقابه فلا يسئل الاول ولا يستعيذ من الثاني قال في الفتح: لأن الله تعالىٰ وعد بالرحمة اذا استمع ووعده حتم واجابة دعاء المتشاغل عنه غير مجزوم بها.

لیکن غیر اختیاری طور پر زبان پر یہ کلمہ جاری ہو جائے جیسا کہ بسا اوقات قرآن مجید سمجھنے پر

کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں کوئی کراہت نہیں۔

لما فی التاتارخانیۃ:(۲۱۸/۱ طبع قدیمی)

وفی السراجیۃ:رجل اعجبتہ قراءۃ الامام فجعل یبکی ویقول بلی أونعم الیٰ قولہ......لاتفسد صلوتہ..... فالحاصل أنہ اذادعا فی الصلوۃ بما جاء فی الصلاۃ أوفی القرآن اوالادعیۃ الماثورۃ لاتفسد صلوتہ.

ولما فی الشامیۃ:(۲۴۸/۲)

فلواعجبتہ قرأۃ الامام فجعل یبکی ویقول بلی أونعم الیٰ قولہ .....لاتفسد لدلالتہ علی الخشوع

ولما فی المنیۃ وشرحہ:(ص۴۳۸)

ان کان المریض لا یملک نفسہ من شدۃ الوجع قال بسم اللہ الرحمن الرحیم أوأن أو تأوہ لا تفسد صلوتہ وکذا عن ابی یوسف ایضا لأن مالا یمکن الامتناع عنہ یکون عفوا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۱۳۶

## ﴿دوران نماز غیر محرم کے آنے سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر ہم ایسی جگہ نماز پڑھیں جہاں غیر محرم نہیں آتے اور اچانک غیر محرم آ جائے تو کیا ہماری نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عورت جتنی پوشیدہ اور مستور جگہ میں نماز ادا کرے وہ اس کے لیئے باعث فضیلت اور اجر ہے تاہم دوران نماز اگر کوئی غیر محرم آ جائے تو اس سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما فی الطبرانی بحوالہ اعلاء السنن:(۲۲۲/۴ طبع دارالکتب بیروت)

عن ام سلمۃ رضی اللہ عنہ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ المرأۃ فی بیتھا خیر من صلاتھا فی حجرتھا وصلاتھا فی حجرتھا خیر من صلاتھا فی دارھا وصلاتھا فی دارھا خیر من صلاتھا فی مسجد قومھا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم:عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۲۷۸

## ﴿کیا قوم کے گدوں پر نماز پڑھنا درست ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ قوم کے

موٹے گدے پر نماز پڑھنا درست نہیں ہے کیونکہ سجدہ کی حالت میں پیشانی اور پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے، قرآن وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: عبدالرشید ٹیکسلا

﴿جواب﴾ اس آدمی کی بات صحیح ہے، موٹا گدہ جس پر پیشانی اور پاؤں دوران سجدہ قرار نہ پکڑیں بلکہ دبانے سے مزید دبتا جائے اس طرح کی کوئی بھی چیز ہو فوم گدہ ہو یا اور کوئی موٹی نرم چیز اس پر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ پیشانی اور پاؤں وغیرہ کا ٹکنا یعنی قرار پکڑنا سجدہ کی شرائط میں سے ہے۔

لما فی الرد المحتار: (۵۰۰/۱، طبع: سعید)

(قوله وان یجد حجم الارض )تفسیره ان الساجد لو بالغ لا یتسفل راسه ابلغ من ذلک، فصح علی طنفسة وحصیر وحنطة وشعیر وسریر وعجلة ان کانت علی الارض لا علی ظهر حیوان کبساط مشدود بین اشجار ،ولا علی ارز او ذرة الا فی جوالق او ثلج ان لم یلبده وکان یغیب وجهه فیه ولا یجد حجمه ،او حشیش الا ان وجد حجمه (قوله والناس عنه غافلون)ای عن اشتراط وجود الحجم فی المسجود علی نحو الکور والطراحة ،کما یغفلون عن اشتراط السجود علی الجبهة فی کور العمامة

ولما فی الحلبی الکبیری:( ص:۲۵۲، طبع نعمانیة)

وان سجد علی الثلج فانه ان لم یلبده بان یکبسه حتی یتداخل ویلزق بعض اجزاء ه ببعض وکان الثلج بحیث یغیب وجهه ای وجه الساجد فیه ولا یجد حجمه ای صلابة جرمه لم یجز سجوده لعدم استقرار جبهته علی الارض او ما یتصل بها وان لبده حتی صار بحیث یجد صلابته ولا یغیب وجهه فیه ،وضابطه ان لا یتسفل بالتسفیل فحینئذ جاز سجوده علیه

ولما فی حاشیة الطحطاوی :(ص ۲۳۱ ،طبع قدیمی)

ومن شروط صحة السجود کونه (علی ما )ای شیء (یجد)الساجد(حجمه)بحیث لو بالغ لا تتسفل راسه ابلغ مما کان حال الوضع فلا یصح السجود علی القطن والثلج والتبن والارز والذرة وبذر الکتان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ | فتویٰ نمبر: ۳۳۸۰

﴿عمداً فرض میں تاخیر کرنے سے نماز کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بوڑھی خاتون تقریباً

دس سال سے لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے نماز کے قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف بھی پڑھ رہی ہے تو کیا اس عمل کی وجہ سے اس کی نماز پر کوئی اثر تو نہیں پڑا؟ اگر شرعاً اس کا یہ عمل درست نہیں ہے تو اب قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے لیے کیا حکم ہے وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ اس عورت کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام نمازوں کا اعادہ کرے جن میں قعدہ اولیٰ کے اندر تشہد کی مقدار پڑھنے کے بعد درود شریف بھی پڑھا گیا ہے۔ کیونکہ قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد بلا تاخیر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہونا ضروری ہے

یہ غلطی اگر سہوا ہوتی تو نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرنے سے تلافی ہو جاتی لیکن غلطی اگر سہواً نہ ہو جیسے کہ یہاں ہے تو تلافی کے لیے سجدہ سہو کافی نہیں بلکہ اعادہ ضروری ہے باقی رہی بات لاعلمی اور جہالت کی تو یہ کوئی عذر نہیں ہے اتنا علم حاصل کرنا فرض عین ہے جس سے عبادات معاملات وغیرہ کے جواز وعدم جواز صحت وفساد حلال وحرام کا علم ہو سکے۔

لما فی البحر الرائق: (۲۹۵/۱ طبع: سعید)

ولا تفسد الصلوة بتركها عمدا أو ساهيا بل يجب عليه سجود السهو في السهو جبراً للنقصان الحاصل بتركها سهوا والاعادة في العمد والسهو اذا لم يسجد له لتكون مؤدلة على وجه لا نقص فيه فاذا لم يعدها كانت مؤداة اداء مكروها كراهة تحريم وهذا هو الحكم في كل واجب تركه عامدا أو ساهيا.

ولما فی حاشية الطحطاوی: (ص: ۲۴۷، طبع قدیمی)

قوله (واعادتها بتركه عمدا) اى ما دام الوقت باقيا وكذا فى السهو ان لم يسجد له وان لم يعدها حتى خرج الوقت تسقط مع النقصان وكراهة تحريم ويكون فاسقا آثما وكذا الحكم في كل صلوة أديت مع كراهة التحريم.

ولما فی تنوير الابصار: (۵٦/۱ طبع: سعید)

(ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو ان لم يسجد له وان لم يعدها يكون فاسقا آثما وكذا كل صلوة أديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی غفرلہ ولوالدیہ

۱٦ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۲۱٦

## ﴿قنوت نازلہ ممنوع یا منسوخ نہیں ہوئی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قنوت نازلہ جو آجکل

مساجد میں پڑھی جارہی ہے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض تفاسیر میں ہے کہ آپ ﷺ پڑھ رہے تھے پھر اللہ پاک نے ایت " لیس لک من الامر شیء" نازل فرما کر منع فرمادیا تو آپ علیہ السلام نے پڑھنا چھوڑ دیا تو ہم لوگوں کے لیے پڑھنا جائز ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آیت کریمہ "لیس لک من الامر شیء" کے نزول سے مطلق قنوت نازلہ کی ممانعت نہیں ہوئی بلکہ آپ علیہ السلام نے قنوت نازلہ میں بعض کفار کے نام لے کر بددعاء کی تھی اسکی ممانعت ہوئی تھی کہ مخصوص طور پر کسی کا نام لے کر بددعاء نہ کی جائے اس کے بعد حضور ﷺ نے کسی کا نام لے کر قنوت نازلہ میں بددعاء نہیں کی، ویسے کسی کافر کے لیے بددعاء کرنا منع نہیں ہے، چنانچہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کرام سے بھی حضور اکرم ﷺ کے بعد خاص حالات میں قنوت نازلہ کا پڑھنا ثابت ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ قنوت نازلہ ممنوع یا منسوخ نہیں ہوئی لہذا قنوت نازلہ کا پڑھنا اب بھی جائز اور قابل عمل ہے۔

لما فی سنن الکبریٰ :(۲/۲۱۸، طبع، دار الحدیث بیروت)

باب الدلیل علی انه لم یترک اصل القنوت فی صلاۃ الصبح انما ترک الدعاء لقوم او علی اخرین باسمائهم او قبائلهم......عن انسؓ ان النبی ﷺ قنت شهراً یدعوا علیهم، ثم ترکه فاما فی الصبح فلم یزل یقنت حتی فارق الدنیا.

ولما فی اعلاء السنن:(۵/۱۰۹، طبع دار الکتب العلمیه بیروت)

عن ابی وهب عن معاویة بن صالح عن عبدالقاهر هو ابن عبد الله عن خالد بن ابی عمران قال:" بینما رسول الله ﷺ یدعوا علی مضر اذا جاء ہ جبریل فاؤما الیه ان اسکت فسکت فقال:یا محمدا ان الله لم یبعثک سباباً ولا لعاناً وانما بعثک رحمة ولم یبعثک عذاباً"لیس لک من الامر شیء"-----قوله " عن ابن وهب الخ واستدل به الحازمی فی" الاعتبار"علی ان القنوت فی الفجر لم ینسخ مطلقاً وانما نسخ اللعن علی الکافر.

وفیه ایضاً

عن انس ان النبی ﷺ قنت شهراً یدعوا علی قاتلی اصحابه ببیر معونة ثم ترک فاما فی الصبح فلم یزل یقنت حتی فارق الدنیا......ومعناہ عندنا لم یزل یقنت عند النازلة۔ فان الاحادیث المرفوعة لاتفید بقاء قنوت النوازل صراحة، بل صار امراً مجتدا فیه ـفیتجه الاجتهاد بان یظن ان ذلک انما هو لرفع شرعیة ونسخه نظراً الی سبب ترکه علیه السلام وهو انه ترک لما نزل" لیس لک من الامر شیء" ثم نظرنا الی افعال الصحابة فوجدناهم قنتوا بعد وفاته ﷺ فی الفجر، فترجح جانب شرعیة عند

النازلة على نسخه مطلقاً ولكن لم يثبت عنهم ذلك الا في الفجر فحسب فعلمنا ان القنوت فيما سواها من الصلوات منسوخة مطلقاً.

وهكذا في كفاية المفتي (۲/۵۱۵)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۶۹۰

## ﴿خاص حالات میں قنوت نازلہ پڑھنا سنت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب نے آج کل کے حالات کی بناء پر فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا شروع کیا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ قنوت نازلہ کا کیا حکم ہے فرض، سنت یا واجب ہے؟ براہ کرم رہنمائی فرمائیں؟

﴿جواب﴾ نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفائے کرامؓ پر جب کوئی اجتماعی پریشانی یا حادثہ پیش آتا تھا تو فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کے لئے دعا اور کافروں کے لئے بددعا فرمایا کرتے تھے، لہذا ایسی کوئی صورت ہو تو قنوت نازلہ پڑھنا سنت ہے۔

لما في حجة الله البالغة: (۲/۲۰ طبع سعيد)

وكان النبي ﷺ وخلفاءه اذا نابهم امر دعوا للمسلمين وعلى الكافرين بعد الركوع او قبله ولم يتركوه بمعنى عدم القول عندالنائبة.

ولما في فتح القدير: (۱/۵۱ طبع رشيديه)

وقد روى عن الصديقؓ انه قنت عند محاربة الصحابةؓ مسيلمة وعندمحاربة اهل الكتاب وكذالك قنت عمرؓ وكذا عليؓ في محاربة معاويةؓ في محاربته.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۶۷۳

## ﴿سترہ کی مقدار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سترہ کی مقدار کتنی ہونی چاہیے اور کن چیزوں کو سترہ بنایا جا سکتا ہے؟ اور سترہ کی ضرورت کہاں پیش آتی ہے؟

﴿جواب﴾ نمازی اپنے سامنے کسی چیز کو بطور آڑ کھڑا کردے یا پہلے سے موجود کھڑی چیز کے سامنے وہ نماز شروع کردے تاکہ نمازی اور گذرنے والوں کے درمیان وہ چیز آڑ بنے تو یہ

سترہ کہلاتا ہے مثلاً عصا، کرسی، پلر، دیوار وغیرہ اسی طرح کسی انسان کے آڑ میں کوئی نماز پڑھے تو وہ بھی سترہ کے حکم میں ہے اسی طرح کچھ بھی سامنے آڑ ہو بشرطیکہ کم از کم ایک ہاتھ لمبائی اور انگلی کے برابر موٹائی رکھتا ہو۔

کسی ایسی جگہ نماز پڑھنے کا اگر اتفاق ہو جائے جہاں لوگوں کا عام آنا جانا ہو اور نمازی کے سامنے گذرنے کا اندیشہ ہو تو ایسے موقع پر سترہ کا انتظام کرنا ضروری ہے ورنہ گذرنے والوں کا گناہ نمازی کو ہوگا اور جہاں ایسا کوئی اندیشہ نہ ہو تو وہاں اس کا انتظام کرنا کوئی ضروری نہیں ہے البتہ اولیٰ اس صورت میں بھی ہے اس لیے کہ نمازی کے سامنے کوئی آڑ نہ ہو تو توجہ اور دھیان بھٹکنے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔

لما فی الدر مع الرد:(۶۳۷/۱،طبع سعید)سترۃ بقدر ذراع طولاً وغلظ اصبع

ولما فی مجموعة قواعد الفقه ص: ۳۱۹

السترة :هی مایعرز وینصب امام المصلی من سوط او عکازة او غیر ذلک بقدر ذراع وغلظ اصبع.

ولما فی حلبی کبیر ص:۳۶۶،۳۶۷،سهیل اکیڈمی لاهور

ویکره المرور بین یدی المصلی اذالم یکن عنده ای عند المصلی حائل یحول بین المارّ نحو السترة ای العصا المرکوزة امامه اوالاسطوانة او نحو هما من شجرة او آدمی او دابّة وغیر ذلک فانه لایکره المرور بین یدی المصلی اذا کان من وراء الحائل .

ولما فی الدر المختار:(۶۳۸/۱،طبع سعید)

ولو عدم المرور والطریق جاز ترکها وفی الشامیة(قوله ولو عدم المرور )ای لو صلی فی مکان لایمرّ فیه احد ولم تواجه الطریق لایکره ترکها لان اتخاذها للحجاب عن المار قال فی البحر عن الحلیة ویظهر ان الاولی اتخاذها فی هذا الحال وان لم یکره الترک لمقصود آخر وهو کف بصره عما وراء ها وجمع خاطره بربط الخیال .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

رجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۲۴

## ﴿نماز کی حالت میں بچھو مارنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو دوست نماز پڑھ رہے تھے، نماز کی حالت میں سجدہ کی جگہ پر اچانک بچھو ظاہر ہو گیا، نماز کی حالت ہی میں میرے

دوست نے چپل اٹھا کر بچھو کو مار دیا، نماز مکمل کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ آپ تو نماز کی حالت میں تھے، آپ کی تو نماز ٹوٹ گئی تو اس نے کہا کہ مجھے مسئلہ معلوم ہے، یعنی نماز کی حالت میں مارنا جائز ہے، براہ کرم شریعت کی روشنی میں تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ بچھو یا سانپ نمازی کے سامنے سے اگر گزرے اور نمازی کو اس سے ایذاء پہنچنے کا اندیشہ ہو تو نماز کی حالت میں ان کو مارنا بلا کراہت جائز ہے، لھٰذا آپ کے دوست نے صحیح کہا ہے اس سے اس کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

لما فی البحر الرائق:(۳۰/۲،طبع: سعید)

(قوله لا قتل الحية والعقرب)ای لا یکره قتلها لحدیث صحیحین "اقتلوا الاسودین فی الصلاة والحية والعقرب" وفی صحیح مسلم مرفوعا امر علیه الصلوة والسلام بقتل الکلب العقور والحية والعقرب فی الصلاة واقل مراتب الامر الاباحة وفی شرح منیة المصلی ویستحب قتل العقرب بالنعل الیسری ان امکن..........وفی النهایة معزیا الی الجامع الصغیر البرهانی انما یباح قتلها فی الصلاة اذا مرت بین یدیها وخاف ان تؤذیه والا فیکره وقید بالحية والعقرب.

ولما فی الشامی:(۶۵۱/۱،طبع: سعید)

(قوله لا یکره قتل حية أو عقرب)لخبر الشیخین "اقتلوا الاسودین فی الصلاة الحية والعقرب" نهر واما قتل القملة والبرغوث فسیأتی.(قوله ان خاف الاذی)ای بان مرت بین یدیه وخاف الاذی والا فیکره نهایة.وفی البحر عن الحلیة:ویستحب قتل العقرب بالنعل الیسری ان امکن ،لحدیث ابی داؤد کذلک ،ویقاس علیه الحية،

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۷۰

## ﴿مرد اور عورت کی نماز میں فرق﴾

﴿سوال﴾ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کیا مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے؟ اگر فرق ہے تو وضاحت فرمائیں، بعض لوگ اس فرق کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ایسا کچھ ثابت نہیں ہے۔

مستفتی: محمد عارف رشید بٹ صاحب ابوبکر صدیق مسجد

﴿جواب﴾ یوں تو مرد و عورت دونوں ہی نبی کریم ﷺ کے امتی ہیں جس طرح مرد پر لازم ہے کہ وہ ہر عمل میں آپ ﷺ کی اقتداء کرے، اسی طرح عورت کو بھی حکم ہے کہ وہ ہر کام میں

آپ ﷺ کا طرز عمل و نہج اپنائے، لیکن شریعت مطہرہ نے کسی بھی موقع پر عورت کے پردہ وحیا کو نظر انداز نہیں کیا۔کوئی بھی وضع و کیفیت اس کے پردہ وحیاء کے منافی اگر ہے تو شریعت میں وہاں عورت کے لیے الگ تعلیم ہے چنانچہ احرام حج وعمرہ میں مرد کے لیے سلے ہوئے کپڑے پہننے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ گناہ ہے اور باعث جنایت ہے لیکن عورت کو اس کے خلاف حکم ہے اس لیے کہ مردوں کا طریقہ احرام اپنانے میں عورت کی بے پردگی ہے اور اس کے حیاء کے منافی ہے اسی طرح نماز کے ارکان میں کوئی بھی ہیئت اور وضع عورت کے پردہ وحیاء کے منافی اگر ہے تو شریعت نے اس کے خلاف کا حکم دیا ہے چنانچہ نماز کے بعض احکام میں خود آپ ﷺ نے وضاحت کے ساتھ اس کا حکم دیا ہے۔اور یہ کہنا کہ ایسا کچھ ثابت نہیں ہے بالکل غلط ہے چنانچہ بخاری شریف کی صحیح حدیث ہے کہ......

(۱) اگر دوران نماز امام سے غلطی ہو جائے تو متنبہ کرنے کے لیے مردوں کو تسبیح (سبحان اللہ) کا حکم ہے اور عورتوں کو تصفیق (یعنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے) کا حکم ہے۔

قال رسول الله ﷺ "التسبيح للرجال والتصفيق للنساء" (بخاری ۱/ ۱۶۰)

ترجمہ: آپ ﷺ نے فرمایا مردوں کے لیے تسبیح ہے اور عورتوں کے لیے تصفیق

(۲) عورتوں کے لیے افضل تو گھروں میں ہی نماز پڑھنا ہے لیکن اگر وہ مسجد میں آکر جماعت میں شریک ہوں تو ان کے لیے بہترین صفیں آخری صفیں ہیں اور بدترین صفین پہلی صفیں ہیں جبکہ مردوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔اس لیے کہ سامنے ہونے کی صورت میں عورت پر مردوں کی نظر پڑیگی۔

قال رسول الله ﷺ خير صفوف الرجال اولها وشرها آخرها ،وخير صفوف النساء آخرها وشرها اولها (مسلم ۱/ ۱۸۲)

ترجمہ: آپ ﷺ کا ارشاد ہے مردوں کی صفوں میں تو بہترین صفیں پہلی صفیں ہیں اور بدترین صفیں آخری صفیں ہیں جبکہ عورتوں کی بہترین صفیں آخری صفیں ہیں اور بدترین صفیں پہلی صفیں ہیں۔

(۳) مردوں کے لیے مسجد میں باجماعت نماز پڑھنا افضل بلکہ ضروری ہے جبکہ عورتوں کے لیے اپنے اپنے گھروں تنہا نماز پڑھنا افضل ہے

صلوة المرأة في بيتها افضل من صلوتها في حجرتها وصلاتها في مخدعها افضل من صلوتها في بيتها(سنن ابی داود ۱/۸۴)

ترجمہ: عورت کا اپنے سونے کے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اس کا پچھلی کوٹھری میں نماز پڑھنا اگلے کمرے میں نماز پڑھنے سے افضل ہے

قال رسول الله ﷺ خير مساجد النساء قعر بيوتهن (سنن بیہقی ۲/۱۳۱)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ آپ ﷺ کا ارشاد نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا عورتوں کی بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں

(۴) مرد اگر ننگے سر نماز پڑھے تو جائز ہے لیکن عورتوں کے لیے ننگے سر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اس طرح اسکی نماز نہیں ہوگی۔

لا يقبل الله صلوة حائض الا بخمار (ترمذی ۱/۷۵)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا بالغہ عورت کی نماز اللہ تعالیٰ اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں فرماتا (یعنی نماز نہیں ہوتی)

(۵) مرد کو سجدہ میں پیٹ رانوں سے، بازو بغل سے جدا، نیز کہنیاں زمین سے اٹھا کر رکھنی چاہئیں جب کہ عورت ان سب اعضاء کو ملا اور سمٹا کر رکھے

ان النبي ﷺ مر على امرأتين تصليان فقال اذا سجدتما فضما بعض اللحم الى الارض فان المرأة ليست في ذلك كالرجل(اعلاء السنن ۳/۱۹)

ترجمہ: آپ ﷺ کا دو عورتوں پر گزر ہوا جو نماز پڑھ رہی تھیں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کو زمین سے ملا دو اس لیے کہ بیشک عورت اس بارے میں مرد کی طرح نہیں ہے

اذا سجدت الصقت بطنها بفخذها كاستر ما يكون لها(اعلاء السنن ۳/۳۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب عورت سجدہ کرے تو اپنا پیٹ رانوں سے ایسے طور پر چپکالے جو اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردے کا باعث ہو

(۶) قعدہ میں مرد اپنا بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھے، جبکہ عورت کے لیے حکم ہے کہ وہ دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر سرین پر بیٹھے

وكان يامر الرجال ان يفرشوا اليسرى وينصبوا اليمنى فى التشهد ويامر النساء ان يتربعن (سنن بيهقى ۲/۲۲۳)

ترجمہ: آپ ﷺ مردوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ تشہد میں دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھ جائیں اور عورتوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ چوکڑی مار کر بیٹھیں

(۷) مردوں پر جمعہ کی نماز اپنی شرائط کے ساتھ فرض ہے اس کے ترک کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں جبکہ عورتوں پر سرے سے جمعہ ہی فرض نہیں

الجمعة حق واجب على كل مسلم فى جماعة الا الاربعة ،عبد مملوك او امرأة او صبى او مريض (سنن ابى داود ۱/۱۵۳)

ترجمہ: جمعہ حق ہے اور باجماعت ہر مسلمان پر واجب ہے علاوہ چار آدمیوں کے، غلام جو کسی کی ملک ہو، عورت، بچہ، مریض

(۸) مرد عورتوں کا امام بن سکتا ہے لیکن عورت مردوں کا امام نہیں بن سکتی

قال ﷺ خير صفوف الرجال اولها وشرها آخرها ،وخير صفوف النساء آخرها وشرها اولها(صحيح مسلم ۱/۱۸۲)

وجہ استدلال: امامت کے لیے سب سے آگے کھڑا ہونا پڑتا ہے جبکہ عورت کو سب سے پیچھے کھڑے ہونے کا حکم ہے، حتی کہ اس کا تو اپنی عورتوں کی صفوں میں بھی اگلی صف میں کھڑا ہونا پسند نہیں کیا گیا چہ جائیکہ مردوں سے آگے کھڑی ہو

عن على ابن ابى طالبؓ انه قال لا تؤم المرأة(اعلاء السنن ۴/۲۳۶)

ترجمہ: حضرت علی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ عورت امامت نہ کرے، الفاظ حدیث اپنے عموم کی وجہ سے اس پر بھی دال ہیں کہ عورت مردوں کی امامت نہ کرے

(۹) تکبیر تحریمہ کے وقت مردوں کو کانوں تک ہاتھ اٹھانے کا حکم ہے جبکہ عورتوں کو کندھوں تک اٹھانے ہیں

قال رسول الله ﷺ اذا صليت فجعل يديك حذاء اذنيك والمرأة تجعل يديها حذاء ثدييها (كنز العمال ۴/۱۷۵)

ترجمہ: حضرت وائل ابن حجرؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم نماز پڑھو تو اپنے ہاتھ کانوں کے برابر اٹھاؤ اور عورت اپنے ہاتھ چھاتی کے برابر اٹھائے

(۱۰) تکبیر تحریمہ کے بعد مردوں کو ناف سے نیچے ہاتھ باندھنے کا حکم ہے جبکہ عورتوں کو سینے پر باندھنے کا

تجمع المرأة يديها في قيامها ما استطاعت (مصنف عبدالرزاق ۱۲۷/۳)

ترجمہ: حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں عورت اپنے قیام میں اپنے ہاتھوں کو جتنا سکیڑ سکتی ہے اتنا سکیڑے۔

اما في حق النساء فاتفقوا على ان السنة لهن وضع اليدين على الصدر (السعاية ۱۵۶/۲)

ترجمہ: عورتوں کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ ان کے لیے سنت سینے پر ہاتھ باندھنا ہے۔

(۱۱) مرد کو رکوع میں اچھی طرح جھکنا چاہیے کہ سر اور پشت برابر ہو جائیں اور عورتوں کو صرف اس قدر جھکنا چاہیے کہ جس سے ان کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں، مردوں کو انگلیاں کشادہ کر کے گھٹنوں کو پکڑنا چاہیے اور عورتوں کو کشادہ کیے بغیر ملا کر رکھنا چاہیے، مردوں کو رکوع میں کہنیاں پہلو سے الگ رکھنی چاہیں اور عورتوں کو ملا کر رکھنی ہیں۔

اما المرأة فتنحني في الركوع يسيراً ولا تفرج ولكن تضم وتضع يديها على ركبتيها وضعاً وتحني ركبتيها ولا تجافي عضديها لان ذلك استر لها (رد محتار ۴۹۳/۱)

(۱۲) مرد جہری نمازوں میں جہراً قراءت کریگا جبکہ عورت کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ جہری نمازوں میں بھی جہراً قراءت نہ کرے۔

ولما في ردمحتار: (۵۰۲/۱، طبع: سعید کراچی)

ولا تجهر في الجهرية، بل لو قيل بالفساد بجهرها لامكن بناء على ان صوتها عورة

(۱۳) عورت کو سجدہ میں پاؤں بچھا کر رکھنے چاہیں، مردوں کی طرح پاؤں کو کھڑا رکھنا عورتوں کے لیے مسنون نہیں ہے

لما في الرد المحتار: (۵۰۴/۱، طبع: کراچی)

وحاصل ما ذكره ان المخالفة في ست وعشرين، وذكر في البحر انها لا تنصب اصابع القدمين كما ذكره في المجتبى، ثم هذا كله فيما يرجع الى الصلوة والا فالمرأة تخالف الرجل في مسائل كثيرة مذكورة في احكامات الاشباه فراجعها

مذکورہ بالا احادیث و آثار اور فقہاء کرام کی عبارات سے واضح ہوا کہ مرد و عورت کی نماز میں بعض ہیئت و صورت کے اعتبار سے فرق ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ عورت کو بھی مرد کی طرح اعضاء وغیرہ

کوتان کر نماز پڑھنی چاہیے دونوں کی نمازوں میں کوئی فرق نہیں ہے یہ بالکل غلط ہے۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: کتبہ: ضیاء الحق الحکی

ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

## ﴿وضو اور تیمم پر قدرت نہ ہو تو نماز کیسے ادا کریں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اجتماع کے موقع پر زور دار بارش ہوئی جسکی وجہ سے پنڈال پانی سے بھر گیا تھا لوگوں کیلئے ادھر ادھر جانا انتہائی مشکل تھا یعنی بالکل ناممکن تھا اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا وضو کیلئے پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ ہی تیمم کیلئے خشک زمین میسر تھی اور زمین پر نماز پڑھنے کیلئے کوئی جگہ نہیں تھی ہر طرف کیچڑ اور پانی تھا سجدہ کرنا تقریباً زمین پر ناممکن تھا ایسی صورت میں نماز پڑھنے کیلئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جواب دیکر عنداللہ ماجور ہو۔ مستفتی: امیر نواز دوکاندار عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان

﴿جواب﴾ اس سال رائے ونڈ اجتماع میں بارش کی وجہ سے جو صورت حال پیش آئی بلاشبہ ایک آزمائش تھی اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور کوئی بڑی حکمت تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ عصر کے وقت بارش شروع ہوئی عصر، مغرب اور عشاء تینوں نمازیں متاثر ہوئیں، عصر، مغرب کا وقت ویسے بھی مختصر ہوتا ہے۔ لوگ وضو کیلئے پریشان تھے اور نماز کیلئے بھی اس لئے کہ زمین پر بیٹھنا دشوار تھا اور سجدہ تو اور بھی زیادہ مشکل تھا۔

یہ تو واضح ہے کہ نماز ایسی صورت میں بھی قضا کرنے کی گنجائش نہیں ہے، کوئی بھی ترتیب نہ بن سکے تو کم از کم نمازی کی سی ہیئت اپنانا ضروری ہوتا ہے اور بعد میں اسکی قضا بھی کرے۔ چونکہ بارش وقفہ وقفہ سے ہو رہی تھی تو وضو کی ضرورت بارش کے پانی سے بھی پوری ہو سکتی تھی ہاں بارش اتنی ہو کہ، چہرہ، دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت اور دونوں پاؤں پر ٹخنوں تک بارش کے قطرے اتنے پڑ جائیں کہ یہ تمام خوب بھیگ جائیں اور ہاتھ بھی ان جگہوں پر پھیر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اور سر پر تر ہاتھ مسح کی غرض سے پھیر لینا ضروری ہے۔ اس سے وضو ہو جاتا ہے البتہ بارش اتنی نہ ہو یا بارش ہو گئی اور کسی وجہ سے نمازی وضو کے فرائض پوری نہ کر سکا اور کیچڑ وغیرہ کی وجہ سے پاک پانی تک پہنچنا بھی انتہائی دشوار ہو کہ اتنے میں نماز کا بھی وقت نکل جائے گا اور بارش کا پانی بھی

کسی نشیب جگہ میں اتنا جمع نہ ہوا ہو کہ اس سے وضو ہو سکے۔ اتنا پانی کسی نشیب جگہ میں جمع ہو گیا ہو خواہ گدلا ہو تو اس سے وضو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں وضو کرتے ہوئے کیچڑ ہاتھوں میں آئے تو ایسا پانی وضو کیلئے استعمال کرنا ضروری نہیں ہے۔

پانی پر قدرت کسی طرح حاصل نہ ہو تو تیمم کا حکم ہے۔ تیمم پاک مٹی، گرد و غبار خواہ کپڑوں یا سیٹ پر ہو اور پتھر پر بھی کیا جاسکتا ہے، کیچڑ پر تیمم کرنے سے چہرے پر مٹی لپنے کا اندیشہ ہو تو ایسا کیچڑ تیمم کیلئے موزون نہیں ہے۔ البتہ ہاتھوں کو نہ لگے تو ایسی تر مٹی سے تیمم کیا جاسکتا ہے اور بارش کی وجہ سے خشک جگہ اگر نہ ملے تو زمین کی کچھ کھدائی آسانی سے اگر ہو سکے تو ایسی مٹی تیمم کیلئے نکال لینی چاہئے جس سے کیچڑ کی طرح لیپنے کا اندیشہ نہ ہو یا کیچڑ لیکر کپڑوں پر مل دیں تا کہ کچھ خشک ہو پھر اس پر تیمم کر کے فریضہ نماز ادا کرے۔ اور ایسی کوئی بھی تدبیر کام نہ آئے تو یہ شخص "فاقد الطھورین" کہلاتا ہے ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ باقاعدہ نماز نہ پڑھے البتہ ظاہری ہیئت نمازی کی طرح بنائے اور بعد میں قضا کرے۔ بہر حال طہارت وضو کر کے حاصل ہو یا تیمم کے ذریعہ چونکہ نماز کیلئے شرط ہے کسی طرح حاصل کرنا ضروری ہے۔

باقی نمازی کیلئے زمین پر سجدہ کرنا انتہائی مشکل ہو مثلاً پانی یا کیچڑ کا منہ، ناک میں جانے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر یا قیام ہی کی حالت میں اشارہ سے نماز پڑھے۔ بعض لوگوں نے گاڑیوں کی چھتوں پر نماز پڑھی ایسی جگہ ملے تو بہت اچھا ہے بعض نے گاڑیوں میں اپنی اپنی سیٹ پر نماز پڑھی سیٹ قبلہ رخ اگر تھی تب تو نماز ہوگئی ہے اور قبلہ کے جہت کے خلاف اگر تھی تو نماز نہیں ہوئی اس لئے کہ قبلہ رخ کرنا بھی شرائط نماز میں سے ہے اور زمین پر کھڑے ہو کر قبلہ رخ کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی اس لئے ایسی نماز جو قبلہ رخ کے خلاف پڑھی گئی ہے واپس لوٹانا ضروری ہے۔

لما فی التنویر مع الدر (۲۵۲/۱۔۲۵۳ طبع سعید)

(والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورين) بان حبس في مكان نجس ولا يمكنه اخراج تراب مطهر وكذا العاجز عنهما لمرض (يؤخرها عنده: وقالا: يتشبه) بالمصلين وجوبا فيركع ويسجد ان وجد مكانا يابسا والا يومي قائما ثم يعيد كالصوم (به يفتي واليه صح رجوعه) أي الامام كما في الفيض،

ولما فی الشامی (۲۵۲/۱۔۲۵۳ طبع سعید)

(قوله ولا يمكن اخراج تراب مطهر) اما لو امكنه بنقر الارض او الحائط بشئ فانه

یستخرج ویصلی بالاجماع،بحر عن الخلاصه. قال ط:وفیه انه یلزم التصرف مال الغیر بلااذنه(قوله یؤخرها عنده) لقوله علیه السلام "لا صلوۃ الا بطہور" سراج (قوله وقالا یتشبه بالمصلین)احتراما للوقت قال ط:ولایقرء کما فی ابی السعود،سواء کان حدثه اصغر اواکبر قلت :وظاهره انه لاینوی ایضا لانه تشبه لاصلوۃ حقیقة تامل (قوله ان وجد مکانایابسا)ای لامنه من التلوث،لکن فی الحلیة:الصحیح علی هذاالقول انه یؤمی کیفماکان،لانه لو سجدصار مستعملاللنجاسة(قوله کالصوم)ای فی مثل الحائض اذا طہرت فی رمضان:فانہا تمسک تشبہا بالصائم لحرمة الشہر ثم تقضی ،وکذاالمسافر اذا افطر فاقام.

ولما فی المحیط البرهانی(۲۱۶/۱طبع،ادارۃ القرآن)

الوجه الثانی :ان یکون محبوسا فی مکان نجس لایجد ماء ،ولا ترابا نظیفا،فانه علی وجهین:ان امکنه نقرالارض او الحائط بشئی ،واستخراج التراب الطاهر،فعل ذلک ،ویصلی بالتیمم.وان لم یمکنه ذلک،فعلی قول ابی حنیفةؒ لایصلی،بل ینتظر،حتی یجد الماء اوالتراب الطاهر،وقال ابو یوسفؒ:یصلی بالایماء تشبیهابالمصلین ،ویعید.وقول محمدؒ مضطرب،ذکر"فی الزیادات"وفی کتاب الصلوۃ فی روایة ابی حفصؒ قوله مع قول ابی حنیفةؒ.وذکرفی کتاب الصلوۃ لابی سلیمانؒ قوله مع قول ابی یوسفؒ.قال بعض المشائخ علی قول ابی یوسفؒ. انمایصلی بالایماء اذالم یکن الموضع یابسا،اما اذاکان یابسا یصلی برکوع وسجود.

ولما فی العالمگیریة(۳۱/۱،طبع قدیمی)

ولو کان المسافر فی طین وردغة لایجد ماء ولاصعیدا ولیس فی ثوبه وسرجه غبار یلطخ ثوبه او بعض جسده بالطین فاذا جف تیمم به ولاینبغی ان یتیمم مالم یخف ذهاب الوقت لانه فیه تلطخ الوجه من غیر ضرورۃ فیصیر بمعنی المثلة وان تیمم به اجزأه عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ لان الطین من اجزاء الارض ومافیه من الماء مستهلک هکذا فی البدائع وان صار الطین مغلوبا بالماء فلایجوز به التیمم هکذا فی محیط السرخسیؒ.

ولما فی المحیط البرهانی(۳۱۰/۱،طبع ادارۃ القرآن)

قال محمدؒ فی "الاصل "فی المسافر اذاکان فی طین وردغة فاصابه مطر فابتل سرجه وثیابه، ولم یجد ماء یتوضأ به فانه یلطخ ثوبه بالطین ویجففه،ثم یفرکه ،ویتیمم به ،قال القدوری فی "شرحه :وهذاقول محمد لانه یعتبر استعمال جزء من الصعید ،یعنی علی احدی الروایتین :فاما علی قول ابی حنیفة ،واحدی الروایتین عن محمد ،فلایعتبر استعمال جزء من الصعید ،وانمایعتبر المس ،والطین من جنس الارض ،فیضع یده علی الطین ویتیمم ،ومن المشائخ من قال ماذکر فی "الاصل "قول الکل.

ولمافی الدر مع الرد(۲۴۰/۱،طبع سعید)

وطین غیر مغلوب بماء لکن ،لاینبغی التیمم به قبل خوف فوات وقت لئلا یصیر

مثله بلا ضرورة، وحاصل ما في الولوالجية انه اذا لم يجد الا الطين لطخ ثوبه منه فاذا جف تيمم به، وان ذهب الوقت قبل ان يجف لا يتيمم به عند ابي يوسفؒ، لان عنده لا يجوز الا بالتراب او الرمل وعند ابي حنيفةؒ ان خاف ذهاب الوقت تيمم به لان التيمم بالطين عنده جائز، والا فلا كي لا يتلطخ بوجهه فيصير مثلة.

ولما في فتاوى قاضي خان (۶۰/۱،طبع قديمي)

ولو كان الرجل في طين طاهر لا يتمم به لكن يلطخ به بعض ثيابه او جسده ويترك حتى يجف ثم يتيمم به، وقال الشيخ الكرخيؒ يجوز التيمم بالطين، وذكر شمس الائمة الحلوانيؒ انه لا ينبغي ان يتيمم بالطين لان فيه تلطيخ الوجه ولو فعل جاز ولو نفض ثوبه او لبده او سرجه فتيمم بغاره جاز.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد دیروی

۱۱صفر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر ۳۹۴۳

## ﴿داڑھی منڈوانے والے کا صف اول میں نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی داڑھی منڈواتا ہے تو اسکو صف اول میں نماز پڑھنے سے روکا جائے گا؟ آیا داڑھی منڈوانے کیوجہ سے اسکو صف اول سے محروم کیا جائے گا؟ ہمارے مسجد کے امام صاحب نے ایک داڑھی منڈوانے والے کو صف اول سے نکالا تھا؟

مستفتی: ایک طالب العلم

﴿جواب﴾ داڑھی رکھنا واجب ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، اور موجودہ دور میں علماء وصلحاء کیلئے تمغہ امتیاز بھی، آپ علیہ السلام اور خیر القرون کے دیگر ادوار میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی داڑھی منڈواتا یا کترواتا تھا، اسلئے فقہاء کرام کی عبارتوں میں خاص داڑھی منڈوانے والے کیلئے کوئی ہدایت نہیں مل رہی کہ وہ صف اول میں کھڑا نہ ہو احادیث کریمہ میں واضح طور پر یہ حکم ضرور ہے کہ امام کہ قریب میں اصحاب علم وشرف اور ایسے لوگ کھڑے ہوں جن کو دین میں کوئی خاص مقام ورتبہ حاصل ہو، اسلئے کہ بسا اوقات امام کو خلیفہ بنانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اور لقمہ دینے کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے۔ لہذا نمازیوں کو چاہیے کہ خود ہی اس حکم کا خیال رکھیں۔ اور صف اول میں خصوصا امام کے قریب میں ایسے ہی حضرات کو کھڑا ہونے کا موقع دیں۔

اور عام نمازیوں کو ایسا کوئی احساس نہ ہو. تو امام صاحب کو یہ حق حاصل ہے کہ حکمت وبصیرت کیساتھ مقتدیوں کو سمجھائیں. تاکہ نمازی لوگ خود ہی اس کا خیال رکھیں. اور کسی امام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محلہ میں اور مقتدیوں میں ایسی قبولیت سے نوازا ہو کہ تمام نمازی ان کی بات کا بڑا احترام کرتے ہوں۔ اور انکی بات کا نمازیوں پر منفی اثر نہ پڑتا ہو جس طرح گھر کے افراد اپنے کسی بڑے کی بات سے منفی اثر نہیں لیتے بلکہ ماننے میں اپنا فائدہ جانتے ہیں اور انکے تلخ اور سخت لہجہ کو بھی شفقت پر محمول کرتے ہیں تو ایسا امام کسی داڑھی منڈوانے والے کو اگلی صف میں کھڑے ہونے سے روک بھی سکتا ہے ان کو یہ حق حاصل ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ تمام مسلمان اپنے آئمہ مساجد کو ایسا ہی مقام دیں، لیکن جہاں فائدہ سے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہو کہ کل کو یہ داڑھی منڈا نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیگا یا امام صاحب کیلئے فتنہ کھڑا کر دیگا تو ایسی صورت میں نرم انداز اختیار کرنا چاہیے کسی کو صف سے نکلنے کا ہرگز کہنا نہیں چاہیے، موقع محل شناسی بہت ضروری ہے۔ اور اسی کو حکمت وبصیرت کہتے ہیں، جو کہ علماء ربانیین کا شیوہ ہے. اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطاء فرمادے۔ آمین

**لما فی صحیح المسلم:(۱/۱۲۹، طبع قدیمی)**

عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خالفوا المشرکین احفوا الشوارب واعفوا اللحی،

**ولما فی الهندیة:(۱/۸۹، طبع رشیدیه)**

وینبغی أن یکون بحذاء الامام من هو افضل کذا فی شرح الطحاوی،

**ولما فی الشامی:(۱/۵۶۹ طبع سعید)**

وان سبق أحد الی الصف الأول فدخل رجل أکبر منه سنا أو أهل علم ینبغی أن یتأخر ویقدمه تعظیما له اه

**ولما فی الدر:(۱/۵۷۰، طبع سعید)**

ولو وجد فرجة فی الأول لاالثانی له خرق الثانی لتقصیرهم،

**ولما فی صحیح المسلم :(۱/ ۱۸۱، طبع قدیمی )**

عن عبد اللہ بن مسعود قال :قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلنی منکم اولو الأحلام والنهی ثم الذین یلونهم ثلاثا الحدیث قال النووی رحمه اللہ تعالی تحت هذا الحدیث، فی هذا الحدیث تقدیم الأفضل فالأفضل الی الامام لأنه اولی بالاکرام ولأنه ربما احتاج الامام الی استخلاف فیکون هو اولی ولأنه یتفطن لتنبیه الامام علی السهو لما لا یتفطن له غیره ولیضبطوا صفة الصلوة ویحفظوها وینقلوها

ويعلموها الناس وليقتدي بافعالهم من ورائهم ولا يختص هذا التقديم بالصلوة بل السنة أن يقدم اهل الفضل في كل مجمع الى الامام وكبير المجلس كمجالس العلم والقضاء والذكر والمشاورة ومواقف القتال وامامة الصلوة والتدريس والافتاء واسماع الحديث الخ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۲۲ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ　　　فتوی

## ﴿صلوٰۃ کسوف، خسوف اور استسقاء کا بیان﴾

### ﴿چاند گرہن میں با جماعت نماز مسنون نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ چاند گرہن کے وقت جماعت کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھنا مسنون ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ چاند گرہن کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا مسنون نہیں ہے بلکہ اکیلے اکیلے پڑھنی چاہیے۔

(لما في التنوير والدر ۱۸۳/۲ طبع سعيد)

(وان لم يحضر الامام) للجماعة (صلى الناس فرادى) في منازلهم تحرزاً عن الفتنة (كالخسوف للقمر)

قال الشاميؒ:

(قوله كالخسوف للقمر) اي حيث يصلون فرادى سواء حضر الامام أو لا كما في البرجندي اسماعيل

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفی اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکی

۲ شعبان ۱۴۳۳ھ　　　فتوی نمبر:

### صلوۃ الخسوف (چاند گرہن کی نماز)

مسئلہ نمبر ۱۔ جب چاند گرہن ہو تو اس وقت اکیلے دو رکعت نماز پڑھنا مسنون ہے، نماز سے فارغ ہو کر دعا کرے یہاں تک کہ چاند روشن ہو جائے۔

لما في صحيح البخاري ۱/

عن قيس قال سمعت ابا مسعودؓ يقول قال النبي ﷺ ان الشمس والقمر لا ينكسفان لموت احد من الناس ولكنهما آيتان من آيات الله فاذا رأيتموها فقوموا فصلوا.

(ولما فی الرد المحتار ۱۸۲/۲ طبع سعید)

وظاهر الروایة هو الرکعتان ثم الدعاء الی ان تنجلی شرح المنیة۔

مسئلہ نمبر۲۔ صلوۃ الخسوف (چاند گرہن کی نماز) میں سرا یعنی خفیہ قرأت کی جائیگی۔

لمافی الدر مع الرد ۱۸۲/۲ طبع سعید)

(بلا اذان و)لا (اقامة و)لا (جهر و)لا (خطبة)

قال الشامیؒ:(قوله ولا جهر )وقال ابو یوسفؒ یجهر وعن محمد روایتان۔

(ولما فی حاشیة الطحطاوی ص۵۴۵ قدیمی کتب خانه)

(بلا اذان ولا اقامة ولا جهر )فی القراءة فیهما عنده خلافاً لهما۔

قال الطحطاویؒ:(عنده خلافاً لهما )الصحیح قول الامام کما فی المضمرات۔

## ﴿نماز استسقاء پڑھنے کا طریقہ﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب نماز استسقاء پڑھنے کا کیا طریقہ ہے وضاحت فرمائیں؟

﴿جواب﴾ استسقاء کے سلسلے میں سب سے بڑی چیز توبہ واستغفار، عجز ونیاز اور اللہ تعالی کے دربار میں بندوں کی گریہ زاری ہے اور یہ انفرادی طور پر اجتماعی نماز کے بغیر بھی ہوسکتی ہے البتہ باقاعدہ صلوۃ استسقاء کا ارادہ ہوتو شہر کے تمام چھوٹے بڑے مسلمان شہر سے باہر عیدگاہ یا کسی وسیع میدان میں جمع ہوجائیں، پورے اخلاص، صدق دل کے ساتھ توبہ واستغفار کریں، پھر اس کے بعد دورکعت نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں، اور امام صاحب جہراً قراءت کرے، سلام پھیرنے کے بعد جمعہ کی طرح دو خطبے دیں اور دونوں خطبوں کے درمیان جلسہ کرے، پھر اجتماعی دعا مانگی جائے اور امام صاحب قلب رداء کرے یعنی چادر پلٹے اگر چارکونوں والی (مربع) ہے تو اوپر حصے کو نیچے اور نیچے حصے کو اوپر کریں۔

(لما فی التنویر والدر ۱۸۴/۲ طبع سعید)

(هو دعاء واستغفار )لانه السبب لارسال الامطار (بلا جماعة )مسنونة بل هی جائزة (و)بلا (خطبة)وقالا تفعل کالعید (و)بلا (قلب رداء)

وفی الشامیة:

(قوله کالعید)ای بان یصلی بهم رکعتین یجهر فیهما بالقراءة بلا اذان ولا اقامة ثم یخطب بعدها قائماً علی الارض معتمدا علی قوس او سیف او عصا خطبتین عند محمدؒ وخطبة واحدة عند ابی یوسفؒ ......(قوله خلافاً لمحمدؒ)فانه یقول یقلب الامام رداءه اذا

مضى صدر من خطبته .فان كان مربعاً جعل اعلاه اسفله واسفله اعلاه وان كان مدورا جعل الايمن على الايسر والايسر على الايمن ،وان كان قباء جعل البطانة خارجا والظهارة داخلاً حلية ،واختار القدوری قول محمدؒ لانه ﷺ فعل ذلک نهر ،وعليه الفتوى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی

۵ شعبان ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب صلوۃ الاستسقاء میں کونسی دعائیں پڑھنا منقول ہیں وضاحت فرمائیں؟

﴿جواب﴾ آپ ﷺ سے مختلف دعائیں منقول ہیں مثلاً......

(۱) اللهم اسقنا غيثاً مغيثاً مريئاً مريعاً نافعاً غير ضار عاجلاً غير آجل.

(۲) اللهم اسق عبادك وبهائمك وانشر رحمتك واحى بلدك الميت

(۳) اللهم انت الله لا اله انت الغنى ونحن الفقراء انزل علينا الغيث واجعل ما انزلت لنا قوتاً وبلاغاً الى خير.

(لما فی ابی داؤد ۱/۱۷۳)

عن جابر بن عبد الله قال اتت النبی ﷺ بواكى فقال اللهم اسقنا غيثا مغيثا مريئا مريعا نافعا غير ضار عاجلا غير آجل قال فاطبقت عليهم السماء.

عن عائشةؓ قالت شكى الناس الى رسول الله ﷺ قحوط المطر فامر بمنبر فوضع له فى المصلى ووعد الناس يوماً يخرجون فيه قالت عائشةؓ فخرج رسول الله ﷺ حين بدا حاجب الشمس فقعد على المنبر فكبر وحمد الله ثم قال انكم شكوتم جدب دياركم واستيخار المطر عن ابان زمانه عنكم وقد امركم الله عزوجل ان تدعوه ووعدكم ان يستجيب لكم ثم قال الحمد لله رب العلمين الرحمن الرحيم مالک يوم الدين لا اله الا الله يفعل ما يريد اللهم انت الله لا اله الا انت الغنى ونحن الفقراء انزل علينا الغيث واجعل ما انزلت لنا قوتاً وبلا غا الى خير .

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال كان رسول الله ﷺ اذا استسقى قال اللهم اسق عبادك وبهائمك وانشر رحمتك واحى بلدك الميت .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی

۷ شعبان ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر

## ﴿استسقاء میں تین دن پورے کرنا ضروری نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ استسقاء کے دوران

اگر تین دن پورا ہونے سے پہلے بارش ہو جائے تو تین دن پورے کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور خطبہ کی استسقاء میں کیا حیثیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: مقتدی ابوبکر مسجد

﴿جواب﴾ استسقاء کے لیے تین دن تک نکلنا مستحب ہے اس سے زیادہ ثابت نہیں اگر تین دن پورا ہونے سے پہلے بارش ہوگئی تو استسقاء کا عمل پورا ہو گیا تین دن پورے کرنا ضروری نہیں تاہم اگر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی نیت سے نکلا جائے تو مستحب ہے نہ نکلنے میں بھی کوئی حرج نہیں، استسقاء میں خطبہ صاحبین کے نزدیک سنت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اگر خطبہ نہ پڑھا جائے تب بھی خلاف سنت نہ ہوگا روایات سے بغیر خطبہ صرف نماز اور دعاء بھی ثابت ہے۔

لما فی الهندية:(۱/۱۵۴،طبع رشيديه)

"ثم المستحب ان يخرج الامام بالناس ثلاثة ايام متتابعات ولم ينقل اكثر من ذالك"

ولما فی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص۵۴۸-۵۴۹،طبع قديمی)

"ويستحب الخروج له "وفی حاشيته :وهو مسنون عند الحاجة اليه فی موضع لا يكون لأهله أودية وأنهار وآبار يشربون منها أوكان لهم ذلک لكن لا يكفيهم فان كان كافيا لا يستسقون وفيه أيضاً اذاسقوا قبل الخروج وقد كانوا تهيئوا له ندب أن يخرجوا شكراًلله تعالی ويستزيدون من فضله ورحمته".

ولما فی غنية المستملی:(ص۴۷۰،طبع نعمانيه)

ويخطب خطبين عند محمد كما فی العيد وهو المشهور عن أبی يوسف.واستدل محمد ومن وافقه علی سنية الجماعة والخطبة وعندهما سنة فكذاالخطبة والعمل علی مذهب الصاحبين .كذا فی فيض الباری:(۲/۳۹۲،طبع رشيديه)

ولما فی معارف السنن:(۴/۴۹۳،طبع سعيد)

"فقال أبو حنيفة باستنان الدعاء فقط ،وقال أحمد باستنان الصلاة فقط......فيه أيضاخلاف بناءً علی اختلاف الروايات فيه ولعل الكل واسع".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ أعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:

## ﴿استسقاء کیلئے ہاتھ اٹھا کر کے دعا مانگنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں جمعہ کی تقریر میں امام صاحب نے فرمایا کہ استسقاء کیلئے ہاتھ اٹھا کر کے دعاء مانگی جائے، کیا شرعاً ہاتھ اٹھا

کر کے دعا مانگنا ثابت ہے یا نہیں؟ مستفتی: قاری ساجد احمد زید و صوابی

﴿جواب﴾ احادیث مبارکہ میں استسقاء کیلئے ہاتھ الٹے کر کے دعا مانگنا ثابت ہے اور فقہاء کرام نے اس کو مسنون قرار دیا ہے لہٰذا امام صاحب کا یہ فرمانا کہ استسقاء کیلئے ہاتھ الٹے کر کے دعا مانگی جائے درست ہے، تاہم سیدھے ہاتھ کر کے دعا مانگنا بھی منع نہیں ہے۔

لما فی معارف السنن:(۲۹۶/۴،طبع ایچ ایم سعید)

قال النووی فی شرح مسلم قال جماعة من اصحابنا وغیرهم السنة فی کل دعاء لرفع البلاء کالقحط ونحوه ان یرفع یدیه ویجعل ظهر کفیه الی السماء۔۔۔واحتجوا بهذا الحدیث ویرید به حدیث مسلم عن انس بن مالک ان النبی ﷺ استسقی فاشار بظهر کفیه الی السماء

ولما فی مرقاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح:(۵۵۱/۴،مکتبه رشیدیه)

تحت حدیث انسؓ:من اراد دفع بلاء من قحط ونحوه فلیجعل ظهر کفه الی السماء ومن سئل نعمة من الله فلیجعل بطن کفه الی السماء.

ولما فی البنایة فی شرح الهدایة:(۲۱۶/۳،مکتبه حقانیه ملتان)

ولو اشار بظهر کفه الی السماء یجوز لما روی انسؓ انه صلی الله علیه وسلم استسقی واشار بظهر کفه الی السماء وفی شرح الوجیز قال العلماء وهذه سنة لمن دعا لدفع البلاء واذا سأل شیئا من الله یجعل باطن کفه الی السماء وکذا فی المبسوط.

ولما فی الدر مع الرد:(۵۰۷/۱،طبع سعید)

ودعا رهبة یجعل کفیه لوجهه کالمستغیث من الشئ.

وفی الشامیة:قوله یجعل کفیه لوجهه الذی فی البحر یجعل ظهر کفیه وجهه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۰ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۴۲۳

## ﴿نفل نماز کی قضاء میں قیام کی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ توڑی ہوئی نفل نماز میں قیام کی کیا حیثیت رہتی ہے؟ کیا ایسی نفل نماز میں قیام فرض، واجب یا مستحب ہوتا ہے؟

﴿جواب﴾ نفل نماز کسی وجہ سے فاسد ہوگئی تو قضاء میں قیام واجب ہے یا نہیں؟ اس بارے میں صریح جزئیہ تو نہیں ملا، البتہ ایک دوسرے مسئلہ پر فقہاء کرام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک نفل کی قضاء میں بھی قیام واجب نہیں ہے جبکہ صاحبینؒ کے

نزدیک لزوم کے بعد قیام واجب ہے۔ امام صاحبؒ کے قول کی تائید استحسان سے ہورہی ہے اور اسی پر فتاوی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فتوی عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں: ''توڑی ہوئی نفل نماز کے بارے میں بالکل صریح جزئیہ تو نہیں ملا۔ علامہ طحطاویؒ نے مراقی کی عبارت سے وجوب مستنبط کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: ''قوله والواجبات ظاهره شمول قضاء النفل الذی أفسده '' لیکن اس کے مشابہ ایک مسئلہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ توڑی ہوئی نفل نماز کی قضاء میں قیام صاحبینؒ کے نزدیک واجب ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوگا''۔

لما فی حلبی کبیر: (ص ۲۷۱ طبع سهیل اکیڈمی لاہور)

اما القعود بغير عذر بعد الافتتاح قائما فيجوز عند ابی حنيفةؒ لكن مع الكرهة على مااختاره صاحب الهداية وبلا كراهة على مااختاره فخر الاسلام ـ وأما عندهما فلايجوز اتمامها مع القعود بلا عذر بعد الافتتاح قائما اصلا لان الشروع معتبر بالنذر ومن نذر صلوٰة ركعتين قائما لايجوز له أن يصليها قاعدا من غير عذر فكذا اذاشرع فيهما ولأبی حنيفةؒ ان اللزوم بالشروع لضرورة صيانة المؤدى عن البطلان وصيانته عنه ليست موقوفة على القيام لصحته بدونه والضرورة تتقدر بقدرها ـ ولذا اتفقوا على انه لو نذر الحج ماشيا لزمه بصفة المشي ولو شرع فيه ماشيا لايلزمه.

لما فی حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح: (ص ۲۲۲ طبع قدیمی)

والسابع منها تعيين الواجب أطلقه فشمل قضاء نفل أفسده والنذر والوتر وركعتى الطواف، والعيدين.

لما فی مجمع الانهر: (۲۰۱/۱ طبع مكتبة المنار كوئٹه)

(ولو قعد بعد ماافتتحه قائما جاز) عند الامامؒ استحسانا لانه اسهل من الابتداء (ويكره لو بلا عذر) عنده (وقالا لا يجوز الا بعذر) قياسا لان الشروع ملزم كالنذر ولونذر ان يصلی قائما لم يجز ان يصلی قاعدا فكذا هذا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۳۱۹۳

# ﴿کتاب الجنائز﴾

## ﴿فصل فی الغسل والکفن﴾

### ﴿غسل سے پہلے میت کے پاس تلاوت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو غسل دینے سے پہلے میت کے قریب قرآن کریم کی تلاوت کرنا جائز ہے؟ مستفتی: خلیل الرحمٰن محمود آباد

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینے سے پہلے قریب بیٹھ کر تلاوت کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے، البتہ کچھ فاصلے سے ہو تو کوئی حرج نہیں۔

لما فی العالمگیریہ: (۱۵۷/۱ طبع: رشیدیہ)

ویکرہ قراءۃ القرآن عندہ حتی یغسل کذا فی التبیین.

ولما فی الشامی: (۱۹۳/۲، طبع: سعید)

(تنبیہ) الحاصل ان الموت ان کان حدثا فلا کراھۃ فی القراءۃ عندہ وان کان نجسا کرھت وعلی الاول یحمل مافی النتف وعلی الثانی ما فی الزیلعی وغیرہ وذکر ط اذا کان قریبا منہ ،اما اذا بعد عنہ بالقراءۃ فلا کراھۃ .

ولما فی البحر الرائق: (۱۷۱/۲ طبع سعید)

ویقرء عندہ القرآن الی ان یرفع والی ان یرفع روحہ فی التبیین.

ولما فی نورالایضاح (۱۲۵ طبع قدیمی)

وتکرہ قراءۃ القرآن عندہ حتی یغسل.

ولما فی حاشیۃ الطحطاوی: (۵۶۵ طبع: قدیمی)

(وتکرہ قراءۃ القرآن عندہ حتی یغسل) تنزیھا للقرآن عن نجاسۃ الحدث بالموت والخبث فانہ یزول عن المسلم بالغسل تکریما لہ بخلاف الکافر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بندہ شاہ جہان ڈیروی

۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر ۳۲۵۶

### ﴿میت کے آس پاس بیٹھ کر تلاوت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں جب کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے متعلقین اس کو استنجاء کروا کر کپڑے سے ڈھانپ دیتے ہیں اور پھر اس

کی چارپائی کے دائیں بائیں دو چار پائیاں رکھ کر اس پر چند مردوں اور عورتوں کو تلاوت قرآن کے لیے بٹھاتے ہیں اب تلاوت بھی ہورہی ہوتی ہے اور میت کے عزیز واقارب رو بھی رہے ہوتے ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ مذکورہ طریقہ شرعا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینے سے پہلے اس کے پاس بیٹھ کر تلاوت کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے البتہ اگر میت کو چادر وغیرہ سے مکمل طور پر ڈھانپ دیا جائے تو غسل سے پہلے بھی میت کے پاس تلاوت قرآن کی گنجائش ہے اور غسل کے بعد تو بلاتردد جائز ہے اور تلاوت کے اندر اخفاء کو اختیار کیا جائے اونچی آواز سے تلاوت نہ کی جائے

لما فی الدر المختار: (۱۹۳/۲ طبع: سعید)

ویقرأ عنده القرآن الى ان يرفع الى الغسل كما فی القهستانی معزيا للمنتف

قلت: وليس فی المنتف الى الغسل بل الى ان يرفع فقط وفسره فی البحر برفع الروح وعبارة الزيلعی وغيره تكره القراءة عنده حتى يغسل وعلله الشرنبلالی فی امداد المفتاح تنزيها للقرآن عن نجاسة الميت لتنجسه بالموت۔

ولما فی الرد المحتار: (۱۹۲/۲ طبع: سعید)

قلت: والظاهر ان هذا ايضا اذا لم يكن الميت مسجى بثوب يستر جميع بدنه لانه لو صلى فوق نجاسة حائل من ثوب او حصير لا يكره فيما يظهر فكذا اذا قرأ عند نجاسة مستورة وكذا ينبغی تقييد الكراهة بما اذا قرأ جهرا

ولما فی العالمگیریة: (۱۷۳/۱ قدیمی کتب خانه)

ويكره تلاوة القرآن عنده حتى يغسل كذا فی التبيين

ولما فی البحر الرائق: (۱۷۱/۲ طبع: سعید)

وفی التبيين وتكره تلاوة القرآن عنده الى ان يغسل

ولما فی التبيين: (۵۶۵/۱ طبع: سعید)

وتكره تلاوة القرآن عنده حتى يغسل.

واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی — الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۲۲۰ — ۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ

## ﴿میت کو غسل دینا واجب علی الکفایہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو غسل دینا فرض،

واجب، یا مستحب ہے؟ برائے مہربانی مدلل جواب عنایت فرمائیں۔ مستفتی: طارق علیم

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینا واجب علی الکفایہ ہے، یعنی واجب سب پر ہے، البتہ کوئی بھی غسل دیدے تو تمام مسلمانوں کیطرف سے کفایت ہو جائے گی، اور کوئی بھی اگر غسل نہ دے تو قریب کے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔

لما فی التنویر مع الدر (۱/۱٦۷ طبع سعید)

(ویجب) ای یفرض (علی الاحیاء) المسلمین (کفایة) اجماعا (ان یغسلوا) بالتخفیف (المیت) المسلم الا الخنثی المشکل فییمم.

ولما فی خلاصة الفتاوی (۱/۱۲ طبع رشیدیه)

وواحد واجب وهو غسل المیت.

ولما فی البحر الرائق (۱/۲۵ طبع سعید)

(قوله ووجب للمیت) الغسل فرض علی المسلمین علی الکفایة لاجل المیت هو مراد المصنف من الوجوب کما صرح به فی الوالجی فی الجنائز.

ولما فی العالمگیریه (۱/۱٦ طبع رشیدیه)

وواحد واجب وهو غسل الموتی کذا فی محیط السرخسی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بندہ شاہ جہان ڈیروی

۸ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۵۹

## ﴿غسل اور کفن کا بیان﴾

### ﴿بم دھماکے، ایکسیڈنٹ وغیرہ میں بکھرے ہوئے انسانی اعضاء کو غسل و نمازِ جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل پوری دنیا خصوصاً پاکستان میں بم دھماکے ہوتے رہتے ہیں، اس میں بے شمار لوگ بے گناہ مر جاتے ہیں اور ان کے اعضاء بکھر جاتے ہیں جن کا پتہ بھی نہیں چلتا، ٹانگ ایک جگہ پڑی ہوتی ہے جبکہ ہاتھ دوسری جگہ، کبھی سر اس کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی آدھا دھڑ ہوتا ہے، کبھی ایکسیڈنٹ وغیرہ میں بھی ایسا ہوتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ایسے اعضاء کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: ریاض حسین حیدرآبادی

﴿جواب﴾ ایکسیڈنٹ وغیرہ میں انسانی ایسے اعضاء مل جائیں جو بدن کا اکثر حصہ

یا آدھا دھڑ سر کے ساتھ ہو تو اس کو غسل دینا اور نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے، البتہ آدھا دھڑ سر کے بغیر یا بالکل ٹکڑے ٹکڑے مل جائے کہ نہ سر کا پتہ چلتا ہو اور نہ دوسرے اعضاء کا تو اس صورت میں اس کو غسل دینا اور نماز جنازہ پڑھنا ضروری نہیں ہے، کپڑے میں لپیٹ کر دفن کیا جائے، لیکن بم دھماکے میں عموماً بے گناہ مسلمان ظلماً مارے جاتے ہیں اور اکثر اسی موقع پر انتقال کر جاتے ہیں، اس صورت میں وہ شہید ہے اور شہید کو غسل وکفن نہیں دیا جاتا، لہذا بم دھماکے میں شہید ہونے والے واقعی شہید کی صفت پر ہو تو غسل نہیں دیا جائے گا۔

لمافی الدر مع الرد:(۲/۱۹۹،طبع سعید)

(وجد رأس آدمی) أو أحد شقیه (لا یغسل ولا یصلی علیه) بل یدفن الاأن یوجد أکثر من نصفه ولو بلا رأس.(قوله ولو بلا رأس) وکذا یغسل لو وجد النصف مع الرأس بحر.

ولمافی الهندیة:(۱/۱۵۹،فی الجنائز،طبع رشیدیه)

لو وجد أکثر البدن أو نصفه مع الرأس یغسل ویکفن ویصلی علیه کذافی المضمرات، واذا صلی علی الأکثر لم یصلی علی الباقی اذا وجد کذافی الایضاح،وان وجد نصفه من غیر الرأس أو وجد نصفه مشقوقاً طولاً فانه لا یغسل ولا یصلی علیه ویلف فی خرقة ویدفن فیها کذافی المضمرات.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۹۲۸

## ﴿مقتدیٰ شخصیت بھی میت کو غسل دے تو باعث ثواب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ کیا مقتدیٰ شخص اپنے رشتہ داروں کے علاوہ کسی غیر میت کو غسل دے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ ہم نے سنا ہے کہ مقتدیٰ کیلئے میت کو غسل دینا نا مناسب فعل ہے۔

اور کیا غسل دینے کیلئے کوئی مقدار متعین ہے یا نہیں؟ کہ اتنے مردوں کو غسل دینے کے بعد کسی میت کو غسل دینا درست نہیں، جبکہ ہم نے اسکے بارے میں بھی سنا ہے کہ سات مردوں کو غسل دینے کے بعد غسل دینا درست نہیں، وضاحت فرمائیں۔ مستفتی:تاج علی کورنگی کراچی

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے، مقتدیٰ شخص بھی ثواب وفضیلت کا محتاج ہے اور جتنا زیادہ ہو سکے یہ عمل کرے تو زیادہ ثواب واجر ہے اس

کیلئے کوئی حد مقرر نہیں ہے، ایسی بے بنیاد باتیں سن کر اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔

لما فی الهندية:(۱/۱۵۷، طبع: قدیمی)

غسل الميت حق واجب على الاحياء بالسنة واجماع الأمة ولكن اذا قام به البعض سقط عن الباقين.

ولما فی ردالمحتار(۲/۲۰۲، طبع: سعید کراچی)

[خاتمة]يندب الغسل من غسل الميت ويكره ان يغسله جنب أوحائض والاولى كونه أقرب الناس اليه فان لم يحسن الغسل فأهل الأمانة والورع.

ولما فی غنية المستملی فی شرح منية المصلی:(ص۵۹۹، طبع: نعمانیه)

والاولى فی الغاسل ان يكون أقرب الناس الى الميت فان لم يحسن الغسل فأهل الأمانة والورع.

ولما فی الهندية:(۱/۱۷۵، طبع: قدیمی)

ويستحب للغاسل أن يكون أقرب الناس الى الميت فان لم يعلم الغسل فأهل الأمانة والورع ويستحب أن يكون الغاسل ثقة يستوفی الغسل ويكتم مايری من قبيح ويظهر مايری من جميل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد ملازئی

۲۹ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۳۳

## ﴿کیا پانی میں ڈوب کر مرنے والے شخص کو غسل دیا جائے گا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس بارے میں کہ غریق فی الماء کی نماز جنازہ پڑھانا غسل دیئے بغیر جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم جواب عنایت فرما کر مشکور ہوں۔ مستفتی: سعید

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے اور بغیر غسل دیئے اس پر نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص پانی میں ڈوب جائے تو نکالنے کے بعد اس کو بھی غسل دینا ضروری ہے اور اگر غسل دیئے بغیر اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی تو نماز جنازہ تو ادا ہو جائیگی کیونکہ ڈوبنے کیوجہ سے اس کو طہارت حاصل ہوگئی ہے لیکن غسل نہ دینے والے گنہگار ہونگے، البتہ اگر پانی سے نکالتے وقت میت کو غسل کی نیت سے حرکت دی ہے مثلاً واپس پانی میں غوطہ دیا ہو تو اس سے بھی غسل کی ذمہ داری پوری ہو جائیگی۔

ولما فی التنوير مع الدر:(۲/۲۰۰، طبع سعید)

لو وجد ميت فی الماء فلا بد غسله ثلاثا لانا امرنا بالغسل فيحركه فی الماء

بنیۃ الغسل ثلاثا(الفتح)وتعلیله یفید انهم لو صلوا علیه بلااعادۃ غسله صح وان لم یسقط وجوبه عنهم.

ولما فی حاشیۃ الطحطاوی:(ص۵۶۹،طبع قدیمی)

والنیۃ فی تغسیله لاسقاط الفرض عنا حتی انه اذاوجدغریقا یحرك فی الماء بنیۃ غسله لهذا لالصحۃ الصلاۃ.

ولما فی البحر الرائق:(۱۷۹/۲،طبع سعید)

شرطها اسلام المیت وطهارته فلا تصح علی الکافر للآیۃ ولا تصل علی احد منهم مات ابدا ولاتصح علی من لم یغسل لانه له حکم الامام من وجه لا من کل وجه وهذاالشرط عند الامکان فلو دفن بلا غسل ولم یمکن اخراجه الا بالنبش صلی علی قبره بلا غسل للضرورۃ بخلاف ماذالم یهل علیه التراب بعدفانه یخرج ویغسل.

ولما فی الهندیۃ:(۱۵۸/۱،طبع قدیمی)

المیت اذا وجد فی الماء لا بد من غسله لان الخطاب بالغسل توجه علی بنی آدم ولم یوجد من آدم فعل الا ان یحرکه فی الماء بنیۃ الغسل عند الاخراج.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:شاہدخان سواتی

۲۵محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۱۰

## ﴿حائضہ عورت کا میت کو غسل دینا مکروہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا حائضہ عورت وفات شدہ عورت کو غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟اور اگر نہیں دے سکتی تو کیا دوبارہ پاک عورت کا غسل دینا ضروری ہے یا وہی غسل کافی ہے؟اور اگر غسل دینے والی پاک عورت ہواور پانی ڈالنے والی حائضہ ہوتو کیا حکم ہے؟ مستفتی:محمد عارف رشید بٹ ابوبکرصدیق مسجد فیز۲

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینے والے کو چاہئے کہ وہ خود بھی پوری طرح طہارت کیساتھ ہو،اس لئے مناسب ہے کہ غسل دینے کیلئے وضوء کرلے،جنابت،حیض،نفاس کی حالت میں اگر کوئی عورت میت کو غسل دیدے تو میت کا غسل ہوجائیگا دوبارہ دینے کی ضرورت نہیں،البتہ اس غسل دینے والی عورت کیلئے مکروہ ہے۔اور یہ حکم غسل دینے والی کیلئے ہے،پانی ڈالنے والی معاون اگرچہ ہے غسل دینے والی نہیں ہے،لہذا اس کیلئے طہارت کوئی ضروری نہیں۔

لما في الهندية:(۱/۱۵۹،طبع رشيديه)

"وينبغي أن يكون غاسل الميت على الطهارة ،ولو كان الغاسل جنباً أو حائضاً أو كافراً جاز ويكره ،ولو كان محدثاً لا يكره اتفاقاً".

ولما في رد المحتار:(۲/۲۰۲،طبع سعيد)

"يندب الغسل من غسل الميت،ويكره أن يغسله جنب أوحائض"

ولما في البدائع:(۱/۳۰۴،طبع سعيد)

"وسواء كان الغاسل جنباًأوحائضاً، لأن المقصود وهوالتطهير حاصل فيجوز وروي عن أبي يوسف أنه كره للحائض الغسل،لأنهالواغتسلت بنفسهالم تعتدبه فكذااذاغسلت"

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ أعلم بالصواب:عبدالباری چشتی

۳ ربیع الأول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۹۷۹

## ﴿میت کا چہرہ دیکھنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کا چہرہ دیکھنا کفن دینے کے بعد جائز ہے یا نہیں؟ اور آجکل یہ جو رسم چلی ہے کہ نماز جنازہ کے بعد جنازہ پڑھنے والے لوگ فرداً فرداً میت کا چہرہ دیکھتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ نیز بعض علاقوں میں قبر میں رکھنے کے بعد میت کا چہرہ دکھایا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی:محمد عظیم

﴿جواب﴾ میت کو کفنانے کے بعد اگر کوئی چہرے سے کفن کا کپڑا اٹھا کر میت کا چہرہ دیکھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لما في التاتارخانية:(۲/۱۳۲،طبع قديمي)

وفي اليتيمة:سألت يوسف بن محمدعمن يرفع الستر عن وجه الميت ليراه ؟قال لا بأس به.

لیکن نماز جنازہ کے بعد تمام اہل جنازہ کا فرداً فرداً میت کا چہرہ دیکھنا مندرجہ ذیل مفاسد کی وجہ سے ترک کرنا ضروری ہے۔

(۱) شرعی حکم یہ ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت اور کفناتے وقت کم سے کم آدمی ہوں اور وہ میت کے اقارب واحباب میں سے ہوں، تاکہ میت میں خدانخواستہ موت کی وجہ سے کوئی تغیر یا عیب نظر آئے تو اس کا افشاء نہ ہو، منہ دکھانے کی رسم شریعت کے اس حکم وحکمت کے خلاف ہے۔

(۲) اگر میت کوئی مشہور شخصیت ہے تو اسکی منہ دکھائی کی رسم میں کئی گھنٹے صرف کئے جاتے ہیں حالانکہ میت کے دفن میں تاخیر جائز نہیں۔

(۳) رونمائی کی رسم کا نتیجہ یہ ہے کہ میت اگر کوئی مشہور شخصیت ہو تو میت کی تصویریں لیکر اخبارات میں شائع کیجاتی ہیں، جس میں تصویر کی لعنت اور عذاب کے علاوہ میت کے چہرے میں تغیر کی اشاعت بھی ہے جو حرام ہے۔

بعض لوگ تو میت کو قبر میں رکھنے کے بعد اسکا چہرہ دکھاتے ہیں یہ بالکل ممنوع ہے، اسلئے کہ قبر میں رکھنے کے بعد تو بعض اوقات آثار برزخ شروع ہو جاتے ہیں، جس سے لوگوں میں میت کے بارے میں بدگمانی پیدا ہونیکا قوی اندیشہ ہے۔

لما فی الهندية:(۳۵۱/۵،طبع رشيديه)

ولا بأس بان يرفع ستر الميت ليرى وجهه وانما يكره ذلك بعد الدفن كذا في القنية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالرزاق غفرلہ

۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر: ۱۱۳۳

## ﴿نابالغ لڑکے کے کفن کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بالغ مرد اور نابالغ لڑکے کے کفن میں کوئی فرق ہے یا نہیں یعنی نابالغ لڑکے کو کس طرح کفن دیا جائے؟

﴿جواب﴾ مراہق یعنی قریب البلوغ لڑکے کو عام بالغ مرد کی طرح کفن دینا ضروری ہے اس سے کم عمر کے لڑکے کو دو کپڑوں میں کفنانا بھی کافی شمار ہوتا ہے بلکہ ایک کپڑے کی بھی گنجائش ہے۔

لما فی الدرالمختار:(۲۰۲/۲،طبع سعيد)

والمراهق كالبالغ ومن لم يراهق ان كفن في واحد جاز.وفي الشامية:وان كان صبيا لم يراهق فان كفن في خرقتين ازار ورداء فحسن وان كفن في ازار واحد جاز.

ولما في الهندية:(۱۲۰/۱،طبع رشيديه)

المراهق في التكفين كالبالغ الصبي و ادنى ما يكفن به الصغير ثوب واحد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۶ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۳۵۲

## ﴿جمعہ کے دن مرنے کی فضیلت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقے میں ایک آدمی کے انتقال کے موقع پر (جن کا انتقال شب جمعہ کو ہوا) ایک عالم نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص شب جمعہ کو وفات پائے تو اس سے قبر میں سوال جواب نہ ہوگا اور وہ بلا حساب کتاب جنت میں چلا جائے گا، مذکورہ قول کہاں تک درست ہے؟ اور کیا یہ بشارت صرف شب جمعہ کے ساتھ خاص ہے؟ وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: شیر عزیز

﴿جواب﴾ ماہ رمضان، جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن کے کسی بھی ساعت میں کوئی مومن فوت ہو جائے تو عذاب قبر سے وہ مامون رہتا ہے حدیث مبارک میں آتا ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح: (۱۲۱/۱ طبع سعید)

عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مامن مسلم يموت يوم الجمعة او ليلة الجمعة الا وقاه الله فتنة القبر (رواه احمد والترمذى).

تاہم ایک ساعت اس پر تنگی کردی جاتی ہے پھر قیامت تک عذاب سے محفوظ رہتا ہے کافر کو قیامت تک عذاب ہوتا ہے لیکن ان دنوں میں اس سے بھی عذاب اٹھالیا جاتا ہے ان ایام کے گزرنے پر عذاب پھر لوٹتا ہے۔

ولمافی التنویر مع الدر: (۲۲/۲، طبع امدادیہ)

(ويامن الميت من عذاب القبر ومن مات فيه أو في ليلته أمن من عذاب القبر ولا تسجر فيه جهنم، وفيه يزور أهل الجنة ربهم تعالى)

وفي الشامية: قال اهل السنة والجماعة: عذاب القبر حق، وسوال منكر و نكير، وضغطة القبر حق لكن اذا كان كافراً فعذابه يدوم الى يوم القيامة ويرفع عنه يوم الجمعة وشهر رمضان، فيعذب اللحم متصلاً بالروح، والروح متصلاً بالجسم، فيتألم الروح مع الجسد وان كان خارجاً عنه والمومن المطيع لايعذب بل له ضغطه يجد هول ذالك وخوفه، والعاصى يعذب و يضغط، لكن ينقطع عنه العذاب يوم الجمعة وليلتها ثم لايعود، وأن مات يومها أوليلتها يكون العذاب ساعة واحدة وضغطة القبر ثم يقطع۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۸

## ﴿میت کے ناخنوں سے بھی ناخن پالش اتارنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت انتقال کر گئیں اور اس نے (تہہ والی) ناخن پالش لگائی ہوئی تھی، تو کیا غسل دیتے وقت ناخنوں سے پالش ہٹانا ضروری ہے یا پالش کے ہوتے ہوئے بھی غسل ہو جائے گا، نیز غسل سے پہلے پالش ہٹانے کا حکم صرف زندہ لوگوں کے ساتھ خاص ہے یا مردوں کے لیے بھی یہی حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ایسی ناخن پالش جس کی باقاعدہ تہہ ہوتی ہے چونکہ وہ پانی کی سرایت کے لیے مانع ہوتی ہے جب کہ غسل میں بدن کے ہر ہر حصے تک پانی پہنچانا ضروری ہوتا ہے یہاں تک کہ بال برابر بھی جگہ اگر خشک رہ گئی تو غسل نہیں ہوگا، لہذا غسل دینے سے قبل میت کے ناخنوں سے پالش اتارنا ضروری ہے، اور واجب غسل کے لیے یہی حکم ہے غسل زندہ کرے یا مردے کو کرایا جائے اگر غسل واجب ہے تو ایسی چیزوں کو دور کرنا ضروری ہے۔

لما فی الفقه الحنفی وأدلته:(۶۱/۱،طبع بیروت)

ولابد من زوال ما یمنع وصول الماء الی الجسد کطلاء الاظافر ونحوها.

ولما فی نور الایضاح:(ص:۳۱،فصل فی الوضوء)

ولو انضمت الاصابع او طال الظفر فغطی الانملة او کان فیه ما یمنع الماء کعجین وجب غسل ما تحته.

ولما فی الهندیه:(۴/۱،طبع رشیدیه)

فی فتاوی ما وراء النهر ان بقی من موضع الوضوء قدر رأس ابرة او لزق باصل ظفره طین یابس او رطب لم یجز۔ولو کان علیه جلد سمک او خبز ممضوغ قد جف فتوضأ ولم یصل الماء الی ما تحته لم یجز لان التحرز عنه ممکن کذا فی المحیط.

ولما فی الشامی:(۱۵۴/۱،مطلب فی ابحاث الغسل طبع سعید)

ولو فی اظفاره طین او عجین فالفتوی علی انه مغتفر قرویاً کان او مدنیاً آه.نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیة فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء

ولما فی تحفة الفقهاء:(ص:۱۸ الجنابة والغسل)

واما انواع الغسل المشروع فتسعة ثلاثة منها فرض وواحد منها واجب وهو غسل الموتی واما تفسیر الغسل فنقول للغسل رکن واحد فهو تسییل الماء علی جمیع ما یمکن غسله من بدن مرة واحدة

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۱۵ جمادی الاولی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۳۲

## ﴿میت کو غسل دینے سے پہلے وضو کرانا چاہیے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نابالغ بچے کی میت کو وضو بھی کرانا چاہیئے یا صرف غسل پر اکتفا کیا جائے؟ مستفتی: حبیب الرحمٰن

﴿جواب﴾ میت کو غسل دینے سے پہلے وضو کرانا چاہیے، میت خواہ بڑے کی ہو یا نابالغ بچے کی، البتہ اتنا چھوٹا بچہ جو بالکل ناسمجھ ہو، ابھی نماز، وضو نہیں جانتا، اس کو وضو کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ولمافی الشامیۃ:(۲/۱۹۵-۱۹۶،طبع سعید)

(قوله ويوضأمن يومر بالصلوة)خرج الصبي الذى لم يعقل لأنه لم يكن بحيث يصلي قاله الحلواني.وهذاالتوجيه ليس بقوى.اذيقال ان هذاالوضو سنة الغسل المفروض للميت لا تعلق للميت بحيث يصلي أو لاكما في المجنون شرح المنية ومقتضاه لاكلام في ان المجنون يوضأ وأن الصبي الذى لايعقل الصلوة يوضأ ايضاعلى الخلاف مايقتضيه توجيه الحلواني من أنهمالا يوضأن.

ولمافی تقریرات الرافعی:(۱۱۷،طبع سعید)

(قوله هذاالتوجيه ليس بقوى الخ)الظاهرمافي الحلواني وليس قصده توجيه المسئلة بدليلهابل بيان أن عدم الوضوء ان ماهولفقدشرطه كذافي الجوهرةوالمحيط والبحروغيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۱۴

## ﴿مردے کے لیے ناپاکی کی حالت میں ایک غسل کافی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت یا مرد کا ناپاکی کی حالت میں انتقال ہو جائے مثلاً عورت حیض یا نفاس کی حالت میں مر جائے، تو انکو دو مرتبہ غسل دیا جائے گا یا صرف ایک مرتبہ کافی ہے اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ دو مرتبہ غسل دیا جائے گا۔

﴿جواب﴾ ناپاکی کی حالت میں بھی ایک ہی غسل کافی ہے دو مرتبہ غسل دینے کو ضروری سمجھنا جہالت ہے اور احتیاطاً منہ اور ناک میں پانی ڈال کر روئی یا کپڑے کی مدد سے واپس نکال لیں تو یہ بہتر ہے۔

لما فی تنویر الابصار وشرحه: (۱۹۲/۲، طبع سعید)

ولو كان جنبا او حائضا او نفساء فعلا اتفاقا تتميما للطهارة كما فی امداد الفتاح مستمدا من مشرح المقدسی (ولو كان جنبا) نقل ابو السعود عن شرح الكنز للشلبی ان ما ذكره الخلخالی ای فی شرح القدوری من ان الجنب يمضمض ويستنشق غريب مخالف لعامة الكتب. قلت: وقال الرملی ايضا فی حاشيه البحر اطلاق المتون و الشروح و الفتاوی يشمل من مات جنبا و لم ار من صرح به لكن الاطلاق يدخله والعلة تقتضيه اه وما نقله ابو السعود عن الزيلعی من قوله بلا مضمضه و استنشاق ولو جنبا صريح فی ذلك لكنی لم اره فی الزيلعی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۲۳

## ﴿مردے کے بال ناخن کاٹنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ اگر مسلمان مردے کے زیر ناف بال زیادہ لمبے ہو کر انگلی کے برابر ہو گئے ہوں، اسی طرح کوئی ہندو مسلمان ہو کر مر جائے ،اور اسکے زیر ناف بال زیادہ لمبے ہوں، تو کیا اس کا کاٹنا جائز ہے؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں نوازش ہو۔ مستفتی: مولوی محمد خالد کوئٹہ

﴿جواب﴾ بال و ناخن کاٹنے سے زیب و زینت مقصود ہوتی ہے، مردے کو اسکی ضرورت نہیں ہوتی ،اور سنت یہ ہے کہ مردے کو اپنے تمام اعضاء کیساتھ دفن کیا جائے ،لہذا مردے کے زیر ناف بال، ناخن وغیرہ اگر چہ لمبے ہوں کاٹنا جائز نہیں ہے۔

لما فی المبسوط لسرخسی: ۵۹/۲، باب غسل الميت ،طبع دار المعرفة بيروت

ثم يغسل رأسه ولحيته بالخطمی ولا يسرح لان ذالك يفعله الحی للزينة وقد انقطع عنه ذالك بالموت ولو فعل ربما يتناثر شعره والسنة دفنه علی ما مات عليه ولهذا لا تقص اظفاره ولا شاربه ولا ينتف ابطه ولا تحلق عانته ورأت عائشة رضی الله عنها قوما يسرحون ميتا فقالت علام تنصون ميتكم. كذا فی الهندية: ۱۵۸/۱ طبع رشيدية

ولما فی البدائع: ۳۰۱/۱ طبع سعید

والسنة أن يدفن الميت بجميع اجزاءه ولهذا لا تقص اظفاره وشاربه ولحيته ،ولا يختن ولا ينتف ابطه ،ولا تحلق عانته ،لان ذالك يفعل لحق الزينة والميت ليس بمحل الزينة ،ولهذا لا يزال عنه شیئ مما ذكرنا ،وان كان فيه حصول زينة ،وهذا عندنا وعند

الشافعی یسرح ویزال عنه شعر العانة والابط اذا کانا طویلین وشعر الرأس یزال ان کان یتزین بازالته الشعر ولا یحلق فی حق من کان لا یحلق فی حال الحیاة وکان یتزین بالشعر واحتج الشافعی بما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال: "اصنعوا بموتاکم ما تصنعون بعرائسکم" ثم هذه الاشیاء تصنع بالعروس فکذا بالمیت ولنا بما روینا عن عائشة رضی الله عنها وذکرنا من المعقول وبه تبین ان ما رواه ینصرف الی زینة لیس فیها ازالة شئی من اجزاء المیت کالطیب والتنظیف من الدرن ونحو ذالک بدلیل ما روینا.

ولما فی التنویر مع الدر: ۱۹۷/۲، ۱۹۸ طبع سعید

ولا یسرح شعره ای یکره تحریما ولا یقص ظفره الا المکسور ولا شعره ولا یختن.

وفی الشامیة تحت (قوله ای یکره تحریما) لما فی القنیة من ان التزیین بعد موتها والامتشاط وقطع الشعر لا یجوز، نهر، فلو قطع ظفره او شعره ادرج معه فی الکفن.

والله اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۳۷۴۹ ۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ

## ﴿میت کو غسل دینے کی فضیلت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میت کو غسل دینے کے بارے میں حدیث پاک میں کوئی فضیلت بیان کی گئی ہو تو براہ کرم وضاحت کردیں۔

﴿جواب﴾ میت کو غسل اور کفن دینا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، احادیث مبارکہ میں اس کے بے شمار فضائل بیان ہوئے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا اے علی! مردوں کو غسل دیا کریں اس لیے کہ جو شخص مردوں کو غسل دیتا ہے اس کی ستر مغفرتیں کردی جاتی ہیں اگر ان میں سے ایک مغفرت کو تمام مخلوق پر تقسیم کردیا جائے تو وہ مغفرت ان سب کے لیئے کافی ہوجائے۔

لما فی المراقی مع حاشیة الطحطاوی: (ص ۵۷۹، طبع قدیمی)

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یا علی غسل الموتی فانه من غسل میتا غفرله سبعون مغفرة لو قسمت مغفرة منها علی جمیع الخلائق لوسعتهم الخ رواه البیهقی فی المعرفة والحاکم فی المستدرک بحواله طحطاوی.

ولما فی الترغیب والترهیب: (۲۲۲/۴، مکتبه حقانیه)

عن ابی رافع قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من غسل میتا فکتم علیه غفرالله

له اربعين كبيرة ومن حفر لا خيه قبراحتى يجنه فكا نما اسكنه مسكنا حتى يبعث
ولمااليه ايضا:(۲۲۳/۲)

ورواه الطبراني في الاوسط من حديث جابر و سنده الخليل بن مره و لفظه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من حفر قبرا بنى الله له بيتا في الجنة ومن غسل ميتا خرج من ذنوبه كيوم ولدته امه ومن كفن ميتا كساه الله من حلل الجنة ومن عزى حزينا البسه الله التقوى وصلى على روحه في الارواح ومن عزى مصابا كساه الله حلتين من حلل الجنة لاتقوم لهما الدنيا ومن اتبع جنازة حتى يقضى دفنها كتب الله له ثلاثة قراريط القيراط منها اعظم من جبل احد الخ.

الجواب صحيح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۱۰

## ﴿فضائل غسل میت اور اجرت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ شریعت نے غسل وکفن دینے کا کیا اجروثواب بیان کیا ہے مکمل وضاحت فرمائیں؟ (۲) ہمارے علاقہ میں ایک خاتون مردوں کو غسل دیتی ہے اور غسل وکفن کی اجرت بھی لیتی ہے اس کا اجرت لینا درست ہے؟ جب اجرت لی تو اسکو اجروثواب جو کہ غسل وکفن پر ملتا ہے وہ ملے گا یا نہیں؟ (۳) غسل وکفن دینا خود زیادہ افضل ہے یا پھر اجرت دے کر زیادہ افضل ہے؟ مستفتی: جناب محبوب علی کراچی

﴿جواب﴾ میت کو غسل وکفن دینا اس کا واجب علی الکفایہ حق ہے، قریب کے تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کا یہ حق ادا کریں، البتہ کوئی ایک بھی یہ ذمہ داری پوری کر لے تو تمام سبکدوش ہو جاتے ہیں، اور ادا نہ کرنے کی صورت میں تمام قریب کے مسلمان گنہگار ہوں گے، میت کو غسل اور کفنانے دفنانے کے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث کا مفہوم ہے: جس نے کسی میت کو غسل دیا اور دوران غسل جو عیب اس پر ظاہر ہوئے انکو پوشیدہ رکھا تو اللہ تعالیٰ اسکے چالیس بڑے گناہ معاف کرتے ہیں، اور جس نے اپنے بھائی کے لیے قبر کھودی یہاں تک کہ اسکو اس میں چھپایا پس اس نے اس شخص کو دوبارہ اٹھنے تک ٹھہرنے کی جگہ دی۔ دوسری حدیث کا مفہوم ہے جس نے کسی کی قبر بنائی اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے گھر بنائیں گے اور جس نے میت کو غسل دیا وہ گناہوں سے ایسا پاک کر دیا جاتا ہے

جیسے کہ آج اسکی ماں نے اس کو جنا ہو اور فرمایا کہ جس نے کسی میت کو کفن دیا اللہ تعالیٰ اسکو جنت کے لباس میں سے لباس پہنائیں گے اور جس نے کسی غم زدہ کی تعزیت کی اللہ پاک اسکو تقویٰ کا لباس پہنائیں گے اور اسکی روح پر رحمت بھیجیں گے اور جس نے مصیبت زدہ کی دستگیری کی اسکو جنت کے لباس میں سے دو جوڑے پہنائیں گے جنکی نظیر دنیا میں نہیں، اور جو جنازے کے ساتھ گیا تدفین کے عمل مکمل ہونے تک اس کے ساتھ رہا، اسکو تین قیراط عطا فرمائیں گے جو کہ ہر ایک قیراط احد پہاڑ سے بڑا ہوگا اور جس نے کسی یتیم کی کفالت کی یا اس کے لئے توشہ کا انتظام کیا اللہ اسکو اپنے سائے میں جگہ دیں گے اور جنت میں داخل فرمائیں گے۔

لما فی الترغیب والترھیب:(۲/۲۲۲،مکتبہ حقانیہ)

عن ابی رافعؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من غسل میتا فکتم علیہ غفر اللہ لہ اربعین کبیرۃ ومن حفر لا خیہ قبرا حتی یجنہ فکا نما اسکنہ مسکنا حتی یبعث.

ولما فیہ ایضا:(۲/۲۲۳)

ورواہ الطبرانی فی الاوسط من حدیث جابر وفی سندہ الخلیل بن مرہ و لفظہ قال رسول اللہ ﷺ من حفر قبرا بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ ومن غسل میتا خرج من ذنوبہ کیوم ولدتہ امہ ومن کفن میتا کساہ اللہ من حلل الجنۃ ومن عزی حزینا البسہ اللہ التقوی وصلی علی روحہ فی الارواح ومن عزی مصابا کساہ اللہ حلتین من حلل الجنۃ لا تقوم لھما الدنیا و من اتبع جنازۃ حتی یقضی دفنھا کتب اللہ لہ ثلاثۃ قراریط القیراط منھا اعظم من جبل احد ومن کفل یتیما او ارملۃ اظلہ اللہ فی ظلہ وادخلہ الجنۃ.

(۲) اس عورت کے علاوہ بھی غسل دینے والے موجود ہوں تو اس عورت کے لیے اجرت لینا جائز ہے لیکن اجرت لیکر غسل دیگی تو ثواب نہیں ملیگا (۳) میت کا ولی میت کو خود غسل دے یہ زیادہ افضل ہے مرد کو مرد غسل دے عورت کو عورت غسل دے۔

لما فی تنویر الابصار و شرحہ:(۲/۱۹۹،طبع سعید)

(والافضل ان یغسل) المیت (مجانا فان ابتغی الغاسل الاجر جاز. ولا یجوز الاستئجار علی غسل المیت و یجوز علی الحمل والدفن واجازہ بعضھم فی الغسل.

ولما فی التقریر الرافعی:(۲/۱۱۸ طبع سعید)

(فیہ ان اخذ الاجرۃ علی الطاعۃ لا یجوز الخ) الذی یظھر ان کلام المصنف مبنی علی ما قالہ المتاخرون من جواز اخذ الاجرۃ علی القرب عند الضرورۃ الا ان ھذا عند عدم التعین فانھا اذا تعینت صارت فرضا عینیا علیہ کا ذلہ الصوات وعلی ھذا یکون قولھم بالجواز مقیدا بعدم التعین تامل و کلا مھم عام فی مواضع الضرورۃ شامل لما ھنا

ولما فی فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة:(۲۹/۵،طبع رشیدیه)

استاجر لحفر القبر او لحمل الجنازه او لغسل المیت ان لم یکن غیرهم یباشر هذا الامر لا تجوز الاجارة وان کان غیرهم یباشره ایضا یجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۲۶ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۶۹

## ﴿بعد الوفات بیوی کا چہرہ دیکھنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ جب کسی کی بیوی کا انتقال ہوتا ہے تو شوہر کو نہ اس کا چہرہ دکھاتے ہیں نہ چارپائی اٹھانے دیتے ہیں، نہ قبر میں رکھنے دیتے ہیں، نیز یہ کہتے ہیں کہ بیوی کے انتقال کے بعد نکاح بالکل ختم ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں، اس سلسلے میں شرعی حکم کیا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: سرتاج عالم

﴿جواب﴾ بیوی کے انتقال سے زوجین کا نکاح ختم ہو جاتا ہے، تاہم شریعت نے خاوند کے لئے اپنی مرحومہ بیوی کا چہرہ دیکھنے کی گنجائش رکھی ہے، البتہ اب اس کا چھونا جائز نہیں ہوگا، نیز اگر بیوی کے محرم رشتہ دار موجود ہوں تو شوہر کے لئے بیوی کو قبر میں اتارنا (اس طریقے پر کہ اس کو ہاتھ لگے) بھی جائز نہیں ہے، رہا اس کی چارپائی کو کندھا دینا اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، لہٰذا شوہر کو اس سے روکنا، یا ایسا کرنے پر اسے ملامت کرنا درست نہیں ہے، عام لوگوں کے کندھا دینے کو برا نہیں سمجھا جاتا جبکہ شوہر جو زندگی بھر ساتھ رہے اس کے کندھا دینے کو برا سمجھنا جہالت ہے۔

لما فی تنویر الابصار:(۱۹۸/۲،طبع سعید)

ویمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الاصح)منیه وفی الشامیة بخلاف ما اذا ماتت لا یغسلها لانتهاء ملک النکاح لعدم المحل فصار اجنبیا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین

۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۵

## ﴿وفات کے بعد شوہر کا اپنی بیوی کو چھونا اور غسل دینا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے متعلق کہ کیا زوجہ کی وفات پر شوہر اس

کو چھو سکتا ہے غسل دے سکتا ہے؟ جبکہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کو غسل دیا تھا۔

﴿جواب﴾ وفات کے بعد شوہر بیوی کو چھو سکتا ہے اور نہ ہی غسل دے سکتا ہے، البتہ دیکھنے کی اجازت ہے۔

لمافی الدر المختار:(۱۹۸/۲،طبع سعید)

ویمنع زوجها من غلسها و مسها لا من النظر الیها علی الاصح۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ام ایمنؓ نے غسل دیا تھا جس نے ان کی پرورش کی تھی غسل کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غسل کا سامان مہیا کیا تھا اور اس کا انتظام کیا تھا، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غسل دینے کا واقعہ اگر روایات صحیحہ سے ثابت بھی ہو جائے تو یہ ان کی خصوصیت ہوگی کسی اور کے لئے جائز نہ ہوگا۔

ولمافی الشامیة:(۱۹۸/۲،طبع سعید)

(قلنا) قال فی شرح المجمع لمصنفه فاطمه رضی الله عنها غسلتها أم أیمن — حاضنة رسول الله صلی الله علیه وسلم "فتحمل روایة الغسل لعلی رضی الله عنه علی معنی التهیئة والقیام التام بأسبابه ولئن ثبتت الراویة فهو مختص به، ألاتری أن ابن مسعود رضی الله عنه لما اعترض علیه بذالک أجابه بقوله: أما علمت أن رسول الله صلی الله علیه ال:ان فاطمة زوجتک فی الدنیا والآخرة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۰

## ﴿احد الزوجین کا بعد وفات ایک دوسرے کو دیکھنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ بیوی کے مرنے کے بعد کیا شوہر اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں اور اپنی بیوی کو چھو سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا بیوی شوہر کا چہرہ دیکھ سکتی ہے اور چھو سکتی ہے جبکہ ہمارے علاقے میں شوہر کو بیوی کا چہرہ دیکھنا اور بیوی کو شوہر کا چہرہ دیکھنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے؟ مستفتی: گل نواز

﴿جواب﴾ بیوی کے مرنے کے بعد شوہر بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے لیکن اس کو چھو نہیں سکتا ہاں بیوی اپنے شوہر کو چھو سکتی ہے اور چہرہ بھی دیکھ سکتی ہے۔

لمافی الدر المختار:(۱۹۸/۲،طبع سعید)

ویمنع زوجہا من غسلہا و مسہا لامن النظر الیہا علی الأصح وھی لاتمنع من ذالک.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:صلاح الدین چترالی

۲۱ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتوی نمبر:۶۰

## ﴿میت کوایک غسل دینا کافی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں میت کودومرتبہ غسل دیتے ہیں،ایک مرتبہ مرنے کے فوراً بعد صفائی کی غرض سے اوردوسری مرتبہ اصل غسل جو میت کودیا جاتا ہے،پوچھنا یہ ہے کہ پہلا غسل کافی ہے؟یادوبارہ غسل دیناضروری ہے؟

﴿جواب﴾ شریعت میں میت کوایک مرتبہ غسل دینا مکلفین پر فرض کفایہ ہے،دوسری مرتبہ غسل دینے کی ضرورت نہیں ہے،بلکہ پہلی مرتبہ مکمل غسل دینا چاہیئے اگر صفائی کیلئے ہوتو اسمیں فرض غسل کی نیت بھی کرنی چاہیئے نیت نہ کریں تب بھی اس غسل سے فرضیت ساقط ہو جائیگی،لیکن نیت نہ کرنے کی وجہ سے ثواب نہیں ملیگا۔

آپ کے علاقے میں دومرتبہ غسل کا جورواج ہے اگراسکولازم وکارثواب سمجھاجاتا ہے تواسکوچھوڑناضروری ہے کیونکہ یہ بدعت ہے،اگرلازم وکارثواب نہیں سمجھا جاتا ہے تواگرکسی عذرکے بناء پر یاویسے ہی دومرتبہ غسل دیاجائے توکوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی الخانیة علی الھندیة:(۱۸۷/۱،رشیدیہ)

میت غسلہ اھلہ من غیر نیة الغسل اجزاھم ذلک.

ولما فی حلبی کبیر:(ص۵۸۰،طبع سہیل اکیڈمی)

ولیس فیما ذکرما یفیداشتراط النیة لاسقاط الوجوب بل یفیدان الفرض وجود فعل الغسل لہ منّا حتی لو غسل لاجل تعلیم الغیر یسقط الوجوب ویکون اداء لحقہ.

ولما فی الشامیة:(۲۰۰/۲،طبع سعید)

انہ لابد فی اسقاط الفرض من الفعل واما النیة فشرط الثواب ولذا صح تغسیل الذمیة زوجھا المسلم مع ان النیة شرطھا الاسلام فیسقط الفرض عنا بفعلنابدون نیة وھو المتبادر من قول الخانیة اجزاھم ذلک.

ولمافی منحة الخالق علی البحرالرائق:(۱۷۳/۲،طبع سعید)

فالحاصل انہ لابد فی اسقاط الواجب من الفعل واما النیة فشرط لتحصیل

الثواب — لظہران ما استظہرہ فی الفتح غیر ظاہر بل الظاہر ما جزم بہ فی الخانیۃ واختارہ فی الغایۃ والاسبیجابی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۶۳

## ﴿میت کو کس پانی سے غسل دینا افضل ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ میت کو عام پانی سے غسل دیا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا صحیح ہے یا گرم پانی سے غسل دینا مسنون ہے؟

﴿جواب﴾ عام پانی سے غسل دینا جائز ہے تاہم نیم گرم پانی سے غسل دینا زیادہ افضل ہے کیونکہ گرم پانی سے صفائی خوب حاصل ہوتی ہے۔

ولما فی العالمگیریۃ: (۱/۱۵۸، طبع رشیدیہ) والغسل بالماء الحار افضل عندنا کذا فی المحیط.

ولما فی الشامیۃ: (۲/۱۹۶، طبع سعید)

(والا فماء خالص مغلی) ای اغلاء وسط لان المیت یتاذی بما یتاذی بہ الحی وافاد کلامہ ان الحار افضل سواء کان علیہ وسخ اولا نہر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سعید احمد

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۴۷

## ﴿میت کو غسل دیتے وقت آہستہ آواز سے ذکر کرنا مستحسن ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو غسل دیتے وقت کوئی دعاء وغیرہ پڑھنا جائز ہے یا؟ نہیں ہمارے ہاں بعض لوگ میت کو غسل دیتے وقت معمولی آواز سے کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں شریعت میں اسکی کیا حیثیت ہے۔ مستفتیہ: حلمہ یوسفیہ بنوریہ

﴿جواب﴾ احادیث میں آیا ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت "غفرانک یا رحمٰن" پڑھتے رہنا چاہیئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آہستہ آہستہ انفرادی طور پر، دعاء وذکر، کا اہتمام کرنا مستحسن ہے، بہتر ہے کہ مذکورہ دعاء کا ورد جاری رکھے تاہم اگر کوئی کلمہ طیبہ پڑھے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن خاص کلمہ طیبہ کو سنت سمجھ کر پڑھنا غلط ہے۔

لمافی المراقی مع الطحطاوی:(ص ۶۲۹،طبع قدیمی)

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یا علی غسل الموتی فانه من غسل میتا غفرله سبعون مغفرة لو قسمت مغفرة منها علی جمیع الخلائق لوسعتهم قلت ما یقول من یغسل قال یقول غفرانک یا رحمن حتی یفرغ من الغسل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ سبحانہ اعلم:افتخاراحمدکلکتی

۲۹ذی الحجہ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۸۰۳

## ﴿پانی کی عدم موجودگی میں میت کی تجہیز وتکفین کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانی کی عدم موجودگی میں میت کو تیمم کرایا جائے گا یا بغیر غسل کے دفنایا جائے گا؟　　　　مستفتی:عرباض شمس اورنگی ٹاؤن

﴿جواب﴾ پانی کی عدم موجودگی میں میت کو تیمم کرا کے نماز جنازہ پڑھنے کے بعد دفنادیا جائے گا۔

لمافی التنویر وشرحہ:(۲/۲۰۱،طبع سعید)

یمم لفقد ماء وصلی علیه ثم وجدوه غسلوه وصلوا ثانیاوقیل لا.(قوله یمم لفقد ماء)قال فی الفتح ولولم یوجد ماء فیمم المیت وصلوا علیه ثم وجدوه غسلوه وصلوا علیه ثانیا عند ابی یوسفؒ وعنه یغسل ولاتعاد الصلاة علیه.

لما فی البدائع:(۱/۳۰۴،طبع سعید)

ومنها وجود الماء لان وجود الفعل مقید بالوسع ولاوسع مع عدم الماء فسقط الغسل ولکن یمم بالصعید لان التیمم صلح بدلا عن الغسل فی حال الحیاة فکذا بعد الموت.

ولمافی الهندیة:(۱/۱۶۰،طبع رشیدیه)

رجل مات ولم یجدوا ماء فیمموه وصلوا علیه ثم وجدوا ماء غسل ویصلی علیه ثانیافی قول ابی یوسفؒ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:احمد حسن عفرلہ

۲۰ربیع الثانی۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۳۲۸

## ﴿میت کے آدھے جسم یا اس سے کم کے غسل کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زلزلہ میں چھت کے نیچے آنے والے شخص کی نعش مل گئی جس کے جسم کا آدھا حصہ ضائع ہوگیا تھا اب پوچھنا یہ ہے کہ ایسی نعش کے غسل اور نماز جنازہ کا کیا حکم ہے ؟　　　　مستفتی:زین العابدین

﴿جواب﴾ میت کے بدن کا اکثر حصہ یا آدھے حصہ سے کم،سر سمیت ملا تو اس کو غسل دینا

ہوگا اور جنازہ بھی ادا کیا جائے گا اور اگر بغیر سر کے آدھا حصہ ملا یا صرف ہاتھ پیر وغیرہ ہے تو اس حصہ کو باقاعدہ غسل دینے کی ضرورت نہیں ہوگی البتہ کپڑے میں لپیٹ کر دفنانا ضروری ہے۔

لما فی التنویر وشرحہ:(۱۹۹/۲،طبع سعید)

وجد رأس آدمی او احدشقیه لایغسل ولایصلی علیه بل یدفن الاان یوجد اکثرمن نصفه ولو بلا رأس.وفی الشامیة:ولو بلا رأس وکذا یغسل لووجد النصف مع الرأس.

ولما فی حلبی کبیر:(ص۵۹۰،طبع سہیل اکیڈمی)

کان فی حکم الکل بأن وجد اکثره او النصف ومعه الرأس اذ للاکثرحکم الکل وکذا النصف مع الرأس لا شتمالہ علی اکثر الا عضاء الرئیسة بخلاف مالووجد نصفه مشتوقاطولافانه لایصلی علیه لئلا یؤدی الی تکرار الصلوة علی میت واحد فانه غیرمشروع.

لما فی الهندیة:(۱۵۹/۱،طبع رشیدیه)

ولو وجد اکثر البدن او نصفه مع الرأس یغسل ویکفن ویصلی علیه کذا فی المضمرات واذاصلی علی الأکثرلم یصلی علی الباقی اذا وجد کذا فی الایضاح وان وجد نصفه من غیر الرأس اووجد نصفه مشتوقا طولا فانه لایغسل ولایصلی علیه ویلف فی خرقة ویدفن فیها کذا فی المضمرات.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۲۲۳

## ﴿ہیجڑے کو غسل کون دے؟﴾

﴿سوال﴾ما ذا یقول العلماء الکرام فی غسل الخنثی بعدالموت سمعنا یشتری له الجاریة ثم یباع وقد انتفت العبدیة فی هذا الزمن ؟

﴿جواب﴾ان کان الخنثی فی حکم الرجال یغسله الرجال و ان کان فی حکم النساء تغسله النساء وان کان الخنثی المشکل یتیمم بالصعید ثم ان کان المیمم غیرذی رحم محرم منه یممه بالخرقة ویعرض وجهه عن ذراعیه وشراء الجاریة انما تکون للختان لا للغسل.

لما فی الهدایة:(۶۷۸/۲،طبع رحمانیه)

وان مات قبل ان یستبین امره لم یغسله رجل ولا امراة لان حل الغسل غیر ثابت بین الرجال والنساء فیتوقی لاحتمال الحرمة ویتیمم بالصعید لتعذر الغسل.

ولمافی العنایۃ علی فتح القدیر:(۹/۲۲۳،طبع رشیدیہ)

(قوله لان حل الغسل غير ثابت بين الرجال والنساء) ای غسل الرجل المراة وعکسه غير ثابت فی الشرع فان النظر الی العورة حرام والحرمة لم تنكشف بالموت الا ان نظر الجنس الی الجنس اخف فلاجل الضرورة أبيح نظر الجنس عند الغسل و المراهق كالبالغ فی وجوب ستر عورته فان كان مشكلا لم يعرف له جنس فتعذر غسله فصار بمنزلة من تعذر غسله لعدم مايغسل فيمم بالصعيد وهو نظير امراة ماتت بين الرجال وعكسه فانه يمم بالصعيد مع الخرقة ان يمم الاجنبی وبغيرها ان كان ذا رحم محرم من الميت وينظر الی وجهه ويعرض وجهه عن ذراعيه لجواز ان يكون امرأة ولا يشتری جارية للغسل كما كان يفعل للختان لانه بعد الموت لا يقبل المالكية فالشراء غير مفيد بخلاف الشراء للختان فانه فی حال الحياة وله اهلية المالكية فيها.

ولمافی الدر المختار:(۲/۷۲۹،طبع سعید)

(ولو مات قبل ظهور حاله لم يغسل وييمم بالصعيد) لتعذر الغسل (وقال الشامیؒ تحت هذه العبارة) وييمم ای بخرقة ان يممه ذورحم محرم منه ويعرض الاجنبی......ولا يشتری جارية للغسل كما كان يفعل للختان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: معراج الدین غفرلہ

۲۴ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۲۷۳

## ﴿تجہیز وتکفین میں تأخیر کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے علاقے کے بعض لوگ کام کیلئے انگلینڈ، امریکہ وغیرہ جاتے ہیں انکا کوئی عزیز فوت ہوجائے تو گاؤں میں جنازہ پڑھ کر میت سرد خانے میں رکھ دی جاتی ہے انکے اصرار پر بعض اوقات میت تین تین دن سرد خانے میں پڑی رہتی ہے تو کیا انکے اصرار پر اتنی دیر میت کو رکھنا جائز ہے؟ اور انہیں اصرار کرنا چاہیئے کہ نہیں؟

﴿جواب﴾ میت کو دفنانے میں جلدی کرنے کی صراحت احادیث میں آئی ہے اسلئے بلاوجہ تأخیر کرنا مکروہ ہے، البتہ معقول عذر کی صورت میں بقدر ضرورت تأخیر کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ میت خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

لما فی سنن ابوداؤد:(۲/۹۷،طبع رحمانیہ)

عن الحصين بن دحوح أن طلحة بن البراء مرض فأتاه النبی صلی الله عليه وسلم يعوده فقال انی لا أری طلحة الا قد حدث فيه الموت فاذنونی به وعجلوا فانه لا ينبغی لجيفة مسلم ان تحبس بين ظهرانی أهله.

ولمافی حاشیة الطحطاوی :(ص ۵۶۵-۵۶۶ طبع قدیمی)

واذا تیقن موته یعجل بتجهیزه اکراما له لمافی الحدیث وعجلوا به فانه لا ینبغی لجیفة مسلم أن تحبس بین ظهرانی اهله.

ولمافی الشامیة:(۲/۲۳۲ طبع سعید)

(وكره تاخير صلاته ودفنه ليصلى عليه جمع عظيم بعد صلوة الجمعة)والافضل أن يعجل بتجهيزه كله من حين يموت بحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفی عنہ

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۶۷

## ﴿میت کو عمامہ پہنانا مکروہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت (مرد) کو کفن پہناتے وقت ایک کپڑا بطور عمامہ سر پر باندھا جاتا ہے، شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ مرد میت کے کفن میں عمامہ شامل ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ میت کو عمامہ پہنانا مکروہ ہے۔

لمافی الدر المختار (۲/۲۰۲) طبع سعید

(وتكره العمامة) للميت (في الأصح) مجتبى واستحسنها المتأخرون للعلماء والأشراف ولا بأس بالزيادة على الثلاثة .قال ابن عابدين:(قوله الأصح) هو أحد تصحيحين .قال القهستاني :واستحسن على الصحيح العمامة يعمم يمينا ويذنب ويلف ذنبه على كورة من قبل يمينه ،وقيل :يذنب على وجهه كمافي التمرتاشي ،وقيل :هذا اذا كان من الأشراف ،وقيل :هذا اذا لم يكن في الورثة صغار ،وقيل :لا يعمم بكل حال كذا في المحيط ،والأصح أنه تكره العمامة كما في الزاهدي .

ولما في البحر (ج ۲/ص ۱۸۵) سعید

ولم يذكر المصنف العمامة لما في المجتبى وتكره العمامة في الأصح .

ولمافی الکفایة (ج ۲/ص ۳۴) رشیدیه

وفي المبسوط ولم يذكر العمامة في الكفن ،وقد كره بعض مشائخنا لأنه لو فعل كان الكفن شفعاً والسنة فيه ان يكون وتراً ،واستحسنه بعض مشائخنا لحديث ابن عمر أنه كان يعمم الميت .....

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ ہنگرامی

۳۰ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۰۵

## ﴿نامعلوم میت کی تکفین ونماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے متعلق کہ اگر کسی علاقے میں کسی اجنبی شخص کی لاش ملے اور اس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ مسلمان ہے یا کافر تو شرعاً اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اسی طرح اگر علاقہ مشترک ہو مسلمان اور کفار دونوں رہتے ہوں اور یہ صورتحال پیش آجائے تو کیا حکم ہے؟

مستفتی: محمد عمار مانسہروی

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں غالب گمان کا اعتبار ہے علامات یا حالات سے کسی طرح مسلمان ہونا اگر معلوم نہ ہو اور علاقہ مسلمانوں کا ہے تو مسلمان سمجھ کر کفن وغسل دینا ضروری ہے اور نماز جنازہ پڑھنا بھی واجب ہے اور اگر علاقہ مشترک ہو مسلمان اور کفار دونوں طرح کے لوگ آباد ہوں اور علامات وغیرہ سے کچھ پتہ نہ چلے تو اس صورت میں غسل دینے کی گنجائش ہے لیکن نماز جنازہ کے بغیر دفنانا چاہیے اس لئے کہ احتمال ہے کہ میت کافر کی ہو اور کافر کی نماز جنازہ پڑھنے سے قرآن مجید میں واضح ممانعت کا حکم موجود ہے۔

لما فی القرآن الحکیم پارہ ۱۰/آیت نمبر ۸۴ سورہ التوبہ)

ولا تصل علیٰ احد منهم مات ابدا ولا تقم علیٰ قبره.......الخ

ولما فی در المختار ۲/۲۰۰ مکتبہ سعید)

لو لم یدر أمسلم أم کافر ولا علامة فان فی دارنا غسل وصلی علیه والا لا .اختلط موتانا بکفار ولا علامة اعتبر الأکثر فان استووا غسلوا واختلف فی الصلوٰة علیهم وعلی دفنهم

ولمافی رد المحتار ۲/۲۰۰ مکتبہ سعید )

(قوله فان فی دارنا الخ) افاد بذکر التفصیل فی المکان بعد انتفاء العلامة ان العلامة مقدمة وعند فقدها یعتبر المکان فی الصحیح لانه یحصل به غلبة الظن کما فی النهر من البدائع .وفیها ان علامة المسلمین آربعة الختان والخضاب ولبس السواد وحلق العانة

(قوله واختلف فی الصلوة علیهم) فقیل لا یصلیٰ لان ترك الصلوة علی المسلم مشروع فی الجملة کالبغاة وقطاع الطریق فکان اولیٰ من الصلوة علیٰ الکافر لانها غیر مشروعة لقوله تعالیٰ ولا تصل علیٰ احد منهم مات ابدا

ولما فی الفتاوی الولوالجیة ۱/۱۶۳ مکتبہ فاروقی پشاور)

ومن وجد علیه علامة المسلمین صلی علیه ومن وجد علیه علامة الکفار لم یصل علیه وعلامة المسلمین الختان والخضاب بالحناء ولبس السواد وعلامة التکفیر الزنار وعدم الختان .وبعد اسطر فان کانت الغلبة للمسلمین صلی علیهم وینوی بها

المسلمين وان كانت الغلبة للمشركين لم يصل عليهم لان العبرة للغالب فيما تعذر الوصول الى معرفته باليقين وان استوى الفريقان لم يصل عليهم لانه اجتمع عليهم ما يوجب الصلوة وما يوجب الترك لكنه ترجح الترك لان ترك الصلوة على المسلم يباح بحال فانه لايصلى على الباغي وهو مسلم والصلوة على الكافر لا تباح بحال فكان الميل الى ما يباح اولى.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکئی غفرلہ ولوالدیہ

یکم صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۱۸

## ﴿فصل فی الصلوة علی المیت واحکامها﴾

## ﴿میت پر نماز اور اس سے متعلق احکام﴾

### ﴿نمازِ جنازہ میں چاروں تکبیرات کے بعد ہاتھ چھوڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں ہاتھ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے چھوڑ دیئے جائیں یا بعد میں؟ جبکہ ایک مولانا صاحب فرماتے ہے کہ چاروں تکبیرات مکمل ہونے پر ہاتھ چھوڑ دینے چاہیئے۔ مستفتی: کریم بخش

﴿جواب﴾ چاروں تکبیرات مکمل ہونے پر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہیئے اور آخر تک باندھنے میں بھی کوئی حرج نہیں، نیز مولانا صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی تنویر الأبصار:(۱/ ۴۸۷،طبع سعيد)

هو سنة قيام له قرار فيه ذكر مسنون فيضع حالة الثناء وفي القنوت وتكبيرات الجنازة.

ولمافي الهندية:(۱/ ۷۳،طبع رشيديه)

كل قيام فيه ذكر مسنون فالسنة فيه الاعتماد كما في حالة الثناء والقنوت وصلاة الجنازة وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كما في تكبيرات العيدين فالسنة فيه الارسال كذا في النهاية وهو الصحيح كذا في الهداية وبه كان يفتى شمس الأئمة السرخسي والصدر الكبير برهان الأئمة والصدر الشهيد حسام الدين كذا في المحيط.

ولمافي السعاية في كشف ما في شرح الوقاية:(۱-۲/ ۱۵۹،طبع سهيل اكيڈمی)

ومن ههنا يخرج الجواب عما سئلت في ستة وثمانين أيضا من أنه هل يضع مصلي الجنازة بعد التكبير الأخير من تكبيراته ثم يسلم أم يرسل ثم يسلم وهو أنه ليس بعد التكبير الأخير ذكر مسنون فيسن فيه الارسال.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۳۰

﴿نماز جنازہ میں امام سے تکبیر چھوٹ جائے تو نماز نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں امام سے اگر کوئی تکبیر چھوٹ جائے مثلاً دو یا تین تکبیروں کے بعد سلام پھیر دیا تو نماز جنازہ ہوگئی یا نہیں؟ اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ مستفتی: اویس سی راولپنڈی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ چاروں تکبیریں نماز جنازہ کا رکن ہیں، اگر ایک بھی تکبیر چھوڑ دی، تو جنازہ نہیں ہوگا غلطی سے کوئی تکبیر چھوٹ جائے تو سلام کے بعد چھوٹی ہوئی تکبیر کہہ کر دوبارہ سلام پھیریں، اگر چھوٹی ہوئی تکبیر نہیں کہی تو رکن رہ جانے کیوجہ سے نماز جنازہ نہیں ہوگی امام ایسی غلطی کرے، تو اعادہ ضروری ہے اور کوئی مقتدی ایسی غلطی کرے تو صرف اسکی نماز نہیں ہوئی۔

لمافی الدرمع الرد: (۲/۲۰۹، طبع سعید)

(ورکنها) شیئان (التکبیرات) الاربع، فالأولی رکن ایضا لا شرط فلذا لم یجز بناء أخری علیها والقیام فلم تجز قاعدا بلا عذر.

قال ابن عابدین تحته (قوله شیئان) أما فی القهستانی عن التحفة من زیادة المحاذاة الی جزء من المیت فالذی یظهر کونه شرطا لا رکنا کما قدمناه. (فلذا الخ) ای لکونها رکنا لا شرطا لأنه لو نواها للأخری ایضا یصیر مکبرا ثلاثا وانه لا یجوز بحر عن المحیط.

ولمافی الهندیة: (۱/۱۶۴، الفصل الخامس فی الصلوٰة علی المیت، طبع رشیدیه)

وصلوٰة الجنازة اربع تکبیرات ولو ترك واحدة منها لم تجز صلاته هکذا فی الکافی.

ولمافی حاشیة الطحطاوی علی الدر: (۱/۳۷۴، طبع رشیدیه)

(تنبیهان) الأول فی الفوائد التاجیة: اذا سلم علی ظن أنه أتم التکبیر ثم علم أنه لم یتم فانه یبنی لأنه سلّم فی محله وهو القیام فیکون معذورا.

ولمافی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح: (ص ۵۸۷، طبع قدیمی)

ولو سلّم الامام بعد الثلاثة ناسیا کبّر الرابعه وسلّم قوله سجود السهو ویحتمل أن الضمیر راجع الی المأموم، وهو بعید لأن الامام اذا اقتصر علی ثلاثة فسدت فیما یظهر، واذا فسدت علی الامام فسدت علی المأموم لترك رکن من ارکانها.

ولما فی التاتارخانیة: (۲/۱۲۱، طبع قدیمی)

ولو سلّم بعد الثلاثة ناسیا کبّر الرابعه ویسلّم.

واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان کھوڑہ راولپنڈی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۸۷۰

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ

## ﴿قبر کے سرہانے اذان دینا بدعت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو دفنانے کے بعد بعض لوگ قبر کے پاس اذان دیتے ہیں، کیا یہ طریقہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: رحمت زمان

﴿جواب﴾ مردہ کو دفنانے کے بعد قبر کے سرہانے صرف سورۃ بقرہ کے اول اور آخر کی آیات کی تلاوت مستحب ہے، لیکن دفنانے کے بعد قبر پر اذان دینا شریعت سے ثابت نہیں، لہذا اس اذان کو سنت سمجھ کر دینا بدعت ہے۔

لما في مشكوٰة المصابيح:(١/١٤٩،طبع سعيد)

وعن عبدالله بن عمرؓ قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلّم يقول اذامات أحدكم فلاتحبسو وأسرعوبه الى قبره وليقرء عندرأسه فاتحة البقرة وعند رجليه بخاتمة البقرة.

ولمافي الشامي:(١/٢٣٧،طبع سعيد)

كان النبي صلى الله عليه وسلّم اذافرغ من الميت وقف على قبره وقال استغفر والأخيكم واسألوالله له التثبيت فانه الآن يسأل وكان ابن عمرؓ يستحب أن يقرء على القبر بعدالدفن اول سورة البقرة وخاتمتها.

ولمافي الرد:(٢/٢٣٥،طبع سعيد)

(تنبيه)في الاقتصار على ماذكر من الوارداشارة الى أنه لايسنّ الأذان عند ادخال الميت في قبره كماهو المعتاد الآن،وقدصرح ابن حجرفي فتاويه بأنه بدعة،وقال:ومن ظنّ أنه سنة قياسا على ندبهاللمولودالحاقًالخاتمة لأمربابتدائه فلم يصب.

ولمافي منحة الخالق على البحرالرائق:(١/٢٥٦،طبع سعيد)

ورأيت في كتب الشافعية:أنه قديسنّ الأذان لغيرالصلوٰة كمافي اذان المولود والمهموم والمفزوع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان او بهيمة وعندمزدحم الجيش وعندالحريق قيل وعندانزال الميّت القبرقياسًاعلى اول خروجه للدنيا،لكن رده ابن حجرفي شرح العباب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد ملازئی

۲۲ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۰۰

## ﴿دعاء بعد صلاۃ الجنازۃ بدعت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دعاء بعد نماز جنازہ

فرض، واجب، سنت یا مستحب ہے؟ اور اگر کوئی شخص نماز جنازہ کے بعد دعاء نہ مانگے تو لوگ اس پر ناراض ہوتے ہیں اور طعن و تشنیع کرتے ہیں، تو براہ کرم مہربانی فرما کر درج ذیل امور کا دلائل کے ساتھ جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(۱) اس دعاء کا ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ہیں یا نہیں؟ (۲) اگر اس کا ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے نہیں تو کیا حضرات تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ اور فقہاء کرام رحمہم اللہ سے اسکا منع یا ثبوت مروی ہے؟ (۳) نیز قائلین حضرات جو حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء، اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ان سبقتمونی بالصلاۃ علیه فلا تسبقونی بالدعاء پیش کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب و محمل ہے؟ مستفتی: حافظ محمد فیاض متھرکھوہ

﴿جواب﴾ (۱-۲) نماز جنازہ کے بعد جو مروجہ دعاء مانگی جاتی ہے یعنی قبل از دفن ہیئت اجتماعیہ کے ساتھ نہ اسکا ثبوت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور نہ ہی چاروں خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ہے، اور نہ انکے بعد آنے والے حضرات تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ سے ہے، خیر القرون کے دور میں اس کا ثبوت نہ ہونا واضح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بدعت ہے، اور آپکے علاقہ میں اس دعاء میں شرکت نہ کرنے والے پر لوگ اگر ناراض ہوتے ہوں تو ایسے علاقہ میں اس کے خلاف کرنے کا حکم زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے، چنانچہ صاحب مرقاۃ ملا علی قاری حنفی مکی رحمہ اللہ تعالی اپنی کتاب مرقاۃ شرح مشکوۃ شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی تشریح کے ذیل میں فرماتے ہیں

(مرقاۃ: ۲/۲۶ طبع رشیدیہ)

قال الطیبی: وفیه أن من أصر علی أمر مندوب وجعله عزما ولم یعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشیطان من الاضلال فکیف من أصر علی بدعة أو منکر.

یعنی جو شخص مباح عمل کو واجب کا درجہ دے اور اس پر اصرار کرے تو بیشک شیطان نے اس کو گمراہ کر دیا ہے، مباح تو پھر مباح ہے اگر بدعت کو کوئی واجب کا درجہ دے تو اسکی گمراہی اور زیادہ واضح ہے، نیز فقہاء کرام کی عبارتوں میں اس دعا کی ممانعت کی خصوصیت کے ساتھ صراحت ہے۔

لمافی البحر:(۱۸۳/۲،طبع سعید)

وقید بقوله بعد الثالثة لانه لایدعو بعد التسلیم.

ولمافی خلاصة الفتاوٰی:(۲۲۵/۱،طبع رشیدیه)

ولایقوم بالدعاء فی قراءة القرآن لاجل المیت بعد صلاة الجنازة وقبلها.

ولمافی الفتاویٰ السراجیة:(ص۲۳،طبع سعید)

لیس فی صلوٰة الجنازة دعاء موقت اذا فرغ من الصلوٰة لایقوم بالدعاء.

ولمافی البزازیة:(۷۲/۱،طبع قدیمی)

لایقوم بالدعاء بعد صلوٰة الجنازة لانه دعامرة لان اکثرهادعاء.

ولمافی المرقاة:(۱۴۹/۲،طبع رشیدیه)

ولایدعو للمیت بعدصلاة الجنازة لانه یشبه الزیادة فی صلاة الجنازة.

فقہاء کرام کی ان عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعاء بعد الجنازۃ بدعت اور گمراہی ہے، جس سے اجتناب ضروری ہے۔

(۳) باقی قائلین حضرات جو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول پیش کرتے ہیں، جس کو شمس الأئمۃ علامۃ سرخسی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب المبسوط (۶۷/۲، دار المعرفۃ بیروت) میں ذکر فرمایا ہے:

ان سبقتمونی بالصلاة علیه فلاتسبقونی بالدعاء.

اگر دعاء سے دعاء بعد صلاۃ الجنازۃ مراد ہوتی تو فقہاء کرام اس سے قطعاً منع نہیں فرماتے، بلکہ خود بھی اسکا اہتمام فرماتے اور امت کو بھی اسکی تعلیم دیتے، لہٰذا اس سے دعاء بعد الدفن ہی مراد ہے جو کہ بلاشبہ سنت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ (أبوداؤد ۱۰۵/۲/ رحمانیہ میں ہے:

عن عثمان بن عفان رضی الله عنه قال کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیه فقال استغفروا لاخیکم واسألوا له بالتثبیت فانه الآن یسئل.

باقی قائلین حضرات جو حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں، تو اسمیں جو دعاء کا حکم ہے، اس سے مراد وہی دعا ہے جو نماز جنازہ کے اندر پڑھی جاتی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن ماجۃ نے اس پر باب باندھا ہے کہ اس سے دعا فی صلوۃ الجنازۃ مراد ہے یعنی وہ دعا جو تکبیروں کے درمیان پڑھی جاتی ہے، وہی اس حدیث سے مراد ہے، اسی طرح ملا علی قاری حنفی کی مرقاۃ شرح مشکوۃ شریف میں اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں: (مرقاۃ ۱۴۱/۴)

ويمكن أن يكون معناه اجعلوا الدعاء خالصاً له في القلب وان كان عاما في اللفظ...... وقال ابن حجر (عسقلاني رحمه الله) الدعاء للميت بخصوصه بعد التكبير الثالثة ركن.

ملا علی قاریؒ کی اس عبارت سے واضح طور پر معلوم ہورہا ہے کہ اس حدیث میں دعا سے مراد نماز جنازہ کے اندر تیسری تکبیر کے بعد جو دعا ہے، وہی مراد ہے، اور علامہ ابن حجرؒ نے تو تصریح فرما کر اس بات کو اور بھی واضح کردیا ہے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک خوشابی

۶ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۹۶۵

## ﴿مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنے کی ایک خاص صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ بعض مساجد کے قریب میں ایسی جگہ ہوتی ہے جس میں آسانی کیساتھ نماز جنازہ ادا کیجا سکتی ہے، اس کے باوجود امام کیساتھ ایک صف محراب کے سامنے باہر ہوتی ہے اور باقی لوگ مسجد کے اندر، تو ایسی صورت میں نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟ بعض علمائے کرام سے سنا ہے کہ بلا عذر ایسی صورت اختیار کرنا منع ہے، لیکن سوال یہ ہیکہ بیت اللہ شریف میں میت کو بھی اندر لے آکر نماز جنازہ ادا کیجاتی ہے، تو وہاں ایسا کیوں کرتے ہیں؟　　مستفتی: قاری حبیب اللہ

﴿جواب﴾ جگہ کی تنگی یا اس طرح کا دوسرا کوئی شرعی عذر نہ ہو تو مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا مکروہ ہے، جگہ کی تنگی ہو اور قریب میں متبادل جگہ نہ ہو تو ایسی صورت میں میت مسجد سے باہر ہو اور امام کیساتھ کچھ لوگ بھی باہر ہوں، باقی لوگ مسجد کے اندر ہوں تو اس کی گنجائش ہے، اور بلا عذر ایسی صورت اختیار کرنا بھی منع ہے، آپ ﷺ سے مروی ہے:

لما في سنن أبي داؤد: (۳/۱۸۲ مطبع بیروت)

من صلى على ميت في المسجد فلا صلاة له.

یعنی جس شخص نے مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھی تو اسکی نماز نہیں ہوئی۔ رہا یہ کہ بیت اللہ شریف میں میت کو مسجد میں لے آکر نماز جنازہ ادا کرنے کا معمول کیوں ہے؟ سو اسکا جواب یہ ہیکہ بیت اللہ شریف میں طواف کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے، اور لوگ زیادہ ہوتے ہیں، باہر

ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جسمیں آسانی کیساتھ نماز جنازہ ادا کرنے کا اہتمام کیا جا سکے، کیونکہ آجکل مسجد حرام کی بہت توسیع ہوئی ہے تو اتنے سارے لوگوں کا بیت اللہ شریف کے معمولات کو چھوڑ کر اتنا دور باہر آنا بہت دشوار ہے، جبکہ وہاں باقاعدہ حکومت کی طرف سے انتظام بھی ہوتا ہے، میت کے جسم سے خون وغیرہ نکلنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا، اسلئے کہ پہلے سے وہ لوگ پوری طرح چیک اپ کر کے انتظام کر لیتے ہیں، جبکہ عام مساجد میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا مساجد کے ناپاک ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے، لہذا بیت اللہ شریف پر باقی مساجد کو قیاس نہ کیا جائے، دیکھئے مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام کے اندر میت کو لے آکر جنازہ نہیں پڑھایا جاتا بلکہ میت کو باہر رکھ کر نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہاں اکثر لوگ امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مقلد ہیں جن کے مذہب کے مطابق نماز جنازہ مسجد کے اندر ادا کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، بشرطیکہ مسجد کے ناپاک ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

بہرحال حدیث کے اطلاق پر عمل کرتے ہوئے علمائے احناف کثرھم اللہ کا اس بارے میں مؤقف یہی ہے کہ بلا عذر نماز جنازہ مسجد کے اندر ادا کرنا مکروہ ہے خواہ میت اور کچھ لوگ باہر کیوں نہ ہو، عذر ہو تو ایسی صورت اختیار کیجا سکتی ہے۔

لما في الدر المختار: (۲/۲۲۴، طبع سعید)

"والمختلف في الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً خلاصة بناء على أن المسجد انما بني للمكتوبة وتوابعها كنافلة وذكر وتدريس علم وهو الموافق لاطلاق حديث أبي داؤد "من صلى على ميت في المسجد فلا صلاة له" وفي الشامية (قوله مطلقا) أي في جميع الصور المتقدمة كما في الفتح عن الخلاصة ،وفي مختارات النوازل:سواء كان الميت فيه أو خارجه هو ظاهر الرواية ،وفي رواية لا يكره اذا كان الميت خارج المسجد".

ولما في الهندية: (۱/۱۶۵، طبع رشیدیه)

"وصلاة الجنازة في المسجد الذي تقام فيه الجماعة مكروة سواء كان الميت والقوم في المسجد لو كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد أو كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقي في المسجد أو الميت في المسجد والامام والقوم خارج المسجد هو المختار"

ولما في المغني لابن قدامة الحنبلي: (۲/۲۲۲، مكتبة شاملة)

"ولا بأس بالصلاة على الميت في المسجد اذا لم يخف تلويثه ،وبهذا قال الشافعي واسحاق وأبو ثور وداؤد وكره ذلك مالك وأبو حنيفة".

ولما فی المدونة لمالک بن أنس رضی الله عنه:(۱/۲۵۴،مکتبة شاملة)

"وقال مالک أکره أن توضع الجنازة فی المسجد،فان وضعت قرب المسجد للصلوٰة علیها فلاباس أن یصلی من المسجد علیها بصلاة الامام الذی یصلی علیها اذاضاق خارج المسجد بأهله"

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ أعلم بالصواب:عبدالباری پشینی

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتوی نمبر:۳۰۴۶

## ﴿مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ نماز جنازہ کی مشروعیت کب ہوئی ؟اور مشروعیت سے پہلے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم وفات پا چکے تھے انکی نماز جنازہ کی کیا صورت تھی؟ ہمارے گاؤں میں جنازہ گاہ نہیں ہے،لہذا اس عذر کی وجہ سے ہم مسجد میں نماز جنازہ ادا کرتے ہیں اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ میت کو باہر رکھتے ہیں اور کچھ لوگ بھی باہر ہوتے ہیں باقی لوگ مسجد کے اندر ہوتے ہیں تو کیا اسطرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟　　　مستفتی:عالمگیر خان چارسدہ

﴿جواب﴾ نماز جنازہ کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال ہوئی اور مشرعیت سے پہلے جو صحابہ کرام وفات پا چکے تھے ان پر جنازہ نہیں پڑھا گیا تھا۔

لما فی اوجزالمسالک:(۲/۲۸۲،بیروت)

وفی الانوار الساطعة :شرعت صلاة الجنازة بالمدینة المنورة فی السنة الاولی من الهجرة فمن مات بمکة المشرفة لم یصل علیه.

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے،البتہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی دوسری عذر کیوجہ سے فقہاء کرام نے اجازت دی ہے اور اگر کچھ لوگ میت کیساتھ مسجد سے باہر ہوں تو پھر بلا کراہت جائز ہے لیکن ضرورت کی وجہ سے ورنہ تو ایسی صورت میں بھی منع ہے۔

لما فی الشامی:(۲/۲۲۶،طبع سعید)

قال الشامی تحت قوله فلا صلاة له.....انما تکره فی المسجد بلا عذر فان کان فلا.

ولما فی الشامی:(۲/۲۲۵،طبع سعید)

قوله بناء علی ان المسجد.أما اذا عللنا بخوف تلویث المسجد فلا یکره اذا کان المیت خارج المسجد وحده أو مع بعض القوم ،قال فی شرح المنیة ،والیه مال فی المبسوط والمحیط وعلیه العمل وهو المختار ثم اعلم ان التعلیل الاول فیه خفاء اذلا شک ان

الصلاة على الميت دعاء وذكر وهما مما بني له المسجد.

**ولما في الفتح القدير:(۱۳۲/۲،طبع رشيديه)**

ولا يصلى على ميت في مسجد جماعة اذا كانت الجنازة في المسجد فالصلاة عليها مكروه باتفاق اصحابنا وان كانت الجنازة والامام وبعض القوم خارج المسجد والباقي فيه لم يكره بالاتفاق.

**ولما في تبيين الحقائق:(۵۸۰/۱،طبع سعيد)**

قال شمس الأئمة تاويل حديث ابن البيضاء انه عليه الصلاة والسلام كان معتكفا في ذلك الوقت فلم يمكنه الخروج من المسجد فامر بالجنازة فوضع خارج المسجد فصلى عليها في المسجد للعذر فعلم ذلك اصحابه و خفي عليها وهذا دليل على ان الميت اذا وضع خارج المسجد لعذر والقوم كلهم في المسجد او الامام وبعض القوم خارج المسجد والباقون في المسجد لا يكره.

**ولما في اوجز المسالك:(۳۳۶/۴،طبع بيروت)**

قال الزرقاني تبعا للحافظ في الفتح ،على جواز الصلاة على الجنازة في المسجد وهي رواية المدنيين وغيرهم ،من مالك وكرهه في المشهور وبه قال ابن ابي ذئب وابو حنيفة وكل من قال بنجاسة الميت۔۔۔في الدر المختار وغيره المختار الكرهة مطلقا سواء كان الميت في المسجد او خارجه .بناء على ان المسجد بني للمكتوبة وتوابعها قال ابن عابدين اما اذا علّلنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره اذا كان الميت خارج المسجد واليه مال في المبسوط وغيره وفي التعليل الاول خفاء اذ لا شك ان الصلاة على الميت دعاء وذكر وهما مما بني له المسجد.

**ولما في حلبي كبيري:(ص ۵۸۹،طبع سهيل اكيڈمي)**

وفي جوامع الفقه لو وضعت خارج المسجد والامام وبعض القوم معها والباقي في المسجد والصفوف متصلة لا يكره.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب:محمد عمران چارسدوی

۱۵صفر الخیر۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۶۳

## ﴿دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ کا تکرار جائز ہے یا نہیں؟ ولی موجود ہو لیکن اس غرض سے کہ اپنے علاقہ میں رشتہ داروں کے ساتھ نماز جنازہ ادا کریگا شہر میں نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوا، اور دوسروں کو پڑھتے دیکھا لیکن منع

نہیں کیا تو کیا یہ اجازت شمار ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: اظہر محمود صاحب

﴿جواب﴾ نماز جنازہ فرض کفایہ کا حکم رکھتا ہے ایک مرتبہ ادا کرنے سے فریضہ ساقط ہو جاتا ہے اور فرض کا تکرار جائز نہیں ہے اور نفلی نماز جنازہ کا شریعت میں کوئی تصور نہیں ہے، البتہ یہ حق اولیاء کو حاصل ہے، جب تک جنازہ ولی نے خود یا اسکی اجازت سے ادا نہ ہو تو اس کا حق باقی رہتا ہے اسکی اجازت کے بغیر اگر کوئی ادا کرے تو نماز ہو جائے گی البتہ ولی کو دوبارہ پڑھنے کا حق باقی رہتا ہے لیکن ولی کی اجازت صراحۃ ہو یا دلالۃ ایک بار نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد دوبارہ پڑھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

مذکورہ صورت میں اجازت نہ صراحۃ ہے اور نہ دلالۃ، صریح اجازت تو واضح ہے اور دلالۃ اجازت یہ ہوگی کہ اسکی موجودگی میں کوئی اور نماز جنازہ پڑھائے اور وہ خود بھی شریک جماعت ہو، لیکن صراحۃ اجازت نہ ہو اور نماز جنازہ لوگ ادا کر رہے ہیں اور ولی شریک نہیں ہوتا تو یہ اجازت سے گویا خاموش اعراض ہے، دلالۃ اجازت نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نماز اداء کرنے سے روکا نہیں ہے لیکن رکاوٹ نہ بننا دلالۃ اجازت شمار نہیں ہوتی۔ لہٰذا ولی کو دوبارہ نماز جنازہ ادا کرنے کا حق حاصل ہے۔

**لمافی الهداية: (۱/۱۹۲، طبع رحمانیه)**

فان صلى غير الولي أو السلطان اعاد الولي أو السلطان ان شاء لماذكرنا أن الحق للاولياء، وان صلى الولي لم يجز لاحد ان يصلي بعده لان الفرض يتادى بالاول والنفل بها غير مشروع.

**ولمافی الهندية: (۱/۱۶۳، طبع رشيديه)**

ولا يصلي على ميت الامرة واحدة والتنفل لصلاة الجنازة غير مشروع.

**ولمافی الهندية: (۱/۱۶۴، طبع رشيديه)**

وان صلى عليه الولي لم يجز لاحد ان يصلي بعده ولو صلى عليه الولي وللميت أولياء آخر بمنزلته ليس لهم ان يعيدوا كذافي الجوهرة النيرة رجل صلى صلوة الجنازة والولي خلفه ولم يرض به ان تابعه فصلى معه جاز ولا يعيد الولي.

**ولمافی البدائع: (۱/۳۱۱، طبع سعيد)**

ولا يصلي على ميت الا مرة واحدة لا جماعة ولا وحدانا عندنا الا ان يكون الذين صلوا عليها أجانب بغير أمر الاولياء، ثم حضر الولي فحينئذله ان يعيدها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۶/۱/۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۸۳۳

## ﴿نماز جنازہ کے اعادہ کا کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک خاتون کا کراچی میں انتقال ہوا، اس کے کچھ بیٹے یہاں کراچی میں موجود تھے جن میں بڑا بیٹا بھی شامل تھا انہوں نے یہاں اس کی نماز جنازہ ادا کی، اس کے بعد میت کو ڈیرہ غازیخان لے جایا گیا تو وہاں اس کے باقی بیٹوں نے دوبارہ نماز جنازہ پڑھی، اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی روشنی میں ان دونوں نماز جنازہ میں سے کونسی صحیح تھی اور دوبارہ پڑھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ کراچی میں نماز جنازہ اگر موجود بیٹوں کی اجازت سے ادا کی گئی ہے تو یہی فرض نماز جنازہ تھی، اس کے بعد دوسرے بیٹوں کو وہاں نہیں پڑھانا چاہیے تھا، کیونکہ نماز جنازہ نفلی طور پر مشروع نہیں ہے، البتہ کراچی میں موجود بیٹوں کے علاوہ کوئی اور پڑھاتا اور مرحومہ کے بیٹوں کی اجازت بھی شامل نہ ہوتی تو وہاں کے بیٹوں کیلئے دوبارہ پڑھانے کی گنجائش ہوتی۔

لما فی التنویر والدر ۲/۲۲۳ طبع سعید)

(وان صلیٰ هو)أی الولی (بحق بان لم یحضر من یقدم علیه لا یصلی غیره بعده)وان حضر من له التقدم لکونها بحق .أما لو صلی الولی بحضرة السلطان مثلاً اعاد السلطان کا فی المجتبی وغیره

(ولما فی الهندیه ۱/۱۶۴ طبع رشیدیه)

وان صلی علیه الولی لم یجز لاحد ان یصلی بعده ولو اراد السلطان ان یصلی علیه فله ذلک لانه مقدم علیه ولو صلی علیه الولی وللمیت اولیاء اخر بمنزلته لیس لهم ان یعیدوا کذا فی الجوهرة النیرة

(ولما فی البحرالرائق ۲/۱۸۱ طبع سعید)

(قوله ولم یصل غیره بعده )أی بعد ما صلی الولی لان الفرض قد تأدی بالاولی والتنفل بها غیر مشروع الا لمن له الحق وهوالولی عند تقدم الاجنبی ان قلنا ان اعادة الولی نفل والا فلا استثناء......فان صلی علیه الولی لم یجز ان یصلی احد علیه بعده وهذا اذا کان حق الصلوة له بان لم یحضر السلطان وأما اذا حضروصلی علیه الولی یعید السلطان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق آکی

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۲۶۶

## ﴿نماز جنازہ میں مسبوق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ نماز جنازہ میں مسبوق ثناء، درود شریف اور دعا کس ترتیب سے پڑھے، بالفرض نماز سے فارغ ہو کر لوگ میت کو سامنے سے اٹھالیں تو مسبوق کی نماز کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عنایت اللہ چمنی

﴿جواب﴾ مسبوق کو امام کی نماز جنازہ کا اگر کسی طرح اندازہ ہو کہ امام اس وقت فلاں تکبیر میں ہے، تو مقتدی بھی نماز میں داخل ہوتے ہی وہی عمل کرے مثلاً تیسری تکبیر میں امام ملے تو تکبیر کہنے کے بعد مقتدی میت کیلئے مسنون دعاء پڑھے اور اندازہ نہ ہو سکے تو اصل ترتیب کی مطابق پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھے، دوسری تکبیر کے بعد درود شریف وغیرہ، اور امام جب نماز سے فارغ ہو جائے اور مسبوق کو اندیشہ ہے کہ لوگ میت کو اٹھالیں گے تو صرف باقی ماندہ تکبیرات پر اکتفاء کرے ثناء درود شریف اور دعا کا موقع اگر نہ ملے تو بھی نماز بلا کراہت ہو جائیگی لیکن کوئی تکبیر رہ نہ جائے، البتہ تکبیرات پوری کرنے سے پہلے لوگ میت کو اٹھا کر سامنے سے بھی اگر ہٹالیں تو مسبوق کی نماز فاسد ہو جائیگی۔

لمافی الرد:(۲/۲۱۷،طبع سعید)

وفي نور الايضاح وشرحه ان المسبوق يوافق امامه في دعائه لو علمه بسماعه ولم يذكر ما اذا لم يعلم وظاهر تقييده الموافقة بالعلم انه اذا لم يعلم بان لم يعلم انه في التكبيرة الثانية او الثالثة يأتي به مرتبا:اى بالثناء ثم الصلوة ثم الدعاء تأمل.

ولمافي حلبي كبير:(ص۵۰۶،طبع قديمي)

ثم المسبوق يقضي مافاته من التكبيرات بعدسلام الامام متوالية من غير دعاء لئلا ترفع قبل فراغه فتبطل صلوته فاذا رفعت على الأكتاف قبل فراغه يقطع التكبير لانها بطلت وقيل وضعها على الأكتاف لا تبطل وان رفعت عن الارض وعن محمد ان كانت الى الارض اقرب يأتي بالتكبير وان كانت الى الأكتاف اقرب فلا وقيل لايقطع حتى تبعد والاول اصح.

ولمافي التجنيس والمزيد:(۲/۲۶۱،طبع ادارة القرآن كراچي)

رجل فاته بعض التكبير على الجنازة ،يقضي متتابعا بلا دعاء مادامت الجنازة على الارض ، لانه لو قضى مع الدعاء رفع الميت فيفوته التكبير واذا رفعوا الميت من الارض قطع التكبير لان الصلوة على الميت والميت لا يتصور.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

یکم ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۱۹۲۶

## ﴿نماز جنازہ شروع ہے تو بعد میں آنے والا کیسے شامل ہو؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص نماز جنازہ کے درمیان میں آجائے اور اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کون سی تکبیر ہے تو کیا کرے؟ اور اگر نماز جنازہ میں مسبوق ہو جائے تو بقیہ نماز کس طرح پوری کرے؟ مستفتی: عبدالمعز

﴿جواب﴾ نماز جنازہ میں شروع سے امام کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو سکا بعد میں آیا اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ امام صاحب اس وقت کون سی تکبیر میں ہے تو یہ شخص اب انتظار کرے جب امام تکبیر کہے تو یہ بھی تکبیر کہہ کر نماز میں شریک ہو پھر ترتیب کے ساتھ پہلے ثناء پڑھے امام صاحب اگر مزید تکبیر کہے تو یہ شخص بھی تکبیر کہہ کر ترتیب کے مطابق درود شریف پڑھے تو یہ امام صاحب کی اگر چوتھی تکبیر تھی تو سلام کے بعد بلا تاخیر یہ شخص دعا پڑھ کر باقی ماندہ تکبیر کہہ کر سلام پھیر دے البتہ میت سامنے سے اٹھائے جانے کا اگر اندیشہ ہو تو دعا پڑھے بغیر باقی ماندہ تکبیر کہہ کر سلام پھیر دے اور اگر شامل ہوتے ہی امام نے سلام پھیر دیا یعنی یہ ان کی چوتھی تکبیر تھی اور اندیشہ تھا کہ جنازہ سامنے سے اٹھالیا جائے گا تو صرف باقی ماندہ تکبیرات پر اکتفاء کرے اور سلام پھیر دے۔

لما فی الشامی: (۲۱۶/۲، طبع سعید کراچی)

"(قوله وقال ابو یوسف الخ) قال فی النهایة: تفسیر المسئلة علی قوله انه لما جاء وقد کبر الامام تکبیرة الافتتاح کبر هذا الرجل للافتتاح فاذکبر الامام الثانیة تابعة فیها ولم یکن مسبوقا وعندهما لایکبر للافتتاح حین یحضر بل ینتظر حتی یکبر الامام الثانیة ویکون هذا التکبیر تکبیر الافتتاح فی حق هذا الرجل فیصیر مسبوقا بتکبیرة یاتی بها بعد سلام الامام.

ولما فیه ایضا: (۲۱۷/۲، طبع سعید کراچی)

فی نور الایضاح و شرحه أن المسبوق یوافق امامه فی دعائه لو علمه بسماعه و لم یذکر ما اذا لم یعلم، و ظاهر تقییده الموافقة بالعلم انه اذا لم یعلم بان لم یعلم انه فی التکبیرة الثانیة أو الثالثة مثلاً یأتی مرتباً أی بالثناء ثمّ الصلوٰة ثم الدعاء.

و لما فی المحیط البرهانی: (۸۰/۳، طبع: ادارة القرآن)

و هل یأتی بالأذکار المشروعة بین التکبیرتین ؟ ذکر الحسن رحمه الله فی المجرّد أنه ان کان یأمن رفع الجنازة فانه یأتی بالأذکار المشروعة و ان کان لا یأمن رفع الجنازة یتابع بین التکبیرات و لا یأتی بالأذکار.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۹۶

## ﴿مخنث کی نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ کیا ہیجڑے کی نماز جنازہ پڑھنا درست ہے؟ کوئی قباحت تو نہیں ہمارے ہاں ایک صاحب ہیں وہ کہتے ہیں کہ درست نہیں شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔ مستفتی: شاہد اللہ قریشی باوانی چالی کراچی

﴿جواب﴾ مردہ خواہ ہیجڑا ہو اگر مسلمان ہے تو اس کی نماز جنازہ پڑھنا مسلمانوں پر واجب ہے ہیجڑا ہونا تو اس کے اختیار میں نہیں ہے، البتہ ان صاحب نے شاید اس لئے کہا ہو کہ ہیجڑے عموماً فسق وفجور میں مبتلا رہتے ہیں لیکن فسق وفجور کی وجہ سے بھی کسی کی نماز جنازہ چھوڑنا غلط ہے۔

لمافی سنن ابی داؤد: الحدیث: صلوا علیٰ کل بر وفاجر.

ولمافی الرد: (۲/۲۰۷، مکتبه ایچ ایم سعید)

وشرطها ستة اسلام الميت وطهارته اسلام الميت ولو بطريق التبعية لاحد ابويه الخ.

ولمافی الهندية: (۱/۱۶۳، مکتبه رشيديه)

ويصلى علىٰ كل مسلم مات بعد الولادة صغيرا كان او كبيرا ذكرا كان او انثىٰ الخ.

ولمافی البدائع: (۱/۳۱۱، مکتبه ایچ ایم سعید)

فكل مسلم مات بعد الولادة يصلى عليه صغيرا كان او كبيرا — لقول النبي صلى الله عليه وسلم صلوا على كل بر وفاجر. وقوله للمسلم على المسلم ست حقوق وذكر من جملتها ان يصلى على جنازته من غير فصل الا ما خص بدليل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۳۲۷

## ﴿مردہ بچے کے شرعی احکام﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسقاط حمل میں یا معمول کے مطابق ولادت میں مرا ہوا بچہ پیدا ہو اور پیدائش کے وقت زندگی کی کوئی علامت اس میں موجود نہ ہو، اگرچہ اعضاء سب بن چکے ہوں تو اسکے غسل وکفن اور نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اسقاط حمل میں یا معمول کے مطابق ولادت میں مرا ہوا بچہ پیدا ہو اور پیدائش کے وقت زندگی کی کوئی علامت اس میں موجود نہ ہو، اگرچہ اعضاء سب بن چکے ہوں تو اس کو غسل دیا جائے اور نام بھی رکھا جائے، لیکن باقاعدہ کفن دینے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ جنازہ

کی نماز پڑھی جائے، البتہ بہتر ہے کہ غسل دیکر پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کیا جائے۔

لمافی البحرالرائق:(۲/۱۸۸،طبع سعید)

(قوله ومن استهل صلی علیه والا)الاستهلال الصبی فی اللغتان یرفع صوته بالبکاء ..... عند والا انه .. وذکر المصنف ان حکمه الصلاة علیه ویلزمه ان یغسل وأن یرث ویورث وأن یسمی وان لم یبق بعده حیا لاکرامه لانه من بنی آدم..... وافاد بقوله والا انه اذالم یستهل لایصلی علیه ویلزم منه أن لایغسل ولایرث ولایورث ولایسمی واتفقوا علی ماعدا الغسل والتسمیة اختلفوا فیهما فظاهر الروایة عدمهما وروی الطحاوی فعلهما وفی الهدایة انه المختار لانه نفس من وجه.

وفی منحة الخالق:السقط الذی لم تتم اعضاؤه لایصلی علیه باتفاق الروایات واختلفوا فی غسله والمختار انه یغسل ویدفن ملفوفا بخرقة.

ولمافی التنویروشرحه:(۲/۲۲۸،طبع سعید)

(والا)یستهل (غسل وسمی )عندالثانی وهوالاصح .فیفتی به علی خلاف ظاهرالروایة اکراما لبنی آدم..... واذااستبان بعض خلقه غسل وحشر هو المختار(وادرج فی خرقة ودفن ولم یصل علیه ..... (قوله والا یستهل غسل وسمی) شمل ماتم خلقه ولا خلاف فی غسله ومالم یتم وفیه خلاف والمختار أنه یغسل ویلف فی خرقة ولا یصلی علیه ..... فی حدیث "سموا أسقاطكم فانهم فرطكم".

ولمافی الهدایة:(۱/۱۶۳،طبع رحمانیه)

وان لم یستهل لم یصل علیه ولأن الاستهلال دلالة الحیوة فتحقق فی حقه سنة الموتی ومن لم یستهل ادرج فی خرقة کرامة لبنی آدم ولم یصل علیه لمارویناویغسل فی غیرالظاهر من الروایة لانه نفس من وجه وهو المختار.

ولما فی کنزالدقائق:(ص۴۸،طبع قدیمی)

ومن استهل صلی علیه والا لا أی لا یصلی علیه والمختار انه یغسل ویدرج فی خرقة ویسمی. وفی حاشیتها:فلواستهل سمی وغسل وصلی علیه ویرث ویورث وان لم یستهل ادرج فی خرقة تکریما لبنی آدم ولم یصل علیه ولا یرث ولا یورث اتفاقا.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ    واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان سواتی

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ    فتویٰ نمبر:۱۵۳۴

## ﴿پیدائش کے وقت بچے میں حیات کی کوئی علامت نہ ہو تو اس پر جنازہ پڑھا جائیگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہسپتال میں کسی بچے کی پیدائش ہوگئی اور اس سے چیخنے، چلانے کی کوئی آواز نہیں سنی گئی، مگر ڈاکٹروں نے اس کو آکسیجن

میں رکھا اور انکا کہنا ہے کہ کچھ دیر تک اس کے دل کی دھڑکن چلتی رہی جو اس کے زندہ پیدا ہونے کی علامت تھی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ایسے بچے پر نماز جنازہ پڑھی جائیگی یا نہیں؟ برائے مہربانی دلائل کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: ساجد احمد، ڈیفنس

﴿جواب﴾ پیدائش کے وقت بچے کی حیات کی کوئی بھی علامت ظاہر ہو تو وہ زندہ شمار ہوگا، اس کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر لوگ اگر اس بچے کی حیات کی تصدیق کرتے ہیں تو شرعاً ان کی تصدیق معتبر ہے۔

لما فی البحر: (۱۸۸/۲ طبع ایچ ایم سعید)

ومن استهل صلى عليه ـ وفي الشرع ان يكون منه ما يدل على حياته من رفع صوت أو حركة عضو ولو ان يطرف بعينه.

لما فی الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید: (۳۲۷/۱ طبع دار القلم بیروت)

فمن ولد فمات: يغسل ويصلى عليه ويرث ويورث ويسمى ان وجد ما يدل حياته بعد خروج اكثره، والا غسل وسمى وأدرج في خرقة ودفن اكراما لبنى آدم.

لما فی حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح: (۵۹۷ طبع قديمى)

ومن استهل ان وجد منه حال ولادته حياة بحركة أو صوت وقد خرج اكثره وصدره ان نزل برأسه مستقيما وسرته ان خرج برجليه منكوسا سمى وغسل وصلى عليه وورث ويورث.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفر لہ ولوالدیہ

۲۳ جمادی الاول ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۴۱۶۵

## ﴿نماز جنازہ کے فرائض﴾

﴿سوال﴾ نماز جنازہ کے فرائض کتنے ہیں؟ دعا یاد نہ ہونیکی وجہ سے اگر کوئی نہ پڑھے تو اسکی نماز جنازہ اداء ہو جائیگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نماز جنازہ میں دو چیزیں فرض ہیں نمبر۱: چار تکبیرات نمبر۲: قیام، ان دو چیزوں میں سے اگر کسی ایک پر عمل نہیں ہوا تو نماز جنازہ اداء نہ ہوگی باقی ثناء، درود اور دعاء تینوں سنت ہیں ان پر اگر عمل نہیں ہوا تو نماز جنازہ اگر چہ ادا ہو جائیگی لیکن ایک عاقل، بالغ، مسلمان کی شان یہ نہیں کہ وہ ان کو اہمیت ہی نہ دے، اس لئے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان مسنون دعاؤں کو یاد

کرے، دعا یاد نہ ہو تو "اللھم اغفر للمؤمنین والمؤمنات" پڑھے یا کوئی اور مسنون دعا پڑھ لے۔

لما فی الدر المختار: (۲/ ۲۰۹، طبع سعید)

ورکنھا شیآن التکبیرات الاربع فالاولیٰ رکن ایضا لا شرط، فلذالم یجز بناء أخری علیھا والقیام فلم تجز قاعدا بلا عذر وسنتھا ثلاثۃ التحمید والثناء والدعاء فیھا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ    واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ    فتوی نمبر: ۲۱۶

## ﴿نماز جنازہ میں سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ نماز جنازہ میں بعض لوگوں کو دیکھا گیا کہ وہ تکبیرات ختم ہوتے ہی سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟ یا دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں۔    مستفتی: کریم اللہ

﴿جواب﴾ بہتر یہی ہے کہ "تکبیرات اربعہ" کے بعد قبل از سلام ہاتھ چھوڑ دیں کیونکہ اس کے بعد اب کوئی مسنون ذکر باقی نہ رہا لیکن اگر آخر سلام تک باندھے رکھے تب بھی کوئی حرج نہیں۔

لما فی خلاصۃ الفتاوی: (۱/ ۲۲۵، طبع رشیدیہ)

ولا یعقد بعد تکبیر الرابع لانہ لا یبقیٰ ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح انہ یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین ھکذا فی الذخیرہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ    واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۳ جمادی الاول ۱۴۲۷ھ    فتوی نمبر: ۲۹۸

## ﴿نماز جنازہ میں امام کے آہستہ سلام کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے ہاں ایک امام صاحب نے نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے آخر میں بالکل آہستہ سے سلام پھیرا جس کی وجہ سے ہمیں بالکل پتہ نہیں چلا، پھر جب لوگ منتشر ہونے لگے تو ہم نے بھی سلام پھیر دیا اب سوال یہ ہے کہ سلام آہستہ کہنا چاہیئے یا زور سے کہنا چاہیئے؟ فقہاء کرام کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

﴿جواب﴾ نماز جنازہ میں سلام آہستہ کہے، مذہب میں اس کی بھی روایت ہے

امام صاحب کی نظر سے شاید یہی روایت گزری ہو لیکن مفتیٰ بہ قول یہ ہیکہ سلام زور سے کہے لہٰذا اس پر عمل ہونا چاہیے۔

لما فی بدائع الصنائع:(۱/۳۱۴،مکتبہ سعید)

وهل يرفع صوته بالتسليم لم يتعرض له فى ظاهر الرواية وذكر الحسن بن زياد انه لا يرفع صوته بالتسليم فى صلاة الجنازة لان رفع الصوت مشروع للاعلام ولا حاجة الى الاعلام بالتسليم الخ ولكن العمل فى زماننا هذا يخالف مايقوله الحسن.

ولما فى الشامية:(۲/۲۱۳،طبع سعيد)

ويسر الكل الا التكبير زيلعى وغيره لكن فى البدائع العمل فى زماننا على الجهر بالتسليم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:عبدالوہاب نعمانی عفااللہ عنہ

۵ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۴۲۷۷

## ﴿نماز جنازہ میں تکبیر بھول جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقے میں ایک مولوی صاحب نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے چوتھی تکبیر بھول گئے تیسری تکبیر کے بعد سلام پھیر دیا اب اس صورت میں نماز جنازہ درست ہوگی؟ مستفتی:معین الدین

﴿جواب﴾(۱) نماز جنازہ کی چار تکبیریں قائم مقام چار رکعتوں کے ہیں یہ رکن صلوٰۃ ہیں سوائے پہلی تکبیر کے کہ یہ من وجہ شرط ہے اور من وجہ رکن ہے ان میں سے کوئی ایک تکبیر بھی چھوٹ جائے تو نماز نہ ہوگی۔

لما فى التنوير و شرحه:(۲/۱۰۵-۱۰۹،طبع امداديه)

(وركنها) شيئان: (التكبيرات) الاربع، فالاولى ركن أيضاً لاشرط—(وهى أربع تكبيرات) كل تكبيرة قائمة مقام ركعة.

ولما فى الهندية:(۱/۱۶۲،طبع رشيديه)

وصلوة الجنازة اربع تكبيرات ولو ترك واحدةً منها لم تجز صلوٰته هكذا فى الكافى.

ولما فى حاشية الطحطاوى:(ص۳۱۸،طبع قديمى)

(واركانها التكبيرات والقيام) لكن التكبيرة الاولىٰ شرط باعتبار الشروع بها ركن باعتبار قيامها مقام ركعة كباقى التكبيرات كما فى المحيط.

(۲) صورت مذکورہ میں امام نے جب بھول کر تیسری تکبیر کے بعد سلام پھیر دیا تو اس کو چاہیے تھا کہ فوراً ایک تکبیر اور کہہ کر سلام پھیرے تاکہ نماز درست ہو جائے۔

ولما فی الهندية:(۱/۱۶۵،طبع رشيديه)

ولو سلم الامام بعد الثالثة ناسياً كبر الرابعة ويسلم كذا في التتارخانية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۴

## ﴿جنازے کی تکبیرات فوت ہونے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے متعلق کہ اگر کسی شخص سے جنازے کی چاروں تکبیریں فوت ہو جائیں تو وہ کیا کرے؟ نماز میں شرکت کی گنجائش ہے؟ مستفتی: محمد وقاص

﴿جواب﴾ چار تکبیروں کے بعد قبل سلام اگر کوئی شخص شامل ہو جائے تو وہ امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شریک سمجھا جائے گا اور اسی پر فتویٰ ہے اور وہ شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد بقیہ تین تکبیریں کہہ دے۔

لما في التنوير وشرحه:(۲/۱۱۶-۱۱۷،طبع امداديه)

(فلو جاء) المسبوق (بعد تكبيرة الامام لرابعة فاتته الصلوٰة) لتعذر الدخول في تكبيرة الامام، وعندا أبي يوسف: يدخل لبقاء التحريمة فاذاسلم الامام كبر ثلاثاً كما في الحاضر، وعليه الفتوى، ذكره الحلبي وغيره.

وفي الشامية:(وعليه الفتوى):أي على قول أبي يوسف في مسألة المسبوق خلافاًلما مشى عليه في المتن (ذكره الحلبي وغيره) عبارة الحلبي في شرح المنية:وان جاء بعد ما كبر الرابعة فاتته الصلوٰة عندهما، وعند أبي يوسف: يكبر، فاذا سلم الامام قضى ثلاث تكبيرات، وذكر في المحيط أن عليه الفتوى.

ولما في الهندية:(۱/۱۶۵،طبع رشيديه)

وان جاء رجل قد كبر الامام اربعاً ولم يسلم لايدخل معه في رواية عن أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ والاصح أنه يدخل وعليه الفتوىٰ كذا في المضمرات.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۶

## ﴿جوتوں سمیت نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام مندرجہ ذیل سوال کے بارے میں کہ بعض لوگ نماز جنازہ پڑھتے وقت جوتے نہیں اتارتے بلکہ جوتوں سمیت نماز پڑھتے ہیں، جبکہ بعض لوگ جوتے اتار کر اس کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں کیا یہ دونوں طریقے صحیح ہیں؟ جواب حوالہ کے ساتھ مطلوب ہے۔ مستفتی: ایم اقبال خان کراچی

﴿جواب﴾ جوتوں سمیت نماز جنازہ پڑھنے کی صورت میں اگر زمین کا وہ حصہ جس پر نمازی کھڑا ہے پاک ہو اور جوتوں کے تلوے بھی پاک وصاف ہوں تو نماز ہو جائیگی، ناپاک ہوں تو نماز نہ ہوگی اور جوتوں کو نکال کر ان کے اوپر کھڑے ہونے کی صورت میں اگر صرف جوتوں کا بالائی حصہ پاک ہو تو نماز ہو جائے گی ایسی صورت میں جوتوں کے تلوے اور جس جگہ پر وہ کھڑا ہے اس کا پاک ہونا ضروری نہیں ہے، نماز جنازہ چونکہ عام طور پر پاک جگہ ہی پر ادا کی جاتی ہے اس لیے جوتے اتار کر زمین ہی پر کھڑا ہونا چاہیئے۔

لمافی البحر: (۱۷۹/۲ طبع سعید)

وقد قدمنا فی شروط الصلوٰة انه لو قام علی النجاسة وفی رجلیه نعلان لم یجز ولو افترش نعلیه وقام علیهما جازت وبهذا یعلم ما یفعل فی زماننا من القیام علی النعلین فی صلاة الجنازة لکن لا بد من طهارة النعلین کما لا یخفی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۹

## ﴿ایک سے زیادہ مرتبہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سے زیادہ مرتبہ نماز جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: فضل غنی

﴿جواب﴾ ایک سے زیادہ مرتبہ نماز جنازہ پڑھنا ثابت نہیں ہے ہاں اگر میت کے ولی نے جنازہ کی نماز نہ پڑھی ہو تو دوبارہ پڑھ سکتا ہے لہٰذا ایک مرتبہ سے زیادہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔

لمافی الھندیة: (۱۶۳/۱ طبع رشیدیه)

ولا یصلی علی میت الا مرة واحدة والتنفل بصلاة الجنازة غیر مشروع کذا فی

الایضاح- وفیہا أیضا وان صلی علیہ الولی لم یجز لاحد أن یصلی بعدہ.

ولمافی التنویر وشرحہ:(۱۲۲۳،طبع امدادیہ)

فان صلی غیرہ ای الولی ممن لیس لہ حق التقدم علی الولی ولم یتابعہ الولی اعاد الولی ـــ الی أن قال ولذا قلنا: لیس لمن صلی علیہا أن یعید مع الولی لأن تکرارہا غیر مشروع

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ . واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۳۳۳

## ﴿غائبانہ نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو حضور ﷺ نے جو شاہ حبشہ حضرت نجاشیؓ اور حضرت معاویہ مزنیؓ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اسکا کیا جواب ہے؟

﴿جواب﴾ نماز جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جنازہ نمازی کے سامنے ہو لہٰذا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۰۹)

وشرطہا ایضاً حضورہ(ووضعہ)وکونہ ہو أواکثرہ (أمام المصلی)وکونہ للقبلۃ فلا تصح علی غائب ومحمول علی نحو دابۃ وموضوع خلفہ ، لأنہ کالامام من وجہ دون وجہ لصحتہا علی الصبی ، وصلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی النجاشی لغویۃ أو خصوصیۃ.

حضرت نجاشی اور حضرت معاویہ ابن معاویہ مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ اس طور پر پڑھی کہ دور سے بطور معجزہ ان کے جنازے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کردیئے گئے تھے اس لئے ان دو واقعات سے غائبانہ نماز جنازہ کی سنت پر استدلال صحیح نہیں ہے، یہ آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔

ولمافی اعلاء السنن:(۸/۲۴۳-۲۴۴،۲۴۵،طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

عن عمران بن حصین رضی اللہ تعالی عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اخاکم النجاشی توفی فقوموا صلوا علیہ فقام رسول صلی اللہ علیہ وسلم وصلوا خلفہ فکبر اربعا وہم لایظنون الا ان جنازتہ بین یدیہ رواہ ابن حبان فی صحیحہ کذا فی نصب الرایۃ وفی فتح الباری بعد نقلہ مانصہ اخرجہ من طریق الاوزاعی عن یحیی ابن کثیر عن ابی قلابۃ عن ابی المہلب عنہ ولابی عوانۃ (فی صحیحہ) من طریق ابان وغیرہ عن یحیی فصلینا خلفہ ونحن لانری الاان الجنازۃ قدامنا اھ.

فقد اخرج الطبرانی وابن الضریس فی فضائل القرآن وسمویه فی فوائده وابن منده والبیهقی فی الدلائل کلهم من طریق محبوب ابن هلال عن عطاء ابن ابی میمونة عن انس بن مالک رضی الله عنه قال نزل جبرئیل علی النبی صلی الله علیه وسلم فقال یا محمد مات معاویة بن معاویة المزنی اتحب ان تصلی علیه قال نعم فضرب بجناحیه فلم یبق اکمة ولاشجرة الا تضعضعت فرفع سریره حتی نظر الیه فصلی علیه وخلفه صفان من الملائکة کل صف سبعون الف ملک فقال یا جبرئیل بم نال معاویة هذا المنزلة قال بحب قل هو الله احد وقراء ته ایاها جائیا وذاهبا، وقائما وقاعدا وعلی کل حال. ومحبوب قال ابوحاتم: لیس بالمشهور. وذکره ابن حبان فی "الثقات" وفی روایة: قال جبرئیل: فهل لک أن تصلی علیه فاقبض لک الارض: قال: نعم فصلی علیه. وفی روایة: فوضع جبرئیل جناحه الایمن علی الجبال فتواضعت حتی نظرنا الی المدینة ذکر الروایات کلها الحافظ فی الاصابة. ثم قال قد یحتج به من یجوز الصلوٰة علی الغائب ویدفعه ماورد انه رفعت الحجب حتی شهد جنازة.

قلت: ولو کانت الصلوٰة علی المیت الغائب مشروعة لم یکن لسؤال جبرئیل "اتحب أن تصلی علیه؟ وضربه بجناحیه بعد قوله "نعم" معنی لامکان الصلوٰة علیه بغیر ذلک ایضا وکذا لم یکن لقوله فهل لک ان تصلی علیه فاقبض لک الارض: معنی لعدم الاحتیاج الی ذلک للصلاة علیه فالحدیث ان ثبت کما زعمه الحافظ فهو حجة لنا لا علینا فافهم.

بالفرض یہ معجزہ حدیث سے ثابت نہ ہوتا تو بھی ان واقعات کو معجزہ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر محمول کرنا ضروری ہے اس لئے کہ "صل علیھم ان صلاتک سکن لھم" کے مطابق آپ ہر صحابی کے نماز جنازہ پڑھنے پر حریص تھے، حتیٰ کہ اگر کسی کو حضور اکرم ﷺ کی نماز جنازہ کے بغیر دفنا دیا گیا تو آپ ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی اور اسکی قبر پر تشریف لے جا کر نماز جنازہ پڑھی۔ مع ہذا آپ ﷺ نے اپنے ہی دور میں کئی مقرب صحابہ رضی اللہ عنہم اور قراء رضی اللہ عنہم جیسے مخصوصین حضرات پر نماز جنازہ نہیں پڑھی، یہ واضح دلیل ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ صحیح نہیں اور حضرت نجاشی ومعاویہ بن معاویہ مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی نماز جنازہ بطور معجزہ یا بنا بر خصوصیت کے ادا فرمائی گئی تھی۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۱۸

## ﴿خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک لڑکے نے خودکشی کا ارتکاب کیا جنازے کے وقت چند مولوی صاحبان کے ساتھ علاقے سے ایک بڑے عالم صاحب بھی موجود تھے تو لوگوں نے بڑے مولانا سے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو آپ نے کہا کہ اس لڑکے نے خودکشی کی ہے اس لئے میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھا سکتا اور دوسرے مولوی حضرات کو حکم دیا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں اور بڑے مولانا صاحب کی بات کی حقیقت کیا ہے؟

﴿جواب﴾ خودکشی کرنا اگرچہ ایک سخت ترین گناہ ہے لیکن مسلمانوں پر اس کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے اور بڑے مولانا صاحب کا اس کی نماز نہ پڑھانا مصلحت کی وجہ سے ہے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں اور آئندہ کوئی اس جرم عظیم کا ارتکاب نہ کر بیٹھے، لہٰذا ایسے معتبر و معروف عالم دین کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

لمافی الهندية: (۱/۱۶۳ طبع رشیدیه)

ومن قتل نفسه عمداً يصلى عليه عند ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى وهو الاصح.

ولمافی الدرالمختار: (۲/۱۰۸ طبع امدادیه)

(من قتل نفسه) ولو (عمداً يغسل ويصلى عليه) به يفتى

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۹۴

## ﴿حواس باختہ ہوکر خودکشی کرنے والے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کا دماغی توازن خراب تھا اکثر بہکی بہکی باتیں کرتی تھی اور کبھی کبھار گھر سے نکل جاتی تھی اور کہتی کہ ہمارا گھر قبرستان میں ہے اس کا شوہر اس کو اکثر سمجھاتا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہ آتی حتیٰ کہ بعض اوقات اپنے شوہر کو بھی نہیں پہچانتی تھی کچھ لوگ اسکو نفسیاتی مریضہ قرار دیتے اور بعض لوگ اس پر جنات کا اثر بتاتے تھے اور اسکی یہ حالت شادی سے پہلے بھی تھی آخر ایک دن اس نے چھت سے لٹک کر

اپنی جان دیدی، اب پوچھنا یہ ہے کہ حدیث شریف میں خودکشی کرنے والوں کی جو وعیدیں بیان کی گئی ہیں کیا یہ عورت انکی سزاوار ہے؟ ہمارے علاقے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھانی چاہیے اور نہ اسکی تعزیت کے لیے جانا چاہیے، شریعت کی رو سے اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: رفعت اللہ عبدل خیل ڈیرہ اسمٰعیل خان

﴿جواب﴾ بلاشبہ اسلام میں خودکشی حرام اور گناہ کبیرہ ہے لیکن مذکورہ عورت کا جو حال بتایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اختیار میں نہیں تھی، ایسی صورت میں انسان شرعاً غیر مکلف شمار ہوتا ہے، یعنی اخروی عذاب وعتاب کا سزاوار نہیں ٹھہرتا، گناہ وثواب کا تعلق انسان کی اختیاری اعمال سے ہے بہرحال اس عورت نے اس بیماری کی حالت میں اگر خودکشی کی ہے تو عنداللہ اس جرم پر اس کا مواخذہ نہ ہوگا باقی جہاں تک خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ کا تعلق ہے سو نماز جنازہ تو فرض کفایہ ہے ادا نہ کرنے کی صورت میں علاقے کے تمام لوگ گناہ گار ہونگے، البتہ اس گناہ کی شناعت ظاہر کرنے کے لیے علاقے کے بڑے علمائے کرام اگر اعراض کریں تو اس میں حکمت ہے لیکن ادا کرنا ضروری ہے اور تعزیت تو پسماندگان کی دل جوئی اور انکی تسلی کے لیے مسنون عمل ہے اس کو منع کرنا بھی غلط ہے۔

لما فی سنن ابی داؤد (۲/۲۵۱ طبع رحمانیه).

عن ابن عباسؓ قال [illegible] فامر بها عمرؓ ان ترجم فمر بها علی بن ابی طالب کرم [illegible] قالوا مجنونة بنی فلان زنت فامر بها عمر ان ترجم [illegible] فقال یا امیر المؤمنین اما علمت ان القلم رفع عن ثلاثة عن [illegible] حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یعقل قال [illegible]

ولما فی بذل المجهود ([illegible] طبع مکتبه القلم).

ورفع الحکم [illegible] وعن المبتلی) ای المبتلی بملاء المجنون یعنی [illegible] ولا یؤاخذ به ولا اثم علیه فیما یفعله من [illegible] فی الحکم بالرجم قال الخطابی لم یامر عمر برجم مجنونة [illegible] فی الجنون ولکن هذه امراة تجن مرة وتفیق مرة اخری فرای عمر ان [illegible] من الجنون اذا کان اثرها منها فی حالة [illegible] ورای علی ان الجنون شبهة یدرء بها الحد عمن تبتلی به ولعلها قد اصابت وهی فی بقیة بلاء فوافق اجتهاد عمرؓ اجتهاده فی ذلک فدرء عنها الحد.

ولما فی البحر الرائق:(۲۰۱/۱ کتاب الطہارۃ: طبع سعید).

واما العته فلم ار من ذکرہ من النواقض ولا بد من بیان حقیقته وحکمه اما لأول فهو آفة توجب الاختلال بالعقل.....واما الثانی فقد اختلف فیه علی ثلاثة اقوال ففی اصول فخر الاسلام وشمس الائمه والمنار والمغنی والتوضیح انه کالصبی مع العقل فی کل الاحکام الا فی العبادات فانا لم نسقط عنه الوجوب احتیاطا فی وقت الخطاب ورده صدر الاسلام ابو الیسر بانه نوع جنون فمنع الوجوب لانه لا یقف علی العواقب وفی اصول البستی ان المعتوه لیس بمکلف باداء حالا وبقضاء ما مضی اذا لم یکن فیه حرج کالقلیل....وان لم یکن مخاطبا فیما قبل کالنائم والمغمی علیه دون الصبی اذا بلغ وهو اقرب الی التحقیق کذا فی شرح المغنی للهندی وظاهر کلام الکل الاتفاق علی صحة ادائه العبادات اما من جعله مکلفا لانه جعله کالصبی العاقل.

ولمافی اصول السرخسی:(۲۰۷/۲ قدیمی)وانما ینال العبد الجزاء علی ماله فیه اختیار.

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۲۱۷/۱ طبع رشیدیه).

وقاتل النفس یغسل ویصلی علیه عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ وبه کان یفتی شمس الائمه الحلوانی وکان رکن الاسلام علی السغدی یقول انه لا یصلی علیه قال وبه یفتی الشیخ الامام ظهیر الدین والاول اصح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد بلال شاہ وزیرستانی

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۱۱۶

## ﴿مجنون کی نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی جس کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اسے جنون کا مرض لاحق تھا وہ فوت ہو گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ اسکی نماز جنازہ میں دعا بچوں والی پڑھی جائے گی یا بالغوں والی؟

﴿جواب﴾ مذکورہ شخص کو اگر جنون اصلی لاحق تھا یعنی اسے پوری زندگی میں کبھی افاقہ نہیں ہوا تو اسکے لیئے بچوں کی دعا پڑھی جائے گی کیونکہ یہ مکلف نہیں تھا اسوجہ سے اسکے ذمہ کوئی گناہ بھی نہیں، اگر جنون کا مرض عارضی تھا کہ کبھی افاقہ بھی ہو جاتا تھا تو اس کے لئے بالغوں کی دعا پڑھی جائے گی، کیونکہ بالغ ہونے کے بعد جب بھی جنون سے افاقہ ہوا تو وہ شخص مکلف ہو گیا اب اسکے بعد جنون کا لاحق ہونا ماقبل کی تکلیف کو زائل نہیں کر سکتا بلکہ یہ باقی امراض کی طرح شمار ہوگا۔

لما فی حلبی کبیر:(ص ۵۸۷،طبع سهیل اکیڈمی)

والمجنون کالطفل ذکرہ فی المحیط وینبغی ان یقید بالجنون الأصلی لأنه لم یکلف

فلا ذنب له كالصبي بخلاف العارضي فإنه له كالف ومعروض الجنون لا يمحو ما قبله بل هو كسائر الأمراض ورفعه للتكليف انما هو فيما يأتي لا فيما مضى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۰۳

## ﴿پاگل مجنون پر نابالغ والی دعا پڑھی جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں ایک پاگل شخص کا انتقال ہوا جب اس کا جنازہ مسجد میں آیا تو امام صاحب نے کہا کہ بالغ جنازے کی دعا پڑھنی ہے میں نے امام صاحب سے کہا کہ یہ پاگل مجنون تھا ہم نے بچپن سے دیکھا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ امام صاحب کا فعل درست ہے یا میرا؟ جب کہ وہ ہمارے محلہ کا ہے اور امام صاحب چند سال پہلے آئے ہیں۔

مستفتی: عبدالعزیز منبری مسجد

﴿جواب﴾ اگر واقعی آپ نے اس کو بچپن سے مجنون دیکھا ہے اور لوگ بھی کہتے ہیں کہ یہ بچپن سے مجنون تھا تو نابالغ والی دعا اس پر پڑھی جائے گی، لیکن اگر جنون بالغ ہونے کے بعد ہوا ہے تو پھر بالغ والی دعا پڑھی جائے گی۔

لما في تنوير الابصار و شرحه:(۲/۲۲۸،طبع سعيد)

(كصبي سبي مع احد ابويه)... والمجنون البالغ كالصبي.

لما في مراقي الفلاح:(ص ۲۱۵،كتاب الصلاة،طبع قديمي)

(ولا يستغفر لمجنون و صبي)اذلا ذنب لهما ويقول في الدعاء اللهم اجعله لنا فرطا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۱۶

## ﴿میت کا غیر مسلم ہونا یقینی نہ ہو تو اسکی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کی میت ملی ہے جسکے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ ہوسکا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو ہے، مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوؤں کا کہنا ہے کہ وہ ہندو ہے ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسلمانوں کے علاقے میں کوئی میت ایسی مل جائے جسکے بارے میں یقینی طور

پر معلوم نہ ہو سکے کہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم، خاص کر جب علاقہ میں دونوں طرح کے لوگ آباد ہوں تو جب تک یقینی طور پر اسکا غیر مسلم ہونا معلوم نہ ہو مسلمان سمجھنا چاہیے اور اس کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے، مذکورہ صورت میں بھی اس عورت کو مسلمان سمجھتے ہوئے اس کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۹۳/۲،طبع امدادیه)

لو لم يدر أمسلم ام كافرو لاعلامة فان فی دارناغسل وصلی علیه والا لا.

وفی الشامية: افادبذكر التفصيل فی المكان بعد انتفاء العلامة ان العلامة مقدمة وعند فقدها يعتبر المكان فی الصحيح لانه يحصل به غلبة الظن.

ولمافی بدائع الصنائع:(۳۰۲/۱،طبع سعید)

لو وجد ميت اوقتيل فی دار الاسلام فان كان عليه سيما المسلمين يغسل ويصلی عليه ويدفن فی مقابر المسلمين وهذا ظاهر وان لم يكن معه سيما المسلمين ففيه روايتان والصحيح انه يغسل ويصلی عليه ويدفن فی مقابر المسلمين لحصول غلبة الظن بكونه مسلما بدلالة المكان وهی دار الاسلام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ سبحانہ اعلم: افتخار احمد کلکتی

۲۸/۱/۱۴۳۰ھ | فتوی نمبر ۱۹۳۵

## ﴿ڈاکہ ڈالنے والے آدمی کی نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی ڈاکہ ڈالتے ہوئے پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہوا تو ایسے شخص کی نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ڈاکہ ڈالنے کے دوران پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے شخص کی نماز جنازہ بطور تعزیر نہ پڑھائی جائے تا کہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔

لمافی التنویر مع الدر والرد:(۱۰۷/۲،طبع امدادیه)

(وهی فرض علی كل مسلم مات خلا) اربعة: (بغاة وقطاع طريق) تحت هذه المسئلة وانهالم يغسلو اولم يصل عليهم اهانتلهم وزجر الغيرهم عن فعلهم.

ولمافی بدائع الصنائع:(۳۱۱/۱،طبع سعید)

واما بيان من يصلی عليه فكل مسلم مات بعد الولادة يصلی عليه صغيرا كان أوكبيرا ذكرا كان او انثی حرا كان أو عبدا الا البغاة وقطاع الطريق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم: محمد صلاح الدین چترالی عفااللہ عنہ

۶ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ | فتوی نمبر: ۲۶۳

## ﴿ناپاک زمین پر نماز جنازہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے برابر میں ایک بڑی سڑک گزر رہی ہے اور کچھ خالی زمین بھی ہے بصورت گلی، اس گلی اور روڈ پر کتے وغیرہ بھی پھرتے رہتے ہیں اور کبھی گلی میں گندہ پانی بھی آجاتا ہے کیا ایسی جگہ پر صف بچھائے بغیر نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: عبدالباسط کوہرنگی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ جو شرطیں نماز کی صحت کے لئے ہیں وہ سب نماز جنازہ کے لئے بھی ضروری ہیں۔

مذکورہ صورت میں اگر زمین خشک ہو اور نجاست کا رنگ اور بو بھی محسوس نہ ہو تو ایسی جگہ پر نماز جنازہ پڑھنا درست ہے کیونکہ نجس زمین خشک ہونے اور نجاست کا رنگ اور بو ختم ہوجانے سے پاک ہوجاتی ہے۔

لمافی الهداية:(۱/۷۰،طبع رحمانيه)

وان اصابت الارض نجاسة فجفت بالشمس وذهب اثرها جازت الصلوٰة على مكانها ــ قوله عليه السلام " ذكاة الارض يبسها".

ولمافی نورالايضاح مع مراقی الفلاح:(ص ۶۵-۶۶،طبع قديمي)

(واذا ذهب اثر النجاسة عن الارض و) قد (جفت) ولو بغير الشمس على الصحيح طهرت و (جازت الصلوٰة عليها) لقوله صلى الله عليه وسلم أيما ارض جفت فقد زكت(دون التيمم منها) فى الاظهر لاشتراط الطيب نصا.

ولمافی الهندية:(۱/۴۴،طبع رشيديه)

(ومنها)الجفاف وزوال الأثر: ألأرض تطهر باليبس وذهاب الأثر للصلاة لاللتيمم هكذافى الكافى. ولافرق بين الجفاف بالشمس والنار والريح والظل.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱/۸۵،طبع سعيد)

ولو اصابت النجاسة الارض فجفت وذهب اثرها، تجوزالصلاة عليها عندنا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۹

## ﴿تنہا عورتوں کا نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام دریں مسئلہ کہ نماز جنازہ کے لئے اگر مرد نہ ہوں تو

تنہا عورتوں کے پڑھنے سے فرض ساقط ہوجائے گا یا نہیں؟ مستفتی: عبدالرزاق

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تنہا عورتوں کی جنازہ کی جماعت بلا کراہت درست ہے اور نماز جنازہ ادا ہوجاتی ہے بلکہ اگر تنہا ایک عورت بھی نماز جنازہ پڑھ لے تو فرض ساقط ہوجائے گا۔

لما فی التنویر وشرحہ:(۲/۳۰۵،طبع امدادیہ)

(و)یکرہ تحریما (جماعة النساء) ولو فی التراویح فی غیر صلاۃ جنازۃ.

وفی الشامیة:قال فی الفتح: واعلم ان جماعتهن لاتکره فی صلاة الجنازة لانها فریضة وترک التقدم مکروه.

ولما فی الهندیة:(۱/۸۵،طبع رشیدیه)

ویکره امامة المرأة للنساء فی الصلوات کلها من الفرائض والنوافل الافی صلاة الجنازة.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صلاح الدین ڈیروی

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۴۵۵

## ﴿نماز جنازہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ درج ذیل مسئلہ کے بارے میں مفتیان حضرات کیا فرماتے ہیں کہ جنازہ میں شرکت تو فرض کفایہ ہے، لیکن اگر جنازہ مسجد یا مدرسہ میں رکھ دیا جائے اور اسکا اعلان ہوجائے تو اسکا حکم للحاضرین فرض کفایہ ہی رہتا ہے یا حکم بدل جاتا ہے۔ مستفتی: احسان اللہ چارسدہ

﴿جواب﴾ ویسے تو نماز جنازہ فرض کفایہ ہے حاضر ہونے کی صورت میں تاکید زیادہ ہوجاتی ہے، چنانچہ نماز جنازہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پانی کے ہوتے ہوئے بھی فقہاء کرام نے تیمم کو جائز قرار دیا ہے، اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جنازہ حاضر ہونے کی باوجود نہ پڑھنا عبادت اور اجتماعیت سے اعراض ہے جو کہ شریعت میں مذموم ہے، لیکن فرض عین کہنا مشکل ہے۔

لما فی الهندیة:(۱/۱۶۵ طبع رشیدیه)

ولاینبغی ان یرجع من جنازة حتیٰ یصلی علیه وبعدما صلی لایرجع الاباذن اهل الجنازة قبل الدفن.

ولما فی تقریرات الرافعیؒ علی حاشیة ابن عابدین :(۲/۱۱۹ طبع سعید)

(قول المصنف فرض کفایة)فی السندی ثم انه قیل کون صلاة الجنازة فرض کفایة مقید بما اذا لم یکن الناس حاضرین فی مجلس الجنازة لانه ذکر فی فتاوی

قاضیخان وظہیر الدین والمستصفی قال السید الامام ناصر الدین واذا لم یکن الناس حاضرین فی مجلس الجنازۃ ولم یعاینوھا فالصلاۃ علیھا فرض کفایۃ واما عند حضورھم ومشاھدتھم فالصلاۃ واجبۃ علی کل واحد من الناس باداء نفسہ لانھا حینئذ فرض عین ولا خلاف فیہ اصلا ----وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم: صلوا علی صاحبکم مع حضورہ دلیل علی عدم افتراضھا علی کل حاضراہ .لکن الأولی مراجعۃ الکتب التی نسب لھا القول بالافتراض عند الحضور وقد راجعت فتاوی قاضیخان فلم اجد ھذہ المسئلۃ فیھا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۷۷۷

## ﴿وضو میں بلا عذر تاخیر کرنا اور پھر تیمم کر کے نماز جنازہ میں شریک ہونا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص نماز جنازہ کے لیے اس وقت حاضر ہوا جبکہ نماز جنازہ کی ادائیگی میں ۲۰ منٹ یا آدھ گھنٹہ باقی تھا اور پانی بھی موجود تھا اس شخص نے باوجود معلوم ہونے کے کہ میرا وضو نہیں، وضو نہ کیا حتی کہ نماز جنازہ کی ادائیگی کا وقت قریب ہوا تو عین اس وقت اس نے جلدی سے تیمم کر کے نماز جنازہ میں شریک ہو گیا کیا اس کی نماز جنازہ ہو گئی؟

المستفتی: رضوان اللہ حقانی پشاور

﴿جواب﴾ مذکورہ شخص کا پہلے سے نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ تھا اور پانی بھی موجود تھا اس کے باوجود وضو نہ کرنا احکام دینیہ میں غفلت اور سستی کا مظاہرہ ہے جس کی وجہ سے وہ سخت گناہ گار ہو گیا ہے، اس پر توبہ واستغفار لازم ہے باقی نماز جنازہ از روئے فتویٰ اگر چہ ادا ہو گئی ہے لیکن قبولیت خطرہ میں ہے۔

لما فی الدر المختار: (۲۴۱/۱، طبع سعید)

(و) جاز (لخوف فوت صلاۃ جنازۃ): ای کل تکبیراتھا وفی الشامیۃ ای ولو کان الماء قریبا.

ولما فی بدائع الصنائع للکاسانی: (۵۱/۱ طبع سعید)

وھذا الشرط الذی ذکرنا لجواز التیمم وھو عدم الماء فیما وراء صلاۃ الجنازۃ وصلاۃ العیدین فاما فی ھاتین الصلاتین فلیس بشرط بل الشرط فیھما خوف الفوت الخ.

ولما فی الھندیۃ: (۳۱/۱، طبع رشیدیہ)

والاصل ان کل موضع یفوت فیہ الاداء لاالیٰ خلف فانہ یجوز لہ التیمم الخ.

ولما فی البحر الرائق:(۱۱۵/۱،طبع سعید)

اما علیٰ ظاہر الروایۃ فیجوز التیمم للکل عند خوف الفوت.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۲۶

## ﴿مرد اور عورت پر ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک گھر میں عورت کا انتقال ہو جائے اور دوسرے گھر میں مرد کا انتقال ہو جائے تو کیا دونوں کا نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: فضل الرحمٰن

﴿جواب﴾ بہتر یہ ہے کہ الگ الگ پڑھا جائے تاہم اگر دونوں کا ایک ساتھ پڑھا جائے تو یہ بھی جائز ہے ایک ساتھ پڑھنے کی صورت میں امام صاحب کے سامنے پہلے مرد کا جنازہ رکھا جائے پھر عورت کا۔

لما فی الھندیۃ:(۱۶۵/۱ طبع رشیدیہ)

ولو اجتمعت الجنائز یخیر الامام ان شاء صلی علی کل واحد علی حدۃ وان شاء صلی علی الکل دفعۃ بالنیۃ علی الجمیع (وقال بعد سطر) و ترتیبھم بالنسبۃ الی الامام کترتیبھم فی صلاتھم خلفہ حالۃ الحیاۃ فیقرب منہ الافضل فالافضل فیصف الرجال الی جھۃ الامام ثم الصبیان ثم الخنائی ثم النساء ثم المراھقات.

ولما فی منحۃ الخالق علی ھامش البحر:(۱۸۷/۲ طبع سعید)

ولو اجتمعت الجنائز جاز ان یصلی علیھم صلاۃ واحدۃ و یجعلون واحداً خلف واحد ویجعل الرجال مما یلی الامام ویستوی فیہ الحر والعبد فی ظاھر الروایۃ ثم الصبیان ثم الخنائی ثم النساء وان شاؤا جعلوھم صفاً واحداً.

ولما فی الدر المختار:(۲۱۸/۲ طبع سعید)

(واذا اجتمعت الجنائز فافراد الصلوۃ اولی) من الجمع (وان جمع جعلھا صفاً مما یلی القبلۃ) واحداً خلف واحد (بحیث یکون صدر کل) جنازۃ (مما یلی الامام) لیقوم بحذاء صدر الکل (وراعی الترتیب) المعھود خلفہ حالۃ الحیاۃ فیقرب منہ الافضل فالافضل الرجل مما یلیہ فالصبی، فالخنثی فالبالغۃ فالمراھقۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ چارسدوی

۳ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۷۲۷

## ﴿نماز جنازہ میں رفع یدین کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں رفع یدین صرف پہلی تکبیر پر کرنا چاہیئے یا ہر تکبیر پر؟ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ نماز جنازہ میں پہلی تکبیر پر رفع یدین کرنا چاہیئے، یہی نبی کریم ﷺ کا معمول تھا، اس لئے بقیہ تکبیروں پر رفع یدین نہ کرے۔

لما فی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص۵۸۶،طبع قدیمی)

(ولا یرفع یدیه فی غیر التکبیرۃ الاولی)فی ظاهر الروایة قال العلامة الطحطاوی :وهو الصحیح نهر عن المبسوط لما روی الدارقطنی عن ابن عباسؓ وابی هریرۃؓ ان النبی ﷺ کان اذا صلی علی جنازۃ رفع یدیه فی اول تکبیرۃ،ثم لا یعود ولان کل تکبیرۃ قائمة مقام رکعة،وغیر الرکعة الأولی لا رفع فیها فکذا تکبیرات الجنازۃ.

لما فی الهندیة:(۱/۱۶۴،طبع رشیدیه کوئٹه)

ولا یرفع یدیه الا فی التکبیرۃ الاولی فی ظاهر الروایة کذافی العینی شرح الکنز.

لما فی الدرالمختار:(۲/۱۰۹،طبع امدادیه ملتان)

(یرفع یدیه فی الاولی فقط) وقال ائمة بلخ فی کلها.

وفی الشامیة:وهو قول الائمة الثلاثةؒ وروایة عن ابی حنیفةؒ کمافی شرح درر البحار، والاول ظاهر الروایة.

الجواب صحیح :عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الأحد

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتوی نمبر:۱۰۵۶

## ﴿نماز جنازہ میں جماعت شرط نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر نماز جنازہ صرف ایک شخص پڑھ لے تو نماز ہو جائیگی یا نہیں؟　　　　مستفتی: دولت شاہ فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ نماز جنازہ میں جماعت شرط نہیں ہے صرف ایک شخص کے ادا کرنے سے بھی نماز ہو جائیگی اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، البتہ ولی کی اجازت کے بغیر اس شخص نے نماز پڑھی ہو تو دوبارہ نماز جنازہ ادا کرنے کی گنجائش ہے۔

لما فی الدرالمختار:(۲/۲۰۸،طبع سعید)

فلو ام بلا طهارۃ والقوم بها اعیدت وبعکسه لا.

وفی الشامیۃ تحت قولہ:(وبعکسہ لا)ای لا تعاد لصحۃ صلاۃ الامام وان لم تصح صلاۃ من خلفہ ......وبھذا تبین انہ لاتجب صلاۃ الجماعۃ فیھا.

ولما فی الھندیۃ:(۱/۱۶۴،طبع رشیدیہ)

لان صلی غیر الولی او السلطان اعاد الولی ان شاء کذا فی الھدایۃ.ولوکان الامام علی غیر الطھارۃ تعاد وان کان الامام علی طھارۃ والقوم علی غیر طھارۃ صحت صلاۃ الامام ولاتعاد الصلاۃ علیہ.

ولما فیہ ایضا:(۱/۱۶۲،طبع رشیدیہ)

والصلاۃ علی الجنازۃ تتادی باداء الامام وحدہ لان الجماعۃ لیست بشرط الصلاۃ علی الجنازۃ

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۲۸صفر الخیر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۴۳۶۳

## ﴿متعدد اموات کا ایک ہی جنازہ کافی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک وقت میں متعدد جنازے جمع ہو جائیں تو ہر ایک پر الگ الگ جنازہ پڑھنا ضروری ہے یا تمام کے لیے ایک ہی جنازہ کافی ہے؟ مستفتی:فضل غنی صاحب

﴿جواب﴾ تمام پر ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھنا کافی ہے ہر ایک پر الگ نماز پڑھنا کوئی ضروری نہیں ہے، تاہم ہر ایک پر مستقل نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے۔

لما فی الدر المختار:(۲/۲۱۸،طبع سعید)

(واذا اجتمعت الجنائز فافراد الصلاۃ)علی کل واحدۃ(اولی) (وان جمع)جاز.

ولما فی الھندیۃ:(۱/۱۶۵،طبع رشیدیہ)

ولو اجتمعت الجنائز یخیر الامام ان شاء صلی علی کل واحد علی حدۃ وان شاء صلی علی الکل دفعۃ بالنیۃ علی الجمیع.

ولما فی التاتارخانیۃ:(۲/۱۱۹،طبع قدیمی)

اذا اجتمعت الجنائز فالامام بالخیار ان شاء صلی علی کل جنازۃ صلاۃ علیٰ حدۃ وان شاء صلیٰ علیھا صلاۃ واحدۃ وتجزی عن الکل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:رضوان اللہ

۲۳جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۱۹۴

## ﴿غائبانہ نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ ہم نے سنا ہے کہ احناف کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ صحیح نہیں آج کل جو بہت سارے مقامات پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے کیا ہم حنفی مسلک کے لوگ اس میں شریک ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ احناف کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں ہے کیونکہ احناف کے نزدیک نماز جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ میت سامنے حاضر ہو، لہٰذا اگر کسی جگہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جارہی ہو تو حنفی مسلک والوں کو چاہیئے کہ اس میں شریک ہونے سے اجتناب کریں۔

لمافی البحر الرائق:(۱۷۹/۲،طبع سعید)

وزادفی فتح القدیر وغیرہ شرطاثالثافی المیت وھووضعہ امام المصلی فلا تجوز علی غائب.

ولمافی الھندیۃ:(۱۶۲/۱،طبع رشیدیہ)

ومن الشروط حضور المیت ووضعہ وکونہ امام المصلی فلاتصح علی غائب ولاعلی محمول علی دابۃ ولاعلی موضوع خلفہ ھکذافی النھرالفائق.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲۰۸/۲،طبع سعید)

وشرطھا(ایضا)حضورہ (ووضعہ) وکونہ ھوأواکثرہ امام المصلی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز عفی عنہ

۱۲رجب المرجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۱۰۷۳

## ﴿نماز جنازہ کے بعد دعا کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اسی طرح دفنانے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگنا جائز ہے یا نہیں اور ایسے ہی میت کو دفن کر چکنے کے بعد قبرستان سے باہر جا کر دعا کرتے ہیں اس کا بھی قرآن وحدیث اور فقہ سے کوئی ثبوت ہے یا نہیں ہے؟

﴿جواب﴾ نماز جنازہ خود ایک دعا ہے شارع علیہ السلام نے میت کے لیے دعا کرنے کا جو طریقہ مشروع قرار دیا ہے اس سے بہتر طریقہ ہم امتی لوگ کہاں تجویز کر سکتے ہیں چنانچہ وضو کے ساتھ امام کی اقتداء میں تمام لوگ قبلہ رخ ہو کر صفیں باندھ کر تکبیر کہہ کر ثناء پڑھتے ہیں جس میں

اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرتے ہیں، پھر تکبیر کہہ کر حضور ﷺ پر درود بھیجتے ہیں پھر تکبیر کہہ کر دعا مانگتے ہیں، اس کے بعد اور دفن سے پہلے اجتماعی دعا مانگنا شرعاً جائز نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے سلف صالحین کے زمانے میں یہ دعا بالکل نہ تھی، نیز احادیث اور اقوال فقہاء کرام میں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ وہ لوگ ہم سے زیادہ دعاؤں کا اہتمام کرنے والے اور دین کا مزاج سمجھنے والے تھے، البتہ دفنانے کے بعد حضور ﷺ سے قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنے کا ثبوت ہے، قبرستان سے باہر جا کر دعا مانگنے کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں ہے اس لئے اس کو ترک کر دینا ضروری ہے۔

لما فی العنایۃ علی هامش فتح القدیر:(۱۲۶/۲ طبع رشیدیه)

ولیس بعدها دعاء الا السلام فی ظاهر الروایة.

ولما فی العالمگیریة:(۱۶۴/۱، طبع رشیدیه)

ولیس بعد التکبیرۃ الرابعة قبل السلام دعاء هکذا فی شرح الجامع الصغیر لقاضی خان وهو ظاهر المذهب هکذا فی الکافی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: غضنفر حیات کمالوی

۱۵ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۶۳۰

## ﴿مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ نماز جنازہ مسجد میں ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور مسجد کے اندر ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی؟ مستفتی: محمد نصیر

﴿جواب﴾ مسجد میں بلا عذر نماز جنازہ ادا کرنا مکروہ تنزیہی ہے، اور عذر کی صورت میں گنجائش ہے، اگر میت سے مسجد کے ناپاک ہونے کا اندیشہ ہو تو مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ مسجد کو پاک رکھنا واجب ہے۔

لما فی حاشیة المشکوۃ:(ص ۱۴۵، طبع سعید)

"عن ابی هریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی علی میت فی المسجد فلا اجر له وروی فلا شیء له" ثم هی کراهة تنزیه او تحریم روایتان یظهر ان الاولیٰ کونها تنزیها اذا الحدیث لیس هو نهیا غیر معروف ولا قرن الفعل بوعید.

ولما فی فتح القدیر:(۱۳۲/۲ طبع رشیدیه)

(قوله فلا یصلی علی میت فی مسجد جماعة) فی الخلاصة مکروه سواء کان المیت

والقوم في المسجد او كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد او كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقون في المسجد او الميت في المسجد والامام والقوم خارج المسجد هذا في الفتاوى الصغرى قال هو المختار خلافا لما أورده النسفي اه وهذا الاطلاق في الكراهة بناء على ان المسجد انما بني للصلاة المكتوبة و توابعها من النوافل والذكر وتدريس العلم ---ثم هي كراهة تحريم او تنزيه روايتان و يظهر لي ان الاولى كونها تنزيهية اذالحديث ليس هونهيا غير معروف ولاقرن الفعل بوعيد بظني بل سلب الاجر وسلب الأجر لا يستلزم ثبوت استحقاق العقاب لجواز الاباحة الخ.

ولما في رد المحتار:(۲/۲۲۶،طبع سعيد)

[تتمة]:انما تكره في المسجد بلا عذر فان كان فلا. ومن الاعذار المطر كما في الخانية----ام من العذر ما جرت به العادة في بلادنا من الصلاة عليها في المسجد لتعذر غيره اوتعسره بسبب اندراس المواضع التي كانت يصلى عليها فيها. فمن حضرها في المسجد ان لم يصل عليها مع الناس لا يمكنه الصلاة عليها في غيره. ولزم ان لا يصلي في عمره على جنازة---فينبغي الافتاء بالقول بكراهة التنزيه الذي هو خلاف الاولى كما اختاره المحقق ابن الهمام، واذا كان ما ذكرنا عذرا فلا كراهة اصلا، والله تعالى اعلم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین عفی عنہ

۲۰ جمادی الاولی ۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر: ۹۱۴

## ﴿مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ جس مسجد میں باقاعدہ جنازگاہ ہو کیا میت کو وہاں لیجانا ضروری ہے یا پھر اپنی سہولت کے لئے جو مسجد قریب ہو، وہیں پر نماز جنازہ ادا کردی جائے۔ مستفتی: حاجی نصیر برخوردار یہ ابوبکر مسجد ڈیفنس فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ جو مسجد پنج وقتہ نمازوں کے لئے بنائی گئی ہو ایسی مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، البتہ مسجد کے احاطہ میں ایسی جگہ ہو جو مسجد کا حصہ نہ ہو مثلاً لان وغیرہ تو اس میں بلا کراہت نماز جنازہ پڑھنے کی گنجائش ہے، اور جہاں ایسی سہولت میسر نہ ہو تو میت کو جنازگاہ یا کسی بھی خالی میدان لیجانا چاہیے، اور اگر کسی علاقہ میں جنازگاہ نہ ہو اور کوئی خالی میدان بھی نہ ہو اور باہر لیجانے میں دشواری ہو تو مسجد سے باہر میت کو رکھ کر امام بھی کچھ مقتدیوں کے ساتھ مسجد سے باہر ہو باقی صفیں مسجد کے اندر ہوں تو ایسی صورت میں اس کی بھی گنجائش ہے۔

لما في الدر مع الرد:(۲/۲۲۴-۲۲۵،طبع سعيد)

(وكرهت تحريما)وقيل(تنزيها في مسجد جماعة هو)اى الميت(فيه)وحده او مع القوم (واختلف في الخارجة)عن المسجد وحده او مع بعض القوم( والمختار الكراهة)مطلقا خلاصة..... لاطلاق حديث ابي داؤد من صلى على ميت في المسجد فلا صلاة له.

وفي الشامية:قوله مطلقا اى في جميع الصور المتقدمة كما في الفتح عن الخلاصة وفي مختارات النوازل سواء كان الميت فيه او خارجه هوظاهر الرواية وفي رواية لا يكره اذاكان الميت خارج المسجد .(قوله بناء على ان المسجد الخ ) اما اذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره اذا كان الميت خارج المسجد وحده اومع بعض القوم .قال في شرح المنية واليه مال في المبسوط والمحيط وعليه العمل وهو المختار. قلت بل ذكر في غاية البيان والعناية انه لا كراهة فيها با لاتفاق لكن رده في البحر واجاب في النهر بحمل الاتفاق علىٰ عدم الكراهة في حق من كا خارج المسجد وما مر في حق من كا ن داخله.

ولما في الهندية:(۱/۱۶۵، رشيديه)

اما المسجد الذى بنى لاجل الجنازة فلا تكره فيه.

ولما في الشامي:(۲/۲۲۶،طبع سعيد)

انما تكره في المسجد بلا عذر فان كان فلا ومن الاعذار المطر والاعتكاف الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۱۰رجب المرجب ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۴۷۲

## ﴿نماز جنازہ میں دو تکبیرات فوت ہو جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی شخص سے نماز جنازہ میں دو تکبیریں فوت ہو جائیں تو وہ ان کی ادائیگی کس طرح کرے گا؟ مستفتی:نور حسین

﴿جواب﴾ تاخیر سے نماز جنازہ میں شریک آدمی سے اگر کچھ تکبیرات رہ گئیں تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ترتیب کے مطابق فوت شدہ تکبیرات اذکار ودعا سمیت ادا کرے اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ دعا واذکار لوٹاؤ نگا تو میت اٹھالی جائی گی تو صرف پے در پے تکبیرات لوٹانے پر اکتفا کرے، تکبیرات فرض ہیں اور نماز جنازہ میں میت کا سامنے ہونا نماز کی صحت کیلئے شرط ہے۔

لما في مراقي الفلاح:(ص۵۹۴،طبع قديمي)

ثم يقضي المسبوق مافاته من التكبيرات قبل رفع الجنازة مع الدعاء ان امن رفع الجنازة والا كبر قبل وضعها على الاكتاف متتابعاً اتقاء عن بطلانها بذهابها.

قال الطحاویؒ تحت هذاالقول (والاکبر قبل وضعها علی الاکتاف) قال فی الشرح والحاصل انه مادامت الجنازة علی الارض فالمسبوق یاتی بالتکبیرات، فاذارفعت الجنازة علی الاکتاف لایاتی بالتکبیرات.

ولمافی الهندیة:(۱/۲۶۴-۲۶۵،طبع رشیدیه)

واذاجاء رجل وقدکبر الامام التکبیرة الاولی ولم یکن حاضرا انتظره حتی یکبر الثانیة ویکبر معه فاذافرغ الامام کبر المسبوق التکبیرة التی فاتته قبل ان ترفع الجنازة وهذاقول ابی حنیفة ومحمدؒ. وکذاان جاء وقدکبر الامام تکبیرتین اوثلاثاً کذافی السراج الوهاج.

ولمافی الدر المختار:(۲/۱۱۶،طبع امدادیه)

ثم یکبران (المسبوق والحاضر) مافاتهمابعدالفراغ نسقاً (بلادعاء ان خشیارفع المیت علی الاعناق)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین

۲۹ جمادی الاخری ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر:۱۰۰۵

## ﴿قریب المرگ شخص کو شہادتین کی تلقین کا حکم﴾

﴿سوال﴾ قریب المرگ شخص کو کلمہ شریف کی تلقین کس طرح کرنی چاہئے؟ اور تلقین اسکے رشتہ داروں میں سے کون کرے؟ اگر ایک مرتبہ وہ کلمہ شریف پڑھ لے تو کافی ہے یا روح نکلنے تک تلقین کرنی چاہیئے؟

﴿جواب﴾ جب موت کے اثرات ظاہر ہو جائیں تو اسکو اسطرح چت لٹانا چاہئے کہ قبلہ اسکے داہنی طرف ہو اور چہرہ بھی تھوڑا سا قبلہ کی طرف کرنا چاہئے اور اگر تکلیف کا اندیشہ ہو تو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہئے، پھر اسکے پاس آہستہ آہستہ کلمہ شریف کا ورد کرنا چاہئے لیکن اسکو پڑھنے کیلئے نہ کہا جائے اور جب ایک مرتبہ کلمہ پڑھ لے تو پھر خاموش ہونا چاہیے بس یہ ایک مرتبہ کہنا کافی ہے، البتہ ایک مرتبہ کہنے کے بعد اگر وہ کوئی اور بات کرے تو دوبارہ تلقین کرنی چاہئے۔ جب روح نکلنا شروع ہو جائے تو پھر زور زور سے کلمہ پڑھنا چاہیے اور قریب بیٹھ کر سورہ یٰسین شریف بھی پڑھنا چاہیے اس سے روح نکلنے میں آسانی ہوتی ہے۔

تلقین کیلئے کوئی شخص معین نہیں ہے جو بھی رشتہ دار وہاں موجود ہوں مذکورہ طریقہ پر تلقین کریں، البتہ اگر قریبی رشتہ دار، بہن بھائی والدین دوست احباب موجود ہوں تو بہتر یہ ہے کہ وہ تلقین کریں۔

لما فی البحر الرائق:(۱۷۰/۲،طبع سعید)

(قوله ولی المحتضر القبلة علی یمینه)أی وُجِّهَ وَجْهُهُ من حضره الموت ..... وانما یوجه الی القبلة علی یمینه لانه السنة المنقولة .... (قوله ولقن الشهادة)بان یقال عنده لااله الا الله محمد رسول الله ولا یومر بها للحدیث الصحیح من کان آخر کلامه لااله الاالله دخل الجنة وهو تعریض علی التلقین بها عند الموت فیفید الاستحباب ..... فاذا قالها مرة کفاه ولا یکثر علیه مالم یتکلم بعد ذلک .... وفی القنیة لشتد مرضه ودنا موته فالواجب علی اخوانه واصدقائه ان یلقنوه الشهادة وینبغی ان یکون مستحبا کما قدمناه.

ولما فی الدر المختار:(۱۹۰/۲-۱۹۱،طبع سعید)

(ویلقن) ندبا وقیل وجوبا (بذکر الشهادة عنده)قبل الغرغرة (من غیر امره بها )لئلا یضجر واذاقالها مرة کفاه ولا یکرر علیه ما لم یتکلم لیکون آخر کلامه لااله الاالله ویندب قراءة یٰسین والرعد .و(احکام المیت ص۲۲،۲۳)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ

ارجب المرجب ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۱۰۳۶۱

﴿ کچھ دیر زندہ رہنے کے بعد مرجانے والے بچے کے کان میں اذان دینا ضروری نہیں ہے ﴾

﴿سوال﴾ بچہ پیدا ہونے کے بعد کچھ دیر زندہ رہا پھر مر گیا مرنے کے بعد اس کے کان میں اذان دی جائے یا نہیں اسی طرح غسل، کفن ودفن کی تفصیل سے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ ایسا بچہ جو کچھ دیر زندہ رہنے کے بعد مرجائے اور اس کے کان میں اُذان دینے کا موقع نہ ملے تو مرنے کے بعد اُذان کہنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اس کا نام رکھ کر غسل دیا جائے اور نماز جنازہ پڑھی جائے، بچہ ہو تو ایک کپڑا میں بچی ہو تو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے اگر بالغوں کی طرح تین یا پانچ کپڑوں میں کفنایا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

لما فی تقریرات الرافعی :(۴۵/۱،طبع سعید)

(قوله حتی قالوا فی الذی یؤذن للمولود ینبغی ان یحوّل ) قال السندی فیرفع المولود عند الولادة..... وفائدة الأذان فی أذنه انه یدفع ام الصبیان عنه اه (تقریرات رافعی متعلقه.

ولما فی الدر المختار:(۲۲۷/۲-۲۲۸،طبع سعید)

" ومن ولد فمات یغسل ویصلی علیه" و یرث ویورث ویسمی ان استهل .... "والا" یستهل "غسل وسمی "عند الثانی وهو الاصح فیفتی به..... الخ.

ولما فی حلبی کبیر:(ص ۵۷۹،طبع سهیل اکیڈمی)

ولا یؤخذ شئ من شعر المیت ولا ظفره ولا یختن لما روی عن عائشۃؓ انها انکرت

ذالک ..... ولان السنة ان یدفن المیت بجمیع اجزائه لاحترامه ولان ذالک فی الحی یفعل للزینة والمیت قد فارق الزینة اهلها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر ۱۲۸۰

## ﴿نماز جنازہ سنتوں کے بعد ادا کرنا بہتر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ سنتوں کے بعد ادا کی جائے یا فرض کے فوراً بعد یہاں کا عمل حرم شریف کے خلاف نظر آرہا ہے جبکہ رائیونڈ میں بھی فرض کے فوراً بعد جنازہ کی نماز پڑھانے کا معمول ہے۔ مستفتی: بھائی حنیف ڈیفنس

﴿جواب﴾ نماز جنازہ فرض کے فوراً بعد ادا کی جائے یا سنتوں سے فارغ ہونے تک مؤخر کی جائے، کتب فقہ میں دونوں طرح کی روایات ہیں، البتہ بہتر یہ ہے کہ سنتوں سے فارغ ہو کر نماز جنازہ ادا کی جائے، اسلئے کہ نماز جنازہ مسجد سے باہر ادا کرنے کا حکم ہے، فرض سے فارغ ہو کر لوگ جنازہ کیلئے باہر نکلیں گے، تو سنتوں کے چھوٹنے کا اندیشہ ہے اور مسبوقین کے سامنے سے گزرنے کا بھی اندیشہ ہے۔

حرم شریف کے اندر نماز جنازہ ادا کرنے کی شرعاً گنجائش ہے. نیز میت کو سنبھالنے کا بھی بندوبست ہوتا ہے یا میت کے متعلقین پہلے سے اس کا انتظام کر لیتے ہیں عام لوگوں کی نماز متاثر نہیں ہوتی. جبکہ ہماری مساجد میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہوتا، البتہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے بعض مساجد میں محراب کے سامنے ایک صف کی گنجائش کے ساتھ جنازہ کیلئے باہر جگہ ہوتی ہے. اور اکثر نمازی مسجد کے اندر اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو کر جنازہ ادا کرتے ہیں، نماز سے فارغ ہو کر میت کو سنبھالنے کا بھی بندوبست ہوتا ہے تو ایسی مساجد میں اگر سنتوں سے پہلے نماز جنازہ ادا کیجائے تو زیادہ بہتر ہے اور رائیونڈ میں بھی شاید یہی صورت ہوتی ہے۔

لمافی الدر مع الرد: (۱۶۷/۲ طبع سعید)

(و) تقدم (صلاة الجنازة علی الخطبة) و علی سنة المغرب وغیرها .... لکن فی البحر قبیل الأذان عن الحلبی الفتوی علی تأخیر الجنازة عن السنة وأقره المصنف کأنه الحاق لها بالصلاة ".

وفی الشامیة: (قوله وغیرها) کسنة الظهر والجمعة و العشاء."

ولمافی البحر الرائق:(۲۵۳/۱،طبع سعید)

"وقد قدمنا انه يبدأ بصلاة المغرب ثم يصلون على الجنازة ثم يأتون بالسنة و لعله بيان الافضل وفي شرح المنية معزياً الى حجة الدين البلخي ان الفتوى على تأخير صلاة الجنازة عن سنة الجمعة وهي سنة فعلىٰ هذا تؤخر عن سنة المغرب لانها آكد.

ولمافی حلبی کبیر:(ص۶۰۷،طبع سهیل اکیڈمی)

"ولو حضرت الجنازة في وقت المغرب تقدم صلاة المغرب ثم تصلى الجنازة ثم سنة المغرب وقيل تقدم السنة ايضا علىٰ الجنازة.

ولمافی الشامیة:(۲۲۶/۲-۲۲۷،طبع سعید)

"انما تكره في المسجد بلا عذر فان كان فلا ... كما اختاره المحقق ابن الهمام واذا كان ما ذكرناه عذرا فلا كراهة اصلاً والله تعالىٰ اعلم.

ولمافی الطحطاوی:(ص۵۹۵،طبع قدیمی)

"وينبغي أن لا يكون خلاف في المسجد الحرام فانه موضع للجماعات و الجمعة والعيدين والكسوفين و الاستسقاء و صلاة الجنازة الخ".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

۲۶ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۱۲۹

## ﴿نمازِ عصر کے بعد اور دوسرے مکروہ اوقات میں نماز جنازہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ عصر کے بعد جنازہ ادا کرنا کیسا ہے، جائز ہے یا ناجائز اور دیگر مکروہ اوقات کا کیا حکم ہے۔ مستفتی: گل واحد شبقدر پشاور

﴿جواب﴾ نمازِ عصر کے بعد نماز جنازہ ادا کرنا بلا کراہت صحیح ہے، بشرطیکہ غروب آفتاب کا وقت قریب نہ ہو، اسی طرح طلوع آفتاب اور زوال کے وقت بھی نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ مکروہ وقت داخل ہونے سے پہلے نماز ادا کر لیا جائے، البتہ عین مکروہ اوقات میں جنازہ کو مؤخر کرنا بھی غلط ہے، جیسے ہی میت حاضر ہو نماز جنازہ ادا کرنا چاہیئے۔

لمافی التاتار خانیه:(۱۳۵/۲،طبع قدیمی)

ويكره صلاة الجنازة عند طلوع الشمس واستوائها و غروبها، وان صلوها لم تكن عليهم اعادتها، ولو ادى بعد طلوع الفجر او بعد العصر لايكره.

ولمافی رد المحتار:(۲۰۷/۲،طبع سعید)

وسبب وجوبها الميت المسلم كما في الخلاصة، ووقتها وقت حضوره، ولذا قدمت

علی سنة المغرب کما فی الخزانة......الی قوله وتکره فی الاوقات المکروهة.

ولمافی خلاصة الفتاوی: (۱/۲۲۳،طبع رشیدیه)

اما صلاة الجنازة عند طلوع الشمس والغروب والزوال فمکروه. فان صلوها لم یکن علیهم الاعادة،واما بعد غروب الشمس بدؤا بالمغرب ثم بصلاة الجنازة ثم بسنة المغرب کذا افتی شمس الائمة الحلوانیؒ.

ولمافی التجنیس والمزید لصاحب الهدایة:(۲/ ۲۴۳،طبع ادارة القرآن)

ویکره صلاة الجنازة عند طلوع الشمس،و عند استوائها فی الظهیرة وعند غروبها، وهو معروف،فان صلوها فی هذه الاوقات،لم یکن علیهم اعادتها لان سبب وجوبها حضور الجنازة وقد حضرت فی هذه الاوقات فوجبت، فوجبت مع النقصان من حیث الاداء فی هذه الاوقات فقد ادوها ناقصة کما وجبت.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد ادریس چارسدوی عفی عنہ

۱۰/محرم الحرام ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۰۷۸

## ﴿نماز فجر اور عصر کے بعد جنازہ پڑھنے کی اجازت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز فجر اور عصر کے بعد نماز جنازہ پڑھنے کی گنجائش ہے یا دوسری نوافل کی طرح نماز جنازہ کی بھی اجازت نہیں؟ بعض لوگ اس وقت نماز جنازہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔

﴿جواب﴾ نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک ،اسی طرح طلوع فجر یعنی صبح صادق سے لیکر آفتاب تک نوافل پڑھنا منع ہے،نمازہ جنازہ جائز ہے،نوافل اور نماز جنازہ کا ایک حکم نہیں ہے۔البتہ عصر کے وقت سورج جب غروب کے قریب ہو اسی طرح طلوع آفتاب اور زوال کے وقت نماز جنازہ پڑھنا بھی منع ہے۔

لمافی البدائع :(۲/۳۲۹طبع بیروت)

ولاتکره الصلاة علی الجنازة بعدصلاة الفجروبعد صلاة العصر قبل تغیر الشمس لان الکراهة فی هذه الاوقات لیست لمعنی فی الوقت ،فلایظهر فی حق المیت .

لما فی الهندیة : (۱/۵۲طبع رشیدیه کوئٹه )

تسعة اوقات یکره النوافل ومافی معناها لا الفرائض ــــ منها ما بعد صلاة الفجرقبل طلوع الشمس هکذافی النهایة والکفایة. .

لما فی التاتارخانیة :(۱/۴۰۱طبع قدیمی)

وفی الخانیة : تسعة اوقات یجوز فیها قضاء الفائتة وصلاة الجنازة وسجدة التلاوة

ولا یجوز فیھا نفل لھا سبب کالمنذورۃ ۔ بعد الفریضۃ قبل طلوع الشمس، وبعد العصر قبل التغیر۔

لما فی الھندیۃ :(۵۲/۱طبع رشیدیہ)

ثلاث ساعات لا تجوز فیھا المکتوبۃ ولا صلاۃ الجنازۃ ولا سجدۃ التلاوۃ ،اذا طلعت الشمس حتی ترتفع وعند الانتصاف الی ان تزول وعند احرارھا الی ان تغیب الا عصر یومہ فانہ یجوز اداؤہ عند الغروب ھکذا فی فتاوی قاضی خان۔

الجواب صحیح :مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :عزیز احمد خضداری غفر لہ ولوالدیہ

۲۹ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر :۳۱۱۵

## ﴿امام بھولے سے پانچویں تکبیر کہدے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام صاحب نے نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے بھولے سے پانچویں تکبیر کہہ دی تو اس صورت میں مقتدی کے لیے کیا حکم ہے آیا امام کی اقتداء کرے گا یا نہیں؟ مستفتی: حنیف خان

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں مقتدی کو امام کی اقتداء پانچویں تکبیر میں نہیں کرنی چاہیے اور خاموش کھڑے ہو کر امام کے سلام پھیرنے کا انتظار کرنا چاہیے اور امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیے۔

لما فی التنویر وشرحہ:(۱۱۲/۲،طبع امدادیہ)

(ولو کبر امامہ خمسا لم یتبع فیمکث المؤتم حتی یسلم معہ اذا سلم)بہ یفتی.

ولما فی الولوالجیۃ :(۱۵۵/۱،طبع فاروقیہ پشاور)

الامام اذا کبر علی الجنازۃ خمسا فالمقتدی لا یتابعہ لانہ منسوخ ثم ما ذا یصنع ؟ عن ابی حنیفۃ روایتان یسلم للحال ولا ینتظرہ تحقیق للمخالفۃ وفی روایۃ یمکث حتی اذا سلم یسلم معہ فیصیر متابعا فیما وجبت المتابعۃ فیہ وعلیہ الفتوی.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :عبد الرزاق غفر لہ

۸صفر الخیر ۱۴۳۹ھ فتوی نمبر :۱۱۷۶

## ﴿نماز جنازہ میں امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز فاسد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں چار تکبیروں کی بجائے تین تکبیریں کہدی، ایک رہ گئی نماز جنازہ کا کیا حکم

ہے؟ اب کئی دن ہو گئے ہیں میت کو دفنا دیا ہے ایسی صورت میں کیا کریں؟

۲۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ اگر امام نے تین تکبیریں کہہ کر سلام پھیر دیا اور مقتدیوں نے چوتھی تکبیر بھی کہہ دی اور نماز پوری کی تو کیا حکم ہے ؟ کیا نماز جنازہ ادا ہو جائیگی؟

﴿جواب﴾ نماز جنازہ میں چار تکبیریں رکن کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک تکبیر بھی اگر رہ گئی نماز جنازہ ادا نہیں ہوگی، مسئولہ صورت میں چونکہ ایک تکبیر رہ گئی ہے لہذا نماز جنازہ ادا نہیں ہوئی ہے، ایسی صورت میں یہ حکم تھا کہ میت کو دفنانے سے پہلے یا دفنانے کے بعد جب تک یہ غالب گمان تھا کہ ابھی میت پھولی پھٹی نہیں ہوگی، کہ قبر پر نماز جنازہ کا اعادہ کرتے، لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا اور میت کو دفنائے کئی دن ہو گئے ہیں، اس لئے اب نماز کی تو کوئی صورت نہیں رہی البتہ توبہ واستغفار ضرور کریں۔

لمافی التنویر مع الدر(ج۲ص۲۰۹،طبع:سعید)

(وركنها)شيئان (التكبيرات)الأربع،فالأولى ركن أيضا لاشرط ،فلذالم يجز بناء أخرى عليها،وفي الشامية:(قوله فلذا ...الخ)أي لكونها ركنالاشرطالأنه لونواهاللأخرى أيضايصير مكبرالثلاثاوانه لايجوز .

ولمافيه ايضاً(ص:۲۲۴،طبع:سعيد)

:(وان دفن وأهيل عليهاالتراب (بغير صلاة )أوبها بلا غسل أومن لاولاية له (صلى على قبره ) استحسانا(مالم يغلب على الظن تفسخه)

ولمافی النهر(ج۱/۳۹۳،طبع:قديمى)

وهى أبع تكبيرات كل تكبيرة منهاقائمة مقام ركعة .

۲۔ واضح رہے کہ جس طرح فرض نماز میں مقتدی کی نماز کا دارمدار امام کی نماز پر ہوتا ہے ایسا ہی نماز جنازہ میں بھی مقتدی کی نماز کی صحت وفساد امام کی نماز پر موقوف ہوتا ہے، چنانچہ اگر امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدی کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے!

اس ضابطہ کے بعد یہ سمجھئے کہ صورت مسئولہ میں اگر امام نے تین تکبیریں کہکر سلام پھیرا ہے اور چوتھی تکبیر نہیں کہی ہے تو اس سے اسکی نماز فاسد ہوگئی اور اسکی نماز کے فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز بھی فاسد ہوگئی، لہذا بعد میں مقتدیوں نے چوتھی تکبیر کہکر نماز اگر مکمل کی ہے تب بھی انکی نماز ادا نہیں ہوئی، ایسی صورت میں لوٹانا ضروری ہوتا ہے۔

لما في حاشية الطحاوي على مراقي الفلاح (ص۵۸۷) قديمي

قوله (كبّر) الامام الرابعة ،ويسلم ولم يتبينوا،هل يجب عليه سجود السهو ،ويحتمل أن الضمير راجع الى المأموم وهو بعيد إلأن الامام اذا اقتصر على ثلاثة فسدت فيما يظهر واذا فسدت على الامام فسدت على المأموم لترك ركن من أركانها

ولما في الشامي (ج۲ص۲۰۸،طبع:سعيد)

(قوله فلوأمّ بلاطهارة والقوم بها أعيدت وبعسكه لا) لأنه لاصحة لها بدون الطهارة واذالم تصح صلاة الامام لم تصح صلاة القوم(بحر)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ      واللہ أعلم بالصواب: سیف اللہ

۱۴ ربیع الأول ۱۴۳۲ھ      فتویٰ نمبر:

## ﴿نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت پرعمل کرنا ضروری نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی حیات میں یہ وصیت کرے کہ مرنے کے بعد میری نماز جنازہ فلاں شخص پڑھائے تو کیا اس وصیت کو پورا کرنا ضروری ہے؟      مستفتی:اختر شاد کیماڑی کراچی

﴿جواب﴾ نماز جنازہ پڑھانے کا حق شرعاً امام مسجد کو حاصل ہے جس کی اقتداء میں مرحوم اپنی حیات میں نماز پڑھا کرتے تھے اور اسکے بعد میت کے ولی کو یہ حق حاصل ہے،لہٰذا مرحوم نے اپنی حیات میں اگر کسی ایسے شخص سے نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کی ہو جس کو شرعاً حق تقدم حاصل نہ ہو تو ایسی وصیت پرعمل ضروری نہیں ہے، ہاں ولی بھی اس شخص کے جنازہ پڑھانے پر راضی ہو تو اس وقت وہی شخص جنازہ پڑھائے اس لیے کہ اس میں میت کی خواہش کی تکمیل ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کی وصیت کے مطابق ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا تھا اور ولی کی رضامندی کی وجہ سے اس کے حق ولایت کی بھی رعایت ہے۔

ولما في اعلاء السنن :(۲۱۹/۸،طبع دار الكتب بيروت)

عن عروة عن عائشة رضي الله عنها ان ابا بكر اوصى ان تغسله اسماء بنت عميس فضعفت فاستعانت بعبدالرحمن.

ولما في الدر:(۱۲۲/۳ طبع امداديه) والفتوى على بطلان الوصية بغسله والصلاة عليه.

وفي الشامية:لو اوصى بان يصلي عليه غيرمن له حق التقدم أو بان يغسله فلان لا يلزم تنفيذ وصيته ولايبطل حق الولي بذالك.

ولما فی التاتارخانية:(۲/۱۲۷،طبع قديمی)

وفی العيون: اذا أوصى الميت ان يصلی عليه فلان فالوصية باطلة وفی الكبرى وعليه الفتوى. وهكذا فی التجنيس والمزيد (۲/۲۱۱ م قديمی)

الجواب صحيح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:عبدالرزاق غفرلہ

۳صفرالخیر۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۱۶۰

# ﴿فصل فی حمل الجنازة و دفنها﴾

## ﴿جنازہ اٹھانے اور دفنانے کا بیان﴾

### ﴿میت کی چارپائی اٹھا کر کلمہ شہادت کے نعرے لگانا غلط ہے﴾

﴿سوال﴾ ہمارے معاشرے میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کسی گھر میں فوتگی ہو جائے تو میت کو قبرستان یا جنازہ گاہ لے جاتے وقت کلمہ شہادت کا بلند آواز سے ورد کیا جاتا ہے، دوسرا یہ کہ نماز جنازہ تب تک نہیں پڑھائی جاتی جب تک صفیں طاق نہیں ہو جاتیں حتیٰ کہ اس کو نماز جنازہ کی صحت کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے کافی انتظار کیا جاتا ہے، ان دونوں مسئلوں کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ مستفتی:محمد قیصر سعید آباد

﴿جواب﴾ آجکل جنازہ اٹھاتے ہوئے کلمہ شہادت کے نعرے لگانے کا جو رواج پڑ گیا ہے بلاشبہ یہ بدعت ہے، سیاسی جلوسوں کیطرح نعرے بازی اس موقع کے خلاف ہے کلمہ شہادت یا دوسرا کوئی ذکر کرنا بلاشبہ پسندیدہ ہے لیکن دل ہی دل میں ذکر کریں، حضور علیہ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ وتابعین اور ائمہ حضرات کا اس موقع پر ایسا معمول ہرگز نہیں رہا، البتہ خاموشی سے ذکر کرنا، مرحوم کیلیے دعائے مغفرت کرنا یا اس کا ذکر خیر کرنا احادیث سے ثابت ہے نماز جنازہ کے لیے صفوں کی تعداد طاق رکھنا بہتر ہے مگر ضروری نہیں ہے، اس کے لیے اس قدر اہتمام کرنا کہ لوگ اس کو ضروری سمجھنے لگیں، غلط ہے۔

لما فی الهندية:(۱/۱۶۲،طبع رشيديه)

وعلى متبعي الجنازة الصمت ويكره لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن، فان أراد أن يذكر الله يذكره فی نفسه.

ولما فی رد المحتار:(۲/۲۱۴،طبع سعيد)

لقوله: من صلى عليه ثلاثة صفوف غفر له رواه أبوداود وقال حديث حسن والحاكم

وقال صحيح على شرط مسلم ولهذا قال في المحيط ويستحب أن يصف ثلاثة صفوف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: مزمل شاہ بن مبارک شاہ

۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۶

## ﴿تدفین کے بعد اجتماعی دعا کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہوکر ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا مانگنا کیسا ہے؟ مستفتی: ولی اللہ صاحب

﴿جواب﴾ قبرستان میں میت دفن کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا فی نفسہ ممنوع نہیں بلکہ ہاتھ اٹھانا تو آداب دعا میں سے ہے اور بعض موقعوں پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت بھی ہے۔

لما في مسلم وشرحه للنووي: (۱/۳۱۳، طبع قديمي)

حتى جاء البقيع فقام فأطال القيام ثم رفع يديه ثلاث مرات (قولها جاء البقيع فقام فأطال القيام ثم رفع يديه ثلاث مرات) فيه استحباب اطالة الدعاء وتكريره ورفع اليدين فيه وفيه ان دعاء القائم أكمل من دعاء الجالس في القبور.

ولما في سنن ابي داود: (۲/۱۰۵، طبع رحمانيه)

كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا فرغ من دفن الميت وقف على قبره فقال: استغفروا لاخيكم واسئلوا له بالتثبيت فانه الآن يسئل.

البتہ ایسے علاقے کے قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا مناسب نہیں ہے جہاں کے لوگ مزاروں پر مشرکانہ اور بدعاتی رسوم میں مبتلا ہوں تا کہ آپکے صحیح عمل سے انکے غلط طریقے کی ظاہری تائید نہ ہو۔

ولما في تنقيح الحامدية: (۲/۳۶۷، طبع حقانيه)

كل مباح يودي الى زعم الجهال سنية امر او وجوب فهو مكروه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز دیروی

۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۶۱

## ﴿میت دفنانے کے بعد قبر پر سورۃ البقرۃ کا پہلا اور آخری رکوع پڑھنا مستحب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے ہاں میت دفنانے کے بعد اسکے سر کی

جانب سورۃ بقرۃ کا پہلا رکوع اور پاؤں کی جانب سورۃ بقرۃ کا آخری رکوع پڑھا جاتا ہے اسکی شرعی حیثیت کیا ہے بعض لوگ اسکو بدعت کہتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟ مستفتی: حبیب الوہاب سواتی

﴿جواب﴾ میت دفنانے کے بعد قبر کے سرہانے سورۃ بقرۃ کا پہلا رکوع اور پاؤں کی جانب سورۃ بقرۃ کا آخری رکوع پڑھنا مستحب ہے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر اور نبی علیہ السلام کے افعال کو زیادہ محفوظ رکھنے والے صحابی کی روایت سے ثابت ہے، لہٰذا اسکو بدعت کہنا غلط ہے۔

لمافی مشکوٰۃ المصابیح:(۱/۱۴۹،باب البکاء علی المیت،طبع سعید)

عن عبدالله بن عمر قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول اذامات احدکم فلا تحبسوه و اسرعوابه الی قبره ولیقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجلیه بخاتمة البقرة(رواه البیهقی فی شعب الایمان وقال والصحیح انه موقوف علیه).

ولمافی المرقاة:(۴/۱۷۳،طبع رشیدیه)

تحت قوله عند رأسه فاتحة البقرة ای الیٰ المفلحون وعند رجلیه بخاتمة و فی نسخة خاتمة البقرة ای من آمن الرسول.

ولمافی اعلاء السنن:(اثار السنن:۲/۱۲۵)

عن عبد الرحمن بن العلاء بن اللجلاج عن ابیه قال قال أبی اللجلاج ابو خالد یابنی اذا انامت فالحدلی فاذا وضعتنی فی لحدی فقل بسم الله وعلی ملة رسول الله ثم سن علی التراب سنا ثم اقرأ عند رأسی بفاتحة البقرة وخاتمتها فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ذالک رواه الطبرانی فی المعجم الکبیر واسناده صحیح.

ولمافی الاذکار للنووی:(۷۳)(۶/۳۲۹)

وروینا فی سنن البیهقی باسنا دحسن ان ابن عمر استحب ان یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها، وهوموقوف فی حکم المرفوع فانه غیر مدرک بالرأی.

ولمافی ردالمحتار:(۲/۲۳۷،طبع سعید)

وکان ابن عمر یستحب ان یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۶۱

﴿سورۃ بقرۃ کا ابتدائی حصہ قبر کے سرہانے اور آخری حصہ پائنتی کی جانب پڑھنا مستحب ہے﴾

﴿سوال﴾ مردہ کو دفن کرنے کے بعد قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر سورۃ بقرہ کا ابتدائی رکوع

اور پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر آخری رکوع کی تلاوت مستحب ہے یہ حکم صرف بالغ میت کے لیے ہے یا نابالغ کے لیے بھی یہی حکم ہے؟ مستفتی: رضوان اللہ حقانی

﴿جواب﴾ مردہ کو دفنانے کے بعد قبر کے سرہانے سورہ بقرۃ کی ابتدائی آیات 'مفلحون' تک اور پائنتی کی طرف سورۃ بقرہ کی آخری آیات 'امن الرسول' سے ختم سورۃ بقرۃ تک پڑھنا مستحب عمل ہے۔

نصوص شرعیہ میں چونکہ قبر اور میت کا ذکر مطلق آیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم جس طرح بالغ میت کے لیے مستحب ہے اسی طرح نابالغ کے لیے بھی ہے۔

لما فی مشکوٰۃ المصابیح: (۱/۱۴۹ باب دفن المیت طبع سعید)

وعن عبد الله ابن عمرؓ قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول اذا مات احدکم فلا تحبسوه واسرعوا به الی قبره ولیقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجلیه بخاتمة البقرة رواه البیهقی فی شعب الایمان و قال والصحیح انه موقوف علیه.

لما فی الشامی: (۲/۲۳۷ طبع سعید)

کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره وقال استغفروا لاخیکم واسألوا الله له التثبیت فانه الآن یسأل وکان ابن عمرؓ یستحب أن یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها.

لما فی مرقاۃ المفاتیح: (۴/۱۷۳ طبع رشیدیه)

قال الطیبیؒ: لعل تخصیص فاتحتها لاشتمالها علی مدح کتاب الله وانه هدی للمتقین الموصوفین بالخلال الحمیدة من الایمان بالغیب واقامة الصلوٰة وایتاء الزکاة وخاتمتها لاحتوائها علی الایمان بالله و ملائکته وکتبه ورسله واظهار الاستکانة وطلب الغفران والرحمة والتولی الی کنف الله تعالی و حمایته.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۲۷۵

## ﴿جنازہ اٹھانے کا سنت طریقہ﴾

﴿سوال﴾ جنازہ اٹھانے کا سنت طریقہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں جب جنازہ گھر سے اٹھایا جاتا ہے تو مولوی صاحب کو بلاتے ہیں کہ قدم گنو چنانچہ وہ چالیس قدم تک لوگوں کے قدموں کو شمار کرتے ہیں کیا شریعت میں اسکی کوئی اصل ہے؟

﴿جواب﴾ مستحب یہ ہے کہ ہر آدمی چارپائی کے ہر جانب کو دس قدم تک اٹھائے، پہلے

دس قدم تک دائیں جانب کے اگلے پائے کو پھر اسی جانب کے پچھلے پائے کو پھر بائیں جانب کے اگلے پائے کو اور پھر اسی جانب کے پچھلے پائے کو، اسی طرح کل چالیس قدم ہو جائیں گے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے قدم خود گنے گا مولوی صاحب سے گنوانے کی ضرورت نہیں، ایذا رسانی کے بغیر اگر مذکورہ طریقہ پر عمل ہو سکے تو بہتر ہے ورنہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

لمافی حلبی کبیر:(ص ۵۹۲،طبع سهیل اکیڈمی)

ویستحب ان یحملها من کل جانب عشر خطوات لما روی عنه علیه الصلوة والسلام انه قال من حمل جنازة اربعین خطوة كفرت عنه اربعین کبیرة رواه ابو بكر النجار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۱

## ﴿جنازہ لے جاتے ہوئے ذکر کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ جنازہ لے جاتے وقت ایک آدمی زور سے "کلمہ شہادت" پڑھتے ہیں کہہ کر پکارتا ہے باقی لوگ زور سے ذکر کرتے ہیں "کلمہ شہادت" اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مستفتی: مختار مغل

﴿جواب﴾ جنازہ لے جاتے ہوئے زور سے ذکر کرنے کو فقہائے کرام نے مکروہ لکھا ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے، ہاں اگر آہستہ ذکر کریں تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔

لمافی الهندية:(۱۶۲/۱،طبع رشیدیه)

وعلى متبعي الجنازة الصمت ويكره لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن كذا في شرح الطحاوي،فان أرادأن يذكر الله يذكره في نفسه كذا في فتاوى قاضيخان.

ولمافی الدرالمختار:(۱۳۸/۲،طبع امدادیه)

كره فيها رفع صوت بذكر أوقراءة.قال الشامي عن الظهيرية تحت هذاالقول:فان أرادأن يذكر الله تعالى يذكره في نفسه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۹

## ﴿نومولود مر جائے تو نام رکھ کر دفنانا چاہیے﴾

﴿سوال﴾ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب بچہ پیدا ہو کر مر جائے تو اسے نام رکھے بغیر

دفنانا نہیں چاہیئے کیا اس کی کوئی اصل ہے؟

﴿جواب﴾ ہاں یہ بات درست ہے، حدیث پاک میں آیا ہے کہ جب بچہ پیدا ہو کر مر جائے تو اسکا نام رکھو پھر اسے دفن کرو۔

لمافی رد المحتار: (۱۷/۶ مطبع سعید)

وروی: اذا ولد لأحدكم ولد فمات فلا يدفنه حتى يسميه ان كان ذكرا باسم الذكر وان كان انثى فباسم انثى وان لم يعرف فباسم يصلح لهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۷

## ﴿اپنے لیے تیار کردہ قبر میں دوسری میت کے دفن کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے اپنے لیے پہلے سے قبر کھود کر تیار کر رکھی تھی پھر کسی آدمی نے اس قبر میں کسی دوسرے مردہ کو دفن کر دیا تو کیا اب یہ آدمی جس نے اپنے لیے قبر تیار کی تھی قبر کھود کر اس مردے کو نکال سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ اس شخص نے اگر اپنی زمین میں قبر کھود کر تیار کر رکھی تھی اور کسی دوسرے آدمی نے وہاں مردے کو دفن کر دیا تو اس آدمی کو اختیار ہے کہ قبر کھود کر اس مردے کو نکال لے، اور اگر زمین مباح تھی یا قبرستان کیلئے وقف تھی اس میں قبر کھود کر تیار کر رکھی تھی وہاں کسی نے مردہ کو دفن کر دیا تو اس صورت میں اس کیلئے قبر کھود کر مردہ کو نکالنا درست نہیں البتہ مردہ کو دفن کرنے والے سے کھدائی کی قیمت لے سکتا ہے۔

لمافی الدر المختار: (۱۹۹/۶ مطبع سعید)

حفر قبرا فدفن فيه آخر ميتا فهو على ثلاثة أوجه ان الأرض للحافر فله نبشه وله تسويته وان مباحة فله قيمة حفره وان وقفا فكذلك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۴

## ﴿میت کی پیشانی اور سینے پر کچھ لکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ لوگ اکثر میت کی پیشانی اور سینے وغیرہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لا الہ

الا اللہ محمد رسول اللہ اور آیۃ الکرسی وغیرہ لکھتے ہیں کیا یہ لکھنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ اگر روشنائی وغیرہ کیساتھ لکھا جائے تو جائز نہیں کیونکہ میت کے پھٹنے کی وجہ سے بے حرمتی ہوگی، البتہ اگر روشنائی وغیرہ کے بغیر صرف انگلی سے میت کی پیشانی یا سینے پر اسطرح لکھا جائے کہ لکھنے کے نشان ظاہر نہ ہوں تو یہ فی نفسہ جائز ہے تاہم اسکا ترک اولی ہے، کیونکہ یہ عمل سنت سے ثابت تو ہے نہیں جبکہ عام لوگ اسے ضروری خیال کرنے لگیں گے۔

لمافی الشامیۃ: (۲/۲۴۶-۲۴۷ طبع سعید)

وقد أفتى ابن الصلاح بانه لا يجوز ان يكتب على الكفن يٰس والكهف ونحوهما خوفا من صديد الميت، والقياس المذكور ممنوع لأن القصد ثم التميز وهنا التبرك، فا لأسماء المعظمة باقية على حالها فلايجوز تعريضها للنجاسة، والقول بانه يطلب فعله مردود، لان مثل ذلك لايحتج به الا اذا صح عن النبى صلى الله عليه وسلم طلب ذلك وليس كذلك اه وقد منا قبيل باب المياه عن الفتح أنه تكره كتابة القرآن واسماء الله تعالى على الدراهم والمحاريب والجدران ومايفرش ،وماذاك الالاحترامه وخشية وطئه ونحوه مما فيه اهانة فالمنع هنابالاولى مالم يثبت عن المجتهد أو ينقل فيه حديث ثابت فتامل،نعم،نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي ان مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالاصبع المسبحة بسم الله الرحمن الرحيم وعلى الصدر لااله الاالله محمد رسول الله ،وذلك بعدالغسل قبل التكفين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۰

## ﴿مردے کو قبر میں لٹانے کا صحیح طریقہ﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب مردے کو قبر میں لٹایا جاتا ہے تو چت لٹا کر چہرہ قبلہ کی طرف کر دیا جاتا ہے، ایک عالم سے سنا ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں اب سوال یہ ہے کہ میت کو قبر میں رکھنے کا درست طریقہ کونسا ہے؟ اور مذکورہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ میت کو قبر میں لٹانے کا درست طریقہ یہ ہے کہ میت کو دائیں پہلو پر قبلہ کی طرف رخ کر کے لٹایا جائے اور اس کی کمر کو قبر کی دیوار یا لحد کیساتھ سہارا دیا جائے تاکہ استقبال قبلہ برقرار رہے کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو چت لٹا کر صرف چہرہ قبلہ کی طرف کرنا درست نہیں، اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔

لمافی الهندية : (۱/۱٦٦،طبع رشيديه)

ويوضع فی القبر علی جنبه الايمن مستقبل القبلة كذافی الخلاصة.

ولمافی حاشيةالطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص ۶۰۹،طبع قديمی)

(ويوجه الی القبلة) .....(بذلک أمرالنبی صلی الله عليه وسلم)عليا لما مات رجل من بنی عبدالمطلب فقال:ياعلی استقبل به القبلة استقبالا و قولوا جميعاباسم الله وعلی ملة رسول الله وضعوه لجنبه ولا تكبوه علی وجهه ولاتلقوه علی ظهره كذا فی الجوهرة وفی الحلبی ويسند الميت من ورائه بنحو تراب لئلا ينقلب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم: محمد صلاح الدین چترالی عفااللہ عنہ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۴۷

## ﴿میت کیساتھ عہد نامہ وغیرہ دفن کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل امور کے بارے میں:

(۱) جب کسی کا انتقال ہوجائے تو اسکی پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھ دیتے ہیں (۲) عہد نامہ لکھ کر قبر میں میت کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے (۳) دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دی جاتی ہے براہ کرم باحوالہ جواب عنایت فرمائیں کیونکہ ہمارے علاقہ میں مندرجہ بالا امور عام طور پر رائج ہیں۔

﴿جواب﴾ (۱) میت کی پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور سینے پر '' لااله الاالله محمد رسول الله'' لکھنا جائز ہے لیکن غسل کے بعد اور کفن سے پہلے صرف انگلی کے اشارے سے لکھیں کسی ایسی چیز سے نہ لکھیں جس سے سینے اور پیشانی پر نشان پڑ جائے۔

لمافی ردالمحتار:(۲/۲۴۷،طبع سعيد)

نقل بعض المحشين عن فوائدالشرجی ان ممايكتب علی جبهة الميت بغيرمدادبالاصبع المسبحة .بسم الله الرحمن الرحيم .وعلی الصدر. لااله الاالله محمدرسول الله .وذلک بعدالغسل قبل التكفين.

(۲) عہد نامہ لکھ کر قبر میں میت کے ساتھ رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس میں عہد نامہ کی توہین ہے۔

ولمافيه ايضا:(۲/۲۴٦،طبع سعيد)

وقدافتی ابن الصلاح بانه لايجوزان يكتب علی الكفن يٰس والكهف ونحوهماخوفامن صديدالميت......فالاسماء المعظمة باقية علی حالهافلايجوزتعريضهاللنجاسة.

(۳) قبر پر اذان دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یہ بدعت ہے، لہٰذا اس سے احتراز لازم ہے۔

لما فيه ايضاً:(۲/۲۳۵،طبع سعيد)

لا بأس الاذان عند ادخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن وقد صرح ابن حجر في فتاويه بانه بدعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز عفی عنہ

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۲۱

## ﴿میت کو قبر میں رکھنے کا سنت طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کا چہرہ قبر میں قبلہ کی طرف کرنا ضروری ہے یا داہنی کروٹ پر لٹانا سنت ہے؟

﴿جواب﴾ میت کو قبر میں داہنے پہلو قبلہ رخ کر کے لٹانا چاہیے یعنی لحد یا قبر کی شرقی دیوار کے ساتھ پشت کو سہارا دے کر لٹانا چاہیے۔

لما في البحر الرائق:(۲/۱۹۳،۱۹۴ طبع سعيد)

(قوله وجه الى القبلة) بذالك امر رسول الله ﷺ ويكون على شقه الايمن.

ولما في مراقي الفلاح:(۱/۳۳۴،طبع قديمي)

(قوله و يوجه الى القبلة) على جنبه الايمن (بذلك امر النبي ﷺ) عليا لما مات رجل من بني عبد المطلب فقال: يا على استقبل به القبلة استقبالا وقولوا جميعا باسم الله وعلى ملة رسول الله وضعوه لجنبه وتكبوه على وجهه ولا تلقوه على ظهره كذا في الجوهرة وفي الحلبي ويسند الميت من ورائه بنحو تراب لئلا ينقلب.

ولما في الهندية:(۱/۱۶۶،طبع رشيديه)

ويوضع في القبر على جنبه الايمن مستقبل القبلة.

ولما في الدر المختار:(۳/۱۴۱ طبع امداديه)(ويوجه اليها وجوبا وينبغي كونه على شقه الايمن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی

۱۶ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:

## ﴿میت کے دفنانے میں بلاوجہ تاخیر مکروہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں بعض دفعہ میت کو پندرہ، سولہ گھنٹے اور کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ دیر تک رکھا جاتا ہے تاکہ اس کے عزیز

واقارب جو دور رہتے ہیں وہ پہنچ جائیں اور میت کو دیکھ لیں، شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا ناجائز؟ مستفتی: مسعود صاحب

﴿جواب﴾ میت کے دفنانے میں جلدی کرنے کی صراحت احادیث میں آئی ہے اس لئے بلاوجہ تاخیر کرنا مکروہ ہے، البتہ معقول عذر کی صورت میں بقدر ضرورت تاخیر کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ میت کے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

لما فی سنن ابی داود:(۹۷/۲،باب تعجیل الجنازة،طبع رحمانیه)

عن الحصین بن وحوح ان طلحة بن البراء مرض فاتاه النبی ﷺ یعوده فقال انی لاارى طلحة الاقدحدث فیه الموت فاذنونی به وعجلوافانه لاینبغی لجیفة مسلم ان تحبس بین ظهرانی اهله.

ولما فی حاشیة الطحطاوی :(ص ۵۶۶،طبع قدیمی)

واذاتیقن موته یعجل بتجهیزه اکراما له لما فی الحدیث و عجلوا به فانه لا ینبغی لجیفة مسلم ان تحبس بین ظهرانی اهله.

ولما فی التنویرالأبصارمع الرد:(۲۳۲/۲،طبع سعید)

وکره تاخیر صلاته ودفنه لیصلی علیه جمع عظیم بعد صلاة الجمعة)وفی الشامیة:والافضل ان یعجل بتجهیزه کله من حین یموت بحر.

لمافی التاتارخانیة:(۱۱۵/۲،طبع قدیمی)

والمشی خلف الجنازة افضل ، وان مشی امامه کان واسعاً وفی الخانیة ویجوز المشی امامهامالم یتباعد عن القوم، ولاینبغی ان یتقدم کلهم.

ولمافی العالمگیریة:(۱۶۲/۱،طبع رشیدیه)

الافضل للمشیع للجنازة المشی خلفهاویجوزامامهاالاان تباعدعنهااویتقدم الکل فیکره.

ولمافی التنویرمع الدر:(۱۳۶/۳)

(وندب المشی خلفها) لانهامتبوعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سعید احمد

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۹۱

## ﴿اپنی زندگی میں کفن اور قبر تیار کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کسی شخص کا اپنی زندگی

میں کفن اور قبر تیار کر لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ اپنی زندگی میں کفن تیار کر لینا جائز ہے اور عبرت حاصل کرنے کیلئے یا موت کو یاد رکھنے کیلئے اپنی زمین میں قبر تیار کر لینا بھی جائز ہے، البتہ ساتھ ساتھ یہ بھی اعتقاد ہو کہ ضروری نہیں کہ مجھے اسی قبر میں دفنایا جائیگا، کیونکہ موت کا کچھ پتہ نہیں کہ انسان کو کس جگہ آ پکڑے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ زمین میں دفن ہونا بھی نصیب ہوگا یا نہیں۔

لما فی قوله تعالیٰ:(ایت ۳۴ پ ۲۱ سوره لقمان)وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ...... الآیة.

لما فی الدر المختار:(۲/۱۵۴،طبع امدادیه)

ویحفر قبر لنفسه ،وقیل یکره ،والذی ینبغی ان لایکره تهیئته نحو الکفن.

لما فی التاتارخانیة:(۲/۱۳۱،طبع قدیمی)

ومن حفر قبر النفسه قبل موته فلا باس به ویوجر علیه ،هکذا عمل عمر بن عبد العزیز والربیع بن خیثم وغیرهم.

الجواب صحیح :عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۸۳۶

## ﴿میت کو اپنے آبائی وطن کی طرف منتقل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو دفن کرنے سے پہلے اپنے آبائی وطن کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ — مستفتی: مستقیم صاحب

﴿جواب﴾ مستحب یہ ہے کہ جس جگہ فوت ہو جائے اسی علاقہ کے قبرستان میں دفن کیا جائے اپنے آبائی وطن کی طرف منتقل کرنا گو جائز تو ہے لیکن بہتر نہیں ہے۔

لما فی التنویر و شرحه:(۲/۲۳۹،طبع سعید)

ولا باس بنقله قبل دفنه وفی الشامیة قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه قیل مطلقاًوقیل الی ما دون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل أومیلین لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فیکره فیما زادقال فی النهر عن عقدالفرائد و هوالظاهر وأما نقله بعددفنه فلا مطلقاً.

لما فی الخانیة:(۱/۱۷۲،طبع قدیمی)

و یستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فی مقابر او لئک القوم وان نقل قبل الدفن الی قدرمیل أو میلین فلاباس به کذالو مات فی غیر بلده یستحب ترکه

فان نقل الی مصر آخر لابأس به لما روی أن یعقوب مات بمصر ونقل الی الشام و موسیٰ نقل تابوت یوسف من حبس الی الشام بعد زمان وسعد بن ابی وقاص مات فی ضیعة علی اربعة فراسخ من المدینة ونقل علی اعناق الرجال الی المدینة وبعد مادفن لایسع اخراجه بعد مدة طویلة أو قصیرة الابعذر (۱/۱۹۵).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن عفی عنہ

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۴۳۸

## ﴿غیر محرم کا عورت کی میت کو قبر میں اتارنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں عورت کی تدفین کے موقع پر اسکے ایسے رشتہ دار جو محرم نہیں ہوتے، یا قریبی پڑوسی قبر میں اتارتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ عورت کی تدفین کیلئے محرم کا ہونا ضروری ہے یا یہ لوگ بھی قبر میں اتار سکتے ہیں۔

﴿جواب﴾ عورت کی میت کو محارم کی موجودگی میں غیر محرم کیلئے قبر میں اتارنا مناسب نہیں ہے، البتہ محارم موجود نہ ہوں تو دوسرے رشتہ دار جو غیر محرم ہیں وہ اتارلیں، اور وہ بھی موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں دوسرے لوگ غیر رشتہ دار اتارلیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لمافی البحر: (۱۹۳/۲ طبع سعید)

وذوالرحم المحرم أولیٰ بادخال المرأة القبر وکذاالرحم غیرالمحرم أولیٰ من الاجنبی فان لم یکن فلابأس للاجانب وضعها ولایحتاج الی النساء للوضع.

ولمافی حلبی کبیر: (ص ۵۹۷ طبع سھیل اکیڈمی)

وذوالرحم المحرم اولیٰ بوضع المرأة فان لم یکن فاھل الصلاح من الاجانب ذکره فی المحیط وفی الوبری اوالمحرم من غیررحم.

ولمافی الخلاصة: (۲۲۵/۱ طبع رشیدیه)

المرأة اذاماتت ولیس لهامحرم فاھل الصلاح من جیرانهایکون دفنها امالایدخل احدقبرهافان کان من المحارم من النسب اوالرضاع اومن جهة المصاهرة مثل ابن زوجهانزل قبرهاوان لم یکن نزل المشائخ فان لم یکن فالشبان الصلحاء ولایخرج النساء

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی عفی عنہ

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۴۳۹

## ﴿قبر میں رکھنے کے بعد میت کا چہرہ دیکھنے اور تابوت سمیت دفن کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ان مسائل کے بارے میں کہ (۱) بعض لوگ میت کو قبر میں رکھ کر اس پر تختے رکھ دیتے ہیں لیکن چہرے کی جانب کو کھلا چھوڑ دیتے ہے اور میت کے دور سے آنے والے رشتہ داروں کا انتظار کرتے ہیں، اور ان رشتہ داروں کی آمد کے بعد وہ میت کا چہرہ دیکھتے ہیں اور اس کے بعد باقی تدفین کرتے ہیں اسکا کیا حکم ہے؟

(۲) اگر کوئی شخص سعودی عرب میں فوت ہو جائے تو اسکی میت وہاں سے پاکستان تابوت میں لائی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس میت کو تابوت سمیت دفن کرنے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

﴿جواب﴾ (۱) قبر میں رکھنے سے پہلے میت کا چہرہ دکھانا جائز ہے لیکن قبر میں رکھنے کے بعد منع ہے اس کے علاوہ چہرہ دکھانے کیلئے تدفین میں تاخیر کرنا بھی منع ہے۔

لما فی الهندیة: (۵/ ۳۵۱، طبع رشیدیه)

ولا بأس بأن یرفع ستر المیت لیری وجهه و انما یکره ذلک بعد الدفن.

(۲) میت کو تابوت سمیت دفن کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں البتہ بغیر عذر کے تابوت میں رکھ کر دفن کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے۔

لما فی الشامیة: (۲/ ۲۳۴، طبع سعید)

(ولا بأس باتخاذ تابوت) ولو من حجر او حدید (له عند الحاجة) کرخاوة الارض (قوله ولا بأس با تخاذ تابوت الخ) أی یرخص ذلک عند الحاجة: والا کره کما قدمنا آنفا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی عفی عنہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۲۴

## ﴿دفن میت کو جمعہ تک مؤخر کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بدھ یا جمعرات کے دن فوت ہو جائے اور اس کو جمعہ کے دن دفن کیا جائے تو وہ عذاب قبر سے محفوظ رہے گا؟

﴿جواب﴾ حدیث شریف میں ہے کہ جس کا انتقال جمعہ کے دن یا رات میں ہو جائے تو اللہ تعالیٰ قبر کے فتنہ سے حفاظت فرماتے ہیں، محدثین فرماتے ہیں: کہ فتنہ قبر سے عذاب قبر اور

منکر نکیر کا سوال مراد ہے، اس حدیث شریف سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فضیلت جمعہ کے دن یا رات میں موت واقع ہونے کے ساتھ خاص ہے، دفنانے کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

لما فی المشکوٰۃ (ص ۱۲۱، طبع سعید)

عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ ما من مسلم يموت يوم الجمعة او ليلة الجمعة الا وقاه الله فتنة القبر، قال العلامة الملا على القارى تحت هذا الحديث قوله فتنة القبر أى عذابه وسواله هو يحتمل الاطلاق والتقييد والاول هو الاولى بالنسبة الى فضل المولى وهذا يدل على ان شرف الزمان له تاثير عظيم كما ان فضل المكان له اثر جسيم.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: حبیب الوہاب سواتی غفرلہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۶۱۲

## فصل فی الشهيد وايصال الثواب

## شہید اور ایصال ثواب کے احکامات

### احکام شہید

**سوال:** کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص محمد عمر اور سسرال والوں میں تنازعہ تھا (بیوی کے سلسلے میں) جس کی وجہ سے سسرال والوں نے اس کی بیوی کو گھر بلا لیا اور اس کے شوہر کے گھر جانے نہیں دے رہے تھے تو شوہر محمد عمر کو طیش آیا اور وہ بیوی کو قتل کرنے کی نیت سے سسرال گیا وہاں جا کر بیوی پر فائر کیا تو وہ زخمی ہوئی اور اس کی ساس سامنے آئی تو فائر اس پر ہونے کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اس مقتولہ کو شہید قرار دے کر اس کو خون اور کپڑوں کے ساتھ دفنایا اس کا ایک بیٹا عالم بھی موجود تھا، تو شریعت کی رو سے اس کو خون اور کپڑوں کے ساتھ دفنانا درست ہے؟ مستفتی: ابوبکر

**جواب:** شہید کو کپڑوں سمیت، بلا غسل دفنانے کے لئے چند شرائط ہیں مکلّف، مسلمان، طاہر یعنی جنبی، حائضہ، نفاسہ نہ ہونا ہونا، مظلوم حالت میں قتل کیا جانا، قتل کے سبب کسی مال کا واجب نہ ہونا (بلکہ صرف قصاص کا واجب ہونا) اور ارتثاث نہ کیا ہو یعنی کھایا، پیا، ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوش وحواس برقرار رہتے ہوئے منتقل کیا گیا نہ ہو وغیرہ، پھر دیکھیں اگر اس کے جسم پر زائد لباس جیسے کوٹ سویٹر (Sweater) وغیرہ ہو تو اتار دیئے جائیں اور اگر سنت کفن سے کم کم

لباس ہو تو مکمل کیا جائے پھر اس پر نماز جنازہ پڑھ کر بغیر غسل کے دفنا دیا جائے۔

مسئولہ صورت میں مذکورہ مقتولہ میں بھی مندرجہ بالا شرائط اگر پائی جائیں تو بلا غسل، کپڑوں سمیت اسے دفنا دینا درست ہے اور اگر کوئی شرط مفقود تھی (مثلاً مقتولہ، حائضہ تھی وغیرہ) تو بلا غسل کپڑوں سمیت دفنا دینا درست نہیں تھا۔

لمافی تنویر الأبصار:(۲/۱۵۸ تا ۱۶۱، طبع امدادیہ)

هو كل مكلف مسلم طاهر قتل ظلما بجارحة ولم يجب بنفس القتل ولم يرتث.....فينزع عنه مالا يصلح للكفن، ويزاد وينقص له ليتم كفنه، ويصلى عليه بلا غسل يدفن بدمه وثيابه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفااللہ عنہ

۱۷ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۶۶

## ﴿ویڈیو والی گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں مرنے والوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل بعض گاڑیوں میں سفر کے دوران فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور کچھ لوگوں کو پہلے سے معلوم بھی ہوتا ہے قصداً ایسی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں جبکہ دوسری اچھی گاڑیاں جو کہ بغیر فلم ویڈیوں کی ہیں بآسانی مل جاتی ہیں کبھی ویڈیو والی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے جس میں بعض مسافر مرجاتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ اس حادثے میں مرے ہوئے لوگ شہید ہیں یا نہیں۔ مستفتی: صدیق اللہ

﴿جواب﴾ شہادت کے اسباب سے کسی کی موت واقع ہوگئی تو شہید کہلائیگا، ایکسیڈنٹ سے موت واقع ہونا بھی شہادت کے اسباب میں سے ہے، رہا ایسی گاڑی میں سفر کرنا ایک مستقل گناہ ہے جسکی آخرت میں سزا بھی ہوگی لیکن اس جرم کیوجہ سے شہیدوں کی فہرست سے نکالنا ہمارے اور آپ کے اختیار میں نہیں۔

لمافی الشامی:(۲/۲۵۲، طبع سعید)

من غرق في قطع الطريق فهو شهيد وعليه اثم معصيته، وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وان مات في معصية بسبب من اسباب الشهادة فله اجر شهادته وعليه اثم معصيته، وكذالك لو قاتل على فرس مغصوب أوكان قوم في معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم اثم المعصية انتهى.

ولما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ:(۱۵۱۰/۲-۱۵۱۱،طبع رشیدیہ)

من غرق فی قطع الطریق فهو شهید وعلیه اثم معصیته وکل من مات بسبب معصیته فلیس بشهید وان مات فی معصیة بسبب من أسباب الشهادة فله أجر شهادته وعلیه اثم معصیته. ولو قاتل علی فرس مغصوب أو کان قوم فی معصیة فوقع علیهم البیت فلهم الشهادة وعلیهم اثم المعصیة وهذا یعنی أنه اذا مات فی حالة من حالات الشهادة أثناء معصیة فهو شهید عاص.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۷۰

## ﴿شہید کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ایک شخص نے نئی گاڑی خریدی تھی بعد ازاں کسی کام سے نکلا اور گاڑی خود چلا رہا تھا راستے میں اسلحہ بردار چند دہشت گردوں نے اسلحہ دکھا کر گاڑی چھیننے کی کوشش کی اس شخص نے گاڑی ان کے حوالے کرنے کی بجائے مزاحمت کی تو دہشت گردوں نے اس پر گولی چلا دی اس پر وہ چل بسا اب یہ مقتول شخص شہید کہلائے گا یا نہیں؟ کیا اس کو غسل دیا جائے گا؟ مستفتی: احمد علی

﴿جواب﴾ مذکورہ مقتول شخص شہید ہے کیونکہ یہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں ظلماً مارا گیا اور اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جان دی تاہم اس پر دنیوی احکام اس وقت جاری ہونگے جب مندرجہ ذیل شروط پائی جائیں:

(۱) موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہو کھانے یا پینے، علاج معالجے، سونے یا وصیت کی مہلت نہ ملی ہو یا ہوش وحواس کی حالت میں اس پر نماز کا وقت نہ گزرا ہو (۲) اس پر پہلے سے غسل واجب نہ ہو۔

شہید کا دنیوی حکم یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جاتا اور نہ پہنے ہوئے کپڑے اتارے جاتے ہیں بلکہ بغیر غسل کے خون آلود کپڑوں کے ساتھ (نماز جنازہ کے بعد) دفن کیا جاتا ہے۔

لما فی الهندیة:(۱۶۷/۱،طبع رشیدیه)

وهو فی الشرع من قتله أهل الحرب والبغی وقطاع الطریق أو وجد فی معرکة وبه جرح.

ولما فی البحر:(۱۹۷/۲-۱۹۸،طبع سعید)

(ویغسل ان قتل جنباً أو صبیاً أو ارتث بان اکل أو شرب أو نام أو تداوی أو معضیٰ وقت

الصلوٰة وهو يعقل أو نقل من المعركة أو أوصىٰ).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۹ جمادالثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۹۳

## ﴿ظالم قاتل کیساتھ صلح کرنے سے شہید کی شہادت پر کوئی اثر نہیں پڑتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ آجکل لوگ کہتے ہیں کہ بے گناہ مقتول کے ورثاء نے اگر قاتل یا اسکے خاندان والوں سے قتل کے بدلے پیسوں پر صلح کی تو مقتول کی شہادت خراب ہو جائیگی یعنی اسکو پھر شہادت کا ثواب نہیں ملیگا، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز صلح کی بہتر صورت کیا ہے، وضاحت فرما کر ممنون ہوں۔　　　　مستفتی عین اللہ توبہ کاکڑی

﴿جواب﴾ کسی مسلمان کو ظلماً کوئی قتل کرے تو بلاشبہ وہ شہید ہے، اور مقتول شہید کے اولیاء کو شریعت نے حق دیا ہے کہ قصاصاً ظالم قاتل کو قتل کریں یا دیت وصول کریں یا صلح کر کے ظالم سے پیسے وغیرہ وصول کریں، لہٰذا صلح کرنے سے شہید کی شہادت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اولیاء کو بھی کوئی گناہ نہیں ہوتا، البتہ معاف کرنا بلاشبہ ثواب ہے اور احسان ہے لیکن ضروری نہیں۔

لمافی قوله تعالیٰ: (سورة البقرة، جز دوم، ۱۷۸)

يٰأيها الذين آمنوا كتب عليكم القصاص في القتلى الحُرّ بالحُرّ والعبد بالعبد والأنثىٰ بالأنثىٰ فمن عُفي له من أخيه شيء فاتّباع بالمعروف وأداء إليه بإحسان ط ذٰلك تخفيف من ربكم ورحمة ط فمن اعتدىٰ بعد ذٰلك فله عذاب أليم.

ولمافی الدر المختار: (۶/۵۲۹، طبع سعید)

(و) موجبه (القود عينا) فلا يصير مالا الا بالتراضي فيصح صلحا ولو بمثل الدية أو أكثر ابن كمال عن الحقائق (لا الكفارة) لأنه كبيرة محضة، وفي الكفارة معنى العبادة فلا يناط بها.

ولمافی الشامی: (۶/۵۲۹، طبع سعید)

(قوله فيصح صلحا) أي اذا كان القود عندنا هو الواجب في العمد فلا ينقلب مالا الا من جهة الصلح (قوله ولو بمثل الدية أو أكثر) أطلقه فشمل ما لو كان من جنسها أو من غيره حالا أو مؤجلا كما في الجوهرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن غفرلہ

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۰۲

## ﴿ایصال ثواب کا افضل طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ جو لوگ مر گئے ہیں ان کیلئے ایصال ثواب ہوتا ہے یا قبرستان جا کر کوئی چیز تقسیم کرنا افضل ہے نیز زیارت قبور کتنے دن میں ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ عبادات مالیہ کا میت کو ثواب پہنچنا اور میت کا اس سے نفع اٹھانا تو اہل سنت والجماعت کے نزدیک متفق علیہ ہے ہاں عبادات بدنیہ جیسے نماز روزہ، قراۃ قرآن کا ثواب پہنچنے میں اگر چہ ائمہ کا اختلاف ہے تاہم احناف سمیت امام احمد اسی طرح امام شافعی کے بعض علماء کرام بھی ثواب پہنچنے کے قائل ہیں۔

قبرستان میں غلہ وغیرہ لے جانا اچھا نہیں ہے گھر ہی پر فقراء ومساکین کو تقسیم کردیا جائے تو زیادہ بہتر ہے قبرستان لے جانے میں ریا وغیرہ کا اندیشہ ہے جس سے نیک عمل کا اجر وثواب باقی نہیں رہیگا۔

زیارت قبور کیلئے قطعی طور پر کسی وقت اور دن کی تعلیم نہیں دی گئی ہے آپ جب چاہیں جاسکتے ہیں وہاں جانے سے اصل مقصود عبرت حاصل کرنا ہے اور موت اور آخرت کو یاد کرنا ہے البتہ فقہاء کی بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کیلئے جمعہ کا دن افضل ہے۔

لما فی الهندية:(۱/۲۵۷ مطبع رشیدیه)

الاصل فی هذاالباب ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة كان اوصوما اوصدقة اوغيرها كالحج وقرأة القرآن والاذكار وزيارة قبور الانبياء عليهم الصلاة والسلام والشهداء والاولياء والصالحين وتكفين الموتى وجميع انواع البر كذافي غاية السروجي شرح الهداية.

ولما فی الشامية :(۲/۱۵۰-۱۵۱ مطبع امدادیه)

صرح علمائنا في باب الحج عن الغير بان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة اوصوما اوصدقة اوغيرها كذافي الهداية بل في الذكاة.(قوله وبزيارة القبور) اى لاباس بها بل تندب......وتزار في كل اسبوع كما في مختارات النوازل قال في شرح لباب المناسك الاان الافضل يوم الجمعة والسبت والاثنين والخميس--- فالحاصل ان يوم الجمعة افضل الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۶۶۵

## ﴿ایصال ثواب کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے مجھے ایصال ثواب کیلئے ختم قرآن کا کہا اور میں انکار نہ کر سکا کہہ دیا کہ کر دونگا اور پورا قرآن ختم نہیں کیا، کیونکہ کچھ لینا نہیں ہے بلا معاوضہ ہے آیا یہ درست ہے نیز یہ بتا دیا کہ ہم کچھ لیتے نہیں پھر بھی اگر کچھ دے دیا تو کیا اسکی گنجائش ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جتنا ہو سکے اسکا ایصال ثواب کیا جائے اور بتا دے کہ میں نے اتنا ایصال ثواب کیا ہے تو افضل ہے اور نہ بتائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے، اور تلاوت سے پہلے جب بتا دیا کہ ہم کچھ نہیں لیتے اور دل میں نیت بھی نہ ہو اور اگر کوئی کچھ نہ دے ناراض بھی نہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ کچھ دیدیں تو اسکی گنجائش ہے۔

لما فی اعلاء السنن:(۱۲/۲۰۵،طبع بیروت)

فان عمارا وسعدا رزقاهم علی مجرد القراءة دون التعلیم والقراءة لیس مما یتعدی نفعه الی المسلمین بخلاف الثانی وایضافان سعدارزقهم علی قراءة القرآن بالشرط فاشبه الاجرفافهم

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر:۸۵۹

## ﴿ایصال ثواب کا صحیح طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری عادت ہے کہ روزانہ صبح کو تلاوت کرتے ہیں نیت تو خود تلاوت کرنے کی ہوتی ہے لیکن تلاوت ختم کر کے اپنی ماں اور تمام مومنین اور مومنات کو ایصال ثواب کرتے ہیں کیا یہ ٹھیک ہے اگر ٹھیک ہے تو ہمارے ثواب میں کمی تو نہیں آئے گی، نیز ایصال ثواب کا اصل طریقہ کیا ہے صرف دل میں تمنا کرے یا دعا مانگے نیز پہلے پیغمبر ﷺ پھر دوسرے انبیاء پھر مومنین کو ایصال ثواب کیا جائے یا تمام مومنین کہہ کر نیز مردوں کو ثواب پورا پورا ملتا ہے یا جب مردے کم ہوں تو ثواب زیادہ ملتا ہے اور اگر مردے زیادہ ہوں تو ثواب کم ملتا ہے۔

مستفتی: محمد دین وزیرستانی

﴿جواب﴾ تمام نفلی عبادات کا ایصال ثواب حق ہے مومنین کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے خود

ایصال ثواب کرنے والے کے ثواب میں کمی نہیں آتی، صرف دل میں تمنا کرنے سے ثواب پہنچ جاتا ہے، ایصال ثواب کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلے نبی ﷺ اسکے بعد دوسرے انبیاءؑ اور سب سے آخر میں تمام مومنین کو ایصال ثواب کیا جائے، زیادہ افراد کو ثواب بخش دیا تو اللہ کی صفت کریمی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام کو پورا پورا ثواب عطاء فرمائیں گے۔

لما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۲/۱۵۷۹،طبع رشیدیه)

اجمع العلماء على انتفاع الميت با لدعاء والاستغفار بنحو اللهم اغفرله اللهم ارحمه والصدقة واداء الواجبات البدنية العالية التي تدخلها النيابة كالحج۵۵ دار الفكر)

لما فی الهندية: (۱/۲۵۷،طبع رشيديه كوئٹه)

الاصل في هذا الباب ان الانسان له ن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة كان او صوما اوصدقة او غيرها كالحج وقراءة القرآن والاذكار الخ.

لما فی الشامية:(۲/۱۵۱-۱۵۲،طبع امداديه ملتان)

الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوى لجميع المومنين والمومنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شيء هو مذهب اهل السنة والجماعة ــــــــ قلت وقول علمائنا له ان يجعل ثواب عمله لغيره يدخل فيه النبى ﷺ فانه احق بذلک حيث انقذنا من الضلالة ففى ذالک نوع شکر ...... فيشمل كل الانبياء ويدل على ان الدعاء لهم بزيادة الشرف مندوب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۷۹۱

## ﴿نفل پڑھ کر کسی زندہ شخص کو بخشنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ نفل پڑھ کر کسی زندہ شخص کو بخشنا اسی طرح فرض نماز وروزے کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ عبادت نفلی ہو یا فرض اسکا ثواب مردوں کو بخشا جاسکتا ہے اسی طرح زندوں کو بھی بخشا جاسکتا ہے۔

لما فی الدرمع الرد:(۲/۵۹۵-۵۹۶،طبع سعید)

الاصل ان كل من أتى بعبادة ما له جعل ثوابها لغيره.

وفی الشامية: " بعبادة ما" اى سواء كانت صلاة او صوما او صدقة او قراءة او ذكرا او طوافا او حجا او عمرة او غير ذالک من زيارة قبور الانبياء عليهم الصلاة والسلام والشهداء والاولياء والصالحين وتكفين الموتى وجميع انواع البر كما فى

الهنديه.....قلت: واذا قلنا بشموله للفريضة أفاد ذلك لأن الفرض ينويه عن نفسه، فاذا صح جعل ثوابه لغيره دل على انه لا يلزم فى وصول الثواب ان ينوى الغير عند الفعل.— قوله:لغيره:اى من الاحياء والاموات بحر عن البدائع.

ولما فى البحر:(۵۹/۲ مطبع سعيد)

والاصل فيه ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة او صوما او صدقة او قرأة قرآن .....عند اصحابنا للكتاب والسنة اما الكتاب فلقوله تعالى "وقل رب ارحمهما كما ربّيانى صغيرا" ---واما السنة فأحاديث كثيرة منها ما فى الصحيحين حين ضحىٰ بالكبشين فجعل احدهما عن امته وهو مشهور تجوز الزيادة به على الكتاب ومنها ما رواه ابوداؤد اقرؤا على موتاكم سورة يٰس ---واما قوله عليه الصلاة والسلام لا يصوم احد عن احد ولا يصلى احد عن احد وهو فى حق الخروج عن العهدة لافى حق الثواب فان من صام اوصلى اوتصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز ويصل الثواب اليهم عند اهل السنة والجماعة كذا فى البدائع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۱۴۲۹/۲/۸ھ — فتویٰ نمبر ۱۱۷۵

## ﴿اجرت لے کر ایصال ثواب کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک حافظ قرآن لوگوں سے اجرت لیکر انکے رشتہ داروں کی قبروں پر قرآن شریف پڑھتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا قبر کے پاس قرآن شریف پڑھنا جائز ہے؟ نیز اس پر اجرت لینے کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ایصال ثواب حق ہے، اس کے لئے قبر کے پاس آنا ضروری نہیں ہے، دور سے بھی ایصال ثواب ہوسکتا ہے تاہم قبر کے پاس بیٹھ کر ایصال ثواب کی غرض سے زبانی تلاوت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، البتہ اس غرض سے باقاعدہ قبرستان میں قرآن مجید لے جانا مناسب نہیں ہے، خیر القرون اور سلف صالحین سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہا مسئلہ اجرت لینے کا تو اجرت لینا بلاشبہ کسی طرح جائز نہیں ہے، اجرت لیکر تلاوت یا اس جیسی دوسری کسی بھی عبادت کا اجر وثواب خود عبادت گزار کو نہیں ملتا تو میت کو کیا ملے گا؟ تمام اعمال کا مدار نیتوں پر ہوتا ہے اس عمل میں اجر وثواب مقصود نہیں ہوتا بلکہ اجرت ہی مقصود ہوتی ہے لہٰذا لینا دینا دونوں ناجائز ہیں۔

لما فی الشامیة:(۲/۲۴۶،طبع سعید)

ولا یکره الجلوس للقراءة علی القبر فی المختار لتادیة القراءة علی الوجه المطلوب بالسکینة والتدبر والاتعاظ

ولما فی الهندیة:(۱/۱۶۶،طبع رشیدیه)

قراءة القرآن عند القبور عند محمدؒ لا تکره ومشائخنا اخذوا بقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع هکذا فی المضمرات.

ولما فی الشامیة:(۶/۵۶،طبع سعید)

فالحاصل ان ما شاع فی زماننا من قرأة الاجزاء بالاجرة لا یجوز لان فیه الامر بالقراءة واعطاء الثواب للامر والقراءة لاجل المال فاذا لم یکن للقاری ثواب لعدم النیة الصحیحة فاین یصل الثواب الی المستاجر ولو لا الاجرة ما قرء احد لاحد فی هذا الزمان بل جعلوا القران العظیم مکسبا ووسیلة الی جمع الدنیا انا لله وانا الیه راجعون.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق عفی عنہ

۴جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۵۵۱

## ﴿وہ لوگ جن سے قبر میں سوال نہیں کیا جائے گا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وہ کون کونسے لوگ ہیں جن سے قبر میں سوال نہ ہوگا؟ مستفتی:ایک سائل وادی سواتی

﴿جواب﴾ جن لوگوں سے قبر میں سوال نہ ہونے کی بشارت آئی ہے وہ درج ذیل ہیں (۱)انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام (۲)شہداء (۳)اسلامی سرحدات کا پہرہ دینے والا (۴) پیٹ کی بیماری کے سبب فوت ہونے والا (۵)طاعون کی وجہ سے وفات پانے والا (۶)صدیق (زیادہ سچائی والا) یعنی جو پیغام اور احکام اللہ کی طرف سے پیغمبروں کو آئے ان کا دل خود اسکی گواہی دے اور بلا دلیل اسکی تصدیق کرے اور اعمال میں مکمل امتثال احکام ہو (۷)نابالغ بچے (۸)جمعہ کے روز یا اس کی شب میں فوت ہونے والا راتوں کو سورۃ ملک کی تلاوت کا اہتمام کرنے والا، جبکہ بعض حضرات نے سورۃ سجدہ کی بھی یہی فضیلت بتائی ہے اور مرض وفات میں سورۃ اخلاص کی تلاوت کرنے والا۔

لما فی الشامیة:(۲/۱۹۲،طبع سعید)

الشهید والمرابط والمطعون والمیت زمن الطاعون بغیره اذا کان صابرا محتسبا

والصديقين والاطفال والميت يوم الجمعة او ليلتها والقارئ كل ليلة تبارك الملك وبعضهم ضم اليها السجدة والقارئ فى مرض موته "قل هو الله احد" وافاد العلامة ح الحلبى انه يزاد الانبياء عليهم الصلاة والسلام لانهم اولىٰ من الصديقين

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان سواتی

۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۴۹۲

## ﴿فصل فی احکام المقابر و زیارة القبور﴾

## ﴿قبرستان اور اسکی زیارت کے احکامات﴾

### ﴿قبر تیار کرنے کا مسنون طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر تیار کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کراچی میں جتنی قبریں تیار ہوتے دیکھی ہیں ان میں کوئی لحد یا شق نہیں ہوتا صرف کھدائی کر کے اطراف میں چنائی کرتے ہیں پھر میت کو اس میں رکھ لیتے ہیں اور اوپر سلیب رکھ کر تھوڑی سی مٹی ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ کتے یا دیگر درندے میت تک باسانی پہنچ جاتے ہیں بلکہ چھوٹے بچوں کو تو قبروں سے نکال بھی لیتے ہیں کئی بار اس طرح دیکھنے میں آیا ہے لحد یا شق کا جب بتاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح مردے کیلئے قبر میں بیٹھنے کی گنجائش نہیں رہے گی احادیث میں آیا ہے کہ دفنانے کے بعد فرشتے آتے ہیں اور سوال جواب کے لئے مردے کو بٹھا دیتے ہیں، یہ سوچ کس حد تک درست ہے؟ اور قبر کی گہرائی کتنی ہونی چاہیے؟ براہ کرم شریعت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: شاہد ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ قبر کی لمبائی چوڑائی میت کی باڈی کے لحاظ سے اتنی ہونی چاہیے کہ آسانی سے میت اس میں رکھی جا سکے۔ اور قبر کی گہرائی آدمی کے قد کے برابر یعنی 6,5 فٹ ہو تو زیادہ بہتر ہے اور نصف قد تک یعنی 3 فٹ تک کی بھی گنجائش ہے اس سے کم گہرائی جائز نہیں ہے۔

کراچی میں قبر تیار کرنے کا اور اس میں میت کو دفنانے کا مذکورہ عام رائج طریقہ کہ مسنون لحد (بغلی قبر) یا شق (درمیان میں شگاف) کے بغیر قبر میں میت کو رکھ چھوڑتے ہیں اور زمینی سطح

کے برابر سلیپ وغیرہ رکھ کر مٹی ڈال دیتے ہیں، یہ بالکل غلط سنت کے خلاف طریقہ ہے بلاشبہ اس میں میت کی درندوں اور کتوں سے حفاظت بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ بڑی لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت ہے، سب سے بہتر طریقہ لحد کا ہے بشرطیکہ زمین مناسب ہو۔ زمین زیادہ نرم ہو لحد بنانے کے قابل نہ ہو تو شق کرنے کی گنجائش ہے، لحد کا طریقہ یہ ہے کہ کم از کم 3 فٹ یا 5، 6 فٹ کھدائی کرنے کے بعد قبر کی قبلہ جانب دیوار اور قبر کی زمینی سطح کے درمیان مزید اتنی کھدائی کرے کہ میت کو معمولی سا ترچھا کر کے اس میں رکھ سکے تا کہ سینہ اور چہرہ ہلکا سا قبلہ رخ ہو۔ اور میت پوری طرح محفوظ بھی ہو۔ پھر پتھر یا کچی اینٹ کھڑی کر کے اچھی طرح بند کر دیں تا کہ مٹی میت کی طرف بالکل نہ گرے پتھر یا اینٹ نہ ملے تو سیمنٹ کے تیار سلیپ وغیرہ سے بھی بند کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد قبر کے پورے گڑھے کو مٹی سے بھر دیں اور درمیان میں اونٹ کے کوہان کی طرح کچھ زیادہ مٹی ڈال کر بلند کریں اور سرہانے اور پائے کی طرف پتھر کھڑا کر دیں تا کہ قبر واضح ہو اور اخیر میں ہو سکے تو چھوٹے چھوٹے پتھر اوپر ڈال دیں تا کہ بارش اور ہوا کی وجہ سے مٹی اپنی جگہ رہے۔ لحد (بغلی قبر) ایسی زمین میں بنائی جاسکتی ہے جو قدرے سخت ہو نرم زمین میں لحد بنانا مشکل ہوتا ہے زمین اوپر سے گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے ایسی صورت میں شق یعنی قبر کے درمیان میں شگاف کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

شق کا طریقہ یہ ہے کہ کم از کم 3 اور زیادہ سے زیادہ 5، 6 فٹ کھدائی کرنے کے بعد قبر کے بیچ میں میت کی باڈی کے برابر لمبائی میں مزید کھدائی کرے جس میں میت کو معمولی سا ترچھا کر کے قبلہ رخ لٹا سکے پھر قبر کے اندر زمینی سطح پر باڈی سے چند انچ کے فاصلے پر چوڑے پتھر یا چوڑی اینٹ یا سلیپ وغیرہ رکھ کر اچھی طرح بند کریں تا کہ مٹی میت کی طرف نہ جاسکے پھر مندرجہ بالا ترتیب کے مطابق قبر کو مٹی سے بھر دیں اور قبر تیار کریں۔

زمین اگر زیادہ نرم ہو اور پتھر وغیرہ کے وزن سے شق کے کنارے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو مندرجہ بالا ترتیب کے مطابق اینٹ، بلاک وغیرہ سے بھی شق بنانے کی گنجائش ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں قبر کے چاروں اطراف بھی بلاک وغیرہ سے چنائی کی گنجائش ہے۔ تاہم بہرصورت لحد یا شق کے بغیر قبر بنانا اور باڈی سے لے کر اوپر زمین کی سطح تک قبر کو مٹی بھرے بغیر بند کر دینا

بالکل غلط اور خلاف سنت ہے۔تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ قبروں کو سنت کے مطابق بنانے کی تاکید اور بنانے والوں کو اس کا پابند بنائیں۔

باقی میت کو فرشتے بٹھا کر سوال کرتے ہیں یا کھڑا کر کے اس کی آپ فکر نہ کریں،آپ قبر سنت کے مطابق بنائیں آپ اس کے مکلف ہیں،عالم برزخ کے حالات کو دنیاوی زندگی اور حالات پر قیاس کرنا غلط ہے احادیث میں آیا ہے کہ نیک لوگوں کے لئے قبر بڑی وسیع کر دی جاتی ہے حالانکہ دنیاوی مشاہدہ میں قبر چند اسکوائر فٹ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی سب کچھ کرنے پر قادر ہے وہ قبر کو کشادہ کر سکتا ہے اور تنگ بھی۔

لہذا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ ابھی سے میت کے لئے اندر بیٹھنے کی گنجائش چھوڑیں۔

نوٹ: کتاب کے اخیر میں قبر تیار کرنے سے متعلق نقشے دیئے ہیں غور سے دیکھ کر سنت طریقہ سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے مطابق قبر تیار کرنے کی دوسروں کو بھی ترغیب دیں،

لما فی الهندیه:( ۱۶۵/۱ طبع رشیدیه)

والسنة هو اللحد دون الشق كذا في محيط السرخسي .وصفة اللحد ان يحفر القبر بتمامه ثم يحفر في جانب القبلة منه حفيرة فيوضع فيه الميت كذا في المحيط.ويجعل ذالک کالبيت المسقف كذا في البحر الرائق.فان كانت الارض رخوة فلا باس بالشق كذا في فتاوى قاضيخان. وصفة الشق ان يحفر حفيرة كالنهر وسط القبرويبنى جانباه باللبن او غيره ويوضع الميت فيه ويسقف كذا في معراج الدرايه وينبغي ان يكون مقدار عمق القبر الى صدر رجل وسط القامة وكلما زاد فهو افضل كذا في جوهرة النيرة.

ولما في الشامي:( ۲۳۴/۲طبع سعيد)

(قوله مقدار نصف قامة )او الى حد الصدر ,وان زاد الى مقدار قامة فهو احسن كما في الذخيرة فعلم ان الادنى نصف القامة والا على القامة وما بينهما شرح المنية وهذا حد العمق والمقصود منه المبالغة في منع الراحة ونبش السباع ــــــ...........ــــــ

(قوله و يلحد) لانه سنة .وصفته ان يحفر القبر ثم يحفر في جانب القبلة منه حفيرة فيوضع فيها الميت ويجعل ذالک كالبيت المسقف حليه (قوله ولايشق) وصفته ان يحفر في وسط القبر حفيرة فيوضع فيها الميت حلية.

(قوله الا في ارض رخوة )فيخير بين الشق و اتخاذ تابوت ط عن الدر المنتقى. (قوله وسوى اللبن عليه ) اى على اللحد بان يسد من جهة القبر ويقام اللبن فيه حليه عن شرح المجمع.( قوله والقصب) قال في الحليه وتسد الفرج التي بين اللبن بالمدر والقصب كي لا ينزل التراب منها على الميت و نصوا على استحباب القصب فيها كاللبن.

ولما في الشامي :(۲۳۶/۲ طبع سعيد)

لكن نظر صاحب الحليه في هذا التعليل وقال: وروى عن محمد انه لا بأس بذالک،

وبـزيـده مـا روى عن الشافعي وغيره عن جعفر بن محمد عن ابيه "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم رش على قبر ابنه ابراهيم ووضع عليه حصباء" وهو مرسل صحيح ، فتحمل الكراهة على الزيادة الفاحشة وعدمها على القليلة المبلغة له مقدار شبر او ما فوقه قليلا۔

ولما في الشامي:( ۲۳۸/۲، طبع سعید)

ويتقوى بما اخرجه ابوداود باسناد جيد "ان رسول الله ﷺ حمل حجرا فوضعها عند رأس عثمان بن مظعون وقال اتعلم بها قبر اخي وأدفن اليه من تاب أهلي"

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۰۸

## ﴿زیارت قبور کا طریقہ اور وہاں پڑھنے کے مختلف اوراد﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم اپنے والدین مرحومین کی قبروں کی زیارت کیلئے جاتے ہیں تو اس کا درست اور بہتر طریقہ کیا ہے؟ اسی طرح وہاں جا کر کیا کیا پڑھنا چاہیے؟ براہ کرم تفصیل سے جواب دیکر ممنون فرمائیں۔ مستفتی: جناب میجر فہیم

﴿جواب﴾ والدین مرحومین یا دیگر اعزہ اقرباء اسی طرح عام مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کیلئے کبھی کبھار جانا چاہیے اس سے موت کی یاد آتی ہے اور انسان کو اپنی آخرت کے سنوارنے والے اعمال کی توفیق نصیب ہوتی ہے، جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا!

"وعن ابن مسعود رضي الله عنه ان رسول الله ﷺ قال: كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تزهد في الدنيا وتذكر الآخرة.

( مشكوة المصابيح:(ص: ۱۵۴، طبع: سعيد كراچی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا! میں نے تمہیں قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا (اب وہ حکم منسوخ ہے) پس قبروں کی زیارت کیلئے جایا کرو اس لئے کہ یہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ آپ ﷺ بنفس نفیس زیارت کی غرض سے قبرستان تشریف لے جایا کرتے تھے اور خصوصی طور پر والدہ صاحبہ کی قبر مبارک پر کافی دور جا کر بھی زیارت فرمائی ہے اور والدین مرحومین کی قبروں کی زیارت کیلئے جانے کے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں جیسے کہ مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ سے واضح ہے تو یہ سنت عمل ہے، اور اس دور میں ایک سنت زندہ

کرنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

ابو هريرة رضى الله تعالى عنه قال:قال رسول الله ﷺ:استاذنت ربى ان استغفر لامى فلم يأذن لى واستأذنته ان ازور قبرها فاذن لى،وفى رواية ابى داؤد والنسائى قال:اتى رسول الله ﷺ قبر امه فبكى ابكى من حوله فقال رسول الله ﷺ:استاذنت ربى عزوجل ان استغفر لها فلم يأذن لى فاستأذنته ان ازور قبرها فاذن لى فزوروا القبور.

(جامع الاصول:۱۱/۱۳۲،۱۳۵،طبع:دار الكتب العلمية،بيروت)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی والدہ کے لئے استغفار کرنے کی اجازت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہیں دی، پھر میں نے قبر کی زیارت کی اجازت چاہی تو پس اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی والدہ محترمہ کی قبر پر آئے خود بھی روئے اور جو لوگ ساتھ تھے ان کو بھی رلایا پھر فرمایا میں نے رب تعالیٰ سے اپنی والدہ کے لئے استغفار کرنے کی اجازت چاہی تو اللہ تعالیٰ نے اجازت نہ دی پھر میں نے اپنی والدہ کی قبر کی اجازت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی، پس تم لوگ قبروں کی زیارت کیا کرو۔

وعن محمد بن نعمان يرفع الحديث الى النبى ﷺ قال:من زار قبر ابويه او احدهما فى كل جمعة غفر له وكتب برا.(مشكوة،ص:۱۵۴،طبع:سعيد كراچى)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر جمعہ کو اپنے والدین دونوں یا کسی ایک کی قبر کی زیارت کرے اس کی مغفرت کردی جاتی ہے اور وہ والدین کا فرمانبردار لکھا جاتا ہے۔

جب زیارت کو جانے کا ارادہ کرے تو بہتر ہے کہ گھر میں یا جہاں سے بھی روانہ ہو پہلے دو رکعت نفل اس طرح پڑھے کہ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد ایک مرتبہ آیۃ الکرسی اور تین مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھے اور اس کا ثواب میت کو بخشے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مرحوم کی قبر میں نور کا انتظام فرماتے ہیں اور پڑھنے والے کیلئے بڑا اجر و ثواب لکھتے ہیں، پھر راستے میں کسی لایعنی اور فضول کام میں مشغول نہ ہو، جب قبرستان پہنچے تو اداب کو بجالاتے ہوئے جوتے نکالے اور قبروں کی طرف چہرا کر کے ان الفاظ میں سلام کرے:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ" یا ان الفاظ میں سلام کرے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ وَنَسْاَلُ اللّٰهَ

لنا ولکم العافیۃ" ان دونوں میں سے جو آسان لگے اور یاد ہو وہی پڑھے۔

ولما فی الهندیه:(۵/۳۵۰،طبع:رشیدیه،کوئٹه)

واذا اراد زیارة القبور یستحب له ان یصلی فی بیته رکعتین یقرأ فی کل رکعة الفاتحة وآیة الکرسی مرة واحدة والاخلاص ثلاث مرات ویجعل ثوابها للمیت یبعث الله تعالی فی قبره نورا ویکتب للمصلی ثوابا کثیرا ثم لا یشتغل بما لا یعنیه فی الطریق فاذا بلغ المقبرة یخلع نعلیه ثم یقف مستد برالقبلة مستقبلا لوجه المیت ویقول :"السلام علیکم یا اهل القبور یغفر الله لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر".

ولما فی مراقی الفلاح:(ص:۲۲۴،۲۲۵،طبع:قدیمی کتب خانه)

والسنة زیارتها(ای القبور)قائما والدعا عندها کما کان یفعل رسول الله ﷺ فی الخروج الی البقیع ویقول: "السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا ان شاء الله بکم لاحقون ونسأل الله لنا ولکم العافیة"

زیارت کو جانے والے کے لئے مستحب ہے کہ قبرستان میں سورہ یاسین شریف پڑھے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا!

من دخل المقابر فیقرأ سورة یٰسٓ یعنی واهدی ثوابها للأموات خفف الله عنهم یومئذ العذاب ورفعه وکذا یوم الجمعة فیه العذاب من اهل البرزخ ثم لا یعود علی المسلمین، وکان له ای للقاری بعدد ما فیها روایة الزیلعی من فیها من الاموات حسنات.

ترجمہ: جو شخص قبرستان میں داخل ہوا اور سورہ یاسین پڑھے اور اس کا ثواب مردوں کو بخشے تو اللہ تعالیٰ اس دن مردوں سے عذاب اٹھا دیتے ہیں اور پھر ان پر نہیں لوٹتا اور پڑھنے والے کو قبرستان میں مردوں کی تعداد کے بقدر نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ الاخلاص پڑھنے کے بھی بڑے فضائل ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا!

من مر علی المقابر فقرأ قل هو الله احد احدی عشرة مرة ثم وهب اجرها للاموات اعطی من الاجر بعدد الاموات

ترجمہ: قبرستان پر جس شخص کا گذر ہوا اور وہ گیارہ مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو بخشے اس کے لئے مردوں کی تعداد کے بقدر نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے جو آدمی سات مرتبہ (قبر کے پاس) سورۃ الاخلاص پڑھے اور اس

کا ثواب مردے کو بخشے تو مردے کی مغفرت اگر نہ ہوئی ہو تو اس کی مغفرت کی جاتی ہے اور اگر اس کی مغفرت پہلے سے ہو چکی ہو تو پڑھنے والے کی مغفرت کی جاتی ہے۔

اسی طرح سورۃ الفاتحہ، آیۃ الکرسی، سورۃ الزلزال، سورۃ التکاثر، سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں، سورۃ الملک یا اس کے علاوہ قرآن کریم کا جتنا حصہ یاد ہو اور آسانی سے پڑھ سکے پڑھے اور اس کا ثواب مردوں کو بخشے کہ اے اللہ کریم جو کچھ تیری توفیق سے میں نے پڑھا اس کا ثواب ان مردوں کو پہنچا دیں۔

اور جب دعاء مانگنے کا ارادہ ہو تو قبروں کی طرف پیٹھ کر کے قبلہ کی طرف منہ کرے اور اللہ سے اپنے لئے اور مردوں کے لئے دعا مانگے۔

لمافی المراقی الفلاح:(ص:۲۲۴،طبع:قدیمی)

ویستحب للزائر(قرأة سورة يسين) لماروى عن انس رضى الله تعالى عنه انه قال :قال رسول الله ﷺ :من دخل المقابر فيقرأسورة يسين يعني واهدى ثوابها للأموات خفف الله عنهم يومئذ العذاب ورفعه وكذايوم الجمعةيرفع فيه العذاب من اهل البرزخ ثم لايعود على المسلمين، وكان له اى للقارى بعد د مافيهارواية الزيلعي من فيهامن الاموات حسنات ـــ وعن على رضى الله عنه قال قال النبى ﷺ :من مرعلى المقابر فقرأ قل هو الله احد احدى عشرمرة ثم وهب اجرهاللاموات اعطى من الاجربعدد الاموات.

ولمافى الهنديه:(۳۵۰/۵،طبع:رشيديه،كوئٹه)

ثم يقرأ سورة الفاتحةوأية الكرسى ثم يقرأسورة اذازلزلت والهاكم التكاثر ـــ وحكى عن ابى بكربن ابى سعيد انه قال:يستحب عندزيارة القبورقرأة سورة الاخلاص سبع مرات فانه بلغنى من قرأهاسبع مرات ان كان ذلك الميت غيرمغفورله يغفرله وان كان مغفورله غفرلهذاالقارى ـــ واذاارادالدعايقوم مستقبل القبلة.

زیارت کیلئے سب سے افضل چار دن ہیں پیر، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ لیکن ان ہی دنوں میں جانے کو لازمی اور ضروری نہ جانے، ان ایام کے علاوہ دنوں میں بھی جاسکتے ہیں۔

لمافى الهنديه:(۳۵۰/۵،طبع:رشيديه،كوئٹه)

وافضل الايام للزيارة اربعة يوم الاثنين الخميس والجمعة والسبت والزيارة يوم الجمعة بعدالصلاة حسن ويوم السبت الى طلوع الشمس ويوم الخميس فى اول النهاروقيل فى اخرالنهاروكذافى الليالي المتبركة لاسيماليلة براءة وكذلك فى

الازمنة المتبركة كعشر ذى الحجة والعيدين وعاشوراء.

وهكذا ذكر الشامى آداب الزيارة ومايقول الزائروالايام التى ورد فيها فضيلة الزيارة واجاد ماذكر لكن نتركها خوفا من تطويل ممل وتكثير متعب بل نكتفى بهذا القدر القليل والله الموفق وهويهدى الى سواء السبيل.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۰۳۵

## ﴿قبر کے پاس بیٹھ کر تلاوت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنے بیٹے کی وفات پر چند آدمیوں سے کہا کہ تم میرے بیٹے کی قبر پر چالیس دن تلاوت کرو اور صبح وشام کا کھانا اور ناشتہ میرے گھر میں ہوگا چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو شرعاً یہ عمل جائز ہے یا نہیں. یہ بھی وضاحت فرمائیں کہ ان کی جوان عورتوں کا ہر روز صبح وشام قبرستان جانا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت قرآن فی نفسہ پسندیدہ عمل ہے بشرطیکہ کسی خاص نہج اور غیر ضروری طریقے کو اپنا کر اس کا اہتمام نہ ہو اس لیے کہ سنت طریقے سے ہٹ کر نیک عمل بھی بدعت میں تبدیل ہو جاتا ہے.

ایصال ثواب کے لیے تلاوت قرآن قبر کے پاس بیٹھ کر کرنا ضروری نہیں ہے تلاوت جہاں بھی ہو ثواب برابر پہنچتا ہے اس کے علاوہ تلاوت پر کھانا وغیرہ بطور اجرت لینا دینا بھی جائز نہیں ہے تلاوت اگر کوئی اس غرض سے کرے کہ کھانا ملے گا تو خود تلاوت کرنے والے کو کوئی ثواب نہیں ملے گا چہ جائیکہ وہ ثواب مرحوم کو بھی ملے لہٰذا یہ طریقہ غلط ہے اس کو چھوڑنا واجب ہے.

رہا یہ کہ عورتوں کا قبرستان جانا کیسا ہے سو جوان عورتوں کا صبح وشام قبرستان جانا جائز نہیں ہے اس سے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں اس لیے ان کو سختی سے منع کیا جائے. البتہ عمر رسیدہ خواتین صرف عبرت حاصل کرنے یا محض اپنے رشتہ داروں کی قبور کی زیارت کے لیے کبھی کبھار اگر چلی جائیں تو اس کی گنجائش ہے.

(لما فى سنن ابى داؤد ۲/۱۰۷)

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لعن الله زائرات القبور والمتخذين عليها السرج والمساجد

(ولما فی الدر المختار ۲/۲۲۵، ۲۲۶ طبع سعید)

لا یکره الدفن لیلا ولا اجلاس القارئین عند القبر وهو المختار

(ولما فی الشامیه ۲/۲۲۵ طبع سعید)

(قوله ولا اجلاس القارئین عند القبر) عبارة نور الایضاح وشرحه ولا یکره الجلوس للقرائة علی القبور فی المختار لتأدیة القرائة علی الوجه المطلوب بالسکینة والتدبر والاتعاظ

(ولما فی البحر الرائق ۲/۱۹۵ طبع سعید)

ولا بأس بقرائة القرآن عند القبور وربما تکون افضل من غیره ویجوز ان یخفف الله عن اهل القبور شیئا من عذاب القبر.

(ولما فی الشامیه ۲/۲۴۲ طبع سعید)

(قوله ولو للنساء) وقیل تحرم علیهن والاصح ان الرخصة ثابتة لهن بحر وجزم فی شرح المنیة بالکراهة لما مر فی اتباعهن الجنازة .وقال الخیر الرملی ان کان ذلک لتجدید الحزن والبکاء والندب علی ما جرت به عادتهن فلا تجوز وعلیه حمل حدیث لعن الله زائرات القبور وان کان للاعتبار والترحم من غیر بکاء والتبرک بزیارة قبور الصالحین فلا بأس اذا کن عجائز ویکره اذا کن شواب کحضور الجماعة فی المساجد وهو توفیق حسن.

(ولما فی الشامیه ۲/۲۴۰ طبع سعید)

ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوة لقرائة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقرائة سورة الانعام أو الاخلاص .والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قرائة القرآن لأجل الأکل یکره

ولما فی العالمگیریة ۱/۱۶۶ طبع رشیدیه)

قرائة القرآن عند القبور عند محمدؒ لا تکره ومشایخناؒ أخذوا بقوله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۲۰۷

## ﴿میت کے لئے قبر کھودتے وقت زمین سے ہڈیاں نکل آئیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے لئے قبر کھودتے ہوئے زمین سے ہڈیاں نکل آئیں جبکہ یہ معلوم نہیں کہ یہ ہڈیاں کس چیز کی ہیں؟ تو آیا میت کو وہاں دفن کیا جائے یا نہیں؟ نیز یہ کہ جو ہڈیاں نکلی ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ پہلے سے معلوم ہو کہ یہ پرانی قبر کی جگہ ہے تو اس جگہ دوسری میت کیلئے قبر کی

کھدائی جائز نہیں ہے، البتہ قبر کے نشانات باقی نہ رہے اور غالب گمان ہو کہ اب میت بوسیدہ ہو کر مٹی میں تبدیل ہو گئی ہے تو اسی جگہ دوسری میت کے لئے قبر تیار کرنا درست ہے۔

پھر اندازے کے خلاف دوران کھدائی پرانی میت کی کوئی ہڈی نظر آ گئی تو اسے قبر میں ایک طرف کر کے مٹی میں الگ دفن کر دیں۔ اور نئی میت اسی قبر میں دفنانے کی گنجائش ہے۔

لمافی الشامیة:(۲/۲۳۳،۲۳۴ طبع سعید)

ولا یحفر قبر لدفن آخر الا ان بلی الاول فلم یبق له عظم الاان لایوجد فتضم عظام الاول ویجعل بینهما حاجز من تراب۔۔۔۔ ومایفعله جهلة الحفارین من نبش القبور التی لم تبل اربابها وادخال اجانب علیهم فهو من المنکر الظاهر۔۔۔۔ ولو بلی المیّت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره بعدصنعة قلت: لکن فی هذا مشقة عظیمة فالاولیٰ اناطة الجواز بالبلا اذلایمکن ان یعد لکل میّت قبر لایدفن. هکذافی التاتارخانیة : (۲/ ۱۳۰ طبع قدیمی).

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: خالد الرحمٰن کرکی عفی عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۱۵۸

## ﴿قبرستان میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے، کیا کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟　　مستفتی: عبدالشکور

﴿جواب﴾ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے اور حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اور صحیح مسلم (۱/۳۱۳) کی حدیث "ثم رفع یدیه ثلاث مرات" سے ثابت ہوتا ہے اور امداد الفتاویٰ میں حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی رد المحتار کی عبارت "ثم یدعو قائماً طویلاً" کے تحت فرماتے ہیں کہ اس سے دعا کا جائز ہونا ثابت ہوا اور ہاتھ اٹھانا مطلقاً آداب دعا سے میں ہے پس یہ بھی درست ہوا، لہٰذا قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا درست ہے، البتہ جن علاقوں میں قبر پرست لوگ ہوں قبروں سے مرادیں مانگتے ہوں تو اس علاقے میں ان کے ساتھ مشابہت کی بناء پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے مزید یہ کہ ان کے عقیدے کو تقویت نہ ہو۔

لمافی الهندیة:(۱/۱۶۶ طبع رشیدیه)

ویکره عند القبر مالم یعهد من السنة والمعهود منها لیس الا زیارته والدعاء عنده قائما.

ولمافی البحر الرائق:(۲/۱۹۶،طبع سعید)

ویکرہ عند القبر کلما لم یعہد من السنۃ والمعہود منہا لیس الا زیارتہا والدعاء عندہا قائما کما کان یفعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الخروج الی البقیع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۶

## ﴿قبرستان کے درختوں کو کاٹنے اور استعمال کرنے کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ قبرستان کے درختوں کو کاٹ کر اپنے لئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قبرستان کی زمین عموماً وقف کی ہوتی ہے، اس لئے درخت اگر سوکھے ہوئے ہوں تو ان کو کاٹ کر قیمت کو قبرستان ہی پر خرچ کرنا ضروری ہے، اور درخت اگر ابھی سبز اور ہرے ہوں تو انکو کاٹنا ہی درست نہیں ہے۔

لمافی الهندیة :(۲/۴۷۶،طبع رشیدیه)

سئل نجم الدین فی مقبرۃ فیہا اشجار ہل یجوز صرفہا الی عمارۃ المسجد قال نعم ان لم تکن وقفا علی وجہ أخر قیل لہ فان تداعت حیطان المقبرۃ الغراب یصرف الیہا أو الی المسجد قال الی ماہی وقف علیہ ان عرف وان لم یکن للمسجد متول ولا للمقبرۃ فلیس للعامۃ التصرف فیہا بدون اذن القاضی کذا فالظہیریۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۷۷

## ﴿قبرستان کے پتھروں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے متعلق کہ ہمارے علاقے میں جب کوئی وفات پاتا ہے تو اسے دفنانے کے لئے گاؤں والے اکٹھے ہوکر پہاڑوں سے پتھر لاتے ہیں بسا اوقات قبر کی دیواریں مکمل ہوکر وہ پتھر بچ جاتے ہیں، عرض یہ ہے کہ کیا ان کو ہر کوئی استعمال میں لاسکتا ہے یا قبرستان میں رہنے دیئے جائیں تاکہ کسی اور میت کے دفنانے میں کام آئیں؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں جو پتھر لائے جاتے ہیں وہ بظاہر قبرستان ہی کے لئے لائے جاتے ہیں چنانچہ بچنے کی صورت میں دوسری کسی قبر میں استعمال کئے جائیں الا یہ کہ لانے والوں

کی طرف سے اس کے خلاف کوئی بات ثابت ہو جائے کیونکہ اصل مالک وہی لوگ ہیں۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۳

## ﴿اجتماعی قبر کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا ایک قبر میں ایک سے زیادہ مردے دفنانا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ بلاضرورت ایک قبر میں ایک سے زائد مردے دفنانا درست نہیں۔

لما فی الشامی:(۲/۲۳۳،طبع سعید)

واشاره بالمراد بالضمير الى ماتقدم من أنه لايدفن اثنان فى قبر الا لضرورة، وهذا فى الابتداء وكذا بعده — ويكره الدفن فى الفساقى ه وهى كبيت معقود بالبناء يسع جماعة قياماً لمخالفتها السنة لمداد والكراهة فيها من وجوه عدم اللحد، و دفن الجماعة فى قبر واحد بلاضرورة الخ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۴

## ﴿قبروں پر چلنا ان سے تکیہ لگانا اور بیٹھنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرا گھر قبرستان کے قریب ہے قبرستان کی دوسری جانب مسجد اور کچھ دوکانیں ہیں مسجد کو جانے کے لئے اور دوکانوں سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کبھی ہم قبرستان کو اپنا راستہ بناتے ہیں جس کی وجہ سے قبروں کا روندنا بھی واقع ہو جاتا ہے کیا شرعاً یہ درست ہے؟ جبکہ قبرستان کے علاوہ دوسرا راستہ بھی موجود ہے مگر تھوڑا دور پڑتا ہے برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: حاجی بہادر

﴿جواب﴾ قبروں کو روندنے اور ان پر بیٹھنے وغیرہ کی احادیث میں واضح ممانعت آئی ہے اس لئے آپ مسجد جانے کیلئے یا دکانوں سے ضروریات کی اشیاء لانے کیلئے دوسرا راستہ اختیار کرتے رہیں یا بہت احتیاط کے ساتھ قبروں سے بچتے ہوئے قبرستان کا راستہ اختیار کریں۔

لما فی الترمذی:(۱/۱۲۵،طبع فاروقی کتب خانہ ملتان)

عن جابر رضى الله قال قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان تجصص

القبور وان یکتب علیها وان یبنی علیها وان توطأ.

ولمافی الصحیح المسلم ۱۰،۱۲/۱ مطبع:قدیمی کتب خانه

عن جابرنہی رسول الله ﷺ ان یجصص القبر وان یقعد علیه وان یبنی علیه.

ولمافی الشامی:(۲۴۵/۲،طبع:سعید کراچی)

(قوله یکره المشی الخ)قال فی الفتح :یکره الجلوس علی القبر،ووطؤه.

الجواب صحیح عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:۳۷۹۴

## ﴿قبر خراب ہوجائے تو دوبارہ صحیح کرنے کا طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں اگر پانی کی وجہ سے قبر خراب ہوگئی ہو یعنی گڑھا نما بن گئی ہو اب اس کو دوبارہ اسی طرح بنائیں یا پھر صرف مٹی ڈال دی جائے؟

﴿جواب﴾ قبر کسی وجہ سے اگر خراب ہوگئی ہو تو مرمت کرنا شرعاً منع نہیں ہے،البتہ میت کو ظاہر کرنا منع ہے،لھذا میت کے ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو تو مٹی وغیرہ نہ نکالیں بس صرف اوپر اوپر سے مرمت کریں۔

لما فی البحرالرائق(۱۸٦/۲ قدیمی کتب خانه)واذا خربت القبور فلا بأس بتطینها.

ولما فی تاتارخانیه(۱۲۹/۲ قدیمی کتب خانه )

اذا خربت القبور فلا بأس بتطینها ،لما روی ان النبی ﷺ مر بقبر ابنه ابراہیم فرأی فیه حجرا سقط منه فسده واصلحه ثم قال :"من عمل عملا فلیتقنه "وکره ابوحنیفه علی البناء فوق القبر وان یعلم بعلامة.

ولما فی مراقی الفلاح(ص ۲۲۲ قدیمی کتب خانه)

واذا خربت القبور ،فلا بأس بتطیینها لان رسول الله ﷺ مر بقبر ابنه ابراہیم فرأی فیه حجرا فسده ،قال من عمل عملا فلیتقنه.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:شاہ جہان ڈیروی

یکم رجب المرجب ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر:۳۳۰۹

## ﴿قبر کو پختہ کرنا ممنوع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے متعلق کہ قبروں کو پختہ بنانا(جیسا کہ آج

کل یہ کام عام ہے) جائز ہے؟ نیز بعض لوگ اپنے عزیزوں اور احباء کی قبور کے اردگرد لکڑی کے خوبصورت تختے لگا لیتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟

مستفتی: حسین احمد

﴿جواب﴾ (۱) شریعت مطہرہ نے قبروں کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے: (۳۱۲/۱، قدیمی)

عن أبی الزبیر عن جابرؓ قال:

نہی رسول اللہ ﷺ أن تجصص القبور وأن یکتب علیہا وأن یبنیٰ علیہا وأن توطأ.

موت کے بعد انسان کی حالت ویسے بھی قابل رحم ہوتی ہے کہ اس کو اس دشوار گھاٹی سے گزرنا ہوتا ہے تو اس کی قبر کو بھی ایسی حالت میں ہونا چاہیے جس سے اس کی خستہ حالی، کمزوری اور بے چارگی خوب واضح ہو اور اس پر اس کے پروردگار کو رحم آئے اور وہ کچی قبر میں نمایاں ہوتی ہے نہ کہ پختہ قبر میں۔

(۲) قبروں کے اردگرد جو لکڑی کے تختے لگائے جاتے ہیں وہ اگر قبر کو اکھڑنے اور گرنے سے بچانے کے واسطے ہوں تو گنجائش ہے ورنہ تزیین کی غرض سے جائز نہیں۔

لما فی التنویر: (۱۲۲/۲، طبع امدادیہ)

(ولا یجصص) للنہی عنہ (ولا یطین ولا یرفع) علیہ بناء، قیل لا بأس بہ وہو المختار.

وفی الشامیۃ: (وقیل لا بأس بہ الخ) المناسب ذکرہ عقب قولہ ولا أن تطین، لان عبارۃ السراجیۃ کما نقلہ الرحمتی ذکر فی تجرید أبی الفضل أن طین القبور مکروہ والمختار أنہ لا یکرہ۔۔۔ والیوم اعتادوا التسنیم باللبن صیانۃ للقبر عن النبش ورأو ذالک حسناً وقال صلی اللہ علیہ وسلم ماراٰہ المسلمون حسناً فہو عند اللہ حسن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز فیض آبادی

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۰

## ﴿زیارت قبور کا طریقہ﴾

﴿سوال﴾ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قبور کی زیارت سر کی جانب سے نہیں کرنی چاہئے بلکہ پاؤں کی جانب سے کرنی چاہئے کیونکہ اس سے مردے کو تکلیف ہوتی ہے کیا ان لوگوں کی یہ بات درست ہے؟

﴿جواب﴾ ان لوگوں کا یہ کہنا صحیح ہے، اگر میت کے سر کی جانب کھڑے ہو کر زیارت کی

جائے تو یہ میت پر باعث دشواری ہے، لہٰذا اگر ممکن ہو تو پاؤں کی جانب کھڑے ہو کر زیارت اور فاتحہ پڑھنی چاہیئے اور اگر پاؤں کی جانب کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو سر کی جانب کھڑے ہو کر زیارت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما فی الشامی:(۲/۲۴۲،طبع سعید)

ثم من آداب الزيارة ماقالوا، من أنه يأتى الزائر من قبل رجلى المتوفى لامن قبل رأسه لأنه أتعب لبصر الميت بخلاف الاول لانه يكون مقابل بصره لكن هذا اذا أمكنه والا فقد ثبت " أنه عليه الصلاة والسلام قرأ اول سورة البقرة عندرأس ميت وآخرها عند رجليه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم:شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۸۹

## ﴿عورت زیارت قبور کیلئے جاسکتی ہے یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت مزار یا قبرستان جاسکتی ہے کہ نہیں؟ تسلی بخش جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔　　　مستفتی:محمد شیراز

﴿جواب﴾ جوان عورتوں کیلئے قبرستان یا مزار جانے کی علی العموم اجازت نہیں ہے خصوصاً جن کا جانا فتنہ کا باعث ہو تو ایسی عورتوں کا قبرستان جانا سختی سے منع ہے حدیث شریف میں آیا ہے: کہ ایسی عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے، البتہ عمر رسیدہ خواتین عبرت حاصل کرنے کی غرض سے یا اپنے عزیز واقارب کی موانست کی غرض سے زیارت کیلئے جائیں تو اسکی گنجائش ہے بشرطیکہ وہاں جا کر رونے، پیٹنے اور دیگر خلاف شرع کاموں سے گریز کرتی ہوں۔

لما فی الدر المختار:(۲/۲۴۲،طبع سعید)

وبزيارة القبور ولو للنساء لحديث "كنت نهيتكم عن زيارة القبور ألا فزوروها"

ولما فی رد المحتار:(۲/۲۴۲،طبع سعید)

(قوله ولو للنساء)وقيل تحرم عليهن والأصح أن الرخصة ثابتة لهن بحر ، وجزم فى شرح المنية بالكراهة لما مرّ فى اتباعهن الجنازة ،وقال الخير الرملى : ان كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ما جرت به عادتهن فلا تجوز وعليه حمل حديث، "لعن الله زائرات القبور "وان كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس اذا كن عجائز ،ويكره اذا كن شواب كحضور الجماعة فى المساجد،وهو توفيق حسن.

ولمافی حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح:(ص۳۴۰،طبع قدیمی)

واما النساء اذا أردن زيارة القبور ان كان لتجديد الحزن والبكاء والندب كما جرت به عادتهن فلا تجوز لهن الزيارة وعليه يحمل الحديث الصحيح "لعن الله زائرات القبور" وان كان للاعتبار والترحم والتبرك بزيارة قبور الصالحين من غير ما يخالف الشرع فلا بأس اذا كن عجائز وكره للشوابات كحضورهن في المساجد للجماعات.

ولمافی البحر الرائق:(۱۹۵/۲،طبع سعید)

(قوله ولا يخرج من القبر الا أن تكون الارض مغصوبة)۔۔۔ ولم يتكلم المصنف على زيارة القبور ولا بأس ببيانه تكميلا للفائدة قال في البدائع ولا بأس بزيارة القبور والدعاء للأموات ...... وصرح في المجتبى بأنها مندوبة وقيل تحرم على النساء والأصح أن الرخصة ثابتة لهما.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:علی خان غفرلہ

۶ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۵۰۳

## ﴿شب برات میں عورتوں کا قبر پر جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ رسم نکلی ہے کہ ۱۵شعبان کی رات کواور شب قدر کوعشاء کے بعد عورتیں اپنے عزیزوں کی قبروں پر جاتی ہیں، دعا کرتی ہیں، پھر وہاں کوئی چیز، پیسے، یا مٹھائیاں وغیرہ رکھ کرآتی ہیں کہ کوئی اُٹھائے تو ثواب صاحبِ قبر کو ملے گا۔کیاازروئے شریعت یہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ ایصالِ ثواب کے واسطے کوئی خاص دن مقرر کرنا یا کسی خاص مہینے کو افضل سمجھنا درست نہیں ہے، شریعتِ مطہرہ میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے،لہٰذا سب ایام اور مہینے اس سلسلے میں برابر ہیں، باقی رہا عورتوں کا قبرستان جانا، اگر عبرت حاصل کرنے، اپنے متوفّی عزیز واقارب کی موانست کیلئے ہو تو جائز ہے بشرطیکہ وہ ناجائز اور خلافِ شرع امور کا ارتکاب نہ کریں، یہ تو عمر رسیدہ خواتین کے لیے حکم ہے، اگر عورتیں جوان ہوں تو ان کے لیے علی العموم اجازت نہیں ہے، ایصالِ ثواب کی غرض سے مٹھائیاں وغیرہ قبرستان لے جانیکی کوئی ضرورت نہیں ہے، مردوں کو مٹھائیوں وغیرہ سے کیا غرض؟ ثواب تو جہاں پر بھی بخش دیا جائے پہنچ جاتا ہے، لہٰذا ایسی رسموں کو ختم کرنا چاہیئے۔

لمافی الشامی:(۲۴۰/۲،طبع سعید)

ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الى القبر في المواسم

ولمافی الشامی:(۲۲۲،طبع سعید)

صرح علماء نا فی باب الحج عن الغیر بان للانسان ان یجعل ثوابه عمله لغیرہ صلاۃ او صوما او صدقۃ اوغیرھما.

ولمافی الدرالمحتار:(۲/۲۴۲،طبع سعید)

وبزیارۃ القبور ولو للنساء (قال الشامی تحتہ :ولو للنساء)وقیل تحرم علیھن والاصح ان الرخصۃ ثابتۃ لھن وجزم فی شرح المنیۃ بالکراھۃ لما مر ......وقال الخیر الرملی :انکان ذلک لتجدید الحزن والبکاء والندب علیٰ ماجرت عادتھن فلاتجوز وعلیہ حمل حدیث"لعن اللہ زائرات القبور" وان کان للاعتبار والترحم ......فلا باس اذا کن عجائز ویکرہ اذا کن شواب کحضورھن الجماعۃ فی المساجد وھو توفیق حسن.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:محمد شریف حسین عفااللہ عنہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۲۲۴

## ﴿قبر پر شاخ اور پودا لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے کے قبرستان میں قبروں کے اوپر اور اردگرد خودرو گھاس کاٹ کر صاف کیا جاتا ہے، کیا اسطرح کرنا جائز ہے؟ واضح رہے، کہ مذکورہ قبرستان میں خودرو گھاس وغیرہ صاف نہ کرنے کی صورت میں قبروں کے نشانات مستقبل قریب میں مٹ جانے کا اندیشہ ہے، نیز قبروں پر ترشاخ گاڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور ہمارے علاقے میں سوسن نامی ایک پھول ہے، جسکا پودا اور پتے سال بھر سرسبز وتر رہتے ہیں، اس وجہ سے لوگ اسکو قبروں پر لگاتے ہیں اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مستفتی:اکرام الدین چترالی

﴿جواب﴾ ترگھاس ونباتات خشک ہونے تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو میت کی انسیت اور نزول رحمت کا باعث ہے، اس وجہ سے بغیر ضرورت کے مقبرہ سے ترگھاس ونباتات کاٹنا مکروہ ہے، البتہ خشک ہونے کے بعد کاٹنے میں مضائقہ نہیں ہے، مذکورہ قبرستان کی خودرو گھاس کسی موسم میں خشک تو ہوگی، تو ایسے دنوں میں کاٹ لیا کریں، نیز قبروں پر ترٹہنی گاڑھنا یا پودا لگانا باقاعدہ کوئی شرعی مستحب ہوتا تو خیر القرون میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا بھی معمول رہتا۔

لمافی الشامیۃ:(۲/۱۵۵،طبع امدادیہ)

یکرہ ایضا قطع النبات الرطب والحشیش من المقبرۃ دون الیابس......وعللہ فی

الامداد بانه مادام رطبا یسبح الله تعالیٰ فیؤنس المیت وتنزل بذکره الرحمة.

ولما فی البحر:(۸/۳۲،طبع سعید)

ویکره قطع الحطب والحشیش۔۔۔ وکذا فی اعلاء السنن(۲/۱۹۲،طبع العلمیة بیروت)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفی عنہ

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۵۰۶

## ﴿قبر پر پانی چھڑکنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ علماء کرام قبر پر پانی چھڑکنے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، کیا اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے؟

مستفتی: محمد سلمان کراچی

﴿جواب﴾ میت کو دفنانے کے بعد حفاظت کیلئے قبر پر پانی چھڑکنے میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن اس عمل کیلئے سال میں کچھ ایام کو خاص کر دینا جیسا کہ آج کل بعض لوگ شب برات یا محرم کے شروع دنوں کو خاص سمجھتے ہیں غلط ہے اس سے گریز کرنا ضروری ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۲۳۷،طبع سعید)

(ولا باس برش الماء علیه)حفظا للترابة عن الاندراس۔ وفی ردالمحتار: بل ینبغی أن یندب،لانه صلی الله علیه وسلم فعله بقبر سعد کما رواه ابن ماجه ، وبقبر ولده ابراهیم کما رواه ابوداؤد فی مراسیله ،وامر به فی قبر عثمان بن مظعون کما رواه البزار.

ولما فی التاتارخانیة:(۲/۱۲۹،طبع قدیمی)

وان خیف ذهاب أثره فلاباس برش الماء علیه بلاخلاف ،انما الخلاف فیما اذالم یخف ذهاب أثره ،ذکرفی ظاهر الروایة أنه لایکره.

ولما فی حاشیة التاتارخانیة:(۲/۱۲۹ طبع قدیمی)

فقدذکرالبیهقی فی(سننه الکبری :۳/۴۱۱)من طریق ابی العباس۔۔أن الرش علی القبر کان علی عهدرسول الله صلی الله علیه وسلم وقدرش النبی علی قبرابنه ابراهیم ووضع علیه الحصباء، وکذلک رش علی قبرعثمان بن مظعون ورش بلال علی قبرالنبی صلی الله علیه وسلم بقربة.

ولما فی البحر:(۲/۱۹۴،طبع سعید)ولا باس برش الماء علی القبر لانه تسویة له.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ادریس چارسدوی عفی عنہ

۱۷/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۰۵

## ﴿پرانے قبرستان کی زمین پر تعمیر کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی کا ذاتی قبرستان جس کی قبریں بہت پرانی ہو گئیں ہوں تو اس جگہ مسجد یا مدرسہ تعمیر کرانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد حسن

﴿جواب﴾ قبریں اتنی پرانی ہوں کہ ان میں مردوں کے جسم بوسیدہ ہو کر ختم ہو گئے ہوں تو وہاں مسجد و مدرسہ یا کوئی اور تعمیر چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

لما فی الشامية:(۱۳۸/۲،طبع امدادیه)

وقال الزيلعي: ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه.

ولمافي البحر:(۱۹۵/۲،طبع سعيد)

وفي التبيين ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه.

ولمافي الهندية:(۱۶۷/۱،طبع رشيديه)

ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه كذا في التبيين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی عفی عنہ

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۰۸

## ﴿قبر کو چونا لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں میت کی تدفین کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد قبر کو چونا لگاتے ہیں اس کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟ برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حکم بیان فرمائیں؟ مستفتی: زاہد حسین لیاری کراچی

﴿جواب﴾ قبر کو چونا لگانا اسی طرح دیگر زینت کی اشیاء سے مزین کرنا مکروہ ہے حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے، لہٰذا اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

لما فی الدر المختار:(۲۳۷/۲،طبع سعيد)ولا يجصص للنهي عنه.

ولما في بدائع الصنائع:(۳۲۰/۱،طبع سعيد)

ويكره تجصيص القبر وتطيينه.....لما روى عن جابر بن عبداللهؓ عن النبيﷺ انه قال لا تجصصوا القبور ولا تبنوا عليها ولا تقعدوا ولا تكتبوا عليها ولان ذلك من باب الزينة ولاحاجة بالميت اليها ولانه تضييع المال بلا فائدة فكان مكروها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفی عنہ

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۵۵

## ﴿دعاء میں ہاتھ اٹھانے اور تدفین کے بعد قبر پر پڑھنا﴾

﴿سوال﴾ (۱) دعاء میں دونوں ہاتھوں کو اٹھانے کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا کسی حدیث سے اس کا ثبوت ہے؟ (۲) میت کی تدفین کے بعد قبر کے پاس دعا کرنا کیسا ہے؟ نیز بعض لوگ سورۃ بقرۃ کا اول و آخر پڑھتے ہیں اسکی کیا حیثیت ہے؟ مستفتی: نور اللہ ماڑی پور کراچی

﴿جواب﴾ (۱) دعا کرتے وقت دونوں ہاتھوں کو سینے کے برابر اٹھانا مستحب ہے، متعدد احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

لما فی اعلاء السنن: (۲/۲۱۰، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

عن سلیمانؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ ان ربکم حیی کریم یستحیی من عبدہ اذا رفع الیہ یدیہ ان یردھما صفراً، عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ قال: ھذا الاخلاص یشیر باصبعہ التی تلی الابہام وھذا الدعاء فرفع یدیہ حذو منکبیہ وھذا الابتہال فرفع یدیہ مداً عن عکرمۃ عن عائشۃؓ زعم انہ سمع منہا أنہا رأت النبی ﷺ یدعو رافعا یدیہ یقول انما انا بشر فلا تعاقبنی ایما رجل من المومنین آذیتہ وشتمتہ فلا تعاقبنی فیہ، قال المحدث العلامۃ ظفر احمد عثمانیؒ تحت ھذہ الاحادیث فیہ دلالۃ علی رفع الیدین فی الدعاء وفی تدریب الراوی ومنہ ماتواتر معناہ کالاحادیث رفع الیدین فی الدعاء فقد روی عنہ ﷺ نحو مائۃ حدیث فیہ رفع یدیہ فی الدعاء۔

ولما فی الھندیۃ: (۵/۳۱۸، طبع رشیدیہ)

والمستحب ان یرفع یدیہ عند الدعاء بحذاء صدرہ۔

(۲) تدفین کے بعد قبر کے پاس دعا کرنا مستحب ہے اور احادیث میں تدفین کے بعد میت کی مغفرت کیلئے دعا کرنے کا حکم آیا ہے، اسی طرح سورۃ بقرۃ کا اول (الم سے مفلحون تک) قبر کے سرہانے اور آخر (آمن الرسول سے اخیر سورۃ تک) قبر کے پائے کی طرف پڑھنا بھی مستحب ہے۔

لما فی الشامیۃ: (۲/۲۳۷، طبع سعید)

وفی سنن ابی داؤد کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبرہ وقال: استغفروا لاخیکم واسألوا اللہ لہ التثبیت فانہ الان یسأل وکان ابن عمر یستحب ان یقرأ علی القبر بعد الدفن اول سورۃ البقرۃ وخاتمتہا۔

ولما فی المرقاۃ شرح المشکوۃ: (۴/۱۷۲، طبع رشیدیہ)

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال سمعت النبی صلی اللہ یقول اذا مات احدکم فلا تحبسوہ و

اسرعوابه الی قبره ولیقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجلیه بخاتمة البقرة وهکذا فی حاشیة الطحطاوی :(ص۳۲۸-۳۲۱)

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفی عنہ

۱۴ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۵۷

## ﴿قبر کی اونچائی زمین سے تقریباً ایک بالشت ہونی چاہیے﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب ہمارے علاقے میں لوگ اونچی اونچی قبریں بناتے ہیں، شرعاً قبر کی اونچائی کتنی ہونی چاہیے؟

مستفتی: فاروق شاہ وادی سواتی

﴿جواب﴾ شریعت نے اونچی قبریں بنانے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا قبر کو نہ زیادہ اونچا کیا جائے نہ بالکل زمین کے برابر کیا جائے بلکہ تقریباً ایک بالشت زمین سے اونچی ہونی چاہیے۔

لمافی مشکوٰۃ المصابیح :(۱۴۸/۱ طبع سعید)

عن ابی الهیاج الاسدی قال قال لی علیؓ الاابعثک علی مابعثنی علیه رسول الله ﷺ الاتدع تمثالا(:أی صورة)الاطمسته(:أی محوته)ولاقبرامشرفا(:أی عالیابنی علیه)الاسویته(حتیٰ بقی قدرالشبر)

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۲۲۶/۱،طبع رشیدیه)

وان یکون القبر مسنمامرتفعا من الارض قدر شبر ویرش علیه الماء

ولمافی الفتاوی البزازیه:(۷۲/۱،طبع قدیمی)

ویستحب ان یکون القبر مسنمامرتفعاقدرشبرمن الارض ویرش علیه الماء

ولمافی البحرالرائق :(۱۹۴/۲ طبع سعید)ویسنم قدرشبر وقیل قدر اربع اصابع.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان سواتی

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر ۱۴۹۱

## ﴿تدفین کے بعد تین دن تک روزانہ صبح قبر جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام حالات میں جوان عورتوں کیلئے زیارت قبور مکروہ ہے لیکن ہمارے علاقے میں یہ طریقہ ہے کہ میت کو دفن کرنے کے بعد تین دن تک صبح عورتیں قبروں کی زیارت کیلئے جاتی ہیں اور وہاں تلاوت کر کے ایصال

ثواب کرتی ہیں اور تین دن صبح جانا ضروری اور لازمی سمجھتی ہیں اسکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: احسان اللہ

﴿جواب﴾ ویسے عام حالات میں جوان عورتوں کیلئے قبرستان جانے کی کھلی اجازت نہیں ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایسی عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے، البتہ عمر رسیدہ خواتین اگر عبرت حاصل کرنے کی غرض سے اور اپنے عزیز و اقارب کی موانست کیلئے اگر کبھی کبھار چلی جائیں تو اسکی گنجائش ہے، رہا آپکے علاقہ کی عورتوں کا معمول کہ میت کی قبر پر تین دن تک صبح کے وقت حاضری ضروری سمجھتی ہیں، سو یہ بدعت اور ناجائز عمل ہے، اس کو سختی سے منع کرنا چاہیئے، دور سے بھی ایصال ثواب ہوسکتا ہے، قبر پر حاضری دینا ایصال ثواب کیلئے کوئی ضروری نہیں ہے۔

لما فی الشامیة:(۲/۲۴۲،طبع سعید)

(قوله:ولـلنساء) و قيل تحرم عليهن والأصح أن الرخصة ثابتة لهن بحر وجزم في شرح المنية بالكراهة لما مر في اتباعهن الجنازة و قال الخير الرملي ان كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ما جرت به عادتهن فلا تجوزوعليه حمل حديث(لعن الله زائرات القبور)وان كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس اذا كن عجائز ويكره اذا كن شواب كحضور الجماعة في المساجد وهو توفيق حسن.

لمافی اعلاء السنن: (۸/۳۲۱،طبع دارالکتب العلمیةبیروت)

ثم اعلم أن استحباب زيا رة القبور قد ثبت بهذ ه الاحاد يث للرجال والنساء جميعا وقد اختلفوا في النساء ففي فتح الباري:واختلف في النساء فقيل :دخلن في عموم الاذن وهوقول الأكثر،ومحله اذا أمنت الفتنة و قيل الاذن خاص بالرجال ولا يجوز النساء زيارة القبور و به جزم الشيخ ابو اسحاق في المذ هب.

ولماایضافیہ:(۸/۳۲۵،طبع دارالکتب العلمیةبیروت)

قال بعض الناس، قد قدمت الفرق بين الاتباع والزيارة ؛وهوالفرق بين الذهاب الى المساجد ؛ وغيرها،وبين الزيارة؛فتأمل قلت بتأملنا ،فرأينا زيارة القبور أشد فتنة من الذهاب الى المساجدلكون المساجد في داخل البلدة والقبورخارجها وذهاب المرأة الى خارج البلد أشد فتنة كمالايخفى قال نعم ان لم تكن لها الزيارة مع المحافظة على الحدود الشرعية تمنع عنها والا فلا قلت شرطية لا وجود لمقدمها الا نادرا في هذا الزمان ولا عبرة للنادر في الأحكام ،وانما بناء ها على الغالب فكان المنع أقوى وأحوط فافهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی غفرلہ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر ۱۵۱۶

﴿پرانی قبر میں نئی میت کو دفنانے اور قبر کو پختہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر میت کو قبر میں دفن کریں اور چار پانچ سال کے بعد یہ خدشہ ہو کہ کوئی دوسری میت کو اس قبر میں دفن کریگا آیا یہ دوسری میت اس قبر میں دفن کرنا جائز ہے؟ اور اس ڈر کی وجہ سے کہ قبر خراب ہو جائیگی قبر پختہ کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: شیر علی سواتی

﴿جواب﴾ شریعت نے قبروں کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے، قبریں خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو محفوظ رکھنے کے لئے مٹی ڈالنا چاہئے، اس سے بھی حفاظت نہ ہو سکے تو بقدر ضرورت قبر کے چاروں اطراف پتھر یا بلاک لگانے کی بھی گنجائش ہے، اور اگر پہلا مردہ بوسیدہ و مٹی ہو گیا ہو تو نئی میت کو اس جگہ میں دفن کرنا جائز ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم: (۳۱۲/۱، طبع قدیمی)

عن ابی الزبیر عن جابرؓ قال نهى رسول ﷺ أن يجصص القبور وأن يقعد عليه وأن يبنى عليه.

ولما فی الهندية: (۱۶۶/۱-۱۶۷، طبع رشیدیه)

واذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها كذا فى التاتارخانية وهو الاصح وعليه الفتوى ---- ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره فى قبره وزرعه والبناء عليه كذا فى التبيين

ولما فی التنویر: (۱۴۴/۲، طبع امدادیه)

ولا يجصص ولا يطين ولا يرفع عليه بناء وقيل لا بأس به وهو المختار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: حبیب الوہاب سواتی عفی عنہ

۱۷ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۱۵

﴿قبرستان کا سبزہ وغیرہ کاٹنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبرستان سے گھاس اور دیگر سبزہ وغیرہ کاٹنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد زاہد

﴿جواب﴾ قبرستان میں سبز گھاس پودے وغیرہ اگر ہوں تو کاٹنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ سبز ہرے پودے اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور ذکر کرتے ہیں جس سے مردوں کو فائدہ پہنچتا ہے البتہ خشک ہو جائیں یا راستہ میں ہوں تو کاٹنے کی گنجائش ہے۔

لمافی سراجیة:(ص ۷۳،طبع سعید)

یکره قلع مانبت علی القبور ما دام رطبا لأنه یسبح مادام رطبا وان یبس فلا بأس.

ولمافی نورالایضاح:(ص ۱۳۲،طبع قدیمی)

وکره...قلع الحشیش والشجر من المقبرة ولا بأس بقلع الیابس منهما.

ولمافی مراقی الفلاح:(ص ۲۲۵،طبع قدیمی)

(و)کره(قلع الحشیش)الرطب(و)کذا(الشجر من المقبرة)لأنه مادام رطبا یسبح الله تعالیٰ فیونس المیت وتنزل بذکر الله تعالیٰ الرحمة(ولا بأس بقلع الیابس منهما)ای الحشیش والشجر لزوال المقصود.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد سجاد

۱۶ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۰۴۳

## ﴿باب التعزیة والحداد﴾

## ﴿سوگ اور تعزیت کا بیان﴾

### ﴿تعزیت کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ میت کو دفن کر کے گھر واپس آتے ہیں تو تین دن تک اور بعض سات دن تک تعزیت کیلئے بیٹھ جاتے ہیں اور لوگ تعزیت کے لئے آتے ہیں اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں اور یہ سلسلہ تین یا سات روز تک جاری رہتا ہے تو کیا ایسا شرعا جائز ہے؟اگر یہ طریقہ شرعا جائز نہیں ہے تو پھر تعزیت کا شرعی طریقہ کیا ہے؟وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

﴿جواب﴾ تعزیت کا مطلب ہے اہل میت کو تسلی دینا اور مصیبت میں صبر کی تلقین کرنا اور میت کے لئے بخشش کی دعا کرنا شرعا یہ مستحب عمل ہے اور باعث اجر وثواب ہے،انتقال کے وقت سے لے کر تین دن تک تعزیت کرنا سنت سے ثابت ہے۔مقامی لوگوں کے لئے تین دن گزرنے کے بعد تعزیت کرنا ناپسندیدہ قرار دیا ہے،البتہ غائب یا دور سے آنے والا شخص مذکورہ مدت گزرنے کے بعد بھی تعزیت کر سکتا ہے،تعزیت کا طریقہ یہ ہے کہ پسماندگان کو تسلی دی جائے اور میت کے حق میں دعائیہ کلمات بولے جائیں،البتہ ہاتھ اٹھانے کا اہتمام کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے،لہٰذا ضروری نہ سمجھا جائے اور برا بھی نہ سمجھا جائے اس لئے کہ نفس دعا ثابت ہے۔

لما فی البحر:(۱۹۲/۲،طبع سعید)

والتعزية للمصاب سنة للحديث من عزى مصابا فله مثل اجره،قال البقالي ولا باس بالجلوس للعزاء ثلاثة ايام في بيت اومسجدوقد جلس رسول اللهﷺلماقتل جعفروزيد بن حارثة والناس ياتون ويعزونه والتعزية في اليوم الاول افضل والجلوس في المسجدثلاثة ايام للتعزية مكروه وفي غيره جاء ت الرخصة ثلاثة ايام للرجال وتركه احسن ويكره للمعزى ان يعزى ثانيا اه ،وهي كمافي التبيين ان يقول اعظم الله اجرك وأحسن عزاك وغفر لميتك.

ولمافی الهندية:(۱۶۷/۱ طبع رشیدیه)

التعزية لصاحب المصيبة حسن كذافي الظهيرية وروى الحسن بن زيادإذاعزى اهل الميت مرةفلاينبغي ان يعزيه مرةاخرى كذافي المضمرات ووقتها من حين يموت الى ثلاثة ايام ويكره بعدهاالاان يكون المعزى اوالمعزى اليه غائبافلاباس بهاوهي بعدالدفن اولى منهاقبله وهذااذالم يرمنهم جزع شديدفان رؤى ذلك قدمت التعزية.

ولمافی الدرالمختار:(۱۴۷/۲ طبع امدادیه)

ولاباس.....وبتعزيةاهله وترغيبهم في الصبروباتخاذطعام لهم وبالجلوس لهافي غيرمسجد ثلاثة ايام واولهاافضل وتكره بعدهاالالغائب وتكره التعزية ثانيا وعندالقبروعندباب الدارويقول اعظم الله اجرك.

وفي الشامية:قال في شرح المنية:وتستحب التعزية للرجال والنساء اللاتي لايفتن لقولهﷺ"من عزى اخاه بمصيبة كساه من حلل الكرامةيوم القيامة"رواه ابن ماجه وقولهﷺ"من عزى مصابافله مثل اجرة" (رواه الترمذي).

ولمافی التاتارخانیة:(۱۳۹/۲ طبع قدیمی)

الجلوس في المسجدثلاثة ايام للمصيبةمكروه وفي غير المسجد جاء ت الرخصة ثلاثة ايام للرجال وفوقهايكره وترك الجلوس احسن.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:خضرحیات کمالوی

۱۷محرم الحرام ۱۴۲۸ھ | فتویٰ نمبر:۶۳۹

## ﴿تعزیت کا حکم تدفین میت سے قبل﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں میت کوغسل دینے اورکفن دینے سے پہلے لوگ تعزیت کرناشروع کرتے ہیں شرعاًاس کاکیاحکم ہے؟

﴿جواب﴾ بہتر یہی ہے کہ میت کودفن کرنے کے بعد تعزیت شروع کی جائے البتہ اگراہل

میت کی تسکین وتسلی کے لئے پہلے کی جائے تو بھی جائز ہے۔

لمافی الشامیۃ:(۲/۱۴۹،طبع امدادیہ)

وھی بعد الدفن أفضل منہا قبلہ لأن أھل المیت مشغولون قبل الدفن بتجہیزہ ولأن وحشتہم بعد الدفن لفراقہ أکثر وھذا اذا لم یری منہم جزع شدید والاقدمت لتصکینہم

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:صلاح الدین

۱۹/رجب ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۵۲۵

## ﴿عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کے انتقال پر سوگ منانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا عورت کیلئے اپنے شوہر کے علاوہ کسی رشتہ دار مثلاً بیٹا،بیٹی یا ماں،باپ وغیرہ کیلئے تین دن سے زیادہ سوگ منانا اور زیب وزینت وغیرہ ترک کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ عورت کیلئے اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کے انتقال کے موقع پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا اور سوگ کی غرض سے زیب وزینت وغیرہ ترک کرنا جائز نہیں،ہاں اگر یہ غرض نہیں ہے بلکہ ایسے ہی زیب وزینت وغیرہ ترک کیے ہوئے ہے تو کوئی حرج نہیں۔

لمافی الدر المختار:(۲/۵۳۲،طبع سعید)

ویباح الحداد علی قرابۃ ثلاثۃ أیام فقط، وللزوج منعہا لأن الزینۃ حقہ فتح، وینبغی حل الزیادۃ علی الثلاثۃ اذا رضی الزوج أولم تکن مزوجۃ نہر. وفی التتارخانیۃ :ولاتعذر فی لبس السواد وھی آثمۃ الاالزوجۃ فی حق زوجہا فتعذر الی ثلاثۃ أیام : قال فی البحر:وظاھرہ منعہا من السوادتأسفا علی موت زوجہافوق الثلاثۃوفی النہرلوبلغت فی العدۃلزمہاالحدادفیمابقی۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۴۵۲

## ﴿تین دن کے بعد تعزیت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ جب کسی آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے اگر اس کے دوست واحباب دوسرے کسی دور علاقہ یا ملک میں ہوں تعزیت کے دنوں میں وہ مجبوری کی وجہ سے نہیں آسکے اور جب کافی عرصہ سال/دوسال کے بعد آجاتے ہیں تو میت کے پسماندگان سے ان کے گھر جا کر تعزیت کرتے

ہیں، اس طرح کافی عرصہ گزرنے کے بعد تعزیت کرنا شرعاً کیسا ہے؟ مستفتی: عطاء الحق

﴿جواب﴾ کسی مجبوری کی بناء پر دیر سے تعزیت کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ بغیر مجبوری کے تین دن کے بعد تعزیت کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۱۶۷،طبع رشيديه)

ووقتها من حين يموت الى ثلاثة ايام ويكره بعدها الا أن يكون المعزى أو المعزى اليه غائبا فلا بأس بها.

ولمافی الدرالمختار:(۳/۱۴۹،طبع امداديه)

وتكره بعدها الا لغائب قال الشامی تحت هذاه المسئلة أى الا أن يكون المعزى أو المعزى غائبا فلا باس بها قلت: والظاهر أن الحاضر الذى لم يعلم بمنزلة الغائب كما صرح به الشافعية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۲۱

## ﴿غیر مسلم کی عیادت اور تعزیت جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا کسی کافر کی عیادت کرنا جائز ہے یا نہیں اور اس کی تعزیت کرنے کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عبداللہ

﴿جواب﴾ کافر کی عیادت و تعزیت دونوں جائز ہیں لیکن تعزیت کرتے وقت مردے کے لئے استغفار کے بجائے اس کے پسماندگان کو دوسرے کسی الفاظ سے تسلی دی جائے۔

لمافی الهداية:(۴/۴۷۸،طبع رحمانيه)

ولا بأس بعيادة اليهودى و النصرانى لانه نوع بر فى حقهم وما نهينا عن ذالك وصحه أن النبى صلى الله عليه وسلم عاد يهوديا مرض بجواره.

ولمافی الهندية:(۵/۳۴۸،طبع رشيديه)

ولا بأس بعيادة اليهودى و النصرانى وفى المجوسى اختلاف كذا فى التهذيب ويجوز عيادة الذمى كذا فى التبيين......واذامات الكافر قال لوالده او قريبه فى تعزيته اخلف الله عليك خيراً منه وأصلحك أى أصلحك بالاسلام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۹۱

## ﴿میت کی تعزیت کے وقت دعا کا حکم﴾

﴿سوال﴾ آجکل یہ صورت حال ہے کہ اگر کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو لوگ اہلِ میت کے پاس جا کر دعا کا اہتمام کرتے ہیں اور بعض لوگ تو محض دعا ہی کو تعزیت سمجھتے ہیں اور دعا نہ کرنے والے کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں یعنی برا سمجھتے ہیں کیا ایسی صورتِ حال جائز ہے؟ نیز یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ تعزیت دفن سے پہلے بھی جائز ہے؟ مستفتی: محمد صالح

﴿جواب﴾ کسی کے انتقال کے موقع پر اہلِ میت کے ہاں تعزیت کے لئے جانا مستحب عمل ہے، جس کا مقصد اہلِ میت کو صبر کی تلقین کرنا اور ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنا ہے، اب یہ مقصد خواہ جس کسی طریقے سے بھی حاصل ہو جائے، مثلاً اہلِ میت کے ہاں جا کر دعا کرنے سے ان کو تسلی اور راحت ملتی ہے، یا کسی اور طرح سے یہ مقصد حاصل ہو جائے (بشرطیکہ وہ عمل خلافِ شرع نہ ہو) تو تعزیت کا اجر و ثواب حاصل ہو جائے گا، البتہ دعا ہی کو ضروری سمجھنا کہ دعا نہ کرنے والے کو بُرا کہا جائے، درست نہیں ہے، تعزیت کے لئے جانا دفن کے بعد زیادہ بہتر ہے، تاہم دفن سے پہلے جانا بھی جائز ہے۔

لما في الهندية: (۱۶۷/۱ طبع رشيديه)

التعزية لصاحب المصيبة حسن..... وهي بعد الدفن اولى منها قبله الى آخره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی عفا اللہ عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹

## ﴿تعزیت کے وقت دعائیہ کلمات پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک عرصہ دراز سے یہ معمول چلا آرہا ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو میت کے ایصالِ ثواب کے لئے دعائیں شروع ہو جاتی ہیں اور ہر تعزیت کے لئے آنے والا دعا کرتا ہے اور آجکل یہ بات مشہور ہو رہی ہے کہ میت کو نہلانے اور دفنانے سے پہلے دعا نہیں کرنی چاہیے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نہلانے سے پہلے مردہ جنابت کی حالت میں ہوتا ہے اور اس

وقت دعا کرنے کی صورت میں ثواب نہیں ملے گا، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں اسکی کیا حیثیت ہے؟

﴿جواب﴾ جب کسی کے ہاں فوتگی ہو جائے تو میت کے پسماندگان کی تعزیت کرنا مستحب اور باعث اجر وثواب ہے اور تعزیت کا مطلب یہ ہے کہ پسماندگان کو تسلی دی جائے اور صبر کی تلقین کی جائے، اس موقع پر ایصال ثواب کی نیت سے دعائیہ کلمات بھی کہے جائیں تو تعزیت کے ساتھ ساتھ میت کو انشاء اللہ ثواب بھی ملے گا، تاہم باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو ضروری نہ سمجھیں اور یہ کہنا کہ میت کو نہلانے اور دفنانے سے پہلے دعا کرنے سے ثواب نہیں ملتا یہ غلط ہے بلکہ ایصال ثواب کی نیت سے کسی بھی وقت دعائیہ کلمات پڑھ کر میت کو بخشنا چاہے تو اس کی اجازت ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما في الدر المختار:(۱۴۷/۲،طبع امد ادیه ملتان)

لابأس . وبتعزية اهله وترغيبهم في الصبر--- ويقول عظم الله اجرك واحسن عزائك وغفر لميتك

وفي الشامية:(قوله:وبتعزية اهله):اى تصبيرهم والدعاء لهم به.

ولما فيه ايضا:(۸۵/۲،طبع امداديه)

(كره قراءة القران عنده الى تمام غسله)

وفي الشامية تنبيه:الحاصل ان الموت ان كان حدثًا فلا كراهة في القراءة عنده وان كان نجسا كرهت ---- قلت والظاهر ان هذا اذا لم يكن الميت مسجى بثوب يستر جميع بدنه.....ولا باس بالتسبيح والتهليل وان رفع صوته.

| الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم :محمد اسلم چترالی غفرلہ |
| --- | --- |
| یکم ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر:۱۲۶۷ |

## ﴿میت کے گھر کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں پہلے یہ رواج تھا کہ کسی کے مرنے کے بعد تین دن کے بعد لوگوں کو کھانا دیا جاتا تھا میت کے گھر سے پھر چالیس دن کے بعد کھانا دیا جاتا تھا پھر دو مہینے کے بعد، اس کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ بھیڑ، بکری وغیرہ ذبح کی جاتی تھی پھر لوگوں کو جمع کر کے ان کو کھانا کھلایا جاتا تھا اب یہ رواج ختم ہو کر دوسرا رواج شروع ہو گیا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ بلا کسی وقت کے تعین کے صرف ایک مرتبہ

کھانا پکا کر مساجد میں بھیجا جاتا ہے اس میں بھی بھیڑ، بکری ذبح کرتے ہیں، پھر اس سے کھانا تیار کیا جاتا ہے، اس کو لازمی سمجھ کر کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر اپنے پاس پیسے نہ ہوں تو قرض لے کر کھانا تیار کیا جاتا ہے، لہٰذا گزارش ہے کہ دونوں مسئلوں کا حکم تفصیل سے بتائیں؟ واضح رہے کہ ہمارے علاقے میں مسجد کے ساتھ متصل کمرے میں نماز کے بعد نمازی بیٹھ جاتے ہیں دوسری نماز تک یعنی عصر پڑھ کر مغرب تک مغرب سے عشاء تک اب یہی نمازی مذکورہ کھانا کھاتے ہیں، ان کے لئے یہ کھانا شرعاً کیسا ہے؟ مستفتی: جمیل الرحمٰن

﴿جواب﴾ مذکورہ پہلی صورت میں دنوں کی تخصیص (جیسے تیسرا دن، چالیسواں دن وغیرہ) ہے اس لئے وہ درست نہیں ہے کیونکہ ایصال ثواب میں کسی وقت (خاص) وغیرہ کا اعتقاد رکھنا بدعت ہے۔

دوسری صورت میں چونکہ اہل محلہ وغیرہ کو کھانا کھلانا ضروری سمجھا جانے کا ذکر ہے حتیٰ کہ اس کے لئے قرض بھی لیا جاتا ہے اس لئے یہ بھی ناجائز ہے، ہاں اگر کسی دن کو متعین کئے بغیر اور کھانا کھلانے کو ضروری سمجھے بغیر رسم ورواج سے ہٹ کر، اخلاص کے ساتھ مسلمان بھائیوں کو کھانا کھلا کر ایصال ثواب کیا جائے تو درست ہے۔

آج کل اس قسم کے امور میں عموماً چونکہ رسم ورواج ہی کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جتنی رقم کھانا کھلانے کے لئے درکار ہے اسے چپکے سے کسی حاجتمند، فقیر وغیرہ کو دیدے تو اس میں زیادہ ثواب ہے۔ (واللہ اعلم)

آخری صورت میں جو آپ نے تحریر کی ہے کہ "مسجد کے متصل کمرے میں لوگ بیٹھتے ہیں یہی لوگ وہ کھانا کھاتے ہیں مذکورہ نماز کے انتظار میں بیٹھنے والے لوگوں کا وہ کھانا کھانا جائز اگرچہ ہے تاہم بدعت میں معاونت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا زیادہ بہتر ہے۔

لمافی الشامیة: (۲/۲۴۰-۲۴۱ طبع سعید)

ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشرور وهی بدعة مستقبحة...... الی ان قال ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول و الثالث، وبعد الاسبوع..... واطال فی ذلک. فی المعراج وقال: وهذه الافعال کلها للسمعة والریاء

فيحترز عنها لانهم لا يريدون بها وجه الله تعالیٰ۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد شریف حسین

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۴۳۴

## ﴿موت کے بعد قبر کی زندگی برحق ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں بعض ایسے لوگ ہیں، جو موت کے بعد قبر کی زندگی جسے عالم برزخ کہتے ہیں کا انکار کرتے ہیں اسی طرح وہ عذاب قبر کا بھی انکار کرتے ہیں۔

اسکے علاوہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ قبروں میں مردے نہیں سنتے حتیٰ کہ انبیاء کرامؑ اور شہداء کے بارے میں بھی اسطرح کے الفاظ کہتے ہیں برائے مہربانی دلائل کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

﴿جواب﴾ (۱) موت کے بعد سے لیکر قیامت تک جو درمیانی وقفہ ہے وہ "عالم برزخ" کہلاتا ہے دنوی زندگی ختم ہونے کے بعد انسان کا جسم قبر میں زمین اندوز ہو یا سمندر میں مچھلی کے پیٹ میں ہو یا ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں ذرات پھیلے ہوئے ہوں۔ غرض جس صورت میں بھی ہو وہ عالم برزخ ہوتا ہے، اور عالم برزخ کوئی ایسی محسوس چیز نہیں ہے جسکا محل وقوع بتایا جاسکے بلکہ یہ اس دور کا نام ہے جو آخرت کے قیام سے پہلے پہلے دنیاوی زندگی ختم ہوجانے کے بعد ہے اور ہر انسان کو اس سے گزرنا پڑتا ہے۔

لما فی المعجم الوسیط: (۴۹/۱)

البرزخ: الحاجز بين شيئين وما بين الموت والبعث فمن مات فقد دخل البرزخ.

ولما فی کشاف اصطلاحات الفنون: (۱۱۴/۱)

البرزخ بفتح الاول والثالث على وزن جعفر در لغت عبارت تست از چیزیکه میان دوچیز حائل باشد وآنچه میان دنیا وآخرت باشد وآزمانی است ازوقت موت تا وقت نشور.

(۲) بلاشبہ عذاب قبر حق ہے اسلام کی ابتدائی دور سے لیکر آج تک اس عقیدہ پر تمام اہل سنت والجماعۃ کا اجماع ہورہا ہے، کسی کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں معتزلہ اور روافض جنکا اہلسنت والجماعت سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ خلاف کرتے ہیں۔

عذاب قبر کا ثبوت نا صرف احادیث نبوی ﷺ سے ہے بلکہ قرآن کریم کے بہت ساری آیات سے بھی اس کا ثبوت ہورہا ہے چنانچہ علامہ ابن القیم الجوزیہ "الروح" میں تحریر فرماتے ہیں۔

لما فی الروح:(۱۳۲)

واما الجواب المفصل:فهو أن نعيم البرزخ وعذابه مذكور في القران في غير موضع .فمنها قوله تعالى (ولوترى اذالظالمون في غمرات الموت والملئكة باسطواأيديهم أخرجوا أنفسكم اليوم تجزون عذاب الهون بماكنتم تقولون على الله غيرالحق وكنتم عن ايته تستكبرون)سورۃانعام (۹۳/۶) وهذاخطاب لهم عند الموت وقد أخبرت الملئكة وهم الصادقون أنهم حينئذ يجزون عذاب الهون ولو تأخر عنهم ذالك الى انقضاء الدنيا لما صح أن يقال لهم اليوم تجزون .

ترجمہ:اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ انسان کے لئے عالم برزخ (قبر) میں اللہ تعالی کے نعمتوں کا ہونا یاعذاب کا ہونا قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے (اگر آپ ﷺ انکو دیکھیں موت کے وقت جبکہ یہ ظالم لوگ موت کے سختیوں میں گرفتار ہونگے اور موت کے فرشتے جوملک الموت کے اعوان ہے انکی روح نکالنے کے واسطے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اورشدت کے ظاہر کرنے کو یو کہتے جاتے ہوں گے کہ ہاں جلدی اپنی جانیں نکالو کہاں بچاتے پھرتے تھے دیکھو آج مرنے کے ساتھ ہی تم کو ذلت کی سزادی جائیگی یعنی جس میں تکلیف جسمانی بھی ہواور ذلت روحانی بھی ہواس سبب سے کے تم اللہ تعالی کے ذمہ جھوٹی جھوٹی باتیں بکتے تھے۔(معارف القرآن)

علامہ صاحب اس سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”یہ کفار کے لئے ان کی موت کے وقت خطاب ہے اوراس عذاب کی خبر ملائکہ جو ہمیشہ سچ بولنے والی مخلوق ہے دے رہے ہیں کہ یہ لوگ ابھی ابھی ذلت ورسوائی کے عذاب مبتلاء ہوں گے اور اگراس وقت کاعذاب دعالم برزخ نہ سمجھا جائے بلکہ عالم آخرت مرادلیا جائے تو یوں فمانا درست نہ ہوگا کہ آج ہی آج تمہیں اس عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا،لہذا ایت مذکورہ میں مذکورعذاب سے عالم برزخ (قبر) کا عذاب مراد ہے۔

ولما فی قوله تعالیٰ

”فوقاه الله سيأت مامكرو وحاق بآل فرعون سؤالعذاب .النار يعرضون عليها غدوا وعشيا ويوم تقوم السعاةادخلوا آل فرعون أشدالعذاب“

فذكر عذاب الدارين ذكر صريحا لايحتمل غيره.

ترجمہ:تو اسکو اللہ تعالی نے بچالیا ان کے مکر کی سختیوں اور آگھیرا فرعون کے لوگوں کو سخت

عذاب نے (اور وہ سخت عذاب) آگ ہے کہ اس پر (ان لوگوں کو) حاضر کیا جاتا ہے صبح وشام (دونوں وقت)۔(تو ہم حکم دیں گے کہ) داخل کرو فرعون کے لوگوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔ آگے علامہ صاحب نے فرمایا کہ "اس آیت میں عالم برزخ اور عالم آخرت کی ایسی صراحت سے ذکر فرمایا گیا ہے کہ علاوہ کوئی دوسرا احتمال ہو ہی نہیں ہوسکتا"

اس لئے کہ اس آیت میں عذاب آخرت کو مستقل طور پر یوں بیان فرمایا کہ "اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو اور بھی سخت قسم کی عذاب قیام آخرت سے پہلے پہلے دیا جاتا ہے اور آخرت سے پہلے موت کے بعد کا دور عالم برزخ ہے لہذا اس ایت سے عالم برزخ (قبر) کے عذاب کا صراحۃ اثبات ہوتا ہے۔

ولمافی قوله تعالی

ولنذيقنهم من العذاب الأدنى دون العذاب الاكبر لعلهم يرجعون.

وقد احتج بهذه الاية جماعةفهم عبدالله بن عباس على عذاب القبر ــ فانه سبحانه وأخبر ان له فيهم عذابين أدنى وأكبر فأخبرأنه يذيقهم بعض الأدنى ليرجعوفدل على انه بقى لهم من الأدنى بقية يعذبون بها بعد عذاب الدنيا ولهذا قال من العذاب الأدنى ولم يقل ولنذيقنهم الذاب الأدنى فتأمله قال العبد الضعيف لاتصل أفهام عامةالناس الى فقه هذه الاية مع انها حجة تامة على الخصم فلاحاجة الى ترجمتها.

قرآن مجید کے علاوہ بے شمار احادیث اور اثار اس باب وارد ہوئے ہیں جن سے انکار بلاشبہ راہ حق سے بھٹکنا اور گمراہی ہے چنانچہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

هذاكما أنه مقتضى السنة الصحيحة فهو متفق عليه بين أهل السنة .قال المروزى :قال ابو عبدالله عذاب القبر حق لاينكره الا ضالا أومضل.وقال حنبل قلت لأبى عبدالله فى عذاب القبر فقال هذاأحاديث صحاح نؤمن بها ونقر بها .كلما جاء عن النبى صلى الله عليه وسلم اسناد جيد أقررنا به ،اذا لم نقر بما جاء به رسول الله صلى الله عليه وسلم ودفعناه ورددناه رددناعلى الله أمره قال الله تعالى "وماأتاكم الرسول فخذوه "قلت له عذاب القبر حق ؟قال حق يعذبون فى القبور .قال: وسمعت أباعبدالله يقول :نؤمن بعذاب القبر وبمنكر ونكير وأن العبد يسأل فى قبره "يثبت الله الذين امنوا بالقول الثابت فى الحياة الدنيا وفى الاخرة "فى القبر.

ترجمہ: عذاب قبر حق ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ کا تقاضا ہے اور اس عقیدہ پر اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے، مروزیؒ نے فرمایا: ابوعبداللہ (احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا کہ

عذاب قبر حق ہے اس کا انکار صرف وہ شخص کرتا ہے جو خود گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہو حنبل نے کہا کہ میں نے ابو عبداللہ (احمد بن حنبل ؒ) سے عذاب قبر کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ عذاب قبر کے متعلق صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں جن پر ہمارا ایمان ہے اور ہم انھیں تسلیم کرتے ہیں (چاہے عذاب قبر ہمارے سمجھ میں آئے یا نہ آئے) اس لیے کہ جو بھی بات حضور ﷺ سے ہم تک پہنچ جائے اور وہ معتمد اشخاص کے

ذریعہ سے ہو تو وہ بات ہم ہر صورت میں تسلیم کر لیتے ہیں (یعنی وہ باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر کیوں نہ ہو ہم تسلیم کرتے ہیں) اس لئے کہ اگر وہ بات ہم تسلیم نہ کریں بلکہ اسے رد کردیں تو گویا ہم اللہ عزوجل کی بات رد کر دیا چنانچہ اللہ عزوجل خود قرآن میں ارشاد فرماتے ہیں ''جو کچھ تم کو رسول اللہ ﷺ دے دیا کریں وہ لو اور جس چیز کے لینے سے تمہیں روک دے سو اس (کے لینے سے) رک جایا کرو'' (الفاظ کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے تقریباً تمام مفسرین نے اس سے ہر حکم رسول اللہ ﷺ کی تعمیل کو عملاً فرض قرار دیا ہے) میں نے اس سے (مزید وضاحت کے لئے) کہا کہ کیا عذاب قبر حق ہے؟ فرمایا حق ہے کفار اور مجرمین کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے ۔اور فرمایا کہ میں نے ابو عبداللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ وہ فرما رہے تھے ہمارا ایمان ہے عذاب قبر پر اور منکر نکیر پر اور اس بات پر کہ بندہ سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے (اور اس آخری بات کی دلیل میں یہ ایت تلاوت فرمائی) ''يثبت الله... الخ'' عذاب قبر اور اسمیں سوال وجواب کی تائید میں جس طرح کہ امام سیوطی ؒ اور علامہ ابن قیم ؒ نے مندرجہ بالا ایات قرآن کریم کو پیش کیا ہے چنانچہ امام المحدثین امام محمد بن اسماعیل البخاری ؒ اثبات عذاب قبر کے سلسلہ میں اولاً یہی ایات بطور حوالہ ذکر فرماتے ہیں اور بعد میں یکے بعد دیگرے کئی احادیث ذکر فرماتے ہیں ۔جن سے عذاب قبر، منکر نکیر اور مسئلہ سماع موتی واضح ہو جاتا ہے ۔

ولما في الصحيح البخاری ۱/۱۸۴ طبع قديمی)

باب ما جاء في عذاب القبر وقوله تعالى ولو ترى اذ الظلمون في غمرات الموت ـــ ألیوم تجزون عذاب الهون ـــ وقوله اسنعذبهم مرتين ثم يردون الى عذاب عظيم . وقوله وحاق بآل فرعون سوء العذاب النار يعرضون عليها غدوا وعشيا ويوم تقوم الساعة ادخلوا ال فرعون اشد العذاب .

حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا شعبة عن علقمة بن مرثد عن سعد بن عبيدة عن براء

بن عازب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا أقعد المؤمن فی قبرہ اتی ثم شہد أن لا الہ الا اللہ وان محمد ارسول اللہ فذالک قولہ :یثبت اللہ الذین امنوا با القول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الأخرۃ ــ حدثنا علی بن عبداللہ ــ ان ابن عمر اخبرہ قال اطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی أھل القلیب فقال وجدتم ما وعد ربکم حقا فقیل لہ تدعوا امواتا قال ما انتم باسمع منھم ولکن لا یجیبون ــ اھ حدثنا عبدان ــ عن عائشۃ ان یھودیۃ دخلت علیھا فذکرت عذاب القبر فقالت لھا اعاذک اللہ فسألت عائشۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عذاب القبر فقال نعم عذاب القبر حق قالت عائشۃ فما رأیت رسو اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد صلوۃ الا تعوذ من عذاب القبر زاد غندر عذاب القبر حق اھ حدثنا بن یحی بن سلیمن ــ انہ سمع انہ سمع اسماء بنت ابی بکر تقول قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطیبا فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن فیھا المرء فلما ذکر ذلک ضج المسلمون ضجۃ۔

حدثنا عیاش بن الولید ــ عن انس بن مالک انہ حدثھم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان العبد اذا وضع فی قبرہ وتولی عنہ اصحابہ انہ لیسمع قرع نعالھم اتاہ ملکان فیقعدانہ فیقولان ما کنت تقول فی ھذالرجل لمحمد فاما المؤمن فیقول اشھد ان عبدہ ورسولہ فیقال انظر الی مقعدك من النار قد ابد لک اللہ بہ مقعدا من الجنۃ فیراھما جمیعا قال قتادہ وذکر لنا انہ یفسح لہ فی قبرہ ثم رجع الی حدیث انس قال واما المنافق او الکافر فیقال لہ ما کنت تقول فی ھذالرجل فیقول لا ادری کنت اقول مایقول الناس فیقال لا دریت ولا تلیت ویضرب بمطارق من حدید ضربۃ فیصیح صیحۃ یسمعھا من یلیہ غیر الثقلین۔

ترجمہ حدیث (۱) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن جب اپنی قبر میں بٹھایا جائے پھر وہ شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تو یہ خدا تعالی کے اس فرمان کی تعبیر ہے کہ ''اللہ تعالی مؤمنوں کو صحیح بات کہنے کی توفیق اور اس پر استقلال بخشا ہے دنیا میں اور آخرت میں بھی (یعنی قبر میں)۔

ترجمہ (۲) نبی کریم ﷺ کنویں (جس کنویں میں بدر کے مشرک مقتولین کو ڈالا گیا تھا) والوں کے قریب تشریف لے آئے اور فرمایا تمہارے رب نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اسے تم لوگوں نے صحیح پالیا، کسی صحابی نے عرض کیا کہ (اے حضور) آپ مردوں کو (کیسے) مخاطب کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں، فرق صرف یہ ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے۔

ترجمہ (۳) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ کہ ایک یہودیہ عورت اس کے پاس آئی پھر اس

نے عذاب قبر کے متعلق بات شروع کی، پھر کہا خدا تجھے عذاب قبر سے پناہ دے پس حضرت عائشہؓ نے اس کے متعلق حضور علیہ السلام سے دریافت کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں عذاب قبر حق ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہے اس کے بعد میں نے حضور علیہ السلام کو کوئی نماز پڑھتے نہیں دیکھا کہ جس کے بعد عذاب قبر سے پناہ نہ مانگی ہو یعنی ہر نماز کے بعد عذاب قبر سے ضرور اللہ عزوجل کے ہاں پناہ طلب کرتے تھے۔۔۔۔اھ

ترجمہ (۴) حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ فرماتی ہے کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام نے خطبہ دیا اور خطبے میں عذاب قبر کے بارے میں بیان فرمایا جس میں انسان کا امتحان لیا جاتا ہے اور جہاں انسان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، پس جس وقت اس کا ذکر کیا (عذاب قبر کی کیفیت بیان فرمائی) تو مسلمانوں کی ہچکیاں بندھ گئیں اور سخت گھبرا گئے۔

(۵) انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ کہ حضور علیہ السلام نے بیان فرمایا: کہ بندہ جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے عزیز واقرباء واپس جانے لگتے ہیں تو وہ (میت) ابھی انکے پاؤں کی چپ سن رہا ہوتا ہے کہ دو فرشتے اسکے پاس آجاتے ہیں پھر اس کو بٹھاتے ہیں اس سے سوال کرتے ہیں کہ تو اس شخص کے متعلق (یعنی حضور علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے) کیا کہا کرتا تھا پس جو مؤمن ہوتا ہے تو وہ یوں جواب دیتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ عزوجل کے بندے اور رسول ہیں پھر اس سے کہا جاتا کہ اپنی جگہ آگ میں جو تیری تھی تحقیق اللہ عزوجل شانہ نے اس کے بدلے تیرے لئے جنت میں جگہ تیار کی ہے پس دونوں مقامات اس کو دکھاتے جاتے ہیں قتادہ (راوی) نے یہاں دوسری روایت میں اس جگہ سے متعلق مزید کچھ الفاظ بھی بیان فرمائے اور فرمایا کہ اس میں یہ بھی ہے کہ اس کے لئے قبر کشادہ کی جاتی ہے پھر اسی روایت انس کو بیان کرنے لگے، فرمایا اور جو منافق یا کافر ہو یا ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے متعلق کیا کہا کرتا تھا تو وہ کہتا ہے میں تو نہیں جانتا، جو کچھ لوگ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا پھر اسے کہا جاتا نہ تو تو نے جاننے کی کوشش کی اور نہ اتباع کی اور لوہے کے ہتھوڑے سے مارا جاتا ہے پھر وہ چیخ کر پکارتا ہے جسکی آواز جن وانس کے علاوہ قریب والے تمام سنتے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث کے علاوہ اور بھی بہت ساری احادیث ہیں جن سے یہ بات خوب واضح

ہو جاتی ہے کہ عذاب قبر حق ہے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہمیشہ سے ائمہ اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ رہا ہے۔

(۳) انبیاء کرام علیہم السلام کے اجساد مطہرہ قبروں میں محفوظ ہیں اور قیامت تک محفوظ رہیں گے اور شہداء کے اجساد مبارکہ بھی عموماً محفوظ رہتے ہیں ان کے دوسرے عام مردوں کے اجساد کے متعلق کوئی ضابطہ نہیں ہے اللہ جل شانہ جسے چاہے محفوظ رکھیں اور جسے چاہے محفوظ نہ رکھیں۔

ولما فی مسلم:(۲۶۸/۲) و سنن نسائی:(۲۴۲/۱)

عن انس بن مالک أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال أتیت وفی روایة هداب مررت علی موسی لیلة أسری بی عند الکثیب الأحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ.

ولما فی مسند ابی یعلی المصلی:(۱۴۷/۶ رقم الحدیث ۳۴۲۵)

وعن انس بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون.

ولما فی النسائی :(۲۰۳/۱)

عن اوس بن اوس عن النبی ﷺ ـ(وفیه) قالوا یا رسول اللہ کیف تعرض صلوتنا علیک وقد ارمت ای یقولون قد بلیت قال ان اللہ عزوجل حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء علیهم السلام.

وفی القول البدیع:(ص:۱۲۷)

ونحن نؤمن ونصدق بانه ﷺ حی یرزق فی قبرہ وان جسدہ الشریف لاتاکله الارض والاجماع علی ھذا.

وفی الشرح الشفاء لملا علی القاری

فمن المعتقد المعتمد انه ﷺ حی فی قبرہ کسائر الانبیاء فی قبورھم وھم احیاء (یرزقون) عند ربھم ولن لارواحهم تعلقا بالعالم العلوی السفلی کما کانوا فی حال الدنیوی.

ترجمہ:(۱) انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب معراج میں موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام پر میرا گذر ہوا تو وہ اپنی قبر میں کثیب احمر کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔

ترجمہ(۲) انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: انبیاء کرام زندہ ہیں، قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔

ترجمہ(۳) اوس بن اوس سے مروی ہے کہ: نبی علیہ السلام سے روایت ہے ـــــ (جس میں یہ بھی ہے) کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا درود شریف آپ پر کیسے پیش

کیا جائیگا حالانکہ آپ کا جسم اطہر مٹی بن چکا ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلاشبہ اللہ عزوجل نے زمین پر انبیاء کرام سے اجساد کا کھانا حرام قرار دیا ہے۔

ترجمہ (۴) قول البدیع میں ہے ہم ایمان رکھتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں اس بات کی کہ حضور ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں ان کو رزق عطاء کیا جاتا ہے اور ان کا جسد اطہر زمین نہیں کھا سکتی اور اس بات پر اجماع ہے۔

ترجمہ (۵) ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ''شرح الشفاء'' میں فرماتے ہیں معتمد عقائد میں سے یہ عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ قبر مبارک میں زندہ ہیں جس طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اللہ جل شانہ کے ہاں ان کو رزق عطاء کیا جاتا ہے، اور ان کی ارواح مبارکہ کا عالم سماء و عالم زمین دونوں سے تعلق ہے۔ جس طرح کہ دنیوی زندگی میں تھا۔

منکر نکیر کا سوال و جواب حق ہے اس کے متعلق احادیث جواب نمبر ۲ میں گذر چکی ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
تخصص سال سوم دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

الجواب صحیح: مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ
۱۵/۲/۱۴۱۳ھ

# ﴿کتاب الزکوۃ﴾

## ﴿زکوۃ کے مسائل﴾

### ﴿زکوۃ کی واجب مقدار کا ثبوت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ اڑھائی فیصد زکوۃ ادا کرتے ہیں یہ جو ادائیگی کے لیے شرح مقرر ہے اس پر کوئی صحیح حدیث یا قرآن کریم سے کوئی حوالہ مل سکتا ہے؟ براہ کرم کچھ مستند حوالوں کی نشاندہی فرمادیں؛ تاکہ ایک ساتھی کو مطمئن کرسکوں۔

﴿جواب﴾ اموال باطنہ یعنی سونا، چاندی، نقد روپے اور دیگر ایسے اموال جو باطنہ کے حکم میں ہیں مثلاً مال تجارت ان میں چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے، بشرطیکہ کل مال نصاب کے برابر ہو اور سال بھی اس پر گزرا ہو، یہ حکم احادیث صحیحہ سے واضح طور پر ثابت ہے اور پوری امت کا اس پر اجماع بھی ہے، یعنی دنیا میں رائج ائمہ اربعہ کے تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے اور خیر القرون سے یہ اتفاق چلا آرہا ہے، باقی قرآن کریم میں اس کی صراحت اگرچہ نہیں ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دیکھیے قرآن کریم میں نماز کا حکم سینکڑوں مرتبہ آیا ہے لیکن تعداد رکعات اور تعیین اوقات کی تفصیل قرآن کریم میں نہیں ہے۔

لمافی صحیح البخاری کتاب الزکوۃ باب: زکوۃ الورق (۱۹۴/۱ طبع: قدیمی)

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "لیس فی مادون خمس ذود صدقة من الابل ولیس فی مادون خمس أواق صدقة ولیس فی مادون خمسة أوسق صدقة" وفی روایة مسلم "ولیس فی مادون خمس أواق من الورق".

عکذافی صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب: زکوۃ الورق، (۳۱۵/۱ طبع: قدیمی)

ولمافی البنایہ فی شرح الهدایہ، باب: زکاۃ المال (۸۲/۴ طبع: مکتبہ حقانیہ)۔

"والاوقیة اربعون درهماً"

سنن الترمذی، باب: ماجاء فی زکوۃ الذهب والورق (۷۹/۱، طبع: فاروقی کتب خانہ)

عن عاصم بن ضمرة عن علی رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ أنه قال: "هاتوا ربع العشور من کل أربعین درهما درهم ولیس علیکم شیئ حتی مائتی درهم فاذا کانت مائتی درهم ففیها خمسة دراهم".

هكذا في سنن ابی داود، كتاب الزكوٰة، باب في زكوٰة السائمة (۱/۲۲۱، طبع: رحمانيه، لاہور)

نصب الرايه، كتاب الزكوٰة، باب: صدقة السوائم (۲/۳۲۷، طبع: قديمى كتب خانه، كراچى)

(۳) ولمافى رواية عمرو بن حزم

وفى كل خمس أواق من الورق خمسة دراهم وما زاد ففى كل أربعين درهما درهم وليس فى مادون خمس أواق شيئ وفى كل أربعين دينارا دينار"

نصب الرايه، كتاب الزكوٰة، فصل: فى الذهب، ۲/۳۴۲

(۴) ولمافى رواية معاذ رضى الله عنه

"ومن كل مائتى درهم خمسة دراهم وليس فى مادون خمسة أوسق صدقة ومن كل أربعين دينارا دينار".

## اجماع سے ثبوت

علامہ نووی لکھتے ہیں:

ولمافى شرح صحيح مسلم، كتاب الزكوٰة (۱/۳۱۵، طبع: قديمى كتب خانه، كراچى)

"فنصاب الفضة خمس أواق وهى مائتا درهم بنص الحديث والاجماع واما الذهب فعشرون مثقالا والمعول فيه على الاجماع".

اسی طرح علامہ یوسف بنوری بھی اجماع سے متعلق لکھتے ہیں:

ولمافى معارف السنن، كتاب الزكوٰة، باب ماجاء فى زكوٰة الذهب (۵/۱۷۰، طبع: سعيد)

"اتفقوا على انه لاشيئ فى أربعين درهما حتى يبلغ مائتى درهم ففيها خمسة دراهم والاربعون ذكرها للتقدير والحساب

دکتور وہبہ الزحیلی مقدار زکوٰۃ کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولمافى الفقه الاسلامى وادلته، كتاب الزكوٰة، المبحث الخامس (۳/۱۲۲۳، طبع: رشيديه)

"المقدار الواجب فى النقدين (الذهب والفضة) ربع العشر اى (۲:۵۰٪) فاذا ملك الانسان مائتى درهم وحال عليها الحول ففيها خمسة دراهم وفى العشرين مثقالا نصف دينار".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین گلگتی

۲۳ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۷۴

## ﴿جو چیز ملکیت میں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں میرے والد صاحب نے

کچھ زیورات اس غرض سے بنائے ہیں کہ جب میری شادی ہوگی تو اس کو بطور مہر میری بیوی کو دیا جائیگا، لیکن نہ ان زیورات کو میرے حوالے کیا ہے، اور نہ ہی زبانی طور پر مجھے یہ بتایا ہے کہ یہ آپ کے ہوگئے، تو اب پوچھنا یہ ہے کہ ان زیورات کی زکوۃ کس کے ذمہ ہے میرے یا والد صاحب کے؟

﴿جواب﴾ زیورات کا انتظام آپ کے والد نے اپنے پیسہ سے کیا ہے، اور ابھی تک انہی کے پاس ہیں تو وہ ہی خود مالک ہیں زکوۃ بھی انہی کے ذمہ واجب ہے آپ کی شادی میں مہر کے طور پر دیں گے تو محض اس ارادہ سے آپ مالک قرار نہیں پاتے۔

لما فی خلاصة الفتاوی: ج ۱، ص ۲۳۵

الزکوة انما تجب اذا ملک نصابا تاما نامیا حولا کاملا۔

ولما فی الدر المختار: ج ۵، ص ۲۸۸ ایچ ایم سعید

وشرائط صحتها فی الموہوب ان یکون مقبوضا غر مشاع ممیز غیر مشغول، ورکنها هو الایجاب والقبول۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ

اربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۲۹۴۶

## ﴿ادائیگی زکوۃ کی ایک خاص صورت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ہمارے شیخ رحمہ اللہ کے پاس لوگ زکوۃ کی رقم جمع کرتے تھے اور حضرت مستحقین اور مدارس وغیرہ میں وہ رقم پورے اہتمام سے دیا کرتے تھے، اس کے لیے حضرت نے ایک الگ اکاؤنٹ کھولا تھا جس میں خاص یہی رقم ہوتی تھی اور تمام متعلقہ افراد پر بھی واضح فرمایا تھا کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے، حضرت ادائیگی اور بقایاجات کا حساب وکتاب بھی باقاعدہ رکھتے تھے اب حضرت کا انتقال ہوگیا ہے اور کافی مہینے ہوگئے وہ رقم ایسے ہی پڑی ہے اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ ورثاء کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور ادائیگی میں تاخیر کی کس حد تک گنجائش ہے؟ اس کی وجہ سے ہمارے حضرت کیلئے عنداللہ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں حضرت اقدس کی حیثیت وکیل کی تھی اور وہ انکی وفات سے ختم ہوچکی ہے جیسا کہ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے، لہذا اب حکم یہ ہے کہ موجودہ رقم اصل

مالکان کو واپس کی جائے تاکہ وہ خود زکوۃ ادا کریں کیونکہ جتنی رقم حضرت نے مستحقین تک پہنچادی ہے وہ تو زکوۃ ادا ہو گئی لیکن جو رقم ابھی تک اکاؤنٹ میں موجود باقی ہے اور مستحقین تک نہیں پہنچائی گئی تو اس حد تک زکوۃ ادا نہیں ہوئی، لہذا حضرت کے بعد ذمہ دار افراد کے لیے اب ضروری ہے کہ یہ رقم اصل مالکان کو واپس کر دیں یا ہر ایک مالک سے زکوۃ ادا کرنے کی دوبارہ اجازت حاصل کریں، بہر حال یہ رقم اصل مالکان ہی کی چونکہ ملکیت ہے لہذا اب انہیں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جلد از جلد مزید تاخیر کیے بغیر اس رقم کو مستحقین تک پہنچادیں اور سبکدوش ہو جائیں اور ذمہ دار افراد کو کسی طرح یہ اندازہ اگر ہو کہ مالکان کی طرف سے اب ان کو زکوۃ ادا کرنے کی اجازت ہے تو یہ لوگ زکوۃ ادا کر دیں زکوۃ ادا ہو جائیگی یعنی دلالۃً اجازت بھی کافی ہو جائیگی۔ اس لیے کہ ہر ایک مالک نے زکوۃ کی نیت سے یہ رقم اپنی دوسری رقم سے گویا الگ کر دی ہے۔

باقی رہا تاخیر کا سوال تو زکوۃ واجب ہونے کے بعد بغیر کسی عذر کے سال سے کم تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے پورا سال گزر جائے تو گناہ ہے لہذا جتنا جلدی ہو سکے ادائیگی کا انتظام کیا جائے، اور حضرت اقدسؒ کے لیے عند اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اس لیے کہ حضرتؒ نے اس رقم کو الگ کر رکھا تھا اور تمام ذمہ دار افراد کو اس بارے میں باخبر بھی کر دیا تھا کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے لہذا حضرتؒ کی اتنی ہی ذمہ داری تھی جو انہوں نے پوری کر دی ہے۔

(لما فی التنویر والدر ۲/ ۱۵۳ طبع سعید)

(و) ينعزل (بموت احدهما وجنونه مطبقاً) بالكسر اى مستوعباً سنة على الصحيح درر وغيرها

(ولما فی الدر مع الرد ۲/ ۲۷۰، ۲۷۱ طبع سعید)

ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالاداء للفقراء (قوله ولا يخرج عن العهدة بالعزل) فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكوة ولو مات كانت ميراثاً ...... (وافتراضها عمرى) اى على التراخى وصححه الباقانى وغيره (وقيل فورى) اى واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما فى شرح الوهبانية (فيأثم بتاخيرها) بلا عذر..... قال الشامىؒ ظاهره الاثم بالتاخير ولو قل كيوم أو يومين لانهم فسروا الفور باول الاوقات وقد يقال المراد ان لا يؤخر الى العام القابل لما فى البدائع عن المنتقى بالنون اذا لم يؤد حتى مضى حولان فقد أساء وأثم.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی غفرلہ ولوالدیہ

۲ شعبان ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر: ۳۳۸۳

## ﴿مستحق مسافر کا کرایہ دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ صاحب نصاب شخص اگر زکوۃ کی نیت سے کسی مستحق زکوۃ کی جگہ پر گاڑی میں کرایہ دے، تو اس سے زکوۃ ادا ہو جائیگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوۃ میں مستحق زکوۃ کو زکوۃ کی نیت سے باقاعدہ مالک بنانا شرط ہے، مذکورہ صورت میں چونکہ اس کو باقاعدہ مالک نہیں بنایا گیا، بلکہ اس کا کرایہ دیا ہے، جو کہ ایک منفعت ہے، تو اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی، لیکن اگر کنڈیکٹر نے مستحق شخص کی اجازت سے صاحب نصاب سے کرایہ لیا ہو، تو پھر اس صورت میں زکوۃ ادا ہو جائیگی، اس لئے کہ ایسی صورت میں کنڈیکٹر وکیل بن کر مستحق کیلئے لے رہا ہے۔

لما فی تنویر الابصار مع الدر المختار:(۲/۲۵۶تا۲۵۷،طبع:سعید)

شرعا(تمليك)خرج الاباحة،فلو اطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم كمالو كساه بشرط ان يعقل القبض ..........(جزء ،مال )خرج المنفعة فلو اسكن يتيما داره سنة لا يجزيه

وفى الشامية والمال كما صرح به أهل الاصول مايتمول ويدخر للحاجة وهو خاص بالاعيان فخرج به تملك المنافع

لما فی فتح القدیر:(۲/۲۸۲،طبع:رشیدیه)

ومحل ان يكون بغير اذن الحى واما اذا كان باذنه وهو فقير فيجوز عن الزكاة على انه تمليك منه والدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضا لنفسه

لما فی تنویر الابصار مع الدر المختار:( ۲/۳۴۴،طبع:سعید)

ويشترط ان ايكون الصرف تمليكا ..........(لا )يصرف (الى بناء )نحو (مسجد )وكفن ميت وقضاء دينه )أما دين الحى الفقير فيجوز لو بأمره

وفى الشامية قوله فيجوز الخ اى يجوز عن الزكاة على أنه تمليك منه والدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم قابضا لنفسه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ أعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر:

## ﴿تجارت کی نیت سے زیر تعمیر عمارت میں زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ ایک شخص کو ایک جگہ وراثت

میں ملی ہے اور اس نے اس جگہ پر بیچنے کی غرض سے مکان بنانا شروع کردیا جس کے بننے میں تقریباً دو سال لگے اب اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ مستفتی: مفتی عبد الجبار علی مسجد

﴿جواب﴾ وراثت ملی میں ہوئی زمین پر زکوٰۃ نہیں، البتہ اس زمین پر جو عمارت دو سال تک بیچنے کی نیت سے زیر تعمیر رہی تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی تاریخ میں اس زیر تعمیر بلڈنگ کی بغیر زمین کے جو مارکیٹ ویلیو تھی یا کم از کم جو رقم اس پر خرچ ہوئی تھی اس مالیت کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

ولما فی التنویر مع الدر: (۲/۲۷۳، طبع: سعید)

(لا ما ورثه و نواه لها) لعدم العقد الا اذا تصرف فيه اى ناويا فتجب الزكوة لاقتران النية بالعمل

ولما فی الشامی: (۲/۲۷۳، طبع: سعید)

قال فی فتح القدیر: والحاصل ان نية التجارة فی ما يشتريه تصح بالاجماع وفی ما يرثه لا بالاجماع

ولما فی التنویر مع الدر: (۲/۲۷۲، طبع: سعید)

(وما اشتراها لها) اى للتجارة (كان لها) لمقارنة النية لعقد التجارة

ولما فی الهندية: (۱/۱۹۷، طبع: قدیمی)

الزكوة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب

ولما فی بدائع الصنائع: (۲/۲۰، طبع: سعید)

وسواء كان مال التجارة عروضا او عقارا او شيئا مما يكال او يوزن لان الوجوب فی اموال التجارة تعلق بالمعنى و هو المالية والقيمة

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: برکت اللہ

۲۷ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۸۱

## ﴿چیک کے ذریعے بھی ادائیگی زکاۃ ہوسکتی ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم اپنی کمپنی کے مستحقین ملازمین اور عام مستحقین کو زکوٰۃ بصورتِ چیک دیتے ہیں تو کیا ادائیگی زکوٰۃ چیک کے ذریعے ہوسکتی ہے؟ مستفتی: عبد الغنی صدیقی صاحب کراچوی

﴿جواب﴾ کسی مستحق کو چیک دیکر زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے بشرطیکہ وہ چیک کیش بھی کرے۔

لما فی الشامی:(۲/ ۲۷۱،مطلب فی زکاۃ ثمن المبیع وفاء،طبع سعید کراتشی)

بخلاف ما اذا أمر فقیرا بقبض دین له علی آخر عن زکوٰۃ عین عنده فانه یجوز،لأنه عند قبض الفقیر یصیر عینا فکان عینا عن عین.

ولما فی الهندیة:(۱/ ۱۷۱،کتاب الزکاۃ،طبع رشیدیه کوئٹه)

ولو أمر فقیرا بقبض دین له علی آخر ونواه عن زکاۃ عین عنده جاز کذافی البحر.

ولما فی البحر:(۲/ ۲۱۱-۲۱۲،کتاب الزکاۃ،طبع سعید کراتشی)

ولو أمر فقیرا بقبض دین له علی آخر نواه عن زکاۃ عین عنده جاز،لأن الفقیر یقبض عینا فکان عینا عن عین کذافی الولوالجیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۰۲۳

## ﴿ایزی لوڈ کے ذریعے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا موبائل فون کا ریپیرنگ سینٹر ہے جس میں لوگوں کو ایزی لوڈ بھی کراتا ہوں،ایک مرتبہ میرا دوست آیا اور پانچ ہزار (5,000) روپے کا ایزی لوڈ کسی آدمی کے نمبر پر کروایا جو پنجاب کا رہائش پذیر تھا،زیادہ بیلنس ڈلوانے کی وجہ دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ یہ ایک غریب مستحق آدمی تھا میں نے زکوٰۃ کی نیت سے یہ ایزی لوڈ کروایا ہے،معلوم یہ کرنا ہے کہ موبائل فون کے ذریعے مستحق کے نمبر پر ایزی لوڈ کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟　　　مستفتی:امجد

﴿جواب﴾ ادائیگی زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ مستحق کو بنیتِ زکوٰۃ عین کا مالک بنادیا جائے اور موبائل فون کے ذریعے مستحق کو اگر ایزی لوڈ کردیا جائے تو وہ منفعت کا مالک ہوجاتا ہے عین کا نہیں،لہذا موبائل فون کے ذریعے مستحق کو بنیتِ زکوٰۃ ایزی لوڈ کرنے سے زکاۃ ادا نہیں ہوگی کیونکہ یہ عین نہیں بلکہ سہولت اور منفعت ہے،البتہ موبائل فون کے ذریعہ پہنچنی والی رقم کو واپس پیسوں کی صورت میں وہ مستحق شخص اگر وصول کرسکتا ہو اور باقاعدہ وصول بھی کرلے تو اس صورت میں پہنچنی والی رقم زکوٰۃ میں ادا ہو جائیگی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/ ۲۵۶-۲۵۷،کتاب الزکاۃ،طبع سعید کراتشی)

وھی شرعا(تملیک)خرج الاباحة،فلو أطعم یتیما ناویا الزکاۃ لایجزیه الااذا دفع الیه

المطعوم كالو كساء بشرط أن يعقل القبض الااذاحكم عليه بنفقتهم (جزء مال) خرج المنفعة فلو أسكن فقيراً داره سنة ناويا لايجزيه (عينه الشارع) وهوربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ولومعتوها (غير هاشمي ولا مولاه) اى معتقه وهذا معنى قول الكنز تمليك المال: اى المعهود اخراجه شرعاً (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) فلا يدفع لأصله وفرعه (لله تعالى) لاشتراط النية. وكذافي الهندية: (۱/۱۷۰، كتاب الزكاة، طبع رشيديه)

ولمافي البحر: (۲/۲۰۱، كتاب الزكاة، طبع سعيد كراتشي)

صرح به أهل الأصول مايتمول ويدخر للحاجة وهو خاص بالأعيان، فخرج تمليك المنافع، قال في الكشف الكبير في بحث القدرة الميسرة الزكاة لاتتأدى الابتمليك عين متقومة حتى لو أسكن الفقير داره سنة بنية الزكاة لايجزنه، لأن المنفعة ليست بعين متقومة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۲۲

## ﴿مختلف جانوروں میں نصاب زکوۃ کی ترتیب﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جانوروں کی مختلف اجناس مثلاً اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری میں زکوۃ کے نصاب کی ترتیب کیا ہے؟ مستفتی: حافظ زبیر

﴿جواب﴾ اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ اور بکریاں اگر باہر صحرا، پہاڑ وغیرہ میں چرتے ہوں یعنی بازار کے چارہ پر گزر بسر نہ ہو اور نصاب تک پہنچتے ہوں تو ان میں زکوۃ واجب ہے، پھر ہر ایک جنس کے لئے نصاب اور مقدارِ زکوۃ بھی الگ واجب ہے، چنانچہ اونٹ پانچ سے اگر کم ہوں تو زکوۃ واجب نہیں ہے، پانچ سے چوبیس تک ہر پانچ پر ایک بکری واجب ہے، لہذا چوبیس اونٹ ہوں تو چار بکریاں دینا واجب ہے، اور جب تعداد پچیس کو پہنچے تو ایک "بنت مخاض" یعنی ایک سالہ اونٹنی واجب ہے پینتیس تک، اور جب تعداد چھتیس کو پہنچے تو ایک "بنت لبون" یعنی دو سالہ اونٹنی واجب ہے پینتالیس تک، اسکے بعد جب تعداد چھیالیس کو پہنچے تو ایک "حقہ" یعنی تین سالہ اونٹنی واجب ہے ساٹھ تک، اور جب تعداد اکسٹھ ہو جائے تو ایک "جذعہ" یعنی چار سالہ اونٹنی واجب ہے پچھتر تک، اور جب تعداد چھہتر ہو جائے تو دو "بنت لبون" واجب ہیں نوے تک، اور جب تعداد اکیانوے کو پہنچے تو اس میں دو "حقے" دینا واجب ہوں گے ایک سو بیس تک، اس کے

بعد ہر چالیس میں ایک ''بنت لبون'' اضافی دینا ضروری ہوگا، اور پچاس تک تعداد بڑھے تو مذکورہ مقدار یعنی دو ''حقوں'' کے ساتھ ایک ''حقہ'' کا اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔

لما فی صحیح البخاری :۱۳۸،طبع دارا لکتب العربی)

وعنه رضی الله عنه :ان ابابکر رضی الله عنه کتب له هذا الکتاب لما وجهه الی البحرین :بسم الله الرحمن الرحیم هذه فریضة الصدقة التی فرض رسول الله ﷺ علی المسلمین ،والتی امرالله بها رسوله ﷺ فمن سئلها من المسلمین علی وجهها فلیعطها ومن سئل فوقها فلا یعط :فی اربع وعشرین من الابل فما دونها من الغنم من کل خمس فاذا بلغت خمسا وعشرین الی خمس وثلاثین ففیها بنت مخاض انثی ،فاذا بلغت ستا وثلاثین الی خمس واربعین ففیها بنت لبون انثی ،فاذا بلغت ستا واربعین الی ستین ففیها حقة طروقة الجمل، فاذا بلغت واحدة وستین الی خمس وسبعین ففیها جذعة، فاذا بلغت یعنی ستا وسبعین الی تسعین ففیها بنتا لبون، فاذا بلغت احدی وتسعین الی عشرین ومئة ففیها حقتان طروقتا الجمل ،فاذا زادت علی عشرین ومئة ،ففی کل اربعین بنت لبون ،وفی کل خمسین حقة ،ومن لم یکن معه الا اربع من الابل فلیس فیها صدقة ،الا ان یشاء ربها ،فاذا بلغت خمسا من الابل ففیها شاة۔

ولما فی فتح القدیر: ۱۸۰/۲ طبع رشیدیة)

قال رضی الله عنه(لیس فی اقل من خمس ذود صدقة ،فاذا بلغت خمسا سائمة وحال علیها الحول ففیها شاة الی تسع ،فاذاکانت عشرا ففیها شاتان الی اربع عشر ،فاذاکانت خمس عشرة ففیها ثلاث شیاه الی تسع عشرة فاذاکانت عشرین ففیها اربع شیاه الی اربع و عشرین فاذا بلغت خمساو عشرین ففیها بنت مخاض )الخ۔

ولما فی الدر مع الرد: ۲۷۷/۲ طبع سعید کراچی)

( خمس ،فیؤخذ من کل خمس ) منها ( الی خمس وعشرین بخت) (او عراب شاة ) (قوله شاة ) ذکر اکان او انثی الخ۔

ولما فی البحر الرائق : ۲۱۳/۲ ،طبع سعید کراچی)

(قوله ویجب فی خمس وعشرین ابلا بنت مخاض وفیما دونه فی کل خمس شاة الخ زاد بحسابه الی ستین ففیها تبیعان وفی سبعین مسنة وتبیع وفی ثمانین مسنتان فالفرض یتغیر فی کل عشرة من تبیع الی مسنة الخ۔

بکریوں کی زکوٰۃ کا نصاب شریعت میں چالیس مقرر ہے، اس سے کم تعداد میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے لہٰذا جب تعداد چالیس کو پہنچے تو ایک بکری دینا واجب ہے، پھر ایک سو بیس تک اضافی تعداد میں کچھ واجب نہیں ہے، اور جب تعداد ایک سو اکیس کو پہنچے تو دو بکریاں دینا واجب ہے

دوسو تک، اس کے بعد جب تعداد دوسو ایک ہو تو تین بکریاں دینا واجب ہے تین سو ننانوے تک، اور پھر چارسو پر چار بکریاں، اسکے بعد ہر سینکڑے پر ایک بکری واجب ہوگی، بکری اور بھیڑ کا ازروئے زکوٰۃ ایک حکم ہے۔

لما فی صحیح البخاری: ۱۲۸ طبع دار الکتاب العربی)

وفی صدقة الغنم: فی سائمتها اذا كانت اربعين الى عشرين ومائة شاة، فاذا زادت على عشرين ومئة الى مئتين شاتان، فاذا زادت على مئتين الى ثلاث مئة ففيها ثلاث، فاذا زادت على ثلاث مئة ففي كل مئة شاة، فاذا كانت سائمة الرجل ناقصة من اربعين شاة واحدة، فليس فيها صدقة الا ان يشاء ربها۔

ولما فی فتح القدیر: ۱۱۰/۲ طبع رشیدیہ۔

ليس في اقل من اربعين من الغنم السائمة صدقة، فاذا كانت اربعين سائمة وحال عليها الحول ففيها شاة الى مائة وعشرين، فاذا زادت واحدة ففيها شاتان الى مائتين، فاذا زادت واحدة ففيها ثلاث شياه، فاذا بلغت اربع مائة ففيها اربع شياه، ثم في كل مائة شاة شاة، هكذا ورد البيان في كتاب رسول الله ﷺ وفي كتاب ابي بكر رضي الله عنه وعليه انعقد الاجماع.

ولما فی الدر مع الرد: ۲۸۱/۲ طبع سعید۔

(ونصاب الغنم ضأنا او معزا) فانهما سواء في تكميل (اربعون وفيها شاة) وفي مائة واحدى وعشرين شاتان وفي مأتين وواحدة ثلاث شياه وفي اربع مائة اربع شياه وما بينهما عفو (ثم في كل مائة شاة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۶۹۵

## ﴿زکوٰۃ کی نیت ضروری ہے بتانا ضروری نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بہن کے معاشی حالات ٹھیک نہیں ہیں ان کی ماشاء اللہ پانچ بیٹیاں ہیں، ان میں سے ایک بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ میرے پاس زکوٰۃ کی رقم ہے کیا میں اس زکوٰۃ کی رقم سے کچھ سامان خرید کر اپنی بھانجی کو دے سکتی ہوں اور میں اس کو بتانا بھی نہیں چاہتی کہ یہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ہے تو کیا اس طرح کرنا درست ہے ان پر واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے یا نہیں؟ مستفتیہ: ام حسنین بھکر

﴿جواب﴾ زکوٰۃ ادا کرتے وقت صرف نیت کا ہونا شرط ہے۔ زبان سے کہنا کوئی ضروری

نہیں ہے۔آپ اپنی بھانجی کوزکوۃ کی رقم سے سامان خرید کر دینا چاہتی ہیں تو بیشک دے سکتی ہیں زکوۃ کا بتانا کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ یہی بہتر ہے کہ ہدیہ (گفٹ) وغیرہ کا نام دیکر دیا کریں اور آپ کی بہن بھی اگر زکوۃ کی مستحق ہے تو اس کو بھی دے سکتی ہیں، نقد بھی دے سکتی ہیں اور اگر راشن یا سامان وغیرہ کی صورت میں بھی دے سکتی ہیں اور اس میں ثواب بھی نسبتاً زیادہ ہے۔

لما في بحر الرائق :(۲/ ۲۱۰ طبع سعيد)

قوله و شرط ادائها نية مقارنة للاداء أو لعزل ما وجب او تصدق بكله.

ولما في العالمگيريه:(۱/ ۱۹۲ طبع رشيديه)

ان اداء القيمة افضل من عين المنصوص عليه ، وعليه الفتوى كذا في الجوهرة النيرة.

ولما في الدر المختار مع ردالمحتار:(۲/ ۲۵۷ طبع سعيد)

فلو اطعم يتيماً ناوياً الزكوة لا يجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم ـــــ اذا كان يعول يتيماً و يجعل ما يكسوه يطعمه من زكاته ماله ففي الكسوة لا شك في الجواز لوجود الركن وهو التمليك.

ولما في بحر الرائق:(۲/ ۲۰۱، طبع سعيد)

و لهذا ذكر الولوالجي وغيره انه لو عال يتيماً فجعل يكسوه و يطعمه و جعله من زكوة ماله فالكسوة تجوز لوجود ركنه و هو التمليك.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲ رجب ۱۴۲۳ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۸۲۶

## ﴿قسطوں پر خریدے ہوئے مال تجارت پر زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے بنیت تجارت ایک پلاٹ تین لاکھ روپے میں قسط وار خریدا اور قبضہ بھی حاصل کرلیا، وہ ہر ماہ ساڑھے بارہ ہزار روپے ادا کرتا ہے، ابھی مکمل ادائیگی نہیں کی بلکہ چھ مہینے کی قسطیں ادا کی ہیں اور ڈیڑھ سال کی باقی ہیں، سوال یہ ہے کہ اس پلاٹ پر زکوۃ فرض ہے یا جب مکمل ادائیگی ہوجائے گی اس وقت فرض ہوگی؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: طارق عبد القادر پنڈی

﴿جواب﴾ زکوۃ اس مال پر فرض ہوتی ہے جو ملکیت میں ہو اور جو مال قسطوں پر خریدا جاتا ہے وہ مشتری کی ملکیت میں آجاتا ہے اور اس کا ثمن مشتری پر دین بن جاتا ہے۔

پس صورت مسئولہ میں اس پلاٹ کی موجودہ مالیت میں زکوۃ فرض ہے، البتہ جتنی قسطیں زکوۃ کی ادائیگی کے وقت ادا کرنا باقی ہوں گی وہ مشتری کے ذمہ دین ہیں، لہذا اس دین کی رقم کو کل مال زکوۃ سے منہا کر کے زکوۃ کا حساب لگایا جائے گا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۲۵۹ــ۲۶۳ طبع ایچ ایم سعید)

(وسببه ملک نصاب حولی تام) بالرفع صفة ملک خرج مال المكاتب (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد) وفارغ عن حاجته الاصلية نام لو تقديرا فلا زكوة على مكاتب لعدم الملک التام ولا فيما اشتراه لتجارة قبل قبضه.

وفی الشامية:(قوله قبل قبضه) اما بعده فيزكيه عما مضى كما فهمه فی البحر من عبارة المحيط فراجعه لكن في الخانيه:رجل له سائمة اشتراها رجل لسيامة ولم يقبضها حتى حال الحول ثم قبضها لا زكوة على المشترى فيما مضى لانها كانت مضمونة على البائع بالثمن اه ومقتضى التعليل عدم الفرق بين ما اشتراها للسيامة او للتجارة.

ولما فی الهداية:(۲/۲۰ طبع رحمانيه)

واذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الا من عيب او عدم رؤية.

ولما فی البدائع:(۲/۶ طبع سعيد)

ومنها الا يكون عليه الدين مطالب به من جهة العباد فان كان فانه يمنع وجوب الزكوة بقدره حالا كان او مؤجلا الخ.

ولما فی البدائع:(۲/۹ طبع سعيد)

واما شرائط التى ترجع الى المال فمنها الملک فلاتجب الزكوة فی سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملک وهذا لان فی الزكوة تمليكا والتمليک فی غير الملک لا يتصور الخ.

ولما فی الهندية:(۱/۱۷۹ طبع رشيديه)

الزكوة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: مغیرہ شہاب غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۰۵۲

## ﴿ کیا زکوۃ کے وجوب کیلئے مال پر قبضہ ہونا شرط ہے؟ ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے سنگاپور سے مال منگوایا ہے.. وہ ابھی تک پہنچا نہیں ہے راستے میں ہے۔ کہ اس دوران اس کے پاس موجود مال پر سال گذر گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ اپنے پاس موجود مال کی زکوۃ

ادا کرنے کیساتھ اس آنے والے مال کی بھی زکوۃ ادا کریگا؟ یا پھر جب وہ اس مال پر قبضہ کریں اور سال گذر جائے تب زکوۃ ادا کرنی ہوگی؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔ مستفتی: ڈاکٹر عبدالرحمٰن ڈی آئی خان

﴿جواب﴾ مال تجارت پر ابھی تک قبضہ نہیں ہے اور آپ آگے نہیں بیچ سکتے تو اس پر زکوۃ بھی واجب نہیں ہے لیکن مال راستہ میں ہے جسکا مطلب ہے کہ آپنے وصول کرلیا ہے اگر چہ ابھی تک آپکے گودام وغیرہ میں پہنچنے میں دیر ہے لیکن آپنے خود یا آپکے وکیل مثلاً گاڑی والا یا جہاز کے عاملہ نے آپ کیلئے وصول کرلیا ہے تو یہ بھی قبضہ کہلاتا ہے اور زکوۃ کی تاریخ اگر آگئی ہے تو اس مال کو بھی مال زکوۃ شمار کرنا ضروری ہے .البتہ آپنے صرف سودا کرلیا ہے اور ابھی تک کسی بھی درجہ میں وصول نہیں کیا ہے تو اس مال کی زکوۃ ادا کرنا کوئی ضروری نہیں ہے.

لما فی البحر الرائق: (۲۰۲،۲۰۲/۲ طبع سعید)

(تحت قولہ وملک نصاب حولی فارغ عن الدین وحوائجہ الأصلیة نام ولو تقدیرا) وأطلق الملک فانصرف الی الکامل وھو المملوک رقبة ویدا فلا یجب علی المشتری فیما اشتراہ للتجارة قبل القبض۔۔۔۔۔لعدم الید.

ولما فی الدر مع الرد: (۲۶۳/۲ طبع سعید)

ولا فیما اشتراہ للتجارة قبل قبضہ أما بعدہ فیزکیہ عما مضی کما فھمہ فی البحر'

ولما فی الھندیہ: (۱۷۲/۱ طبع رشیدیہ)

(ومنھا الملک التام) وھو ما اجتمع فیہ الملک والید' وأما اذا وجد الملک دون الید کا الصداق قبل القبض أو وجد الید دون الملک کملک المکاتب والمدیون لاتجب فیہ الزکوۃ کذا فی السراج الوھاج

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۸۲

## ﴿مال پر ملکیت ظاہر نہ ہو تو زکوۃ واجب نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے دوست کو مضاربت کیلئے پیسے دیئے تا کہ ہر مہینہ آمدنی آتی رہے، اور رمضان میں میری زکوۃ ادا کرنے کی تاریخ مقرر ہے، جب میں نے زکوۃ ادا کردی تو کچھ عرصہ کے بعد دوست نے مجھے تین ہزار

روپے دیئے جو کہ اس وقت حساب میں غلطی کیوجہ سے رہ گئے تھے یہ لے لیں کیونکہ یہ آپ کا حق ہے، آیا اس صورت میں تین ہزار کی زکوۃ مجھے ادا کرنی ہوگی یا دوست کو؟ مستفتی: باقر صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یہ پیسہ گم شدہ مال اور غرق شدہ مال کی طرح ہے، اسلئے اس پیسہ کی زکوۃ نہ آپ کو ادا کرنی ہے اور نہ آپ کے دوست کو، آپ دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اسکی زکوۃ واجب نہیں ہے، یہ پیسہ حساب میں اگر چہ بعد میں واضح ہوا لیکن آپکا تھا آپکے دوست کا نہیں تھا، اسلئے ان پر اس پیسہ کی زکوۃ واجب نہیں ہورہی اور آپ پر بھی اس کی زکوۃ واجب نہیں تھی اسلئے کہ اسوقت اس رقم پر آپکی ملکیت ظاہر نہیں تھی، لہذا آئندہ زکوۃ کی آنے والی تاریخ تک اگر یہ پیسہ باقی رہا تو زکوۃ ادا کرنے کا حکم ہوگا۔

لما فی الشامی مع الدر:(۲۵۹/۲،طبع سعید)

(وسببه ملک نصاب حولی تام)خرج مال المکاتب ای خرج بالتقیید به لان المراد بالتام المملوک رقبة ویدا وملک المکاتب لیس بتام قلت وخرج ایضا نحو المال المفقود والساقط فی بحر ومغصوب لا بینة علیه ومدفون فی بریة فلا زکوة علیه اذا عاد الیه لانه وان کان مملوکا له رقبة لکن لا ید له علیه۔

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۱۸۷۵/۳،طبع رشیدیه)

اما المستفاد بعد الحول فلا یضم الی الاصل فی حق الماضی بلا خلاف۔

ولما فی الهندیه:(۱۷۵/۱ طبع رشیدیه)

ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الی ماله وزکاه سواء کان المستفاد من نمائه اولا وبای وجه استفاد ضمه سواء کان بمیراث او هبة او غیر ذلک۔

ولما فی مراقی الفلاح علی الطحطاوی:(۷۱۵/۱۲، طبع قدیمی)

وشرط وجوب ادائها حولان الحول علی النصاب الاصلی واما المستفاد فی اثناء الحول فیضم الی مجانسه ویزکی بتمام الحول الاصلی سواء استفید بتجارة او میراث او غیر ذلک۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۲۵ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۵۴

## ﴿زکوۃ کی ادائیگی کا طریقہ کار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ میرے پاس پونے دو

تولہ سونا اور کچھ رقم ہے، نیز میرے ذمہ پانچ سال کی زکوۃ باقی ہے، شرعی رہنمائی فرمائیں پانچ سال کی زکوۃ کی ادائیگی کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: بیگم زاہد محمد سواتی

﴿جواب﴾ چاندی کی جس تاریخ میں آپ کی ملکیت میں سونا اور نقد روپے دونوں چیزیں آئی تھیں اور دونوں کو ملا کر قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر یا اس سے زیادہ تھی تو اس تاریخ کو آپ صاحب نصاب ہوگئی تھیں، پھر اگلے سالوں میں بھی اسی تاریخ میں آپ کے پاس سونا اور نقد روپے دونوں چیزیں موجود تھیں اور قیمت بھی ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر یا اس سے زیادہ تھی تو آپ کے ذمہ پانچ سالوں کی زکوۃ ادا کرنا لازم تھا، اسی طرح اگلے سالوں کا بھی یہی حکم ہے اور اب تک آپ کے ذمہ پانچ سالوں کی زکوۃ اگر باقی ہے تو اڑھائی فیصد کے حساب سے ہر سال کی زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے اور ہر سال کی زکوۃ ادا کرنے کے بعد دوسرے سال کے حساب میں وہ اداشدہ مقدار سے منہا کرتی رہیں، سمجھ نہ آئے تو مقامی عالم صاحب سے رہنمائی حاصل کریں۔

لمافی التنویر مع الدر والرد:(۲/۲۸۵-۲۸۶،کتاب الزکاۃ،طبع سعید)

(وجاز دفع القیمۃ فی زکاۃ وعشر وخراج وفطر ونذر وکفارۃ غیر الاعتاق) وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الأداء وفی السوائم یوم الأداء اجماعاً وھو الأصح.(قولہ وھو الأصح):ای کون المعتبر فی السوائم یوم الأداء اجماعاً ھو الأصح.

ولمافی المحیط البرھانی:(۳/۱۶۷،کتاب الزکاۃ،زکاۃ عروض التجارۃ،طبع ادارۃ القرآن)

فالحاصل أن أباحنیفۃ یعتبر القیمۃ یوم الوجوب فی جنس ھذہ المسائل وھما یعتبران القیمۃ یوم الأداء

ولمافی الفقہ الحنفی وأدلتہ:(۱/۳۲۷،کتاب الزکاۃ،طبع دار الکلم الطیب)

وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب عند الامام وقالا یوم الأداء وھو الأصح وفی السوائم القیمۃ معتبرۃ یوم الاداء اجماعاً۔۔۔۔الخ۔

ولمافی المحیط البرھانی:(۳/۱۵۷،کتاب الزکوۃ،طبع ادارۃ القرآن)

ویضم الذھب الی الفضۃ والفضۃ الی الذھب ویکمل أحد النصابین بالآخر عند علمائنا الحدیث بکر بن عبداللہ بن الأشج أنہ قال:مضت السنۃ فی ضم الذھب الی الفضۃ فی باب الزکوۃ،ولأن الذھب والفضۃ وان کانا مختلفین صورۃ فھما متفقان معنیً من حیث أنہ تعلق بھما وجوب الزکوۃ وھو وصف الثمنیۃ،فجاز تکمیل أحدھما بالآخر۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　فتوی نمبر:۲۸۶۱

## ﴿غلہ بیچنے کے بعد حاصل شدہ رقم میں زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے گندم سے عشر ادا کرنے کے بعد باقی گندم بیچ دی تو اس رقم پر بھی زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ کیونکہ اس سے تو ایک مرتبہ عشر ادا ہو گیا اور ایک مرتبہ ادا کرنے کے بعد دوبارہ اس گندم پر عشر واجب نہیں ہوتا۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ عام طور پر معاشرے میں لوگ زکوۃ اور عشر کو ایک چیز سمجھتے ہیں لیکن عشر کا حکم الگ ہے اور زکوۃ کا الگ عشر زمین کی پیداوار میں ہوتا ہے اور زکوۃ مال نامی میں ہوتی ہے مثلاً نقد روپے، سونا، چاندی، سامان تجارۃ وغیرہ، لہذا مذکورہ صورت میں غلہ بیچنے کے بعد جو رقم حاصل ہوئی اسکو بھی دیگر نقد روپے وغیرہ کیساتھ شمار کرنا ضروری ہے، اب یہ شخص اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو زکوۃ کی ادائیگی کی تاریخ میں اسکی بھی زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے اگر پہلے سے صاحب نصاب نہیں تھا اور اب اس رقم سے صاحب نصاب بنا تو چاند کی تاریخ کے حساب سے اسی تاریخ میں دوبارہ بھی بقدر نصاب مال نامی اس کے پاس اگر موجود ہے تو زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے ورنہ نہیں۔

لما فی الشامی:(۲۸۸/۲،طبع سعید)

لوأدی عشر طعام اوارض اوصدقة فطر عبدثم باع حيث تضم أثمانها اجماعا.

ولما فی الهندية:(۱۹۳/۱،طبع قديمی)

واما ثمن الطعام المعشور وثمن العبد الذی أدی صدقة فطره فانه يضم اجماعا.

ولما فی بدائع الصنائع:(۱۳/۲،طبع سعيد)

وكان له عبد للخدمة فادى صدقة فطره او كان له طعام فأدى عشره او كان له ارض فأدى خراجها ثم باعها يضم الى اصل النصاب.

ولما فی فتح القدير:(۲۰۲/۲،طبع رشيديه)

واتفقوا على ضم ثمن طعام أدى عشره ثم باعه وثمن ارض المعشور وثمن عبد ادى صدقة فطره

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران

۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر: ۲۸۳۰

## ﴿جس رقم سے عشر ادا کریں وجوب زکوۃ کے بعد زکوۃ بھی ادا کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم زمین میں سبزی کاشت کرتے ہیں اور الحمد للہ

اسکا عشر بھی اداء کرتے ہیں، سبزی منڈی میں فروخت کر کے نقد رقم ہاتھ میں آجاتی ہے یہ رقم بعینہ باقی ہے اور زکوٰۃ اداء کرنے کی تاریخ بھی آگئی، اس صورت میں مجھے دیگر رقوم کی طرح سبزی سے حاصل شدہ رقم کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟ جبکہ ابھی چند روز قبل اس رقم سے عشر ادا کر دیا تھا۔

﴿جواب﴾ آپکو تمام نقد رقوم کے مجموعہ سے زکوٰۃ اداء کرنی ہے یعنی جو رقم پہلے موجود تھی اور جو رقم اب سبزی سے حاصل ہوئی ہے دونوں میں سے زکوٰۃ اداء کرنا ضروری ہے۔

لمافی مراقی الفلاح:(ص۷۱۵،طبع قدیمی)

اما المستفاد فی اثناء الحول فیضم الی مجانسه ویزکی بتمام الحول الاصلی سواء استفید بتجارة او میراث او غیره.

لمافی الهدایة مع فتح القدیر:(۱۴۸/۲،طبع رشیدیه)

ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول من جنسه ضمه وزکاه به.قال العلامة کمال الدین محمد بن عبد الواحدؒ.واتفق علی ضم ثمن طعام ادی عشره ثم باعه وثمن ارض معشورة وثمن عبد ادی صدقة فطره اما عندهما فظاهر واما عنده فلان البدل لیس بدل لمال الزکاة لان العشر لا یجب باعتبار الملک.

لمافی الشامی:(۲۱۲/۲،طبع امدادیه ملتان)

فان وجد منه شیئا قبل الحول ولو بیوم ضمه وزکی الکل.

| | |
|---|---|
| الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد |
| ۱۰ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ | فتویٰ نمبر: ۹۶۹ |

## ﴿بکریوں کا نصاب مکمل ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے کچھ بکریاں پال رکھی ہیں۔ ان سے تجارت کرنے یا بیچنے کی میری نیت نہیں ہے۔ بس ان کو پالنا اور بڑھانا مقصود ہے۔ یہ بکریاں میں نے ایک آدمی کے حوالے کر دی ہیں جو کہ جنگل کے پاس رہتا ہے۔ وہ آدمی ان بکریوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ان کے چرانے کا انتظام اس طرح کرتا ہے کہ کبھی تو جنگل میں ان کو چرانے لے جاتا ہے اور کبھی جنگل سے چارہ کاٹ کر لاتا ہے اور ان کو کھلا دیتا ہے۔ میں اس آدمی کو ماہانہ تنخواہ دیتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ان بکریوں پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں چونکہ بکریاں پالنے کا مقصد ان کی نسل بڑھانا ہے اس لئے

ان میں بکریوں کے نصاب کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوگی۔ چالیس سے کم بکریوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ جب بکریوں کی تعداد چالیس تک پہنچ جائے تو ایک بکری واجب ہے۔ چالیس سے لے کر ایک سو بیس بکریوں تک ایک ہی بکری واجب رہتی ہے۔ جب بکریاں ایک سو اکیس ہو جائیں تو ان میں دو بکریاں بطور زکوٰۃ واجب ہیں۔ دو سو تک یہی دو بکریاں واجب ہیں۔ جب دو سو سے بڑھ جائیں یعنی دو سو ایک ہو جائیں تو تین بکریاں واجب ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد چار سو تک پہنچے۔ چار سو بکریوں پر چار بکریاں بطور زکوٰۃ واجب ہوں گی۔ پھر ہر سو بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں بڑھتی جائے گی یعنی جب پانچ سو ہو جائیں تو پانچ بکریاں۔ چھ سو ہو جائیں تو چھ بکریاں۔ اسی حساب سے آگے بھی زکوٰۃ کی مقدار بڑھتی جائے گی۔

البتہ بکریوں میں مذکورہ بالا زکوٰۃ تب واجب ہوگی جبکہ وہ سال میں چھ مہینے سے زیادہ عرصہ تک جنگل میں چرتی ہوں۔ اگر وہ چھ ماہ یا اس سے کم مدت کے لئے جنگل میں چرتی ہیں اور بقیہ عرصہ ان کو گھر ہی میں چارہ کھلایا جاتا ہے تو ان بکریوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ زکوٰۃ میں دی جانے والی بکری درمیانے درجہ کی ہونی چاہیے جس کی عمر کم از کم ایک سال ہو۔ پھر آپ کو اختیار ہے چاہے تو بکری ہی دے دیں یا اس کی قیمت کے برابر روپیہ دے دیں۔ دونوں صورتوں میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لما فی الخانیۃ:(۲۱۷/۱، طبع قدیمی)

الزکاۃ فرض علی المخاطب اذا ملک نصابا ناميا حولا كاملا والمال النامی نوعان: السائمة ومال التجارة اما السائمة فهی الراعیة التی تکتفی بالرعی يطلب منها العين وهو النسل اللبن فاذا علفها فی مصر او غير مصر فهی علوفة وليست بسائمة وان كان يعلفها فی بعض السنة ويسيمها فی بعض السنة فالعبرة فی ذلک لاكثر السنة فان كانت راعية فی نصف السنة لم تكن سائمة

ولما فیه ایضا:(۲۱۸/۱، طبع قدیمی)

ويكون الخيار فی جنس هذه المسائل وفی اداء القيمة عندنا لمن كان عليه الزكاة

ولما فیه ایضا:(۲۱۸/۱، طبع قدیمی)

ليس فيما دون الاربعين من الغنم صدقة وفی اربعين شاة شاة الی مائة وعشرين فاذا زادت واحدة ففيها شاتان الی مائتين فاذا زادت واحدة ففيها ثلاث شياه الی اربعمائة ففيها اربع شياه ثم فی كل مائة شاة ولا يؤخذ فی زكوة الغنم فی رواية الاصل الا الثنی وهو الذی طعن فی الثانية.

ولما فی المحیط البرھانی:(۱۶۱/۳، طبع ادارۃ القرآن)

ذکر الحسن فی کتابہ عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ ان السائمۃ ما ترعی فی البریۃ یقتنیھا صاحبھا یلتمس بھا الدر والنسل ولا یرید بیعھا ولا التجارۃ فیھا وذکر القدوری فی 'کتابہ' ان السائمۃ ھی الراعیۃ التی تکتفی بالرعی ویمونھا بذلک وھذا لان السوم انما یعتبر لتحقق الزیادۃ من حیث الدر والنسل والسمن وانما یعتبر ذلک زیادۃ اذا قلت مؤنۃ العلف اما اذا کثرت مؤنۃ العلف فلا وان کان یعلفھا احیانا ویرعاھا احیانا یعتبر فیھا الغالب

ولما فیہ ایضا:(۱۶۴/۳، طبع ادارۃ القرآن)

ویأخذ المصدق من اوساطھا فریضۃ التی تجب لہ

ولما فیہ ایضا:(۱۶۴/۳، طبع ادارۃ القرآن)

قال:ولیس فی اقل من اربعین من الغنم صدقۃ فاذا کانت اربعین ففیھا شاۃ الی مأۃ وعشرین فاذا زادت واحدۃ ففیھا شاتان الی مأتین فاذا زادت واحدۃ ففیھا ثلاث شیاہ الی اربعمأۃ فیکون فیھا اربع شیاہ ثم فی کل مأۃ شاۃ ذکر فی الاصل عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ انہ لا یؤخذ الا الثنی فصاعدا

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۷۵/۲، طبع سعید)

(ھی) الراعیۃ وشرعا (المکتفیۃ بالرعی) المباح ذکرہ الشمنی (فی اکثر العام لقصد الدر والنسل) ذکرہ الزیلعی

ولما فیھما ایضا:(۲۸۶،۲۸۵/۲، طبع سعید)

(وجاز دفع القیمۃ فی زکاۃ وعشر وخراج وفطرۃ ونذر وکفارۃ غیر الاعتاق) وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعا وھو الاصح

ولما فی التنویر مع الرد:(۲۸۲/۲، طبع سعید)

(والمصدق)لا(یأخذ)الا(الوسط) ای من السن الذی وجب فلو وجب بنت لبون لا یأخذ خیار بنت لبون ولا ردیئھا بل یأخذ الوسط لقولہ ﷺ لمعاذ حین بعثہ الی الیمن 'ایاک وکرائم اموالھم' رواہ الجماعۃ ولان فی اخذ الوسط نظرا للفقراء ولرب المال مثلا علی التاری وفی الغانیۃ: ولا تؤخذ الربی والاکیلۃ والماخض وفحل الغنم لانھا من الکرائم

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: نعیم اللہ شیخ غفرلہ ولوالدیہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۹۷۳

## ﴿بکریوں کے بچوں میں زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بکریوں کے چھوٹے

بچوں میں زکوۃ فرض ہے یا نہیں؟ یعنی شرعی نصاب میں بچوں کا شمار ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بکریوں کے صرف بچے ہی بچے ہوں، یعنی کوئی ایک بھی بکرا، بکری ساتھ نہ ہو جسکی عمر سال یا اس سے زیادہ ہو تو بکریوں کے ایسے بچوں میں کوئی زکوۃ نہیں ہے خواہ تعداد میں نصاب کے برابر ہوں، البتہ بچوں کے ساتھ کوئی ایک بھی بکرا، بکری ہو تو سال سے کم عمر کے بچوں کو بھی تبعاً شمار کیا جائے گا اور زکوۃ کل تعداد سے دی جائیگی بشرطیکہ نصاب تک پہنچیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ بکری کا بچہ اگر سال کا ہو تو وہ بچہ نہیں کہلاتا اس لئے اسکی قربانی بھی جائز ہے۔

لما فی الشامیة:(۲/۲۸۲،۲۸۳ طبع سعید)

(و) لا فی (حمل) ولد الشاة ـــ وصورته ان یموت کل الکبار ویتم الحول علی اولادها الصغار (قوله الا تبعا لکبیر) قال فی النهر: والخلاف ای المذکور انما مقید بما اذا لم یکن فیها کبار، فان کان کما اذا کان له مع تسع وثلاثین حملا مسن، کذالک فی الابل والبقر کانت الصغار تبعا للکبیر ووجب اجماعاً کذا فی الدرایه ه

ولما فی بدائع الصنائع:(۲/۳۲ طبع سعید)

فاما اذا اجتمعت الصغار والکبار وکان وحد منها کبیرا فان الصغار تعد ویجب فیها ما یجب فی الکبار وهو المسنه بلا خلاف.

ولما فی بدائع الصنائع ۲/۳۰ طبع: سعید)

ثم سا ئمة هی المراعیة التی تکتفی با لرعی عن العلف ویمو نها ذلک ولا تحتاج الی ان تعلف فان کانت تسام فی بعض السنه وتعلف وتسان فی البعض یعتبر فیه الغالب.

ولما فی الشامیة:(۲/۲۸۲ طبع سعید)

(قوله وحمل وفصیل وعجول) فی النهر: الحمل ولد الشاة فی السنة الاولی.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۳۵۳۵

## ﴿نقد، ادھار اور گروی رکھے ہوئے مکان کی زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) اگر کسی آدمی نے اپنا رہائشی مکان کے علاوہ دوسرا مکان (جو تجارت کی نیت سے نہیں خریدا گیا) رھن میں رکھا ہو تو کیا اسمیں زکوۃ ہے یا نہیں؟

(۲) تجار عام طور پر تجارت ادھار سے کرتے ہیں، اسمیں نقد روپیہ بہت کم ہوتا ہے تو کیا زکوۃ صرف نقد میں واجب ہوگا یا ادھار میں بھی؟ جبکہ ادھار کا ملنا متوقع ہو۔ مستفتی: خلیل اللہ سواتی

﴿جواب﴾ (۱) اسمیں زکوۃ نہیں ہے، اس لئے کہ مکان میں زکوۃ تب واجب ہے اگر وہ بغرض تجارت لیا ہو۔ (۲) زکوۃ جس طرح نقد میں واجب ہے اسی طرح ادھار میں بھی واجب ہے لیکن ادھار کی زکوۃ ادا کرنا اس وقت ضروری ہے جب وصول ہو جائے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۱۷۸/۲، کتاب الزکوۃ، مکتبه امدادیه)

(و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم — الخ.

وفي الشامية: وظاهر قوله "فاذا كان له دراهم الخ" أن المراد من قوله "وفارغ عن حاجته الأصلية" ما كان نصابا من النقدين أو أحدهما فارغا عن الصرف الى تلك الحوائج فانه قال: وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة، لأنها مشغولة بحاجته الأصلية وليست بنامية أيضا اه وبه يشعر كلام المصنف الآتي أيضا وأشار كلام البناية الى أنه لا يضر كونها غير نامية أيضا اذلا مانع من خروجها مرتين كما خرج الدين ثانيا بقوله "فارغ عن حوائجه الأصلية" وخصه بالذكر كما قال القهستاني: لما فيه من التفصيل.

ولما في الهندية: (۱۷۲/۱، کتاب الزکاة، طبع رشیدیه)

(ومنها فراغ المال) عن حاجته الأصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة هكذا في الهداية: (۲۰۲/۲، کتاب الزکوۃ، طبع رحمانیه)

ولما في التاتارخانية: (۲۲۵/۲-۲۲۶، طبع قدیمی)

فان مليئا وكان مترابالدين فلا يخلو اما ان وجب الدين بدلا عما هو مال للتجارة كبدل الدراهم والدنانير وعروض التجارة وما أشبهه وهو الدين-- فما وجب بدلا عما هو مال التجارة فحكمه عند أبي حنيفة أن يكون نصابا قبل القبض تجب فيه الزكوة ولكن لايجب الاداء مالم يقبض منه أربعين درهما.

ولما في الهداية: (۲۰۲/۱، طبع رحمانیه)

ولو كان الدين على مترملئ أو معسر تجب الزكوة لامكان الوصول اليه ابتداء أو بواسطة التحصيل.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۲۸۶۲

## ﴿دوکانیں تعمیر کرنے کی غرض سے پلاٹ لیا تو زکوۃ واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک اس دوران میں نے ایک پلاٹ کے سلسلہ میں تقریباً دس سے پندرہ ہزار روپے ادا کردیئے تھے، پھر ۲۰۰۳ء میں مزید پچاس ہزار روپے جمع کردیئے، پھر ۲۰۰۵ء میں ایک لاکھ نوے ہزار مزید جمع کردیئے پھر مزید پانچ ہزار جمع کردیئے، تقریباً کل جمع شدہ رقم دواڑھائی لاکھ روپے ہیں، اس بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس پلاٹ کا ایسا قبضہ کہ میں اس پر کچھ تعمیر کرسکوں اب تک نہیں دیا اور شاید کافی عرصہ اس میں اور بھی لگ سکتا ہے تاہم ڈاکومنٹس کی بنیاد پر مارکیٹ میں اس کی ویلیو کم اور زیادہ ہوتی رہی اور اب میں نے اس کو فروخت کرلیا جسکی اچھی خاصی رقم آئی۔ براہ کرم اسکی زکوۃ ادا کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ واضح رہے کہ شروع میں اس پر دوکانیں بنانے کا ارادہ تھا اور اسی غرض سے لیا تھا لیکن اب ضرورت پیش آنے پر میں نے اس کو فروخت کرلیا۔

﴿جواب﴾ پلاٹ لیتے وقت شروع میں اس پر دوکانیں تعمیر کرنے کا واقعی آپ کا ارادہ اگر تھا اس کو بیچنے کی غرض سے نہیں لیا تھا۔ تو یہ پلاٹ مال زکوۃ میں شمار نہیں تھا اس لئے گذشتہ سالوں کی زکوۃ آپ پر واجب نہیں، البتہ اس پلاٹ کا سودا جس تاریخ میں آپ نے کیا اسی روز آپ اس سے حاصل ہونے والی رقم کے مالک قرار پاگئے، اب اس رقم کی بھی آپ کے پاس دیگر رقم کی طرح زکوۃ واجب ہے لہذا آپ کی ادائیگی زکوۃ کی جو بھی تاریخ مقرر ہے اس سے پہلے آپ نے اگر سودا کیا ہے تو اس رقم سے بھی اڑھائی فیصد زکوۃ ادا کرنا لازم ہے اور اگر یہ سودا اس مقررہ تاریخ کے بعد آپ نے کیا ہے اور آئندہ سال آنے والی تاریخ میں بھی آپ کے پاس یہ رقم اگر موجود رہی تو اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

لما فی التنویر مع ردالمحتار:( ۲/۲۶۵ طبع سعید)

(ولا فی اثاث المنزل ودور السکنی ونحوھا) قولہ ونحوھا ای کثیاب البدن الغیر المحتاج الیھا وکالحوانیت والعقارات۔

ولما فی فتح القدیر:( ۲ ص ۲۲۶ طبع رشیدیہ کوئیٹہ)

[وتشترط نیۃ التجارۃ] لانہ لما لم تکن للتجارۃ خلقۃ فلا یصیر لھا الا بقصدھا فیہ وذلک ھو نیۃ التجارۃ فلو اشتری عبدا مثلا للخدمۃ ناویا بیعہ ان وجد ربحا لازکاۃ فیہ۔

ولما فی المحیط البرھانی:(۳/ ۱۶۴ مکتبہ ادارۃ القرآن)

واذااشتری عرضا بدارھم اودنانیر فاالمشتری لا یصیر للتجارۃ الا اذا نوی التجارۃ.

ولمافی الفقہ الا سلامی وادلتہ: (۱۸۶۶/۳ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

فما العقار الذی یسکنہ صاحبہ او یکون مقرا لعملہ کمحل للتجارۃ ومکان للصناعۃ فلاز کاۃ فیہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی

۱۷ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۳۷۰

## ﴿کیا قرضہ معاف کردینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاڑیوں کی کمائی کا کاروبار ہے، ہم دیگر کمائی والوں کو بھی کمائی دیتے رہتے ہیں نقداً اور ادھار بعض کمائی والے تمیں، چالیس اور پچاس ہزار روپے تک ہمارا مقروض رہتے ہیں تو ہم اپنے مقروض حضرات کو زکوٰۃ کی نیت سے زکوٰۃ کی مقدار کے اعتبار سے قرض معاف کرنا چاہتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہمارا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو شرعی وضاحت فرما کر راہنمائی فرمائیں۔

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی نیت سے مستحق کو باقاعدہ مالک وقابض بنا کر مال دینا شرط ہے، قرضہ معاف کرنے سے زکوٰۃ اداء نہیں ہوتی، آپ اپنے مقروض مستحق کو زکوٰۃ دینا چاہتے ہیں تو زکوٰۃ کی رقم وغیرہ اسکو دیکر باقاعدہ مالک وقابض بنائیں اور پھر وہی مال اپنے قرضہ میں دوبارہ اس سے وصول کرلے تو آپکی زکوٰۃ اداء ہوجائیگی اور مقروض کو قرضہ سے خلاصی مل جائیگی۔

لمافی الدرمع ردالمحتار:(۲/ ۱۹۰، کتاب الزکاۃ مطلب فی زکوۃ ثمن المبیع وفاء امدادیہ)

واعلم أن أداء الدین عن الدین والعین عن العین وعن الدین یجوز وأداء الدین عن العین وعن دین سیقبض لا یجوز وحیلۃ الجواز أن یعطی مدیونہ الفقیر زکاتہ ثم یأخذھا عن دینہ..... الخ.قولہ:(وحیلۃ الجوز)ای فیما اذاکان لہ دین علی معسر وأرادأن یجعلہ زکوۃ عن عین عندہ أودین لہ علی آخر سیقبض.قولہ:(أن یعطی مدیونہ الخ)قال فی الأشباہ:وھو أفضل من غیرہ:ای لأنہ یصیر وسیلۃ الی براءۃ ذمۃ المدیون.

ولمافی الھدایۃ:(۱/ ۲۰۳، کتاب الزکوۃ مکتبہ رحمانیہ)

ولو کان الدین علی مقر ملئی أومعسر تجب الزکوۃ،لامکان الوصول الیہ ابتداء أو بواسطۃ التحصیل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ محرم الحرام ۱۴۳۶ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۸۱۸

## ﴿رہائشی پلاٹ پر زکوٰۃ نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے اپنی ذاتی ضرورت کے لئے پلاٹ خریدا، البتہ ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر کوئی مناسب دام میں خریدے گا تو آگے فروخت بھی کروں گا، پوچھنا یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں یہ پلاٹ مال تجارت میں داخل ہوگا؟

﴿جواب﴾ وجوب زکوٰۃ کے تحقق کے لئے بوقت خریداری نیت کا اعتبار ہے جہاں کہیں تجارت کا ارادہ نہ ہو بلکہ اپنی ضرورت کے لئے خریدا ہو وہ مال، مال تجارت میں داخل نہیں ہوگا۔

لما فی الدرالمختار:(۲/۲۷۴،طبع سعید)

ولونوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئاً للقنية ناوياًأنه وجد ربحاًباعه لا زكوة عليه.

ولما فی فتح القدیر:(۲/۲۲۶،طبع رشیدیہ)

فلو اشترى عبداًمثلاًللخدمة ناوياً بيعه ان وجد ربحاً لا زكوة فيه.

ولما فی المحیط البرهانی:(۳/۱۶۷،طبع ادارۃ القرآن)

وقال هشام سالت محمدا عن رجل يشترى جارية للخدمة وهو ينوى أنه ان اصاب ربحاً باعها فحال عليها الحول وقال ليس فيها زكاة حتى يشترى وعزيمة أمره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: تاج الدین چترالی

صفرالمظفر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۳۰۴۱

## ﴿سونے کے ساتھ نقد روپے یا چاندی ہو تو مجموعی قیمت سے نصاب پورا کیا جائیگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن ایک مولوی صاحب کے ساتھ زکوٰۃ کی فرضیت پر بات چیت ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا کہ اگر کسی کے پاس 5 تولہ سونا ہو اور کچھ نقد رقم ہو، جس پر ایک سال تک عرصہ گزر جائے تو کیا اس آدمی پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے کہ نہیں، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ایسا نہیں ہے کہ کچھ سونا ہو اور کچھ نقد یا کچھ سونا اور کچھ چاندی یا کچھ چاندی اور کچھ رقم سے زکوٰۃ فرض ہو بلکہ زکوٰۃ صرف ساڑھے سات تولہ سونا اور ساڑھے باون تولہ چاندی پر واجب ہے، ایسا نہیں کہ 5 تولہ سونا اور ایک تولہ چاندی یا سونے کیساتھ پیسے ملانا یا چاندی کے ساتھ پیسے ملانا، تاکہ ساڑھے باون تولہ چاندی کا نصاب برابر ہو یہ غلط ہے، اونٹ کا علیحدہ نصاب ہے، بھیڑ، بکری کا علیحدہ نصاب ہے سونے کا علیحدہ

نصاب ہے اور چاندی کا علیحدہ نصاب ہے۔ برائے مہربانی شریعت کی رو سے اس مسئلہ کا تحریری جواب دیں۔

مستفتی: عنایت اللہ جیولرز بنوں

﴿جواب﴾ مولوی صاحب نے صحیح فرمایا ہے، کہ بھیڑ، بکری اور جانوروں کے دیگر اقسام مثلاً اونٹ گائے وغیرہ کا نصاب الگ الگ ہے۔ اور نقود کے بارے میں انہوں نے آپ کو جو مسئلہ بیان فرمایا ہے معلوم نہیں آپ نے صحیح سمجھا نہیں یا انہوں نے صحیح بتایا نہیں؟

نقود یعنی سونا، چاندی اور کسی ملک میں رائج کرنسی کے بارے میں علمائے احناف (کثرھم اللہ) کا فتویٰ یہ ہے، کہ جس شخص کی ملکیت میں ساڑھے سات تولہ یا اس سے زیادہ صرف سونا اگر ہو یا صرف چاندی ساڑھے باون تولہ یا اس سے زیادہ ہو تو یہ شخص صاحب نصاب کہلاتا ہے، اور اگر سونا چاندی دونوں ہوں اور ہر ایک مذکورہ مقدار سے کم ہو تو دونوں کی مجموعی قیمت کسی بھی ایک مقدار تک اگر پہنچے تو اس شخص کو بھی غنی لوگوں کا شرف حاصل ہوگا زکوٰۃ ادا کرنے والے لوگوں میں اس کا شمار ہوگا، اور یہ اس کے لئے بڑی سعادت ہے اور غرباء و مساکین کے لئے بھی فائدہ کی بات ہے۔ لہٰذا سونا 5 تولہ اور ایک تولہ چاندی، یا کچھ نقد روپے 5 تولہ سونے کیساتھ ملکیت میں ہوں اور سال بھر بھی گزر جائے تو بلاشبہ اس شخص پر زکوٰۃ فرض ہے۔

البتہ جانوروں کو سونا چاندی اور نقد روپے پر قیاس نہیں کیا جائیگا، چنانچہ سونا چاندی کچھ بھی کسی کے پاس نہ ہو نقد روپے ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر اس کے پاس ہوں تو اس شخص پر بھی بلاشبہ زکوٰۃ فرض ہے۔

لما فی رد مع الدر: (۲/۳۰۲ طبع سعید کراچی)

(و) یضم (الذهب الى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة) (قوله ويضم) اى عند الاجتماعي اما عند الانفراد احدهما فلا تعتبر القيمة اجماعا بدائع لان المعتبر وزنه اداء ووجوبا كما مر في البدائع ايضا ان ماذكر من وجوب الضم ان اذالم يكن كل و احدمنهما نصابابأن كان اقل فلو كان كل واحدمنهما نصابا تاما بدون زيادة لا تجب الضم بل ينبغى ان يؤدى من كل واحد زكاته.

ولما فی الفقه الحنفی وادلته: (۱/۳۲۵ دار الكلم الطيب بيروت)

وتجب الزكاة في المال المستفاد المجانس في اثناء الحول ويزكيه مع الاصل فالنقدان الذهب والفضة والاوراق النقدية وعروض التجارة جنس واحد فيضم بعضها الى بعض.

ولما فی الشامیة :(۲/ ۲۸۱ طبع سعید کراچی)

(قوله فی تکمیل النصاب )کان نقص نصاب الضأن وعنده من المعز ما یکمله او بالعکس وجبت فیه الزکاة .

ولما فی الهندیة:(۱/ ۱۷۸ طبع رشیدیة)

والجاموس کالبقر وعند الاختلاط یجب ضم بعضها الی بعض لتکمیل النصاب .

ولما فی الهندیة :(۱/ ۱۷۹ طبع رشیدیة )

ولو ضم احدالنصابین الی الاخری حتی یؤدی کله من الذهب او من الفضة لا بأس به لکن یجب أن یکون التقویم بما هوانفع للفقراء قدرا ورواجا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۳ جمادی الاولی ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۲۷۰۰

## ﴿شوہر مقروض ہے تو بیوی کے نصاب پر کوئی اثر نہیں پڑے گا﴾

جناب مفتی صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

﴿سوال﴾ مندرجہ ذیل کا قرآن وحدیث کے حوالے سے شرعی حل فرمائیں: سوال [ا] سونا نصاب کے حساب سے زکوۃ فرض ہے اگر زکوۃ کیلئے پیسے نہ ہوں تو سونا جو موجود ہے اس میں سے کچھ فروخت کر کے زکوۃ ادا کیجائیگی کیا قربانی کرنے کیلئے بھی ایسا کرنا ہوگا یا قربانی جو کہ سربراہ [شوہر] کے ذمہ واجب ہے وہ قربانی کرے؟

[ب] عورت جو کہ امور خانہ داری انجام دیتی ہے کمائی [انکم] کا کوئی ذریعہ نہیں ہے شوہر کے ساتھ رہ رہی ہے شوہر پر اگر قرضہ ہے تو کیا بیوی قربانی کرے؟ مستفتی: رانا مسعود صاحب، کورنگی

﴿جواب﴾ [ا] بیوی اگر خود صاحب نصاب ہے تو گھر کے سربراہ [شوہر] کی قربانی سے وہ بری الذمہ نہیں ہوگی۔ قربانی کیلئے اگر نقد پیسہ نہیں ہے تو قرض لے یا شوہر اسکو ہبہ کردے اسکی مرضی ہے بہرحال قربانی کرنا اسکی خود کی ذمہ داری ہے۔

[ب] میاں بیوی ہر ایک اپنے اپنے مال کے مالک ہیں اور قرض جسکے ذمہ ہے ادائیگی بھی صرف اسی کی ذمہ ہے۔ لہذا بیوی اگر صاحب نصاب ہے خواہ شوہر اسکا مقروض ہے قربانی کرنا اس کیلئے ضروری ہے شوہر کے مقروض ہونے سے قربانی اسکے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتی۔

لما فی الدر ۲/ ۳۱۲ طبع ایچ ایم سعید

وشرائطها:الاسلام والاقامة واليسار الذی يتعلق به وجوب صدقة الفطر (لاالذكورة فتجب على الانثى ).قال فی الرد :قوله اليسار الخ بان ملك ما ئتی درهم اوعرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس اومتاع يحتاجه الى ان يذبح الاضحية

ولما فی البحر ۸/ ۱۷۳/طبع ایچ ایم سعید

تجب على حرمسلم موسرمقيم عن نفسه لا عن طفله شاة اوسبع بدنة فجر يوم النحر.

ولما فی البدائع ۶/ ۲۸۳/طبع دارالکتب العلمیة بیروت لبنان

ومنها (ای ومن شرائط وجوب الیضحیة )الغنی لما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال:من وجد سعة فليضحح شرط (عليه الصلوة والسلام )السعة وهی الغنی ثم ذكر مقداره حيث قال :وهو ان يكون فی ملكه مائتادرهم اوعشرون دينارااوشئی تبلغ قيمته ذلك سوی مسكنه وما يتأثث به وكسوته وخادمه وفرسه وسلاحه ومالايستغنی عنه وهو نصاب صدقة الفطر.

ولما فی المحیط البرهانی ۸/ ۴۵۵/طبع ادارۃالقرآن

وشرط وجوبها اليسار عنداصحابنا والموسر فی ظاهرالرواية من له مائتادرهم اوعشرون دينارااوشئی يبلغ ذلك سوی مسكنه ومتاعه ومركوبه وخادمه فی حاجته التی لايستغنی عنها.

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب :عاقل شاہ

۸ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر:۳۸۶۴

## ﴿چار تولہ سونا اور گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ السلام علیکم ورحمۃ اللہ مفتی صاحب چند سوالات کے متعلق رہنمائی فرمائیں:

(۱) میرے پاس آٹھ سال سے چار تولہ سونا ہے جو کہ زکوٰۃ کی مقدار سے کم ہے لیکن بعض احباب کا کہنا ہے کہ تم پر زکوٰۃ فرض ہے؟ (۲) اگر فرض ہے تو کتنی ادا کروں گی کیونکہ آٹھ سال پہلے فی تولہ سات ہزار کا تھا اور اب تقریباً چالیس ہزار کا ہے؟ (۳) اور گزشتہ آٹھ سالوں کی زکوٰۃ کا کیا ہوگا؟

مستفتیہ :بیگم غلام محی الدین ،پشاور

﴿جواب﴾ (۱) سونے کا نصاب زکوٰۃ ساڑھے سات تولہ اس وقت ہے جب آپ کے پاس چاندی اور نقدی بالکل نہ ہو،لہٰذا چار تولہ سونے کے ساتھ اگر ایک روپیہ بھی ہو اور سال

گزرنے کے بعد چاندی کی اسی تاریخ میں بھی روپیہ یا کم وبیش نقدی ہو تو اس سونے پر زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ نقدی بھی چاندی کے درجہ میں ہے اور اتنی نقدی تو ہر ایک کے پاس عموماً ہوتی ہے۔

(۲) مذکورہ صورت میں آپکے نقدی اور سونے کو چاندی شمار کرنے کے بعد ہی زکوٰۃ کا حکم متوجہ تھا، لہذا چاندی کی تاریخ میں ہر سال جو بھی چاندی کی مقدار آپکے مال سے اداء کرنا ضروری تھا وہی مقدار چاندی یا آج اسکی جو بھی قیمت بنتی ہے اداء کرنا ضروری ہے۔

(۳) زکوٰۃ کا حکم نماز، روزہ کی طرح ہے اگر رہ جائے تو محض توبہ واستغفار سے معاف نہیں ہوگی بلکہ ادا کرنا ضروری ہے، لہذا گزشتہ سالوں میں آپ کے پاس اس سونے کیساتھ کچھ نقدی رقم بھی اگر تھی اور خاص اسی تاریخ میں جس میں آپ شرعاً صاحبِ نصاب قرار پا گئی تھی کچھ نقدی موجود تھی تو ایسی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہے خواہ اس طرح کئی سال گزر گئے ہوں۔

لما فی المبسوط للسرخسیؒ:(۱-۲/۱۹۲، کتاب الزکاۃ، باب زکوٰۃ المال، بیروت)

ولنا حدیث بکیر بن عبدالله بن الأشج رضی الله عنه قال من السنة أن یضم الذهب الی الفضة لایجاب الزکوٰۃ ومطلق السنة ینصرف الی سنة رسول الله علیه وسلم.

ولما فی الدر المختار:(۲/۲۳۲، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ المال، طبع امدادیه ملتان)

ویضم الذهب الی الفضة وعکسه بجامع الثمنیة قیمة وقالا بالأجزاء

ولما فی الدر مع الرد:(۲/۲۱۱، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم، طبع امدادیه)

وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الأداء وفی السوائم یوم الأداء اجماعاً وهو الأصح.

وفی الشامیة: قوله (الأصح) أی کون المعتبر فی السوائم یوم الأداء اجماعاً هو الأصح فانه ذکر فی البدائع أنه قیل: ان المعتبر عنده فیها یوم الوجوب وقیل یوم الأداء اھ وفی المحیط یعتبر یوم الأداء بالاجماع وهو الأصح اھ۔ فهو تصحیح للقول الثانی الموافق لقولهما وعلیه فاعتبار یوم الأداء یکون متفقاً علیه عنده وعندهما.

ولما فی البرهان شرح مواهب الرحمن:(۱/۵۰۷، مخطوطه)

واعتبراها یوم الأداء اذ الأصل هو أداء أجزاء من النصاب وللمزکی حق النقل الی القیمة فیعتبر یوم النقل وهو وقت الأداء وصار کما لو نقصت بعفونته وکالسوائم وهو الأظهر لما قلنا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: حفیظ اللہ بیگ پشاوری

صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر: ۲۹۰۶

## ﴿دس تولہ سونا پر گزشتہ سالوں کی زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے پاس دس تولہ سونا ہے جس کی کئی سالوں کی زکوۃ اس کے ذمہ لازم ہے، پوچھنا یہ ہے کہ گزشتہ کئی سالوں کی زکوۃ کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے؟ ادائیگی میں موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا یا گزشتہ سالوں کی قیمت کا؟

مستفتی: دین محمد کوہائی

﴿جواب﴾ زکوۃ فقراء کا حق ہے جسکی ادائیگی میں ایک سال تک تاخیر کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، لہذا آئندہ کے لیے سال گزرنے سے پہلے پہلے ادا کرنے کا اہتمام کریں اور اب تک جو تاخیر ہوگئی ہے، اس پر توبہ کریں۔

صورت مذکورہ میں زید کی ملکیت میں جس سال سونا آیا ہے، اس سال سے قمری مہینہ کے حساب سے ہر سال زکوۃ میں چالیسواں حصہ ادا کرے، آپ کے ذمہ در اصل سونا ہی واجب الادا ہے، قیمت لگا کر موجودہ کرنسی سے ادا کرنا اس کا متبادل ہے، اس لیے اسکی بھی گنجائش ہے، لہذا ہر سال کی واجب مقدار سونا یا اس کی موجودہ قیمت ادا کرنا ضروری ہے۔

البتہ ہر سال میں واجب مقدار سونا یا اس کی موجودہ قیمت ادا کرنے کے بعد اگلے سال کے حساب میں اسی مقدار کو منہا کر کے حساب کریں۔

لما فی الدر مع الرد:(۲/۲۸۵-۲۸۶،طبع سعید)

وجاز دفع القيمة في زكوة وعشر وخراج وفطرة ونذر وكفارة غير الاعتاق وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء، وفي السوائم يوم الاداء اجماعا وهو الاصح.

وفي الشامية:قوله: وهو الاصح اى كون المعتبر في السوائم يوم الاداء اجماعا هو الاصح، فانه ذكر في البدائع انه قيل ان المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الاداء الخ وفي المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما.

ولما في الهندية:(۱/۱۷۹-۱۸۰،فصل في العروض،طبع رشيديه)

اذا كان له مائتا قفيز حنطة لتجارة تساوى مائتى درهم فتم الحول ثم زاد السعر او انتقص فان ادى من عينها ادى خمسة اقفزة وان ادى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب لان الواجب احدهما ولهذا يجبر المصدق على قبوله وعندهما يوم الاداء وكذا كل مكيل او موزون او معدود

وان كانت الزيادة في الذات بان ذهبت رطوبته تعتبر القيمة يوم الوجوب اجماعا الان المستفاد بعد الحول لا يضم وان كان النقصان ذاتا بان ابتلعت يعتبر يوم الاداء عندهم.

ولما في البحر: (۲/۲۲۱، طبع سعید کراچی)

ويبتني على هذا الاصل مسائل الجامع: له مائتا قفيز حنطة للتجارة تساوي مائتي درهم ولا مال له غيرها فان ادى من عينها يؤدي خمسة اقفزة بلا خلاف وان ادى قيمتها فعنده تعتبر القيمة يوم الوجوب في الزيادة والنقصان وعندهما في الفصلين يعتبر يوم الاداء واختلف على قوله في السوائم فقيل يوم الوجوب وقيل يوم الاداء حسب الاختلاف السابق وتمامه فيه وفي المحيط يعتبر في قيمة السوائم يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح.

ولما في البدائع: (۲/۲۱، طبع سعید)

واما صفة الواجب في اموال التجارة فالواجب فيها ربع عشر العين وهو النصاب، وقال بعض مشايخنا هذا قول ابي يوسف ومحمد واما على ابي حنيفة فالواجب فيها احد شيئين اما العين او القيمة فالمالك بالخيار عند حولان الحول ..... الخ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی

۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۳۲

## ﴿گزشتہ سالوں کی زکوۃ دینا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دس سال ہو گئے ہیں شادی ہوئی ہے، آج تک میں نے اور نہ میرے شوہر نے زکوۃ ادا کی ہے۔ شوہر کے پاس بینک میں کبھی چار، پانچ کروڑ ہوتے ہیں، کبھی صرف ایک لاکھ؟ مستفتیہ: حلمہ معہد الفقیر

﴿جواب﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کے شوہر کو اسی طرح آپ کو بھی بالغ ہونے کے بعد اسلامی جس تاریخ میں بقدر نصاب مال کا مالک بنا دیا تھا اور سال گزرنے کے بعد اسی تاریخ میں بقدر نصاب یا اس سے زیادہ مال پھر بھی موجود تھا تو ایسی صورت میں موجود مال پر زکوۃ واجب تھی، اس کے بعد بھی ہر سال اسی تاریخ کو اگر بقدر نصاب یا زیادہ مال موجود تھا تو ہر سال زکوۃ واجب تھی سال کے دوران مال کم یا زیادہ ہونے کا اعتبار نہیں ہے صرف اسی تاریخ کا اعتبار ہے جس روز آپ صاحب نصاب بنے تھے وہی اسلامی تاریخ یاد رکھنا ضروری ہے اور اسی تاریخ میں موجود مال کا حساب کرنا ضروری ہے پھر اس سے اڑھائی فیصد زکوۃ دینا فرض ہے اگر چہ آہستہ آہستہ دیں لیکن اس روز موجود مال کا معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے لہذا آپ کا شوہر اور آپ

دونوں پہلے وہ تاریخ نکالیں جس روز آپ لوگ صاحب نصاب بنے تھے ظاہر ہے ایک تاریخ نہیں ہوگی آپ کی الگ اور شوہر کی الگ اسلامی تاریخ ہوگی اس کے بعد آپ لوگوں کے پاس نقدی اور سونا مال تجارت وغیرہ اگر بقدر نصاب یا زیادہ رہا ہے تو ہر سال کا الگ حساب کر کے واجب زکوٰۃ کی مقدار معلوم کریں پھر اگر توفیق ہو تو ایک ساتھ ورنہ آہستہ آہستہ تمام۔ مالوں کی زکوٰۃ ادا کردیں اور توبہ استغفار بھی کریں اس لئے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں سال سے زیادہ تاخیر باعث گناہ ہے تاہم ذمہ سے ساقط نہیں ہوتی واجب رہتی ہے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے اور جو لوگ ادا نہیں کرتے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے تو ان کے لئے احادیث میں سخت وعید آئی ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کے مال کو بڑا زہریلا گنجا سانپ بنا کر اس کی گردن میں لپیٹا جائے گا پھر وہ اسکے دونوں جبڑے نوچے گا اور کہے گا میں ہی تیرا مال ہوں میں ہی تیرا خزانہ ہوں۔

لما فی البخاری:(۱۸۸/۱،طبع قدیمی)

عن ابی هريرة قال :قال رسول الله ﷺ "من اتاه الله مالافلم یودز کاته مثل له ماله يوم القيامه شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامه ثم ياخذ بلهزمتيه يعني بشد قيه ثم يقول انا مالک انا کنزك.

لما فی تنویر الابصار:(۲۹۵/۲ طبع سعید).

(نصاب الذهب عشرون مثقال والفضة مائتا درهم كل عشرة )دراهم (وزن سبعة مثاقيل )وللدينا ر عشرون قيراطاً۔۔۔

ولما فی بدائع والصنائع:(۷/۲ طبع :سعید)

وبيان ذلک انه اذاكان الرجل مائتان درهم او عشرون مثقال ذهب فلم یودز کاته سنتين يزكى سنة الاولى وليس عليه للسنة الثانيه شئ عنداصحابناالثلاثه وعندزفريؤدی زكاته سنتين وهكذافي مال التجارة وكذافي السوائم ......

ولمافی محیط البرهانی :(۱۶۷/۳ طبع: ادارة القرآن)

والحاصل ان اباحنيفة يعتبرالقيمة يوم الوجوب فی جنس هذه المسائل وهمايعتبران القيمة يوم الاداء

ولمافی العالمگیرية :(۱۷۰/۱،طبع: سعید)

وتجب على الفورعندتمام الحول حتى يأثم بتاخيره من غير عذروفی رواية الرازی على التراخي حتى يأثم عندالموت والاول اصح كذافي التهذيب.

ولما فی تنویر الابصار:(۲/۲۵۹،طبع: سعید)

(وسببه)ای سبب افتراضها ملک نصاب حولی نسبة للحول لحولانه علیه(تام)۔

ولما فی بحر الرائق:(۲/۲۰۲،طبع:سعید)

والمراد بکونه حولیا ان یتم الحول علیه وهو فی ملکه لقوله علیه السلام لا زکاة فی مال حتی یحول علیه الحول۔

واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۳۶۹۳

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ

## ﴿کیا استعمالی اشیاء زکوٰۃ میں دی جا سکتی ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی آدمی استعمال کے پرانے کپڑے اور گھر کا پرانا سامان فرنیچر وغیرہ زکوٰۃ کی نیت سے مستحق کو دے تو اس سے زکوٰۃ ادا ہو گی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ استعمال کی اشیاء بھی زکوٰۃ میں دے سکتے ہیں بشرطیکہ مارکیٹ میں ایسی اشیاء کی قیمت لگ سکتی ہو فقیر کو ایسی اشیاء دینے سے قیمت کے برابر زکوٰۃ ادا ہو جائیگی۔

لما فی البدائع:(۲/۴۱،طبع سعید)

واما الذی یرجع الی المؤدی فمنها ان یکون مالا متقوما علی الاطلاق سواء کان منصوصا علیه او لا من جنس المال الذی وجبت فیه الزکوٰة او من غیر جنسه والاصل ان کل مال یجوز التصدق به تطوعا یجوز اداء الزکوٰة منه وما لا فلا۔

البتہ اتنی ردی اور ناکارہ چیز زکوٰۃ میں دینا جس کو خود اسکی طبیعت ناپسند کرتی ہو مروت کے خلاف ہے اور شرعاً ناپسندیدہ ہے اگر چہ زکوٰۃ اس سے ادا ہو جائیگی۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورۃ البقرۃ:آیت ۲۶۷)

یاایها الذین اٰمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم بأخذیه الا ان تغمضوا فیه واعلموا اللّٰه غنی حمید..... الاٰیة۔

ولما فی روح المعانی:(۳/۵۲،طبع رشیدیه)

ای لا تقصدوا الخبیث قاصرین الانفاق علیه او من الخبیث ای مختصا به الانفاق وایاما کان لا یرد انه یقتضی ان یکون النهی عن الخبیث الصرف فقط مع ان المخلوط ایضا کذلک لان التخصیص لتوبیخهم بما کانوا یتعاطون من انفاق الخبیث خاصة، فعن عبیدة السلمانی قال:سالت علیا کرم اللّٰه وجهه عن هذا الاٰیة فقال:نزلت فی الزکوٰة المفروضة کان الرجل یعمد الی التمر فیصرمه فیعزل الجید ناحیة فاذا جاء

صاحب الصدقة اعطاه من الردئی فقال الله تعالیٰ:لاتیمموا الخبیث منه تنفقون.
ولما فی سنن ابی داؤد:(۱/۲۲۷،طبع رحمانیه)

عن ابی امامة بن سهل عن ابیه قال:نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الجعرور ولون الحبیق أن یؤخذ فی الصدقة،قال الزهری:لونین من تمر المدینة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی
۱۲ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۸۴۰

## ﴿درختوں کے خرید وفروخت کی صورت میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید، بکر اور خالد نے مل کر گاؤں والوں سے مشترکہ زمین کے درخت بنیت تجارت خرید لئے اور پیسے دیگر گاؤں والوں نے تقسیم کر کے ختم بھی کر لئے لیکن خریدنے والوں نے ابھی تک درخت فروخت نہیں کئے ہیں، ان درختوں کو روکے رکھا ہے اور روکنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ابھی تک اسکی مارکیٹنگ بند ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان تینوں میں سے ایک دوسرے سے چھپا کر خود زیادہ پیسے لینا چاہ رہا تھا، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں ان پیسوں پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جو انہوں نے درختوں کے قیمت میں دئے ہیں اور ان درختوں پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جو انہوں نے خریدے ہیں۔

﴿جواب﴾ زید، بکر اور خالد نے پیسوں کے عوض تجارت کی غرض سے درخت خرید لئے ہیں اب پیسوں پر انکی ملکیت نہیں رہی، البتہ درخت مال تجارت کے حکم میں ہیں، لہذا اگاؤں کے لوگوں نے یہ درخت پوری طرح زید، بکر اور خالد کو اگر حوالہ کرائے ہیں اور کاٹنے میں کوئی رکاوٹ گاؤں والوں کیطرف سے نہیں ہے تو ان درختوں کی مارکیٹ ویلیو جو بھی ہو اس میں زکوٰۃ ہے بشرطیکہ زید، بکر اور خالد صاحب نصاب ہوں اور زکوٰۃ ان پر واجب ہو۔

لما فی سنن ابی داود:(۱/۲۲۸،باب العروض طبع رحمانیه)

عن سمرة بن جندبؓ قال أما بعد فان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یامرنا أن نخرج الصدقة من الذی نعد للبیع.

ولما فیه أیضا:(۱/۲۳۰،طبع رحمانیه)

ولا یجمع بین مفترق ولا یفرق بین مجتمع خشیة الصدقة وما کان من خلیطین فانهما یتراجعان بینهما بالسویة فان لم تبلغ سائمة الرجل اربعین فلیس فیها شئی.

ولما فی بدائع الصنائع:(۲/۲۰ طبع سعید کراچی)

أما أموال التجارة فتقدير النصاب فيها بقيمتها من الدنانير والدراهم فلا شئی فيها ما لم تبلغ قيمتها مائتی درهم أو عشرين مثقالا من ذهب فتجب فيها الزكاة وهذا قول عامة العلماء

ولما فی بدائع الصنائع:(۲/۲۹ طبع سعید)

فأما إذا كانت مشتركة بين اثنين فقد اختلف فيه قال أصحابنا أنه يعتبر فی حال الشركة ما يعتبر فی حال الانفراد وهو كمال النصاب فی حق كل واحد منهما فإن كان نصيب كل واحد منهما يبلغ نصابا تجب الزكاة وإلا فلا.

ولما فی الدر مع الرد:(۴/۵۶۱-۵۶۲ طبع سعید)

التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع.

وفی الشامية: حاصله: أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة...ويصح تسليم ثمار الأشجار وهی عليها بالتخلية وان كانت متصلة بملک البائع.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد ملازئی

۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۹۵۸

## ﴿کراکری کے سامان میں زکوۃ واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دکاندار نے ٹینٹ کا سامان دکان میں کرایہ پر دینے کیلئے رکھا ہے اس سامان میں مختلف قسم کی کرسیاں، میز، دسترخوان اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے برتن یعنی ٹینٹ ہاؤس کا سارا سامان موجود ہے اور یہ شادی بیاہ کے لیے کرایہ پر دینے کے لیے دکان کھولی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس سامان کی آمدنی پر زکوۃ ہے یا اس کی مالیت پر؟

مستفتی: اشفاق احمد

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں دوکان کے سامان کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہے بلکہ اس کو کرایہ پر دینے سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اس پر زکوۃ واجب ہوگی یعنی زکوۃ کی تاریخ میں جتنا مال اب باقی ہے دیگر نقود کیساتھ اسکو بھی شامل کر کے زکوۃ ادا کرنی ہے۔

لما فی الهندية:(۱/۱۸۰ طبع رشیدیه)

ولو اشترى قدورا من صفر يمسكها ويواجرها لا تجب فيها الزكوة كما لا تجب فی بيوت الغلة.

ولما فی تبيين الحقائق:(۲/۲۳ طبع سعید)

وفی الذخيرة لو اشترى جوالق بعشرة آلاف درهم ويوجرها فلا زكوة فيها.

لمافی الولوالجیۃ:(۱/۱۸۲،طبع فاروقی پشاور)

رجل اشتری جوالقابعشرۃ آلاف درھم لیوجرھامن الناس فحال علیہ الحول لازکوۃ علیہ فیھالانہ اشتری لغلۃ لا للمبایعۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد عمران

۳۲محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۷۸۹

## ﴿قرضہ معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دوکاندار آدمی ہوں بعض لوگ ہم سے ادھار خریداری کرتے رہتے ہیں اور مہینے دو مہینے کے بعد پیسے دیتے رہتے ہیں،ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں تو کیا ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ جو رقم ہماری انکے ذمے واجب الاداء ہو اس کو زکوٰۃ میں سے شمار کرکے انکے ذمہ کو فارغ کردیں؟ مستفتی:ارشد صوابی

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی نیت سے قرضہ معاف کرنے سے زکوٰۃ اداء نہیں ہوتی،ایک بار وصول کرکے واپس زکوٰۃ کی نیت سے دیدیا کریں یا زکوٰۃ کی رقم دیکر اس کو زکوٰۃ کا مالک وقابض بنا کر پھر اپنے قرضہ میں وہی روپیہ دوبارہ وصول کریں۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب ایسا شخص سودا لینے آئے تو زکوٰۃ کی نیت سے آپ مطلوبہ سامان دیا کریں تاکہ وہ مقروض نہ ہوں اور آپکی زکوٰۃ بھی اداء ہو۔

لمافی الدرمع الرد:(۲/۲۷۰-۲۷۱،طبع سعید)

واعلم ان اداء الدین عن الدین و العین عن العین وعن الدین یجوز ،واداء الدین عن العین وعن دین سیقبض لایجوز،وحیلۃ الجواز ان یعطی مدیونہ الفقیر زکاتہ ثم یاخذھاعن دینہ.وفی صورتین لایجوزالاولی:اداء الدین عن العین کجعلہ مافی ذمۃمدیونہ زکاۃلمالہ الحاضر ..... الثانیۃ:اداء دین عن دین سیقبض کماتقدم عن البحر وھومالوأبرأ الفقیرعن بعض النصاب ناویابہ الاداء عن الباقی وعللہ بان الباقی یصیرعینا بالقبض فیصیرمؤدیابالدین عن العین.

ولمافی قاضیخان:(۱/۲۳۱-۲۳۲،طبع قدیمی)

اذاوھب الدین من المدیون بعدالحول ینوی بہ الزکاۃ ..... وان کان المدیون فقیرالوھب

الدین ینوی به زکاة مال عین عندالواهب لاتسقط عنه زکاة ذلک المال وکذا لونوی به زکاة دین آخر علی غیره.

ولما فی الهندیة:(۱/۱۷۱ طبع رشیدیه)

واداء العین عن العین وعن الدین جائز واداء الدین عن العین وعن دین یقبض لایجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ صوابی

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۷۸

## ﴿قرضہ کی وصولیابی پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمرو کو دس لاکھ روپے بطور قرض دیے تھے، اب کئی سالوں کے بعد عمرو اس قرضہ کو واپس دے رہا ہے جبکہ پورے قرضے کا آدھا یا ثلث مال زکوٰۃ کا حصہ بن چکا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ زید پر گزشتہ سالوں نیز اس سال کی (جسمیں قرض واپس لے رہا ہے) زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں اگر عمرو اس قرضہ کا اقرار کر رہا تھا اور زید کو بھی اسکی وصولیابی کی امید تھی تو وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوگی اور اس سال کی بھی جسمیں قرضہ وصول ہوا بشرطیکہ سال کے آخر تک یہ رقم اسکے پاس موجود ہو، ورنہ سال کے آخر میں جتنی رقم موجود ہوگی اسکے مطابق زکوٰۃ نکالے گا اور اگر عمرو زید کے قرضے کا انکاری تھا یا زید کو وصولی کی کوئی توقع نہیں تھی تو ایسی صورت میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب نہیں ہے تشکراً ادا کردیں تو زیادہ بہتر ہے۔

لما فی الشامی:(۲/۲۶۶ طبع سعید)

(ولا فی مال مفقود) وجده بعد سنین (وساقط فی بحر ومغصوب لا بینة علیه ودین جحده المدیون سنین) ولا بینة له علیه (وما أخذ مصادرة ثم وصل الیه بعد سنین لعدم النمو)...(ولو کان الدین علی مقر ملیء أو معسر أو مفلس أو جاحد علیه بینة أو علم به قاض فوصل الی ملکه لزم زکاة ما مضی)

ولما فی الشامی:(۲/۳۰۵ طبع سعید)

(و) اعلم ان الدیون ثلاثة عندالامام قوی ومتوسط وضعیف (فتجب) زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فوراً بل (عند قبض أربعین درهما من الدین) القوی کقرض (وبدل مال تجارة)

ولما فی قاضیخان:(۱/۲۲۲-۲۲۳،طبع قدیمی)

وروایۃ الاصل الدیون ثلاثۃ:دین قوی وھو بدل مال التجارۃ والقرض.....ففی الدین القوی تجب الزکوۃ اذا حال الحول ویتراخی الاداء الی ان یقبض أربعین درھما.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عباد اللہ صوابی

۷صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۳۶

## ﴿مال مستفاد کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی شخص نے تمباکو کی فصل کو(جو کہ رجب کے مہینے میں تیار ہوئی تھی)بیچ کر اسکی رقم سے عشر نکال دیا اور باقی رقم کو اپنے مال کے ساتھ ملا دیا جبکہ اسکا عام معمول رمضان میں سالانہ زکوٰۃ نکالنے کا ہے،اب اس دفعہ رمضان میں مجموعی رقم سے زکوٰۃ نکالے گا یا صرف اس مال سے جس پر پورا سال گزر گیا؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں فصل کی رقم سے عشر ادا کرنے کے باوجود رمضان میں مجموعی مال کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مال کے ہر ہر جزء پر پورا سال گزر جائے۔

لما فی الھدایۃ:(۱/۲۰۹،طبع رحمانیہ)

ومن کان لہ نصاب فاستفاد فی أثناء الحول من جنسہ ضمہ الیہ وزکاہ بہ.

ولما فی فتح القدیر:(۲/۲۰۲،طبع رشیدیہ)

واتفقوا علی ضم ثمن طعام أدی عشرہ ثم باعہ.

ولما فی الشامی:(۲/۲۸۸،طبع سعید)

بخلاف مالو أدی عشر طعام أو أرض أو صدقۃ فطر عبد ثم باع حیث تضم اثمانھا اجماعا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عباد اللہ صوابی

۲۶ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۷۵۷

## ﴿کسی کی طرف سے بغیر اس کی اجازت کے زکوٰۃ ادا کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ کسی شخص نے اپنی ماں سے اجازت لئے بغیر انکی طرف سے زکوٰۃ ادا کردی یا پھر ادا کرنے کے بعد اجازت لے لی تو کیا

ماں کے ذمہ سے فریضہ ساقط ہو گیا کہ نہیں؟ اور اگر اجازت لیکر ادا کردے تو کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں ماں کے ذمہ سے زکوٰۃ کا فریضہ ساقط نہیں ہوا، لہٰذا اس پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، اسی طرح اگر بیٹے نے اپنے ہی مال سے ماں کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد اجازت لے لی تو بھی انکی طرف سے ادائیگی نہیں ہوئی۔

البتہ پہلے سے اجازت لیکر ادا کردے تو اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی، اسی طرح اگر ماں کے مال سے بغیر اس کی اجازت کے زکوٰۃ ادا کردی اور مال ابھی تک فقیر کے ہاتھ میں ہے یعنی خرچ نہیں ہوا کہ ماں نے بھی اجازت دے دی تو ایسی صورت میں بھی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی۔

**لما فی رد المحتار:(۲/۲۶۹،طبع سعید)**

فی البحر:لو أدی زکوۃ غیرہ بغیر أمرہ ،فبلغہ فأجاز لم یجز ،لأنہا وجدت نفاذاً علی المتصدق ، لانہا ملکہ ولم یصر نائبا عن غیرہ ،فنفذت علیہ .....قال فی البحر ولو تصدق عنہ بأمرہ جاز.

**ولما فی البدائع:(۲/۴۱،طبع سعید)**

ولو تصدق عن غیرہ بغیر أمرہ ،فان تصدق بمال نفسہ جازت الصدقۃ عن نفسہ ولاتجوز عن غیرہ وان اجازہ ورضی بہ.

**ولما فی التاتارخانیۃ:(۲/۲۱۴،طبع قدیمی)**

ولو تصدق عن غیرہ بغیر أمرہ جازت الصدقۃ عن نفسہ ولاتجوز عمانوی عنہ وان أجازہ ورضی بہ،وھذا اذا کان المال الذی تصدق بہ مال نفسہ ،فأما اذا کان المال مال المتصدق عنہ فان أجازہ جاز اذا کان المال قائما.

| الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ صوابی |
| --- | --- |
| ۲۷ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۸۰۱ |

## ﴿زکوٰۃ فرض ہونے کیلئے نصاب کا پورا ہونا اور سال گزرنا شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زکوٰۃ شرعاً کتنے تولہ سونا پر واجب ہے اگر کسی عورت کے پاس ساڑھے سات تولہ سے کم سونا ہو مثلاً پانچ یا چار ساڑھے چار تولہ سونا ہو اور پچاس یا سو روپے نقد بھی ہو تو کیا سال پورا ہونے پر اس عورت پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ ہمارے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ سونا جب ساڑھے سات تولہ نہ ہو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اگرچہ سات

تولہ ہو اور کچھ نقدی بھی ہو جسکی وجہ سے پورے گاؤں میں کوئی بھی عورت زکوٰۃ نہیں دیتی۔

﴿جواب﴾ جس شخص کی ذاتی ملکیت میں ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی ہو یا ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر نقد روپے یا سامان تجارت ہو تو ایسا شخص صاحب نصاب کہلاتا ہے، اسی طرح نقد روپے یا سامان تجارت مذکورہ مقدار میں اگر چہ نہیں ہے لیکن کچھ سونا یا چاندی بھی اسکے پاس ہے پھر اکیلے وہ بقدر نصاب اگر چہ نہیں ہے لیکن دونوں یا تینوں چیزوں کو ملا کر مشترک مالیت کم از کم ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جاتی ہے تو اس صورت میں بھی یہ شخص صاحب نصاب قرار پاتا ہے اور چاند کی جس تاریخ میں وہ صاحب نصاب بنا تھا، سال گزرنے کے بعد اسی تاریخ میں بھی وہ صاحب نصاب اگر ہے تو اب اس پر زکوٰۃ فرض ہے کل موجود سونا چاندی نقد روپے اور سامان تجارت کی مارکیٹ ویلیو لگا کر اڑھائی فیصد زکوٰۃ اداء کرنا فرض ہوگا۔

یہ بھی یاد رہے کہ دوران سال مال کم یا زیادہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے بشرطیکہ دوران سال بیلنس زیرو تک نہ پہنچا ہو سال گزرنے کے بعد موجود مال پر زکوٰۃ فرض ہے، لہذا کسی عورت کے پاس سونا اور کچھ نقدی ملا کر مجموعہ مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر اگر ہے تو وہ صاحب نصاب ہوگی اور زکوٰۃ کی تاریخ میں موجود مال پر زکوٰۃ فرض ہوگی ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی بیشک نصاب کے لئے معیار ہے لیکن یہ اس صورت میں جب صرف سونا یا صرف چاندی کسی کے پاس ہو مختلف چیزیں ہوں تو یہ حکم نہیں ہے۔

لمافی الفقه الحنفی وادلته:(۱/۳۳۵دار الكلم الطیب بیروت)

وتجب الزكاة فی المال المستفاد المجانس فی اثناء الحول ويزكيه مع الاصل فالنقدان الذهب والفضة والاوراق النقدية وعروض التجارة جنس واحد فيضم بعضها الى بعض.

ولمافی الفقه الاسلامی:(۲/۱۸۲۸-۱۸۲۰ مطبع رشیدیه)

ويضم عند الجمهور (غير الشافعية) احد النقدين الى الاخر فی تكميل النصاب فيضم الذهب الى الفضة وبالعكس بالقيمة فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها لان مقاصد هما وزكاتهما متفقة فهما كنوعی الجنس الواحد...۔ قال الحنفية الزكاة واجبة فی الحلی للرجال والنساء تبرا كان او سبيكة آنية او غيرها لان الذهب والفضة مال نام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی شکر درہ

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۸۶۵

## ﴿زکوٰۃ ادا کرتے وقت نیت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زکوٰۃ ادا کرتے وقت لینے والے کو یہ بتانا کہ ''میں زکوٰۃ آپ کو دے رہا ہوں ضروری ہے؟ یا نہیں کیا زکوٰۃ کا نام لئے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی؟ جبکہ ہمارے علاقے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ لینے والے کو بتانا ضروری ہے کہ یہ مال زکوٰۃ کا ہے اور لینے والے کو بتائے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی ان کی یہ بات کہاں تک درست ہے؟

مستفتی: عبدالرؤف

﴿جواب﴾ زکوٰۃ لینے والے کو یہ بتانا کوئی ضروری نہیں کہ میں یہ زکوٰۃ آپ کو دے رہا ہوں بغیر بتائے بھی زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے بشرطیکہ دل میں زکوٰۃ دینے کی نیت ہو یا زکوٰۃ کی رقم جو کہ الگ کی گئی تھی، اسی سے دیدیا ہو اور لینے والا مستحق زکوٰۃ ہو تو بتائے بغیر دینا بہتر ہے اور اگر زکوٰۃ دینے والے کو لینے والے کے بارے میں شبہ ہو کہ یہ مستحق زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ تو اس وقت بتانا ضروری ہے تا کہ مستحق نہ ہونے کی صورت میں زکوٰۃ لینے سے انکار کردے۔

لما في الدر المختار: (۲/۱۸۷، طبع سعید)

وشرط صحة أدائها نية مقارنة له. (قوله نية) أشار أنه لا اعتبار للتسمية فلو سماها هبة تجزيه في الأصح.

ولما في الهداية: (۱/۱۸۸ طبع رحمانيه)

ولا يجوز أداء الزكوة الا بنية مقارنة للأداء أو مقارنة لعزل مقدار الواجب لأن الزكوة عبادة فكان من شرطها النية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ     واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ     فتویٰ نمبر: ۱۵۹

## ﴿کونسے مستحق کو زکوٰۃ دینا بہتر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ایک شخص صرف ''مستحق زکوٰۃ'' ہے اس پر کوئی قرضہ نہیں دوسرا شخص ''مستحق زکوٰۃ'' بھی ہے اور قرضدار بھی ہے تو ان میں سے کس کو زکوٰۃ دینا بہتر ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں دونوں میں سے کسی بھی شخص کو ''زکوٰۃ'' دی جائے تو ادا ہو

جائے گی کیونکہ دونوں ''مستحق زکوٰۃ'' ہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ وہ ''مستحق زکوٰۃ'' جو قرضدار ہے اس کو دی جائے کیونکہ وہ زیادہ محتاج ہے۔

لمافی الدرالمختار:(۲/۲۸۹،طبع امدادیہ)

وفی الظهيرية: الدفع للمديون اولىٰ منه للفقير.قوله اولىٰ من الدفع للفقير الغير المديون لزيادة احتياجه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۲۸

## ﴿زیورات استعمال میں ہوں یا نہ ہوں مقدار نصاب میں زکوٰۃ واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو زیور عورتیں ہر وقت پہنے رہتی ہیں ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہے یا صرف گھر میں رکھے ہوئے زیور پر واجب ہے؟

﴿جواب﴾ زیورات عورتوں کے استعمال میں ہوں یا ویسے رکھے ہوں تو ان میں بہر صورت زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ وہ عورت صاحب نصاب ہو کیونکہ سونا چاندی خلقۃً ثمن ہیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۹۸،طبع سعید)

مبتدأ(فی مضروب کل)منهما(ومعموله ولو تبراأو حليامطلقا)مباح الاستعمال أولا ولو للتجمل والنفقة،لانهماخلقااثمانافی زکیهماکیف کانا.

ولمافی الهندية:(۱/۱۷۸،طبع رشيديه)

تجب فی کل مائتی درهم خمسة دراهم وفی کل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروباکان أولم يكن مصوغاأوغيرمصوغ حلياكان للرجال أوللنساء تبراكان سبيكة كذافی الخلاصة.

ولماالجوهرة النيرة:(ص۱۵۷،طبع میرمحمد)

سواء كانت الفضة مضروبة أوغيرمضروبة أوحلياقيجمع ما فی ملكه منهامن الدراهم والخواتيم وحلية السيف واللجام والسرج والكواكب فی المصحف والأوانی والمسامير المركبة فی السكاكين والاسورة والدماليج والخلاخيل وغيرذلک فان بلغت كلهاوزن مائتی درهم فيها خمسة دراهم والافلا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۳۰ صفر ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر ۱۹۵۴

## ﴿زکوٰۃ کی ادائیگی تب ہوگی جب کسی کی ملکیت وقبضہ میں دی جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زکوٰۃ کی مد سے مدرسہ کی عمارت بنائی جائے تو زکوٰۃ اُدا ہوجائے گی یا نہیں؟ مستفتی: عبدالوحید

﴿جواب﴾ زکوٰۃ صحیح ادا ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ مال زکوٰۃ باقاعدہ کسی کی ملک وقبضہ میں دیا جائے جب تک مستحق کو باقاعدہ مالک وقابض نہ بنایا جائے تو زکوٰۃ اُداء نہیں ہوتی، لہٰذا زکوٰۃ کی رقم مدرسہ کی تعمیر میں اگر براہ راست خرچ ہوتی ہے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اس لئے کہ مدرسہ بذات خود کوئی مستحق انسان نہیں ہے۔

البتہ طلبا اگر مستحق ہیں ان کو باقاعدہ مالک وقابض بنا کر زکوٰۃ دی جائے پھر وہ اپنی خوشی سے مدرسہ کی تعمیر میں خرچ کرنے کی اجازت دیں تو اس طرح کرنے کی گنجائش ہے زکوٰۃ ادا ہوجائیگی۔

لمافی التنویر مع الدر: (۲/۳۴۴، طبع سعید)

(لا) یصرف (الی بناء) نحو مسجد. وفی الشامیة: (قوله نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانهار والحج والجهاد وکل مالا تملیک فیه.

ولمافی الهندیة: (۱/۱۸۸ طبع رشیدیه)

ولا یجوز أن یبنی بالزکوٰة المسجد وکذا القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الانهار والحج والجهاد وکل ما لا تملیک فیه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۰۲

## ﴿تعجیل (ایڈوانس) زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک دکاندار نے زکوٰۃ ادا کرنے کیلئے دکان میں موجودہ سامان کا اندازہ لگایا مثلاً دو لاکھ روپے کا سامان ہے، اب اس نے احتیاطاً سوا دو لاکھ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کردی بعد میں یقینی طور پر معلوم ہوا کہ سامان دو لاکھ کا ہے تو یہ زیادتی کس مد میں شمار ہوگی؟ مستفتی: عبدالحسیب فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ شروع میں یہ دکاندار اپنا مال سوا دو لاکھ سمجھ رہا تھا اور اپنے علم کے مطابق سوا دو

لاکھ مال کی زکوٰۃ ادا کی لیکن بعد میں یقینی طور پر معلوم ہوا کہ کل مال صرف دو لاکھ کا تھا تو ایسی صورت میں اضافی زکوٰۃ آنے والے سال کی زکوٰۃ میں شمار کر سکتا ہے اور اگر احتیاطاً زیادہ ادا کر دیا ہے تو اضافی اداشدہ زکوٰۃ نفلی صدقہ شمار ہوگا۔

لمافی ردالمحتار:(۲/۲۹۳،طبع سعید)

لوكان عنده اربعمائة درهم فادى زكوة خمسمائة ظانا انها كذلك كان له ان يحسب الزيادة للسنة الثانية.

ولمافي الهندية:(۱/۱۷۶،طبع رشيديه)

رجل له اربعمائة درهم وظن ان عنده خمسمائة فادى زكوة خمسمائة ثم علم فله ان يحسب الزيادة للسنة الثانية.

ولمافي البدائع:(۲/۵۲،طبع سعيد)

واما حكم المعجل اذا لم يقع زكاة انه ان وصل الى يد الفقير يكون تطوعا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۲۸صفر ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر:۴۳۵۴

## ﴿زکوٰۃ سے بچنے کیلئے حیلے اختیار کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ ہمارے ہاں لوگوں میں یہ رواج ہے کہ زکوٰۃ سے بچنے کیلئے مختلف حیلے کرتے ہیں:

مثلاً ایک آدمی کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں، اس نے سال گزرنے سے پہلے اس پر ٹرک خریدا جسکی قیمت دس لاکھ تھی، اب پانچ لاکھ اس کے ذمے دین (قرض) ہو گیا یہ آدمی اس ٹرک کیلئے ڈرائیور تنخواہ پر رکھتا ہے اور اس ٹرک سے کمائی کرتا ہے سال کے آخر میں یہ آدمی لاکھوں کا مالک بن جاتا ہے، اب دوبارہ سال گزرنے سے پہلے یہ ٹرک کا قرضہ بھی ادا کرتا ہے اور باقی رقم سے دوسرا ٹرک کمائی کیلئے خریدتا ہے، کیا مذکورہ آدمی پر زکوٰۃ فرض نہیں؟ جبکہ یہ کروڑوں کا مالک ہوتا ہے۔

﴿جواب﴾ مذکورہ ترتیب اختیار کرنے سے اپنے کاروبار کو ترقی دینا اگر مقصود ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر مقصد زکوٰۃ واجب ہونے سے فرار کا راستہ اختیار کرنا ہو تو بخل ہے اور بہت بری سوچ ہے، تاہم سال گزرنے سے پہلے اس کے پاس بقدر نصاب قابل زکوٰۃ مال اگر نہ رہے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اگرچہ نا قابل زکوٰۃ مال کروڑوں کی مقدار میں اس کے پاس ہو۔

لما فی الهندیة:(۶/۳۹۱،کتاب الحیل،طبع رشیدیه)

قال الشمس الائمة الحلوانی "کرهها محمدؒ، ومشایخنا رحمهم الله اخذوا بقول محمد دفعا للضرر عن الفقراء ومثله فی الاشباه والنظائر.

ولما فی التنویر:(۲/۲۵۹،طبع سعید)

وسببه ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد ......وفارغ عن حوائجه الاصلیة وشرطه حولان الحول.

ولما فیه ایضا:(۲/۳۰۲،طبع سعید)

شرط کمال النصاب فی طرفی الحول فلا یضر نقصانه بینهما.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:عبیداللہ عابدویردی

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۰۰۴

## ﴿کیا نصاب سے کم سونے میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی کے پاس تقریباً تین تولہ سونا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ اگر کسی کے پاس ایک تولہ سونا ہو تو اس پر زکوٰۃ ہے یا پانچ ہزار روپے ہوں مسئلہ کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟　　　　مستفتیہ:اہلیہ محمد شعیب کورنگی

﴿جواب﴾ اگر آپ کے پاس تین تولہ سونا اور کچھ چاندی یا تھوڑی بہت رقم ہے جو کہ ملا کر چاندی کے نصاب کے برابر پہنچتی ہو تو آپ صاحب نصاب شمار ہونگی آپ پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر صرف ایک تولہ سونا ہے اور چاندی یا رقم بالکل بھی نہیں ہے یا صرف پانچ ہزار روپے ہیں سونا چاندی بالکل بھی نہیں ہے تو آپ صاحب نصاب شمار نہ ہونگی کیونکہ پانچ ہزار روپے موجودہ دور میں کسی بھی نصاب کے برابر نہیں۔

لما فی تنویر الابصار وشرحه:(۲/۳۰۳،طبع سعید)

(و)یضم(الذهب الی الفضة)وعکسه بجامع الثمنیه (قیمة)ای عند الاجتماعی اما عند انفراد احدهما فلا تعتبر القیمة اجماعا بدائع لان المعتبر وزنه اداء ووجوبا کما مر فی البدائع ایضا الضم ما ذکر من وجوب انضم ان اذا لم یکن کل واحد منهما نصابا بان کان اقل فلو کان کل واحد منهما نصابا تاما بدون زیادہ لاتجب الضم بل ینبغی ان یؤدی من کل واحد زکاته الخ.

ولما فی الهندية:(۱/۱۷۹،طبع رشيديه)

وتضم قيمه العروض الى الثمنين والذهب الى الفضة قيمة كذا فى الكنزالخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
۲۶ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ

واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام
فتویٰ نمبر: ۲۳۶۷

## ﴿زکوٰۃ کو بطور عیدی دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے موقع پر زکوٰۃ کو عیدی کے طور پر اگر کسی کو دی جائے تو اس طرح کرنے سے زکوٰۃ پر کچھ اثر پڑیگا یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے امام صاحب کہتے ہیں کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی دوبارہ ادا کرنا ہوگی۔ مستفتی: امین اللہ

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی کا مدار نیت پر ہے، دینے والے نے زکوٰۃ کی نیت سے اگر دی ہے اور وہ شخص واقعی زکوٰۃ کا مستحق بھی ہے تو زکوٰۃ ادا ہوگئی ہے، زبان سے عیدی، تحفہ، وغیرہ کچھ بھی بولدیا ہو تو فرق نہیں پڑتا۔

لما فی الدر المختار:(۲/۳۵۶،طبع سعيد)

دفع الزكاة فى صبيان أقاربه برسم عيدأوالى مبشرلومهدى الباكورجاز وفى الشامية قوله:(دفع الزكاة الىٰ صبيان اقاربه)أى العقلاء والافلايصح الابالدفع الىٰ ولى الصغير.

ولمافى البزازية بهامش الهندية:(۲/۸۶،طبع رشيديه)

ولونوى الزكاة فيمايدفعه الىٰ صبيان اقاربه عيداأولمن يهدى اليه الباكورة أويبشره بقدوم صديقه يجوز.وكذافى الهندية:(۱/۱۹۰،طبع رشيديه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
۲۶ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ

واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی
فتویٰ نمبر: ۱۹۴۱

## ﴿مرتد پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ مسلم غنى ذهب الى الروس وتزوج بكافرة وارتد العياذ بالله ثم نلم بعد ثلاث سنين واسلم فهل يجب عليه اداء زكاة سنين التى كان مرتدا فيها؟

﴿جواب﴾ الزكاة عبادة والمرتد ليس من أهل العبادة فلا يجب عليه الزكاة حال ارتداده كالكافر لعدم كونه مخاطبا به ولا بعد ان تاب واسلم لانه لم يجب بعد

ولو اداها توبة و كفارة لكان اولى.

لما فى البدائع:(۲/۲،مذكر الشروط،طبع سعيد)

ومنها اسلامه حتى لا تجب على الكافر ثم قال:.....واما المرتد فكذلك عندنا حتى اذا مضى عليه الحول وهو مرتد فلا زكاة عليه حتى لا يجب عليه ادائها اذا اسلم.

ولما فى الرد:(۲/۲۵۹،طبع سعيد)

فلو اسلم المرتد لا يخاطب بشيء من العبادات أيام ردته.

ولما فى صحيح البخارى:(۲/۶۳۱،طبع رحمانيه)

قال كعب بن مالك لما تاب الله عليه حين كان تخلف عن غزوة تبوك "يا رسول الله ان من توبتي ان انخلع من مالي صدقة الى الله والى رسوله.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب :محمد سلمہ

۴ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر:۲۱۳۳

## ﴿پورا مال صدقہ کرنے سے زکوٰۃ خود بخود اداء ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک شخص کے پاس نقد روپے اتنے تھے کہ وہ صاحب نصاب تھا، سال پورا ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ فرض ہوگئی تھی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے پہلے تمام نقد روپے اس نے صدقہ کر دیئے تو کیا اسکے ذمہ سے زکوٰۃ ساقط ہوگئی ہے یا دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے، واضح رہے کہ قابل زکوٰۃ مال اسکے علاوہ اسکے پاس کچھ نہیں رہا۔

﴿جواب﴾ زکوٰۃ اداء کرنے سے پہلے پورا مال صدقہ کرنے کی وجہ سے زکوٰۃ کی نیت خود بخود متعین ہو جاتی ہے، صورت مذکورہ میں اس شخص کے ذمہ سے زکوٰۃ ساقط ہوگئی ہے دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

لما فى الهداية:(۱/۲۰۳،طبع رحمانيه)

ومن تصدق بجميع ماله لا ينوى الزكاة سقط فرضها عنه استحسانا لان الواجب جزء منه فكان متعينا فيه فلا حاجة الى التعين.

ولما فى فتح القدير:(۲/۱۶۹،طبع رشيديه)

(قوله سقط فرضها عنه) بشرط ان لا ينوى بها واجبا آخر من نذر وغيره سواء نوى النفل اولم تحضره النية.

ولما فى الخلاصة:(۱/۲۴۲،طبع رشيديه)

وان وهب الكل ولم ينو شيئا اونوى التطوع يسقط عنه زكوٰة الكل.

ولما فی الهندیة: (۱۷۱/۱ طبع رشیدیه)

ومن تصدق بجمیع نصابه ولا ینوی الزکاة سقط فرضها وهذا استحسان کذا فی الزاهدی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: افتخار احمد کلکتی

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۴۵

## ﴿بغیر اجازت امانت سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے اپنے پیسے بکر کے پاس امانت رکھوائے تھے سال پورا ہونے پر بکر نے اصل مالک یعنی زید کی اجازت کے بغیر اسکے پیسوں میں سے زکوٰۃ نکال کر کسی مستحق کو دے دی اور بعد میں زید کو اطلاع کر دی کہ میں نے آپ کے پیسوں میں سے زکوٰۃ نکال کر فلاں شخص کو دے دی ہے، اس وقت زید نے بھی زکوٰۃ کی نیت کی تو کیا اس طرح بعد میں نیت کرنے سے زکوٰۃ اداء ہو جاتی ہے؟ اور کیا زید دوبارہ زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اصل مالک یعنی زید نے زکوٰۃ کی نیت اس وقت کی جب پیسے فقیر کی ملک میں موجود تھے ابھی تک خرچ نہیں کئے تھے تو زکوٰۃ ادا ہو گئی ہے، دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر زید نے نیت فقیر کے خرچ کرنے کے بعد کی ہو تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

لما فی الهندیة: (۱۷۱/۱ طبع رشیدیه)

رجل ادی زکاة غیره عن مال ذالک الغیر فاجاز المالک فان کان المال قائما فی ید الفقیر جاز والا فلا کذا فی السراجیة.

ولما فی الدر مع الرد: (۲۶۸/۲ طبع سعید)

وشرط صحة ادائها نیة مقارنة له ای للاداء ولو کانت المقارنة حکما کما لو دفع بلا نیة ثم نوی والمال قائم فی ید الفقیر (المال قائم فی ید الفقیر) بخلاف ما اذا نوی بعد هلاکه. بحر. وظاهره ان المراد بقیام فی ید الفقیر بقاؤه فی ملکه لا الید الحقیقة وان النیة تجزیه مادام فی ملک الفقیر ولو بعد ایام.

ولما فی الخلاصة: (۲۳۲/۱ طبع رشیدیه)

اذا وقع المال الی الفقیر ولم ینو شیئا ثم حضرته النیة عن الزکوٰة ینظر ان کان المال قائم فی ید الفقیر جاز عن الزکوٰة وان تلف لم یجز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ سبحانہ اعلم: افتخار احمد کلکتی

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۴۴

## ﴿بغیر اجازت والد کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کا والد صاحب نصاب ہے لیکن پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، زید جو کہ اپنے والد کا کاروبار میں معاون ہے، یہ چاہتا ہے کہ اپنے والد کے مال سے زکوۃ ادا کرے انہیں بتائے بغیر، کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں زید پر نہیں بلکہ اس کے والد پر زکوٰۃ فرض ہے، جس کی ادائیگی کے لئے والد ہی کی نیت شرط ہے، اس لئے والد کی اجازت کے بغیر زید کے ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، زید کو چاہیے کہ کسی طرح اپنے والد صاحب پر محنت کر کے اس حکم کی تعمیل کے لئے آمادہ کرے۔

ایک ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سال کے آخر میں زید حساب کر کے زکوٰۃ کی رقم الگ رکھ چھوڑیں اور والد کو بتادیں کہ زکوٰۃ کی رقم الگ کر لی ہے، وہ انکار نہ کریں تو یہ بھی اجازت اور نیت شمار ہوگی، زید بعد میں ادا کرتا رہے۔

لمافی التنویر:(٢/٢٨٢ طبع سعید) السکوت کالنطق فی مسائل عدمنها سبعة وثلاثين.

وفی الشامیة: مطلب المواضع التی یکون فیہا السکوت کالقول ...... سکوت المولی حین رای عبده یبیع و یشتری اذن فی التجارة: ای فیما بعد ذلک التصرف لا فیه.

ولمافی المبسوط لشمس الدین السرخسی:(١٣ جزء، ج ٢٥ ص ٣٥، بیروت)

فقال السکوت عن النهی مع التمکین من النهی دلیل الرضی فاما بدون التمکن من النهی فلا یکون دلیل الرضی.

غالب گمان ہو کہ ادا کرنے کے بعد والد اجازت دے دیں گے تو زید مستحق کو زکوٰۃ دے کر والد کو بتادیں کہ زکوٰۃ ادا کردی، اب اگر وہ مال ابھی تک فقیر کے پاس موجود ہے خرچ نہیں کیا ہے تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی بشرطیکہ والد انکار نہ کریں۔

لمافی التنویر مع الدر:(٢/٢٦٨، طبع سعید)

(وشرط صحة ادائها نیة مقارنة له): ای للاداء (ولو) کانت المقارنة (حکما) کما لو دفع بلانیة ثم نوی والمال قائم فی ید الفقیر.

ولمافی الهندیة:(١/١٧١، طبع رشیدیه)

رجل ادی زکوة غیره عن مال ذلک الغیر فاجازه المالک فان کان المال قائما فی ید

الفقیر جاز والافلا کذافی السراجیہ.

ولمافی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص۷۱۵،طبع قدیمی)

وشرط صحۃ ادائہانیۃ مقارنۃ لادائہاللفقیراووکیلہ اولعزل ماوجب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدابخش

۲۶ صفرالخیر۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۴۵۱

## ﴿زکوٰۃ اورعشر میں قیمت اداکرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس بقدر نصاب مال تجارت ہے یااسکوزمین سے پیداوار حاصل ہوئی، پوچھنا یہ ہے کہ اسی جنس سے زکوٰۃ اداکرناضروری ہے یااسکی قیمت مقررکرکےاتنی رقم اداکرنے سے بھی زکوٰۃ اداہوجاتی ہے؟

﴿جواب﴾ اسی مال کی جنس سے زکوٰۃ یاعشراداکرناضروری نہیں بلکہ جتنامال بطورزکوٰۃ یاعشر واجب ہواہےاسکی قیمت مقررکرکےاتنی رقم مستحق کودینے سے بھی زکوٰۃ بلاشبہ اداہوجائے گی۔

لمافی الدرالمختار:(۲۱۰/۲،طبع امدادیہ)

وجازدفع القیمۃ فی زکوٰۃ وعشر وخراج وفطرۃ ونذر وکفارۃ غیر الاعتاق.

ولمافی الھدایۃ:(۱۹۲/۱،طبع رحمانیہ)

ویجوز دفع القیمۃ فی الزکوٰۃ عندنا وکذا فی الکفارات و صدقۃ الفطر والعشر والنذر ......ولناان الامر بالاداء الی الفقیرایصال الرزق الموعود الیہ فیکون ابطالا بقید الشاۃ فصار کالجزیۃ.

ولمافی فقہ الاسلامی:(۱۹۲۸/۲،طبع رشیدیہ)

قال الحنفیۃتفریعاعلی مبدنھم:أن الواجب فی الزکوٰۃجزء من النصاب اماصورۃ ومعنی امامعنی فقط،یجوزدفع القیمۃفی الزکوٰۃوکذافی العشروالخراج وزکاۃالفطر والنذروالکفارۃغیر الاعتاق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفااللہ عنہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۳۶۲

## ﴿مال زکوٰۃ سے صرف ایسے حقوق منہا کئے جائیں جنکا بندوں کیطرف سے مطالبہ ہو﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص جوکہ صاحب نصاب

ہےاس نے بیماری کی حالت میں نذر مانی کہ اگر اللہ نے مجھے صحت دی تو میں آئندہ سال حج کے لئے جاؤنگا، چنانچہ صحت یابی کے بعد اس نے سفر حج کے اخراجات الگ کیے تو اس کی باقی مالیت اتنی نہیں رہی جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچے تو کیا ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

﴿جواب﴾ ادائیگی زکوٰۃ کیلئے چاند کی تاریخ کے حساب سے سال بھر میں ایک تاریخ مقرر ہوتی ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس روز قابل زکوٰۃ مال کے مجموعہ سے ایسے قرضے جنکا بندوں کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے منہا کئے جانے کے بعد بھی بقدر نصاب یا اس سے زیادہ باقی رہے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، نصاب سے کم رہ جائے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

حج ویسے واجب ہو یا نذر کی وجہ سے اسی طرح کفارہ یا صدقہ فطر وغیرہ اگرچہ واجب الاداء ہیں لیکن بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ادا کرنے کا حکم ہوتا ہے، اسلئے ایسے حقوق زکوٰۃ کی خاص تاریخ آنے سے پہلے ادا کر لئے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لیکن تاریخ آنے تک مال اپنے پاس رکھے تو باقی قرضوں کی طرح مجموعہ سے ان قرضوں کا منہا کرنا جائز نہیں ہے، پورے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے۔

لمافی خلاصة الفتاوی:(۱/۲۴۰،طبع رشیدیه)

وكل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكوة سواء كان الدين لله تعالى كالزكوة والعشر والخراج اوالدين للعباد كالثمن والأجرة والنفقة الزوجات والمحارم وكل دين لا مطالب له من جهة العباد كالنذر والكفارة والحج لايمنع وجوب الزكوة.

ولمافی الشامی:(۲/۱۷۷طبع امدادیه)

بخلاف دين نذر وكفارة وحج لعدم المطالب:اى كما اذا كان له مأتادرهم ونذران يتصدق بمائة منها فاذا حال الحول عليها تلزمه زكوتها ويسقط النذر بقدر درهمين ونصف لانه استحق بجهة الزكوة فيبطل النذر فيه ويتصدق بباقى المائة.

ولمافی الهندیة:(۱/۱۷۳،طبع رشیدیه)

وكل دين لامطالب له من جهة العباد كديون الله تعالىٰ من النذر والكفارات وصدقة الفطر ووجوب الحج لا يمنع كذا فى محيط السرخسى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ سبحانہ اعلم: افتخار احمد کلکتی

۲۰/۲/۱۴۳۰ھ

فتوی نمبر: ۱۹۳۹

## ﴿زکوٰۃ کی ادائیگی میں قرض کو منہا کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے پاس پچاس ہزار روپے کے زیورات ہیں اور دس ہزار روپے کا وہ مقروض بھی ہے تو کیا اس صورت میں وہ پچاس ہزار روپے سے زکوٰۃ دیگا یا قرض منہا کر کے چالیس ہزار روپے کا زکوٰۃ دیگا؟

﴿جواب﴾ اس آدمی کی ملکیت میں اگر صرف پچاس ہزار روپے کے زیورات ہیں اس کے علاوہ نقد روپے یا سامان تجارت وغیرہ نہیں ہے تو دس ہزار یعنی بقدر قرض جو اسکے ذمے ہے منہا کر کے باقی چالیس ہزار کی زکوٰۃ ادا کرے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۵۹/۲-۲۶۷،طبع سعید)

(سببه)ای سبب افتراضها(ملک نصاب حولی)......(تام)فارغ عن الدین له مطالب (من جهة العباد)سواء کان لله کزکوٰة وخراج......(وسبب لزوم ادائها توجه الخطاب) یعنی قوله تعالیٰ:واٰتوا الزکوٰة وشرطه ای شرط افتراض ادائها(حولان الحول)وهو فی ملکه(وثمنیة المال کالدراهم والدنانیر)لتعینها للتجارة باصل الخلقة فتلزم الزکوٰة کیفما امسکهما ولو للنفقة.

ولمافی الهندیة:(۱۷۲/۱،طبع رشیدیه)

منها الفراغ عن الدین قال اصحابنا کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکوٰة.

ولمافی البدائع:(۶/۲،طبع سعید)

ومنها ان لا یکون علیه دین مطالب به من جهة العباد عندنا فان کان فانه یمنع وجوب الزکوٰة بقدره حالا کان او مؤجلا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۴۸۲

## ﴿ادائیگی عشر کے بعد پیداوار کی قیمت پر وجوب زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک زمیندار کے پاس پہلے سے اتنی نقدی موجود ہے جو کہ قابل زکوۃ ہے، نیز اسکی زمین سے جو فصل حاصل ہوئی اس نے اسکا عشر بھی ادا کر دیا اور اس کے بعد اس فصل کو بیچ دیا، پوچھنا یہ ہے کہ فصل کی یہ رقم اس کے پاس پہلے سے موجود رقم کیساتھ ضم کی جائیگی تا کہ دونوں سے زکوۃ ادا ہو سکے یا اس رقم پر زکوۃ واجب نہیں ہے؟ ایک عالم نے بتایا کہ ایک چیز پر ایک وقت میں دو وظیفے نہیں ہو سکتے کہ دوران سال عشر اور

زکوٰۃ دونوں ادا کرے، آیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ مستفتی: حامد علی کلابٹ

﴿جواب﴾ بتانے والے عالم صاحب کی بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ ایک چیز پر ایک وقت میں دو وظیفے نہیں ہو سکتے لیکن مسئولہ صورت میں یہ نقد روپے اگر چہ غلہ سے حاصل ہوئے ہیں لیکن غلہ تو نہیں ہے، ہاں زمین سے حاصل شدہ غلہ اپنی صورت میں رہے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نہیں ہے خواہ پڑے پڑے کئی سال گذر جائیں، اسلئے کہ ایک ہی چیز پر دو وظیفے لازم نہیں ہوتے، بیچنے کی صورت میں نقد روپوں کا اب حکم غلہ کا نہیں رہا، نقد روپے غلہ سے حاصل ہو یا کسی بھی ذریعہ سے ملکیت میں آجائیں زکوٰۃ کی تاریخ میں تمام رقوم سے زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے خواہ ایک ہی روز پہلے ملکیت میں کوئی رقم آئی ہو ہر ایک مال پر پورا سال گذرنا کوئی ضروری نہیں ہے، صاحب نصاب اپنی تاریخ میں تمام اموال زکوٰۃ سے زکوٰۃ ادا کریگا۔

لما فی فتح القدیر:(۲/۲۰۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

واتفقوا علی ضم ثمن طعام أدی عشره ثم باعه وثمن ارض معشورة وثمن عبد أدی صدقة فطره، اما عندهما فظاهر واما عنده فلان البدل لیس بدلا لمال الزکوٰة.

ولمافی البحر:(۲/۲۲۳،طبع سعید)

وکذا لو جعل العبد المؤدی زکاته للخدمة ثم باعه یضم ثمنه الی ماعنده ولو أدی صدقة الفطر عن عبد الخدمة او أدی عشر طعامه ثم باعه ضم ثمنه الی ماعنده.....والعشر انما یجب بسبب ارض نامیة لا بالخارج.

ولمافی ردالمحتار:(۲/۲۸۸،طبع سعید)

بخلاف مالو أدی عشر طعام اوارض اوصدقة فطر عبد ثم باع حیث تضم اثمانها اجماعا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۲۷

## ﴿پوری زکوٰۃ ایک شخص کو دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک رشتہ دار ہے وہ بہت غریب ہے اور کمانے وغیرہ سے تقریباً عاجز ہے، اور مریض بھی ہے، میں پوری زکوٰۃ اس کو دے سکتا ہوں؟ بینوا توجروا۔ سائل: کفایت اللہ

﴿جواب﴾ رشتہ دار اگر زکوٰۃ کا مستحق ہے تو اس کو دینے میں زیادہ ثواب ہے، البتہ یکشت اتنی رقم نہ دیں کہ وہ فقیر یا مسکین صاحب نصاب ہو جائے، اس کو پوری زکوٰۃ دینے کا طریقہ یہ

ہے کہ کچھ رقم دے دیں، جب وہ خرچ ہو جائے تو مزید دیں۔

البتہ اگر وہ عیال دار بھی ہے تو بیک وقت اتنی رقم دے سکتے ہیں کہ کل افراد پر تقسیم کی جائے تو کسی کے پاس بھی نصاب پورا نہ ہو، اسی طرح اگر وہ مدیون یا مقروض ہے تو بھی بقدر دین اور قرض کے اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

لمافی البدائع:(۴۸/۲،طبع سعید)

ویکره لمن علیه الزكاة ان یعطی فقیرا مائتی درهم أو أكثر ولوأعطی جاز وسقط عنه الزكاة فی قول اصحابنا الثلاثة...... فان كان، علیه دین فلا بأس بأن یتصدق علیه قدر دینه وزیادة مادون المائتین وكذا اذاكان له عیال یحتاج نفقتهم وكسوتهم.

ولمافی النهر الفائق:(۴۶۸/۱،باب المصرف،طبع قدیمی)

(وكره الاغناء) بان یدفع الی فقیر مابه یصیر غنیا بأن یعطیه نصابا أو یكمله له حتی لو كان له مائة وتسعة وتسعون درهما فاعطاه درهما كره أیضا كمافی الظهیریه، والظاهر أنه لافرق فی ذلک النصاب بین كونه نام أو لاحتی لو أعطاه عروضا تبلغ نصابا فكذلک ولابین كونه من النقود أومن الحیوانات حتی لوأعطی له خمس من الابل لم تبلغ قیمتها نصابا كره لما مر ولوأعطی مدیونا أكثر من نصاب لایفضل له بعده نصاب أوكان له عیال بحیث لو وزع المعطی له علیهم لایصیب كل واحد نصاباً لم یكره وانماكره مع مقارنة الغنی للاداء فقط لانه حالة التملیک فقیر وذلک انمایحصل بعد تمامه.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۱۰۱

## ﴿حقیقی بہن، بھائی اور داماد کو زکوٰۃ دینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اپنے حقیقی بہن، بھائی اور داماد کو صدقۂ فطر، زکوٰۃ، نماز اور روزے کا فدیہ وغیرہ صدقات دینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ صرف اصول وفروع یعنی اوپر، نیچے والوں کو نہیں دی جاسکتی۔ بہن، بھائی اطراف میں ہیں انکو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور داماد کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے بلکہ ایسے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینے میں زیادہ ثواب ہے بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوں۔

لمافی الشامی:(۳۵۳/۲،طبع سعید)

عن أبی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه مرفوعاً الی النبی ﷺ انه قال " یا امة محمد" والذی بعثنی

بالحق لا يقبل الله صدقة من رجل وله قرابة محتاجون الى صلته ويصرفها الى غيرهم والذى نفسى بيده لا ينظر الله اليه يوم القيامة... وفى القريب جمع بين الصلة، والصدقة وفى القهستانى: والأفضل إخوته وأخواته ثم أولادهم ثم أعمامه وعماته ثم أخواله وخالاته.

ولما فى الهندية: (۱/۱۹۰، طبع رشيديه)

والافضل فى الزكاة والفطر والنذور الصرف أز لا الى الاخوة والاخوات ثم الى أولادهم ثم الى الاعمام والعمات.

ولما فى البحر الرائق: (۲/۲۵۶، طبع سعيد)

ان الافضل صرف الزكاتين يعنى زكاة المال وصدقة الفطر الى أحد هؤلاء السبعة الاول اخوته الفقراء وأخواته ثم الى أولاد اخوته وأخواته المسلمين ثم الى أعمامه الفقراء ثم الى أخواله وخالاته.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۳۰ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۶۷

## ﴿لا زكاة فى العروض الا بنية التجارة﴾

## ﴿جو سامان تجارت کے لیے ہو اس پر زکوٰۃ آئے گی﴾

﴿سوال﴾ زید خانی خرید علاوہ از خانی ء کہ رھائش پزیر است. نہ بقصد تجارت مستقلا کسی در این خانہ رھائش پزیر نیست، البتہ دور یک سال چند بار خود صاحب خانہ یا کسی قریب او بآن خانہ رفتہ دو سی روزی رہائش اختیار می کنند آیا در خانی مذکورہ زکات واجب می شود؟

﴿جواب﴾ چون کہ برای وجوب زکات مالی نامی بودن شرط است، و خانہ عروض است بہ ذات خود نامی نیست و نیت تجارت ھم نہ کردہ است تا کہ در حکم مالی نامی شمار شود، لہٰذا در خانیٔ مذکورہ زکات واجب نہ می شود۔

لما فى الفقه الاسلامى: (۲/۱۸۶۹، ذكر العروض طبع رشيديه)

والحنفية اشترطوا اربع شروط (ثم قال) والثالث نية التجارة مصحوبة بعمل التجارة فعلا لان مجرد النية لا يكفى.

ولما فى الدر مع الرد: (۲/۲۷۳، طبع سعيد)

والأصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد جان

۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۲۴

## ﴿عدم وجوب الزکوٰۃ فی المال الحرام﴾

## ﴿مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ هل يجب الزكاة في المال الحرام، ومن جمع مالا حراما لم لم ما يفعل بما عنده من الحرام؟

مستفتی: اسکندر

﴿جواب﴾ لايقبل الله تعالى الزكاة من المال الحرام ويجب رده الى مالكه أو الى ورثته، فان لم يعلمهم يتصدقه من جانب مالكه.

لما في رد المحتار: (۲/۲۹۱، طبع سعيد)

قلت لكن قدمنا عن القنية والبزازية أن ما وجب التصدق بكله لا يفيد التصدق ببعضه لان المغصوب ان علمت اصحابه أو ورثتهم وجب رده عليهم والا وجب التصدق به.

ولما في البزازية بهامش الهندية: (۲/۸۶، طبع رشيديه)

ولو بلغ المال الخبيث نصابا لا يجب فيه الزكاة لان الكل واجب التصدق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد جان

۲۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۸۱

## ﴿قسطوں پر کوئی چیز فروخت کرنا اور اس پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک گاڑی تین لاکھ روپے میں خریدی اور پھر اسکو پانچ لاکھ روپے میں قسطوں پر اس طرح فروخت کیا کہ یہ دوسرا خریدار ہر سال پچاس ہزار روپے بطور قسط ادا کریگا تو کیا اس طرح قسطوں پر بیچنے کی صورت میں زکوٰۃ مجموعی رقم پر آئیگی یا جب بھی قسط وصول ہو جائے؟

مستفتی: وقار علی مردان

﴿جواب﴾ ہر قسط کی وصولی کے بعد اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

ولما في التنوير مع الدر: (۲/۳۰۵، طبع سعيد)

(فتجب) زكاتها اذا تم نصابا وحال الحول لكن لا فورا بل (عند قبض أربعين درهما من الدين) القوي كقرض (وبدل مال تجارة) فكلما قبض أربعين درهما يلزمه درهم.

ولما في خلاصة الفتاوى: (۱/۲۳۸، طبع رشيديه)

الديون على ثلاثة مراتب قوي كالقرض وبدل مال التجارة وفيهما الزكاة وانما يخاطب بالاداء

اذاقبض اربعین منها فاذاقبض الاربعین یخاطب باداء درهم وكذافيما زادبأداء درهم بحسابه.

ولمافی المبسوط:(۲/۱۹۵،طبع دار المعرفةبیروت)

فـفـي الـديـن الـقـوي لايـلـزمه الاداء مالم يقبض أربعين درهمافاذاقبض هذاالمقدار أدى درهماوكذالك كلماقبض أربعين درهما.

ولمافی الهندية:(۱/۱۷۵،طبع رشيديه)

وقوی وهومايجب بدلاعن سلع التجارةاذاقبض اربعين زكى لمامضى.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:رضوان اللہ حقانی

۲۹صفرالخیر ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۹۵۲

## ﴿ادائیگی زکوٰۃ کی نیت سے مسکینوں کو طعام کھلانا﴾

﴿سوال﴾ کیا زکوٰۃ کی رقم سے دعوت کر کے مسکینوں کو کھلا دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟

﴿جواب﴾ مسکینوں کو دعوت کے طور پر کھانا کھلانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی،البتہ اگر بطورِ ملک اُنہیں کھانا دیدیا جائے تو اس کھانے کی قیمت کے بقدر زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لمافی التنویرمع الدر:(۲/۲۵۶،طبع سعید)

وشرعـا(تـمـلـيـک)خـرج الاباحة،فـلـو أطعم يتيماً ناوياً الزكاة لايجزيه الااذا دفع اليه المطعوم.كذافي البحرواللولوالجية.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۱۴ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتوی نمبر:۱۲۶

## ﴿ماموں اگر مستحق ہے تو اسکو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں ذہنی کمزوری کیساتھ عیالدار بھی ہیں جبکہ انکے گھر کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں سوائے اسکے کہ انکے پاس ایک گاڑی ہے جس سے وہ گھریلو اخراجات پورا کرتے تھے اب اس سے بھی کام نہیں چل رہا،اسلئے کہ وہ تو خود ذہنی معذور ہے اور گاڑی کے آمدنی کا کوئی باقاعدہ انتظام بھی نہیں ہے ان وجوہات کی بنا پر میں اپنے ماموں کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟　　　　سائل:ارمان گل لکی مروت

﴿جواب﴾ آپ کے ماموں کی ذاتی ملکیت میں بقدر نصاب سونا،چاندی اور سامان

تجارت یا ضرورت سے زائد اشیاء اگر نہیں ہیں تو وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں انکو زکوٰۃ دیجا سکتی ہے بلکہ ماموں کو زکوٰۃ دینے میں زیادہ ثواب ہے۔

لمافی التاتارخانیۃ:(۲/۲۰۸،طبع قدیمی)

ذکر ابن سماعۃؒ عن محمدؒ اذا کان لرجل دار تساوی عشر آلاف درهم لجودۃ موضعه وقربه من السوق ولیس فیها فضل عن سکناه مایساوی مائتی درهم قالؒ: تحل له الزکوٰۃ،......سئل محمد بن الحسنؒ عمن له اراضی یزرعها او حانوت یستغلها وفی الخانیۃ او دار غلتها تساوی ثلثۃ آلاف قال ان کانت غلتها تکفی لنفقته ونفقة عیاله سنة لایحل له اخذ الزکوٰۃ وهو قول ابی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ وان کانت غلتها لاتکفی لنفقته ونفقة عیاله سنة قال محمدؒ یحل له اخذ الزکوٰۃ وان کانت قیمتها یبلغ الوفاء وفی الفتاوی العتابیه وعلیه الفتوی.

وقال ابو حنیفۃؒ وابی یوسفؒ لایحل له اخذ الزکوٰۃ اذا کان قیمتها یبلغ نصابا والحاصل ان مایکون مشغولا بحاجته الحالیه نحو الخادم والمسکن وثیابه التی یلبسها فی الحال لایعتبر فی تحریم الصدقه بالاجماع ومایکون فاضلا عن حاجته الحالیه یعتبر فی تحریم الصدقة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبید اللہ عابد غفرلہ

۱۵ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۸۱

## ﴿زکوٰۃ لینے کے لئے مستحق ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت ہے اس کا شوہر بالکل صحیح سالم ہے لیکن اپنی بیوی کو خرچہ وغیرہ نہیں دیتا اور اس پر تشدد بھی کرتا ہے اگر یہ عورت پیسے مانگنے آجائے تو کیا اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟ مستفتیہ: حطلمہ یوسفیہ بنوریہ

﴿جواب﴾ مذکورہ عورت اگر زکوٰۃ کی مستحق ہے یعنی سیدہ نہیں ہے اور صاحب نصاب بھی نہیں ہے یعنی اسکی ذاتی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا نہیں ہے اسی طرح ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر نقد رقم، زیورات (سونا چاندی ملاکر) بھی نہیں ہے اور ضرورت سے زیادہ گھریلو اشیاء مثلاً ٹی وی، وی سی آر وغیرہ جنکی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر بنتی ہے، ایسی اشیاء بھی اس کی ملکیت میں نہیں ہیں تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے ورنہ نہیں دی جاسکتی۔

شوہر پر بلاشبہ اپنی بیوی کا نان ونفقہ ضروری ہے اور اچھا سلوک کرنا دینی واخلاقی فریضہ ہے لیکن زکوٰۃ کے استحقاق کیلئے یہ بات معیار نہیں ہے، زکوٰۃ لینے کے لئے مستحق ہونا ضروری ہے۔

لمافی الشامی:(۲/۳۴۴،طبع سعید)

وفی الفتح دفع الی فقیرۃ لها مهر دین علی زوجها يبلغ نصاباً وهو موسر بحيث لو طلبت أعطاها لا يجوز وان كان لا يعطى لو طلبت جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز غفرلہ

۹ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۹۵

## ﴿بیٹی کی اولاد کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ بیٹی کی اولاد کو زکوٰۃ دی جاسکتی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ضابطہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اصول وفروع کو یعنی اباء واجداد اور اولاد کو نہیں دی جاسکتی بیٹی کی اولاد بھی اولاد میں شمار ہوتی ہے، اس لئے نواسوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۳۴۶،طبع سعید)

(ولا)الی(من بينهما ولاد)ولو مملوكا لفقير(او)بينهما(زوجية)

ولمافی الهداية:(۱/۲۲۳،طبع رحمانیه)

ولا يدفع المزكى زكوة ماله الى أبيه وجده وان علا ولا الى ولده وولد ولده وان سفل.

ولمافی خلاصة الفتاوى:(۱/۲۴۲،طبع رشیدیه)

واصل هذا انه لا يجوز دفع الزكوة الى اولاده واولاد اولاده من قبل الذكور والاناث وان سفلوا ولا الى والديه واجداده وجداته وان علوا من قبل الآباء والامهات.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۳ محرم ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۳۰

## ﴿جس فقیر کو سال پورا ہونے سے پہلے زکوٰۃ دی گئی ہو پھر غنی ہو جائے تو زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی زکوٰۃ سال گزرنے سے پہلے کسی فقیر کو دیدے، اور سال گزرنے سے پہلے وہ فقیر بھی مالدار ہو جائے تو کیا اسکی زکوٰۃ ادا ہوگئی ہے یا دوبارہ زکوٰۃ دے؟ مستفتی: شاہد خان سواتی

﴿جواب﴾ زکوٰۃ دیتے وقت لینے والا اگر واقعی فقیر تھا تو زکوٰۃ ادا ہوگئی ہے، سال گزرنے

سے پہلے اگر چہ یہ شخص غنی ہو گیا ہے اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

لمافی الهندية:(۱/۱۷۶ طبع رشيديه)

ولو عجل اداء الزكوٰة الى فقير ثم ايسر قبل الحول اومات اوارتد جاز مادفعه عن الزكوٰة.

ولمافی التنوير مع الدر:(۲/۲۹۴ طبع سعيد)

(وان ايسر الفقير قبل تمام الحول اومات اوارتد و)ذلك (لان المعتبر كونه مصرفا وقت الصرف اليه)لابعده.قوله(لان المعتبر كونه مصرفا وقت الصرف اليه)فصح الاداء اليه ولا ينتقض بهذه العوارض.

ولمافی التجنيس والمزيد :(۲/۳۳۳،طبع ادارة القرآن)

ولو عجل زكاته ودفع الى الفقير المسلم فصار غنيا اوارتد والعياذبالله قبل تمام الحول جاز عن زكاته لان العبرة لوقت الاداء لاستنادالوجوب الى اول الحول فصار كما اذاأدى بعدالوجوب.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب : حبیب الرحمٰن سواتی

۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر :۲۰۳۲

## ﴿ کاروبار میں معاون کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ساتھ بیٹا بھی ملکر تجارتی امور انجام دیتا ہے، عاقل بالغ سمجھدار ہے، دوسرے شہر میں کچھ پلاٹ اس نے رہائش کی غرض سے خرید لئے، میرا ارادہ یہ تھا کہ ان پلاٹوں کو بھی بعد میں بیچ دیں گے تو ایسی جائیداد پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پلاٹ (تجارت) کی غرض سے ہم خرید لیتے ہیں بعد میں اسی میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں اس پلاٹ کو تجارتی شمار کریں گے یا رہائشی؟ اور اگر کوئی پلاٹ ہم رہائش کی غرض سے خرید لیتے ہیں لیکن بعد میں بیچنے کا ارادہ ہو جاتا ہے، تو اب کونسے ارادہ کا اعتبار ہوگا سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کریں گے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بیٹا باپ کیساتھ ملکر کاروباری امور اگر انجام دیتا ہے تو اسکی حیثیت صرف معاون کی ہوتی ہے، اصل مالک (مختار) والد ہوتا ہے اسی کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے، لہذا بیٹے نے کچھ پلاٹ اگر چہ رہائش کی غرض سے خریدے ہیں لیکن آپکی نیت شروع سے بیچنے کی تھی اس لئے ان پلاٹوں کی زکوٰۃ ضروری ہے۔

لمافی شرح المجلة:(۴/۳۱۹ طبع رشيديه)

اذاعمل شخص فی صنعة هو وابنه الذی فی عياله فجميع الكسب لذلك الشخص

وولده بعد معينا له كمااذاعان شخصا ولده الذى فى عياله حال غرسه شجرة فتلك الشجرة للشخص ولا يكون ولده مشاركاله فيها.

ولمافى ردالمحتار:(۶/۵۰۲،طبع امداديه)

لمافى القنية الأب وابنه يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للاب ان كان الابن فى عياله لكونه معينا له.

شروع میں تجارت کی غرض سے پلاٹ لئے تھے اور اب ان میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا تو یہ رہائشی پلاٹ شمار ہوں گے ادائیگی زکوۃ کی تاریخ آنے سے پہلے ایسا ارادہ کرلیا تو زکوۃ واجب نہیں ہوئی لیکن ادائیگی زکوۃ کی تاریخ گزرنے کے بعد ارادہ اگر کرلیا ہے اور ابھی تک انکی زکوۃ ادا نہیں کی تو اب واجب شدہ زکوۃ ساقط نہیں ہوگی ادا کرنا ضروری ہے اور شروع میں رہائش کی غرض سے پلاٹ اگر لئے ہوں اور بعد میں بیچنے کا ارادہ کرلیا تو محض ارادہ کرنے سے یہ تجارتی پلاٹ شمار نہ ہوں گے، عملی طور پر ان میں تجارت کرنے سے یعنی باقاعدہ فروخت کرنے سے ہی یہ تجارتی قرار پائیں گے اس سے پہلے ان میں زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

ولمافى الهندية:(۱/۱۷۴،طبع رشيديه)

ومن اشترى جارية للتجارة ونواها للخدمة بطلت عنها الزكاة كذافى الزاهدى.

ولمافى البزازية على هامش الهندية:(۱/۲۲۵-۲۲۶،طبع رشيديه)

بمنزلة عبد التجارة اذا أرادأن يستخدمه سنين فيستخدمه فهوللتجارة على حاله الا أن ينوى أن يخرجه من التجارة ويجعله للخدمة.

ولمافى فتح القدير:(۲/۱۶۷،طبع رشيديه)

(قوله:لاتصال النيةبالعمل)حاصل هذاالفصل أن ماكان من أعمال الجوارح فلايتحقق بمجردالنيةوماكان من التروك كفى فيه مجردهافالتجارةمن الاول فلايكفى مجرد النيةبخلاف تركها.

ولمافى التنويرمع الدر:(۲/۲۷۲،طبع سعيد)

(لايبقى للتجارة ما):اى عبدمثلا(اشتراه لهافنوى)بعدذلك(خدمته ثم)مانواه للخدمة (لايصير للتجارة) وان نواه لهاما لم يبعه بجنس ما فيه الزكاة والفرق أن التجارة عمل فلا تتم بمجرد النية بخلاف الاول فانه ترك العمل فيتم بها(وما اشتراه لها):اى للتجارة(كان لها)لمقارنة النية لعقدالتجارة ..... ولونوى التجارة بعد العقداواشترى شيئا للقنية ناويا انه ان وجد ربحاً باعه لازكاة عليه.

ولمافى الهداية:(۱/۲۰۳،طبع رحمانيه)

ومن اشترى جارية للتجارة نواها للخدمة بطلت عنها الزكاة وان نواها للتجارة بعد

ذلک لم تکن للتجارة حتی یبیعها فیکون فی ثمنها زکاة وان اشتری شیئاً ونواه للتجارة کان للتجارة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوئٹہ

۱۳ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ　　فتوی نمبر: ۱۸۴۳

## ﴿گھر کے استعمال میں آنے والے ساز وسامان پر زکوٰۃ نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ گھر کی ضرورت سے زائد برتن اور کپڑوں وغیرہ پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟　　مستفتی: حافظ عزیز اللہ کواری روڈ کوئٹہ

﴿جواب﴾ زکوٰۃ صرف مال نامی پر واجب ہے مثلاً سونا چاندی اور مال تجارت انکے علاوہ استعمال میں آنے والی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، لہٰذا گھر کے وہ برتن جو استعمال کے لئے رکھے ہوں خواہ استعمال نہ آتے ہوں یا بہت کم استعمال ہوتے ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں اس لئے کہ یہ اشیاء اموال نامیہ میں داخل نہیں ہیں۔

ولما فی الدر المختار: (۲/۲۶۲، طبع سعید)

(و) فارغ (عن حاجته الأصلية)...... (نام ولو تقديرا) بالقدرة على الاستنماء ولو بنائبه.

ولما فی رد المحتار: (۲/۲۶۳، طبع سعید)

(قوله نام ولو تقديرا) النماء في اللغة بالمد: الزيادة والقصر بالهمز خطأ يقال نمى المال ينمي نماء وينمو نموا وأنماه الله تعالى كذا في المغرب.

وفي الشرع: هو نوعان: حقيقي وتقديري، فالحقيقي الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات، والتقديري تمكنه من الزيادة بكون المال في يده أو يد نائبه بحر. وفي خلاصة الفتاوى: (۱/۲۳۵، طبع رشيديه)

ولما في الفتاوى العالمگيرية: (۱/۱۷۲، طبع رشيديه)

(ومنها الفراغ المال عن حاجته الاصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة وكذا طعام أهله وما يتجمل به من الاواني اذا لم يكن من الذهب والفضة وكذا الجوهر واللؤلؤ والياقوت والبلخش والزمرد ونحوها اذا لم يكن للتجارة. وفي الفقه الاسلامي: (۲/۱۷۹۵، رشيديه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوئٹوی

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　فتوی نمبر: ۲۲۸۸

## ﴿سامان تجارت میں زکوٰۃ کے وجوب کیلئے شروع سے لیکر آخر تک نیت ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا فرنیچر کا کارخانہ ہے جس میں فرنیچر کے مکمل سیٹ تیار کیے جاتے ہیں کبھی گاہک سیٹ خریدنے آجاتا ہے لیکن اس وقت میری دکان میں مکمل سیٹ موجود نہیں ہوتا تو میں انکو گھر میں استعمال ہونے والا سیٹ بیچ دیتا ہوں تو کیا اس سیٹ کی زکوٰۃ مجھ پر آئیگی؟ مستفتی: حافظ عزیز اللہ

﴿جواب﴾ اس مسئلہ کا اصل اعتبار نیت پر ہے استعمال پر نہیں ہے، لہٰذا گھر میں استعمال ہونے والے فرنیچر کے سیٹ کو اگر بناتے وقت ہی تجارت کی نیت سے بنایا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ کچھ وقت کیلئے گھر میں استعمال کرلیا ہو لیکن بناتے وقت استعمال کی نیت کی ہو تجارت کی نہیں تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہوگی اگرچہ بعد میں بیچ ہی دیں۔

ولما فی الدر المختار:(۲/۲۶۷ طبع سعید)

(وشرطه)أی شرط افتراض أدائها(حولان الحول)وهوفی ملكه(وثمنية المال كالدراهم والدنانير)لتعينهما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزكاة كيفما أمسكهما......ولو للنفقة (أوالسوم)بقيدها الآتی(أونية التجارة)فی العروض.

ولما فی الفقه الاسلامی:(۳/۱۶۹۵ طبع رشيديه)

ولا زكاة باتفاق المذاهب علی الحوائج الأصلية......اذالم ينوبها التجارة

ولما فی الهداية:(۱/۲۰۲ طبع رحمانيه)

ومن اشتری جارية للتجارة نواها للخدمة بطلت عنها الزكاة،وان نواها للتجارة بعدذلك لم تكن للتجارة حتی يبيعها فيكون فی ثمنها زكاة،وان اشتری شيأ ونواه للتجارة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن

۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر: ۲۳۰۴

## ﴿اموال زکوٰۃ کے علاوہ اشیاء میں زکوٰۃ نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ اموال زکوٰۃ کے سواء بقیہ اموال (جیسے کارخانوں، گوداموں اور دکانوں کی عمارات، کارخانوں کی مختلف مشینریاں، دکانوں کا فرنیچر، کرائے پر دی گئی عمارات اسی طرح ٹرک ٹیکسیاں رکشے وغیرہ) میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالغفار کوئٹہ

﴿جواب﴾ مذکورہ تمام اشیاء (خواہ استعمال میں ہوں یا نہ ہوں) میں زکوٰۃ نہیں، ان اشیاء

کی صرف آمدن پر زکوٰۃ ہے، البتہ اگر ان میں کوئی چیز تجارت کی ہو یعنی وہی چیز بیچنے کی غرض سے
لی ہو تو آمدن کے علاوہ اس کی کل مالیت پر بھی زکوٰۃ فرض ہوگی۔

لمافی الھندیۃ:(۱/۱۷۲،طبع رشیدیہ)

(ومنھا فراغ المال عن حاجتہ الاصلیۃ فلیس فی دور السکنی وثیاب البدن وأثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمۃ وسلاح الاستعمال زکاۃ.

ولمافی الشامی:(۲/۲۶۲،طبع سعید)

(قولہ وفارغ عن حاجتہ الأصلیۃ) وذلک حیث قال وھی مایدفع الھلاک عن الأنسان تحقیقا کالنفقۃ ودور السکنی وآلات الحرب والثیاب المحتاج الیھا لدفع الحر أو البرد أو تقدیرا کالدین.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرحمٰن

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۳۶۱

## ﴿ہیرے اور جواہرات پر وجوب زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے پاس ہیرے اور جواہرات رکھے ہوں تو ان پر زکوٰۃ آئے گی یا نہیں؟ مستفتی:قاری محمد دین

﴿جواب﴾ ہیرے اور جواہرات کسی نے بیچنے کی غرض سے اگر لیے ہیں تو انکی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی اور اگر استعمال کی غرض سے لئے ہیں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار:(۲/۲۷۳،طبع سعید)لازکاۃ فی اللآلی والجواھر الا ان تکون للتجارۃ.

ولمافی العالمگیریۃ:(۱/۱۸۰،طبع رشیدیہ)

واما الیواقیت واللآلی والجواھر فلازکاۃ فیھا وان کان حلیاً الا ان تکون للتجارۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز

۲۹ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۹۴۷

## ﴿قرض کو زکوٰۃ میں شمار کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک بہت ہی قریبی رشتہ دار نے ہم سے کچھ پیسے بطور قرض لیے تھے یعنی سات آٹھ ہزار روپیہ اور اس شخص کا نہ تو اپنا کوئی کام ہے اور نہ ہی گھر ہے لاوارث ہے، اب جو پیسے ہم نے اس کو بطور قرض دیے ہیں

وہ ہم زکوٰۃ کے پیسوں میں کاٹ سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی نیت سے ادا کی جائے یا اس نیت سے یہ پیسے دیگر پیسوں سے الگ کیے جائیں اور باقاعدہ مستحق کے قبضہ وملکیت میں دے دیے جائیں۔اس کے علاوہ کسی اور غرض مثلاً قرض وغیرہ کی نیت سے اگر دیا ہو اور بعد میں چاہا کہ یہ پیسہ زکوٰۃ کی مد میں شمار ہو تو کم از کم وہی پیسہ ابھی اس شخص کے پاس موجود ہو تو اس صورت میں بھی زکوٰۃ کی نیت کرنے سے باقی موجود رقم زکوٰۃ شمار ہوگی لیکن اس شخص کے پاس سے خرچ ہونے کے بعد زکوٰۃ کی نیت کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

مذکورہ صورت میں آپ کا ذاتی پیسہ آپ کے رشتہ دار نے لیا ہے تو یہ اس کے ذمہ قرض ہے، اب آپ اگر چاہتے ہیں کہ یہ پیسے زکوٰۃ شمار ہوں تو ایک مرتبہ اس سے وصول کر لیں پھر واپس زکوٰۃ کی نیت سے اسکو لوٹا دیں یا زکوٰۃ کی مد سے اور پیسے اپنی طرف سے اسکو دے دیں پھر قرض وصول کرنے کی غرض سے وہی رقم واپس اس سے لے لیں لیکن خالی نیت کرنے سے ابھی وہ قرض والی رقم زکوٰۃ سے شمار نہ ہوگی۔

لما فی تنویر الابصار:(۱۸۷/۲ طبع امدادیہ)

وشرط صحة ادائها بنية مقارنة له ولو حكما او مقارنة بعزل ما وجب.

ولما فی الشامی:(۱۹۰/۲،طبع امدادیہ)

(وحیلة الجواز):أی فیما اذا کان له دیناً علیٰ معسر واراد ان یجعله زکاة عن عین عنده او عن دین له علیٰ آخر سیقبض.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز

۵محرم الحرام ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر:۱۸۶۳

## ﴿قرض پر سال گزرنے میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مکان بنانے کے لئے زمین خریدی اور بیع مکمل ہو چکی ہے لیکن مشتری نے بائع کو ابھی تک پیسے نہیں دیئے کہ سال گزر گیا تو ان پیسوں میں مشتری پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ مستفتی:محمد آیاز کراچی

﴿جواب﴾ چاند کی تاریخ کے حساب سے ہر صاحب نصاب کی ایک تاریخ ہوتی ہے جس

میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس تاریخ کے بعد اگر اس رقم سے زمین خریدی گئی ہے تو یہ بیع اتنے پیسوں میں وجوب زکوٰۃ کیلئے مانع نہیں ہے بلکہ مشتری کے ذمے ان پیسوں میں زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اس تاریخ کے آنے سے پہلے زمین خریدی ہے تو یہ بیع اتنے پیسوں میں وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہے اسلئے کہ یہ مشتری کے ذمے قرض ہے جو بائع کو ادا کرنا ہے۔

لمافی التنویر مع الرد:(۲/۲۶۰،طبع سعید)

(فارغ عن دین مطالب من جهة العباد)فلوكان له نصاب وحال عليه حولان ولم يزكيه فيهما لازكوٰة عليه فى الحول الثانى

ولمافی الهندية:(۱/۱۷۳،طبع رشیدیه)

(ومنها الفراغ عن الدين)... كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للعباد كالقرض وثمن المبيع.

ولمافی البحر الرائق:(۲/۲۰۲،طبع سعید)

(وملك نصاب حولى فارغ عن الدين وحوائجه الاصلية نام ولا تقديرا)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :احمد علی عفی عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۶۷

## ﴿بچیوں کے نام پر سونا رکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک آدمی کی دو بیٹیاں ہیں جنکی عمر دس اور بارہ سال ہیں اس نے انکی شادی کے لئے دس تولے سونا رکھا ہے، اس کے علاوہ اور دوسری چیزیں مثلا برتن کپڑے وغیرہ جمع کر رہا ہے، کیا ان چیزوں پر زکوٰۃ دینی پڑے گی؟

واضح رہے بچیوں کے نام پر کوئی پیسہ جمع نہیں ہے۔ مستفتی: گل رحمان حیدر آباد

﴿جواب﴾ بچیوں کیلئے سونا رکھا ہے تو صرف رکھنے سے سونا بچیوں کی ملکیت میں نہیں آتا، لہٰذا سونے کے اصل مالک (والد ہو یا والدہ وغیرہ) کے ذمے اسکی زکوٰۃ واجب ہے زکوٰۃ کی تاریخ میں اس سونے کو بھی دوسرے اموال زکوٰۃ میں شمار کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

البتہ بچیوں کو باقاعدہ مالک قرار دیا ہو یعنی بچیوں ہی کیلئے خرید ا ہو یا انکے نام پر کر دیا ہو تو اس سونے کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہے، اس لئے کہ بچیاں ابھی تک نابالغ اور غیر مکلف ہیں

اور جب بالغ ہونگی تو ایک بچی کی ملکیت میں صرف پانچ تولہ سونا ہی اگر ہوگا نقد روپے چاندی یا سامان تجارت میں سے کچھ بھی انکے پاس اگر نہیں ہوگا تب بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس لئے کہ پانچ تولہ سونے سے صاحب نصاب نہیں بن پاتی برتن اور کپڑے وغیرہ تو استعمال کی چیزیں ہیں ان میں کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر والرد:(۲۶۷/۲،طبع سعید)

(وسبب لزوم ادائها توجه الخطاب)يعنى قوله تعالى وأتوالزكوٰة.(قوله توجه الخطاب):اى الخطاب المتوجه الى المكلفين بالامر بالاداء(وشرطه)اى شرط افتراض ادائها حولان الحول وهو فى ملكه وثمنية المال كالدراهم والدنانير لتعينهما للتجارة باصل الخلقة فتلزم الزكوٰة كيفما امسكهما ولو للنفقة.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶۹۲/۵ طبع سعید)

(وهبة من له ولاية على الطفل فى الجملة)......(تتم بالعقد)لو الموهوب معلوما وكان فى يده او يد مودعه وفى الشامية:قال محمدؒ كل شىء وهبه لابنه الصغير واشهد عليه وذلك الشىء معلوم فى نفسه فهو جائز والقصد ان يعلم ما وهبه له والاشهاد ليس بشرط لازم لان الهبة تتم بالاعلام تاترخانية.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۵۱۲

## ﴿مدرسے میں غیر رہائشی طلباء اگر زکوٰۃ کے مستحق ہیں تو انکو زکوٰۃ دینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک مدرسے میں صرف غیر رہائشی طالب علم ہیں،ان میں بالغ طلباء بھی ہیں جن سے مدرسے والوں نے تحریری اور تقریری دونوں طریقوں سے اس بات کی اجازت لی ہے کہ وہ انکی طرف سے زکوٰۃ وصدقات وغیرہ وصول کرلیا کریں اور مدرسہ میں جہاں چاہیں حسب صوابدید خرچ کرلیا کریں۔

چنانچہ اساتذہ کی تنخواہ بھی اس رقم سے دی جاتی ہے کیا ایسے مدرسے کیساتھ زکوٰۃ، صدقات، چرم قربانی اور عطیات کے ذریعے تعاون کر سکتے ہیں یا نہیں؟ رہنمائی فرمادیں،تقریباً دس طلباء بالغ غیر رہائشی ہیں۔ مستفتی:محمد علی کورنگی

﴿جواب﴾ زکوٰۃ ہر اس مسلمان شخص کو دی جاسکتی ہے جو سید نہ ہو اور بقدر نصاب مال یعنی

ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی مالیت کے برابر نقد روپے یا سامان تجارت کا مالک نہ ہو، ایسے شخص یا اس کے وکیل کو با قاعدہ مالک وقابض بنا کر دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، مدرسے میں پڑھنے والے طالب علموں کو زکوٰۃ دینے میں زیادہ ثواب ہے، زکوٰۃ کا ثواب تو ملیگا اور اشاعت دین میں تعاون کرنے کا ثواب الگ ملیگا بشرطیکہ طلباء مستحق زکوٰۃ کے مذکورہ معیار پر ہوں، اس مدرسے میں زکوٰۃ کے مستحق طلباء اگر زیر تعلیم ہیں اور مہتمم صاحب کو زکوٰۃ لینے کا با قاعدہ وکیل بنایا ہے تو مہتمم صاحب کو زکوٰۃ دینے سے بلاشبہ زکوٰۃ ادا ہو جائیگی زکوٰۃ ادا ہونے کے لئے طلباء کا رہائشی ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

غیر رہائشی طلباء بھی اگر زکوٰۃ کے مستحق ہیں، تو انکو زکوٰۃ دینا بلاشبہ جائز ہے، غیر رہائشی مدرسہ میں زکوٰۃ دینے کو علماء اس لئے منع کرتے ہیں کہ عموماً اس میں مالدار لوگوں کے نابالغ بچے زیر تعلیم ہوتے ہیں جنکی کفالت انکے والدین کے ذمے ہے لیکن اگر کسی مدرسہ میں ایسے لوگوں کے بچے زیر تعلیم ہوں جو کہ وہ خود زکوٰۃ کے مستحق ہیں یا بالغ لڑکے ہیں اور انکے والدین بیشک مالدار ہیں لیکن وہ لڑکے زکوٰۃ کے مستحق ہیں تو ایسے طلباء کو زکوٰۃ دینا بلاشبہ جائز ہے رہائشی ہوں خواہ غیر رہائشی۔

لما فی قوله تعالی:(سورۃ التوبۃ ایت ۶۰)

انما الصدقات للفقرآء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل

ولما فی الفقه الاسلامی:(۱۹۸۱/۲، طبع رشیدیه)

ولو دفع الزکاۃ للفقیر لا یتم الدفع مالم یقبضها بنفسه او یقبضها له ولیه اووصیه.

ولما فی ردالمحتار:(۲۶۱/۲، طبع سعید)

وفی التملیک اشارۃ الی انه لایصرف الی مجنون و صبی غیرمراهق الااذاقبض لهما من یجوزله قبضه کالاب وغیرهما. یصرف الی مراهق یعقل الاخذکمافی المحیط.

ولما فی البحرالرائق:(۲۲۲/۲ طبع سعید)

وفسره فی البدائع بجمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة الله تعالی وسبیل الخیرات اذاکان محتاجا.

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۲۲۲/۱ طبع رشیدیه)

ولو قبض الصبی وهو مراهق جاز وکذالو کان یعقل القبض بان کان لایرمی بها ولایخدع عنه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی

۲۲ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۵۴

### ﴿زکوٰۃ قیمت فروخت کے اعتبار سے ادا کی جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی سونے کی زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو قیمت خرید کا اعتبار ہوگا یا قیمت فروخت کا اور قیمت فروخت چونکہ مختلف ہوتی ہے مثلا دکاندار اپنا سونا تقریبا پچیس ہزار کا بیچتا ہے اور عام لوگوں سے بیس ہزار کا لیتا ہے تو کونسی قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کی جائے؟

﴿جواب﴾ آپکے سونے کی مارکیٹ میں جو قیمت لگتی ہے، اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۸۵،طبع سعید)

(وجاز دفع القیمة فی زکوٰة وعشر وخراج وفطرة ونذر وکفارة غیر الاعتاق)وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء.

ولمافی فتح القدیر:(۲/۲۲۷،طبع رشیدیه)

(قوله یقومها)ای المالک فی البلدالذی فیه المال حتی لوکان بعث عبد التجارة الی بلد أخری لحاجة فحال الحول یعتبر قیمته فی ذالک البلد.....ثم قول أبی حنیفة فیه انه تعتبر القیمة یوم الوجوب وعندهما یوم الاداء.

ولمافی الهندیة:(۱/۱۸۰،طبع رشیدیه)

وان أدی القیمة تعتبر قیمتها یوم الوجوب لان الواجب احدهما ولهذا یجبر المصدق علی قبوله وعندهما یوم الاداء.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ      واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ      فتوی نمبر:۲۰۴۸

### ﴿گائے کی قیمت خرید اور اسکی دودھ کی آمدنی میں زکوٰۃ نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے ایک گائے اپنے گھر کے لئے خریدی ہے جسکا دودھ وغیرہ ہم گھر میں استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ دودھ بچا کر ہم بازار میں فروخت کرتے ہیں جو پیسے مل جاتے ہیں ان میں کچھ پیسوں سے گائے کے لئے بھوسہ اور چارہ وغیرہ خریدتے ہیں اور کچھ گھر کی ضروریات میں خرچ کرتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ ہم پر گائے کی جسکی قیمت باون ہزار ہے اور دودھ کی آمدنی کی زکوٰۃ دینا فرض ہے یا نہیں؟ گائے کو

چارہ وغیرہ سب کچھ ہم گھر میں ہی دیتے ہیں۔ مستفتی: امجد حسین کوہائی شکردرہ

﴿جواب﴾ گائے اگر دودھ کی غرض سے لی ہے تو اس میں زکوۃ نہیں ہے، دودھ گھر میں استعمال ہو خواہ بیچتے ہوں اور دودھ سے حاصل شدہ خاص پیسوں میں بھی زکوۃ نہیں ہے، البتہ سال بھر میں چاند کی ایک خاص تاریخ میں آپ پہلے سے اگر صاحب نصاب ہیں اور آپ کو اس تاریخ میں زکوۃ نکالنے کے لئے حساب کرنا پڑتا ہے اور دودھ سے حاصل شدہ کمائی میں سے بھی کچھ پیسے اس تاریخ میں نقد صورت میں موجود ہیں تو یہ پیسے بھی دیگر پیسوں کیساتھ حساب میں شامل کرنے ہونگے اور تمام پیسوں کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

لمافی البدائع: (۳۰/۲، طبع سعید)

واما صفة نصاب السائمة فله صفات منها ان يكون معدا للاسامة وهوان يسيمها للدر والنسل لما ذكرنا ان مال الزكوة هو المال النامي وهو المعد للاستنماء.

ولمافی الدر المختار: (۲۵۹/۲، طبع سعید)

(وسببه) اى سبب افتراضها (ملك نصاب حولى) نسبة للحول لحولانه عليه (تام) بالرفع صفة الملك.

ولمافی ردالمحتار: (۲۶۲/۲، طبع سعید)

وليس فى دور السكنى وثياب البدن واثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لانها مشغولة بحاجته الاصلية.

واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہائی عفا اللہ عنہ الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۲۰۱۵ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

## ﴿صرف چھ تولہ سونے پر زکوۃ اور صدقہ فطر کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے پاس چھ تولہ سونا ہے، اس نے حلفیہ اقرار نامہ لکھا کہ میں چھ تولہ سونے کے علاوہ اپنے سارے پیسے اور ضرورت اصلیہ کے علاوہ سارا سامان اور کپڑے وغیرہ اپنے شوہر کو ہبہ کرتی ہوں اور آئندہ بھی اگر کوئی چیز ضرورت اصلیہ کے علاوہ میری ملک میں آئی وہ بھی میرے شوہر کی ہوگی آخر میں دو گواہوں نے اس اقرار نامے پر دستخط بھی کیے، پوچھنا یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد اس عورت

پر زکوٰۃ فرض ہوگی؟ نیز اس عورت پر قربانی اور صدقہ فطر اداء کرنا واجب ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر عورت نے وہ سارا سامان جو فی الحال اسکی ملکیت میں موجود ہے اور ضرورت سے زائد ہے، اپنے شوہر کو ہبہ کر کے با قاعدہ ایسا قبضہ بھی دیا ہے جسکو عرف میں بھی قبضہ سمجھا جاتا ہو تو یہ ہبہ صحیح ہوگیا ہے، اب اسکی ملکیت میں اگر صرف چھ تولے سونا ہی ہے اور کوئی دوسری چیز نہیں جس سے وہ مالک نصاب بنے تو اس پر زکوٰۃ اور قربانی وغیرہ واجب نہیں ہے۔

لیکن یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ سال کے دوران جس تاریخ کو بھی اس عورت کے پاس کچھ نقدی وغیرہ آگئی تو اسی دن وہ صاحب نصاب بن جائیگی اگرچہ بعد میں وہ با قاعدہ شوہر کو ہبہ کرے لیکن چونکہ زکوٰۃ کے وجوب کیلئے سال کے اول و آخر میں صاحب نصاب ہونا شرط ہے اس لئے اس عورت کے پاس سال گزرنے کے بعد اسی تاریخ کو دوبارہ بھی کچھ نقدی اگر موجود تھی (یعنی جس تاریخ کو اسے کچھ نقدی مل کر صاحب نصاب بنی تھی) تو زکوٰۃ فرض ہوجائیگی البتہ ہبہ کے تام ہونے کیلئے چونکہ موہوب چیز کا ہبہ کرنیوالے کی ملکیت میں ہونا اور پھر ہبہ کے بعد جس کو ہبہ کیا ہے اسکا قبضہ شرط ہے اس لئے مستقبل میں کسی چیز کا ہبہ کرنا صحیح نہیں قرار پاتا، لہٰذا اگر بعد میں کوئی چیز اسکی ملکیت میں آجائے تو جب تک دوبارہ ہبہ کر کے با قاعدہ شوہر کے قبضہ میں نہیں دیتی وہ چیز بیوی کی ملک شمار ہوگی، قربانی اور صدقہ فطر کے لئے چونکہ صرف قربانی کے ایام میں صاحب نصاب ہونا شرط ہے اس لئے ان دنوں میں اگر کوئی صاحب نصاب ہو یا کوئی چیز اسکی ملکیت میں آئی جس سے وہ صاحب نصاب بن جائے تو قربانی اور صدقہ فطر واجب ہوجائیگا ورنہ نہیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۸۷-۶۸۸ طبع سعید)

(وشرائط صحتها في الواهب العقل والبلوغ والملك) فلا تصح هبة صغير ورقيق ولو مكاتبا و)شرائط صحتها (في الموهوب ان يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول كماسيتضح (وركنها) هو (الايجاب والقبول)

وفي الشامية:قلت:فقد افاد ان التلفظ بالايجاب والقبول لايشترط بل تكفي القرائن الدالة على التمليك كمن دفع لفقير شيئا وقبضه ولم يتلفظ واحد منهما بشئ وكذا يقع في الهدية ونحوها فاحفظه،ومثله مايدفعه لزوجته او غيرها.قال:وهبت منك هذه

العین لقبضها الموهوب له بحضرة الواهب ولم یقل قبلت صح لان القبض فی باب الهبة جار مجری الرکن فصار کالقبول.

ولمافی ردالمحتار:(۶۹۲/۵،طبع سعید)

(قوله لانه معدوم):ای حکما وکذا لووهب الحمل وسلم بعد الولادة لا یجوز لان فی وجوده احتمالا فصار کالمعدوم)

ولمافی التنویرمع الدر:(۶۹۰/۵،طبع سعید)

(تتم) الهبة (بالقبض)الکامل.

ولمافی الدرالمختار:(۲۵۹/۲،طبع سعید)

(وسببه):ای سبب افتراضها(ملک نصاب حولی)نسبة للحول لحولانه علیه (تام) بالرفع صفة ملک.

ولمافی التنویرمع الدر:(۳۱۲/۶-۳۱۴،طبع سعید)

(فتجب)التضحیة:ای اراقة الدم من النعم عملا لااعتقادابقدرة ممکنة هی مایجب بمجرد التمکن من الفعل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

واللہ اعلم بالصواب:نثار محمود کوہاٹی
فتویٰ نمبر:۲۲۱۰

## ﴿زکوٰۃ کو بطور عیدی کے دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زکوٰۃ کی رقم اگر عید کے دن اپنے ''مستحق زکوٰۃ'' رشتہ داروں کے چھوٹے بچوں کو بطور عیدی کے دیں تو کیسا ہے؟اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کسی ''مستحق زکوٰۃ'' کو مالک بنانا ضروری ہے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا بشرطیکہ قبضے کی اہلیت اور سمجھ ہو۔صورت مذکورہ میں جن بچوں کو یہ رقم دی جاتی ہے اگر وہ مستحق زکوٰۃ اور سمجھدار ہیں قبضے کی سمجھ رکھتے ہیں اور ان کو رقم زکوٰۃ کی نیت سے ادا کی جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی لیکن اگر ان کو سمجھ نہیں ہے تو ان کے اولیاء کو دیئے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

لمافی الدرالمختار:(۲۰۷/۲،طبع امدادیه)

دفع الزکوة الی صبیان اقاربه برسم عید اوالی مبشر او مهدی الباکورة جاز الاالنص علی التعریض.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

واللہ اعلم:محمد عزیز چترالی
فتویٰ نمبر:۳۳۹

## ﴿ایسی بیوہ کو زکوٰۃ دینا جسکی ملکیت میں سات تولہ سونا ہو﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک بیوہ ہے جسکا کوئی کمانے والا نہیں اور اپنا گھر وغیرہ بھی نہیں مگر اس کے پاس سات تولہ سونا ہے، اس کے بھائی وغیرہ اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ لیتے وقت اس بیوہ کی ملکیت میں سات ۷ تولہ سونا کے علاوہ نقد روپے، چاندی اور ضرورت سے زائد گھریلو سامان مثلاً ٹی وی وغیرہ بھی نہ ہو تو اس کو آدھا تولہ سونا کی قیمت کی حد تک زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، عموماً ایسا نہیں ہوتا بلکہ کچھ نہ کچھ نقد روپے تو ہوتے ہیں جسکی وجہ سے یہ بیوہ خود صاحب نصاب شمار ہوتی ہے اور زکوٰۃ اس پر نہیں لگ سکتی اس لئے براہ راست اس کو زکوٰۃ نہ دیں، اس میں احتیاط ہے، البتہ اس کے یتیم بچے اگر زکوٰۃ کے مستحق ہوں تو ان بچوں کے لئے اس بیوہ کو زکوٰۃ دیتے رہیں۔

لمافی الشامی:(۲/۳۵۳،طبع سعید)

وکرہ اعطاء فقیر نصابا اواکثر وعن ابی یوسف لاباس باعطاء قدر النصاب.

ولمافی الشامی:(۲/۳۰۳،طبع رشیدیه)

وفی البدائع:ایضا ان ما ذکر من وجوب الضم اذالم یکن کل واحد منهما نصابابان کان اقل فلو کان کل منهمانصابا تاما بدون زیادةالضم بل ینبغی ان یودی من کل واحد زکاته فلوضم حتی یودی کله من الذهب اوالفضة فلا باس به عندنا ولکن یجب ان یکون التقویم بما هوانفع للفقراء رواجا.

ولمافی الهندیة:(۱/۱۸۷،طبع رشیدیه)

منهاالفقیروهومن له ادنیٰ شیء وهومادون النصاب الخ.

ولمافی الدرمع الرد:(۲/۳۵۰،طبع سعید)وطفل الغنیةفیجوز لانتفاء المانع.

وفی الشامیة:ای ولولم یکن له اب بحرعن القنیةقوله لانتفاء المانع علةللجمیع والمانع ان الطفل یعدغنیابغنی ابیه بخلاف الکبیرفانه لایعدغنیابغنی ابیه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالوہاب لغمانی عفااللہ عنہ

۲۹صفرالخیر۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر:۲۴۷۳

## ﴿اگر واقعی محتاج ہو تو زکوٰۃ لینے میں کوئی حرج نہیں﴾

﴿سوال﴾ جو آدمی باوجود محتاج ہونے کے سوال نہ کرے اور لوگ اُس کی غربت سے

واقف ہوں اور اُس کو زکوٰۃ دے دیں تو کیا اُس لینے والے کا قیامت کے دن مواخذہ ہوگا، نیز ہمارا ایک بھتیجا مدرسے میں پڑھتا ہے اور بالغ بھی ہے اس کے والدین تو مالدار ہیں لیکن وہ خود نصاب کا مالک نہیں ہے، کیا ہم اُس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ اگر کوئی شخص مستحق زکوٰۃ ہو اور اُسے زکوٰۃ دی جائے تو اس (زکوٰۃ کے قبول کر لینے) سے اُس کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، نیز آپ کا اپنے مذکورہ طالب علم بھتیجے کو زکوٰۃ دے دینا نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ زیادہ بہتر ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة التوبة آیت ۶۰) انما الصدقات للفقراء والمساکین...... الآیة.

ولمافی الدر المختار:(۲/۳۴۰،طبع سعید) .

وبهذا التعليل يقوى ما نسب للواقعات من أن طالب العلم يجوز له أخذ الزكوة ولو غنيا اذا فرغ نفسه لافادة العلم واستفادته لعجزه عن الكسب والحاجة داعية الى مالا بد منه.

ولمافی الشامی:(۲/۳۵۴،طبع سعید) والأفضل اخوته وأخواته ثم أولادهم ثم أعمامه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۷۴

## ﴿قرضہ دے کر پھر اس میں زکوٰۃ کی نیت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ زید نے بکر کو ایک ہزار روپے دیئے بعد میں زید کو خیال آیا کہ مجھے زکوٰۃ بھی دینی ہے اور دل میں نیت کر لی کہ وہ ہزار روپے جو میں نے بکر کو بطور قرض دیے تھے وہ زکوٰۃ کے ہیں، بعد میں زید نے بکر سے ان پیسوں کے بارے میں پوچھا تو بکر نے کہا کہ گھر میں رکھے ہوئے ہیں خرچ نہیں ہوئے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ کیا زید کی اسطرح نیت کرنے سے وہ رقم زکوٰۃ میں شمار ہوگی؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اس کے متصل نیت ضروری ہے اگر ادائیگی کے وقت نیت زکوٰۃ کی نہ کی گئی بلکہ ادائیگی کے بعد نیت کی گئی تو اس صورت میں مال اگر فقیر کے ہاتھ میں برقرار ہے تو یہ نیت معتبر ہے اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی لیکن اگر وہ مال فقیر کے ہاتھ میں برقرار نہ ہو (یعنی خرچ ہوا ہو یا ہلاک ہوا ہو) تو یہ نیت معتبر نہیں ہوگی، زکوٰۃ اسکے ذمہ واجب رہے گی۔

صورت مذکورہ میں زید نے بکر کو پیسے دینے کے بعد زکوٰۃ کی نیت کی ہے لیکن مال چونکہ بکر کے ہاتھ میں برقرار ہے اسلئے زید کیطرف سے ہزار روپے بطور زکوٰۃ کے ادا ہو گئے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۸۷/۲،طبع امدادیہ)

(وشرط صحة ادائها نية مقارنة له)اى للاداء(ولو كانت المقارنة حكماً)كمالو دفع بلا نية ثم نوى والمال قائم في يد الفقير اونوى عند الدفع للوكيل ثم دفع الوكيل بلا نية اودفعها للذمى ليدفعها لان المعتبر للفقراء جاز نية الآمر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:محمد عزیز چترالی عفااللہ عنہ

۱۵جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۳۱۷

## ﴿قرض میں دی ہوئی رقم پر زکواۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درجہ ذیل مسائل کے متعلق کہ(۱) کسی کے پاس نصاب جتنا مال ہو مگر وہ سارا قرض میں دیا ہو آیا اسپر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

(۲) کسی شخص کی تنخواہ دس ہزار ہے حکومت اسے آٹھ ہزار دیتی ہے اور باقی دو ہزار اپنے پاس رکھتی ہے اور یہ رقم جمع ہوتی رہتی ہے مگر نام پر اسی کے ہوتی ہے جب یہ شخص ریٹائرڈ ہو جائے تو یہ تمام جمع شدہ رقم اس کو ملتی ہے اگر وہ نصاب تک پہنچ جائے تو اسپر زکواۃ ہے یا نہیں؟ جبکہ رقم بندے کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔

(۳) کسی بچے کے نام پر زیور وغیرہ آیا، کیا اس بچے کی والدہ اس کو بطور حفاظت استعمال کرسکتی ہے یا نہیں؟ مستفتیہ:جامعہ یوسفیہ بنوریہ

﴿جواب﴾ (۱) قرض کی رقم چونکہ دین قوی میں داخل ہے اسلئے سال کے گزرنے پر یہ شخص اگر صاحب نصاب ہے تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی اگر اس پر کئی سال گزر گئے ہیں تو گزشتہ تمام سالوں کی زکوۃ واجب ہوگی، البتہ زکوۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے جب رقم وصول ہو۔

لمافی الشامی:(۳۰۵/۱،طبع سعید)

واعلم ان الديون عند الامام ثلاثة قوى ومتوسط وضعيف فتجب زكاتها اذا تم نصابا وحال الحول لكن لا فورا بل عند قبض اربعين درهما من الدين القوى كالقرض.....(قوله ويعتبر مامضى من الحول)اى فى الدين المتوسط لان الخلاف فيه

اما القوی فلا خلاف فیه لما فی المحیط من انه تجب الزکاۃ فیه بحول الاصل لکن لا یلزمه الاداء حتی یقبض منه اربعین درهما.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۲٦٦،طبع سعید)

(ولو کان الدین علی مقر ملیء او)علی(معسر او مفلس)......(او)علی(جاحد علیه بینة)......(او علم به قاض)......(فوصل الی ملکه لزم الزکاۃ مامضی)

ولما فی خلاصۃ الفتاویٰ:(۱/۲۳۸،طبع رشیدیه)

الدیون علی ثلاث مراتب قوی کالقرض وبدل مال التجارۃ وفیهما الزکاۃ وانما یخاطب بالاداء اذا قبض اربعین منها فاذا قبض الاربعین یخاطب باداء درهم......بحسابه.

(۲) حکومت کی طرف سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ملنے والی یہ رقم دین ضعیف میں داخل ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں گذشتہ سالوں کی زکواۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ رقم جب قبضہ میں آجائے اور پہلے سے وہ صاحب نصاب نہیں ہے تو اب اس مال پر سال بھی گزر جائے تو اس کے بعد زکوٰۃ کے وجوب کا حکم متوجہ ہوتا ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۲/۲۰۷،طبع سعید)

قسم ابو حنیفة الدین علی ثلاثة اقسام قوی وهو بدل القرض الخ ففی القوی تجب الزکاۃ اذا حال الحول ویتراخی القضاء الی ان یقبض اربعین درهما الخ وفی الضعیف لا تجب مالم یقبض نصابا ویحول الحول بعد القبض علیه.

ولما فی مجمع الانهر:(۱/۲۸۹،طبع المنار)

واما الدین الضعیف فهو ما وجب وملک لا بدلا عن شیء الخ والحکم فیه ان لا تجب فیه الزکاۃ حتی یقبض المائتین ویحول علیه الحول عنده.

ولما فی الهندیة:(۱/۱۷۳،طبع رشیدیه)

(ومنها الملک التام)وهو مااجتمع فیه الملک والید واما اذا وجد الملک دون الید کالصداق قبل القبض او وجد الید دون الملک کملک المکاتب والمدیون لاتجب فیه الزکاۃ.

(۳) زیور وغیرہ اگر بچے کی ملکیت ہیں اور بچے نابالغ ہیں تو ایسی صورت میں ماں کے لئے ان کی مملوکہ اشیاء میں تصرف کرنا اور استعمال میں لانا درست نہیں، حفاظت کے لئے کوئی اور ممکنہ طریقہ اختیار کیا جائے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ بہشتی زیور:(۵/۲٦۳،طبع دارالاشاعت) میں لکھتے ہیں:

جو چیز نابالغ کی ملک ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اس بچے ہی کے کام میں لگانا چاہیے کسی کو اپنے کام

میں لانا جائز نہیں خود ماں باپ بھی اپنے کام میں نہ لاویں نہ کسی اور بچے کے کام میں لادیں۔

ولما فی الدر المختار:(۵/۶۹۶،طبع سعید)

لایجوزان یھب شیئا من مال طفله ولو بعوض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۹ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۱۱

## ﴿استعمال کی غرض سے خریدی گئی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ حوائج اصلیہ سے زائد سامان مثلاً گیزر واشنگ مشین، بسترے، ڈنر سیٹ وغیرہ پر سال گزرنے سے زکوٰۃ فرض ہوگی یا نہیں؟ جبکہ یہ چیزیں سال بھر استعمال میں نہیں آتیں۔

﴿جواب﴾ جس شخص کے پاس سونا چاندی یا نقد رقم اتنی ہو جو نصاب کو پہنچتی ہو اور اس پر سال گزر جائے تو شرعاً اس پر زکوٰۃ فرض ہے، سامان تجارت جسکی قیمت ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہو اور سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

حوائج اصلیہ سے زائد سامان جو استعمال کی نیت سے خریدا گیا ہو تجارت کی نیت سے نہ ہو (اگر چہ وہ عام استعمال میں نہ آتے ہوں) پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی۔

لما فی التنویر:(۲/۲۵۹،طبع سعید)

وسببه:ای سبب افتراضها ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد وعن حاجته الاصلیه.

ولما فی الهدایة:(۱/۲۰۲،طبع رحمانیه)

ولیس فی دور السکنیٰ وثیاب البدن واثاث المنزل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوٰة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی عفا اللہ عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:

## ﴿حق مہر پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں

عموماً لڑکیوں کا مہر ایک لاکھ سے اوپر مقرر کیا جاتا ہے جو کہ بقدر نصاب زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہے اس پر کئی سال گزر جاتے ہیں تو کیا اس لڑکی کے ذمہ اس مہر کی زکوٰۃ ہے؟ جبکہ شوہر نے اس کو مہر ابھی تک ادا نہیں کیا؟

مستفتی: جمیل الرحمٰن

﴿جواب﴾ مہر کی رقم جب تک شوہر ادا نہیں کرتا بیوی کے ذمہ اس رقم کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور اگر شوہر بقدر نصاب زکوٰۃ یا اس سے زیادہ رقم ادا کرے اور بیوی کا اس رقم پر قبضہ کے بعد سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ اگر بیوی پہلے سے صاحب نصاب ہے درمیان سال مہر کی رقم وصول ہو تو تمام رقم پر نصاب کا سال پورا گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی مہر کی رقم کے لئے سال جدید کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

لما فی البحر الرائق:(۲/۲۰۷ طبع سعید)

قسم ابوحنيفة الدين على ثلاثة اقسام قوى وهو بدل القرض ومال التجارة ومتوسط وهو بدل ماليس للتجارة كثمن ثياب البذلة وعبد الخدمة ودار السكنى وضعيف وهو بدل ماليس بمال كالمهر والوصية..... وفى الضعيف لاتجب مالم يقبض نصاباً ويحول الحول بعد القبض عليه.

ولما فى التنوير مع الدر:(۲/۲۳۸-۲۳۹ طبع امدادیه)

(و) عند قبض (مائتين مع حولان الحول بعده) أى بعد القبض (من) دين ضعيف وهو (بدل غير مال) كمهر ودية وبدل كتابة وخلع ،الا اذا كان عنده يضم الى الدين الضعيف كما مر. وفى الشامية: والحاصل انه اذا قبض منه شيئاً وعنده نصاب يضم المقبوض الى النصاب ويزكيه بحوله ولا يشترط له حول بعض القبض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ۔۔۔ واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ ۔۔۔ فتویٰ نمبر: ۳۶۰

## ﴿زیورات میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خواتین کے پاس سونے اور چاندی کے زیورات اتنی مقدار میں ہیں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اب زیورات چونکہ کئی سالوں تک خواتین کے پاس پڑے رہتے ہیں تو کیا اس صورت میں ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی یا ایک مرتبہ زکوٰۃ ادا کرنا کافی ہے؟

مستفتی: عبداللطیف صاحب

﴿جواب﴾ سونے اور چاندی کے زیورات اگر بقدر نصاب موجود ہوں اور ان پر سال گزر

جائے تو ان پر زکوۃ واجب ہوگی اسی تاریخ میں جس روز وہ صاحب نصاب بن گئیں تھیں، لہٰذا ہر سال اگر نصاب پورا ہو تو ہر سال زکوۃ واجب ہوگی صرف ایک مرتبہ زکوۃ ادا کرنا کافی نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۷۳/۲ طبع امدادیه)

(وسببه):أی سبب افتراضها (ملک نصاب حولی)نسبة للحول لحولانه علیه(تام)بالرفع صفة ملک.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱۳/۲ طبع سعید)

لاخلاف فی أن أصل النصاب وهو النصاب الموجود فی اول الحول يشترط له الحول لقول النبی صلی الله علیه وسلم لازکوٰة فی مال حتی يحول علیه الحول.

ولمافی خلاصة الفتاویٰ:(۲۳۵/۱ طبع رشیدیه)

الزکوٰة انما تجب اذا ملک نصابا تاماً نامیا حولاً کاملا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۴۳۶

## ﴿شادی یا مکان کے لئے رکھی ہوئی رقم میں زکوۃ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپے ہیں اس پر سال بھی گزر چکا ہے مگر اس کے پاس نہ مکان ہے اور نہ ہی ابھی تک اس کی شادی ہوئی ہے وہ ان ضروریات کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہے، اس پر زکوۃ فرض ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مال اگر سونے چاندی یا نقد روپوں کی صورت میں بقدر نصاب کسی کے پاس موجود ہو اور صاحب نصاب ہونے کے بعد سال بھی اس پر گزر جائے تو ایسے شخص پر زکوۃ فرض ہو جاتی ہے، ادا نہ کرنے کی صورت میں گنہگار ہوگا۔

البتہ سال گزرنے سے پہلے پہلے اس رقم سے مکان کے لئے سامان وغیرہ خرید لے یا شادی کر کے مہر میں ادا کردے تو زکوۃ فرض نہ ہوگی۔

لمافی البحر الرائق:(۲۰۱/۲ طبع سعید)

وشرط فراغه عن الحاجة الاصلية لان المال المشغول بها کالمعدوم وفسرها فی شرح المجمع لابن الملک بما يدفع الهلاک عن الانسان تحقيقاً أو تقديراً فالثانی کالدين والاول کالنفقة ودور السکنی وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر أو البرد وکآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فاذا كان له دراهم

مستحقة لیصرفها الی تلک الحوائج .....فقد صرح بان من معه دراهم وأمسکها بنیة صرفها الی حاجته الاصلیة لاتجب الزکاة اذا حال الحول وهی عنده.

ولما فی الشامی:(۲/۲۶۲ سطبع سعید)

(قوله وفسره ابن ملک)فاذا کان معه دراهم أمسکها بنیة صرفها الی حاجته الاصلیة لاتجب الزکوة فیها اذا حال الحول وهی عنده......الخ.

قلت:وأقره فی النهر والشرنبلالیة وشرح المقدسی،وسیصرح به الشارح أیضا،ونحوه قوله فی السراج سواء أمسکه للتجارة او غیرها،وکذا قوله فی التتارخانیة نوی التجارة أولالکن حیث کان ماقاله ابن ملک موافقا لظاهر عبارات المتون کما علمت وقال ح انه الحق فالاولی التوفیق بحمل مافی البدائع وغیرها،علی ما اذا أمسکه لینفق منه کل مایحتاجه فحال الحول وقد بقی معه منه نصاب فانه یزکی ذلک الباقی وان کان قصده الانفاق منه أیضا فی المستقبل لعدم استحقاق صرفه الی حوائجه الاصلیة وقت حولان الحول بخلاف ما اذا حال الحول وهو مستحق الصرف الیها لکن یحتاج الی الفرق بین هذا وبین ماحال الحول علیه وهو محتاج منه الی أداء دین کفارة أونذر أوحج،فانه محتاج الیه أیضا لبراءة ذمته الخ.

واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی      الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۸۷      ۳ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

## ﴿شادی کیلئے خریدے ہوئے سامان پر زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص شادی کیلئے سامان وغیرہ خریدتا ہے اور اس سامان کی قیمت مقدار نصاب سے بہت زیادہ ہے اور اس پر سال بھی گذر جائے تو کیا اس سامان پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ نیز ایک شخص نے شادی کیلئے کچھ رقم جمع کی ہے جو کہ نصاب سے زیادہ ہے اور مذکورہ رقم اس شخص کے ساتھ پندرہ، سولہ مہینوں سے موجود ہے اور یہ رقم خاص شادی کی ضروریات کیلئے ہے کیا اس رقم پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوۃ صرف اموال نامیہ (مثلاً سونا، چاندی، نقدروپے اسی طرح زمین اگر بیچنے کی غرض سے لی ہو) میں ہے، گھریلو سامان خواہ شادی کیلئے ہو اموال نامیہ میں سے نہیں ہے بلکہ ضرورت اور استعمال کی اشیاء میں داخل ہے، اسلئے اس سامان میں زکوۃ نہیں ہے۔

نقدروپے اگرچہ شادی یا دوسری ضرورت کیلئے رکھے ہیں ان میں زکوۃ فرض ہے چاندی کی

تاریخ کے حساب سے سال بھر میں اس شخص کی جو تاریخ مقرر ہے اس دن اس رقم کو بھی باقی اموال زکوۃ میں شمار کرنا ضروری ہے اورزکوۃ ادا کرنا لازم ہے، اب تک اگرادانہیں کیا ہے تو حساب کرکے ادا کردیں۔

لمافی الهداية:(۲/۲۰۲ طبع رحمانيه)

وليس في دور السكنى وثياب البدن واثاث المنزل ودواب الركوب وعبيدالخدمة وسلاح الاستعمال زكوة لانهامشغولةبالحاجة الاصلية وليست بنامية.

ولمافى رد المحتار:(۲/۲۶۲ طبع سعيد)

فى فصل زكاةالعروض ان الزكاة تجب فى النقد كيفما امسكه للنماء اوللنفقة.

ولمافى الدرالمختار:(۲/۲۶۲ طبع سعيد)

ولافى ثياب البدن المحتاج اليهالدفع الحروالبرد،ابن ملك(واثاث المنزل ودور السكنى ونحوها)

ولمافيه ايضا:(۲/۲۶۷ طبع سعيد)

(وسبب لزوم ادائهاتوجه الخطاب يعنى قوله تعالى آتوا الزكاة(وشرطه)اى شرط افتراض ادائها(حولان الحول)وهوفى ملكه(وثمنيةالمال كالدراهم والدنانير) لتعينهماللتجارة باصل الخلقة فتلزم الزكاة كيفماامسكهماولوللنفقة.

ولمافى حاشيةالطحطاوى:(ص۷۱۵ طبع قديمى)

(وشرط وجوب ادائها)اى افتراضها(حولان الحول)وهوفى ملكه اى وثمنيةالمال كالدراهم والدنانير.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۵ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۵۰۰

## ﴿ملکیت میں ساڑھے سات تولہ سے کم صرف سونا ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے پاس پانچ تولہ سونا ہے نہ تو اس کے پاس اضافی کپڑے ہیں نہ برتن اور نہ پیسے وغیرہ اس کے شوہر کی تنخواہ پانچ ہزار ماہانہ ہے جبکہ اس کے چھ بچے ہیں شوہر گھر کے اخراجات کے لئے پیسے دیتا ہے مگر وہ مہینہ ختم ہوتے ہی ختم ہوجاتے ہیں بعض اوقات تو مہینہ سے بھی پہلے ختم ہوجاتے ہیں اس عورت کے لئے پیسے کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں یعنی اس عورت کے پاس نہ تو والدین کی طرف سے

کوئی پیسے آتے ہیں اور نہ ہی وہ عورت نوکری کرتی ہے، البتہ صرف پانچ تولہ سونے کی مالک ہے اور اس کا شوہر اس سے کہتا ہے کہ میرے پیسوں کو صرف میرے بچوں پر خرچ کرو، زکوٰۃ اور قربانی میں اسے استعمال نہ کرو تو کیا ایسی عورت پر زکوٰۃ اور قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اس عورت کے پاس پانچ تولہ سونے کے علاوہ نقد روپے، چاندی وغیرہ اگر نہیں ہے تو صرف پانچ تولہ سونے سے وہ صاحب نصاب نہیں قرار پاتی اس لئے اس پر زکوٰۃ، قربانی واجب نہیں ہے، البتہ دوران سال کسی بھی وقت کچھ نقد روپے اس کی ذاتی ملکیت میں اگر آگئے تو اس وقت وہ صاحب نصاب قرار پائیگی اور چاند کے حساب سے سال گزرنے کے بعد اسی تاریخ میں بھی اس کے پاس سونے کے علاوہ کچھ نقد روپے بھی اگر موجود ہیں تو زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا اگر چہ دوران سال رقم خرچ ہوگئی تھی۔

لیکن جس تاریخ میں صاحب نصاب ہوگئی تھی اسی تاریخ میں سال گزرنے کے بعد اگر رقم بھی سونے کے ساتھ موجود ہے تو پورے مال کی زکوٰۃ واجب ہے اس تاریخ میں صرف سونا ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح قربانی کے دنوں میں سونے کے علاوہ کچھ رقم یا چاندی بھی اس کی ذاتی ملکیت میں اگر موجود ہے تو قربانی واجب ہے، صرف سونا اس کے پاس ہو تو قربانی واجب نہ ہوگی۔

لمافی اعلاء السنن:(۷/۱۰، طبع دار الکتب بیروت)

عن علیؓ عن النبی ﷺ ببعض اول الحدیث قال: فاذا کانت لک مائتا درهم وحال علیها الحول ففیها خمسة دراهم، ولیس علیک شیء یعنی فی الذهب حتی یکون لک عشرون دینار أفاذا کانت لک عشرون دینار أو حال علیها الحول ففیها نصف دینار.

ولمافی الدر مع الرد:(۲/۲۹۵، طبع سعید)(نصاب الذهب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درهم)

وفی الشامیة:(قوله: عشرون مثقالا) فمادون ذلک لا زکاة علیه.

ولمافی التنویر مع الدر والرد:(۲/۳۰۳، طبع سعید)

(و) یضم (الذهب الی الفضة) وعکسه بجامع الثمنية (قيمة) وفی الشامیة: عند الاجتماع اما عند انفراد احدهما فلا تعتبر القیمة اجماعا بدائع. لان المعتبر وزنه اداء ووجوبا كما مر وفی البدائع ايضا ان ماذكر من وجوب الضم اذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بان كان اقل، فلو كان كل منهما نصابا تاما بدون زيادة لا تجب الضم بل ينبغي ان يؤدي من كل واحد زكاته.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۵۰

## ﴿اسلحہ میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ہر آدمی کے پاس دو بندوق رکھی ہوتی ہیں جن کی قیمت مقدار نصاب زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہوتی ہے، ایک حفاظت کے لئے اور دوسری شکار کے لئے یا دونوں شکار کے لئے ہوتی ہیں، ان پر سال گزرتا رہتا ہے تو کیا اس صورت میں ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ مستفتی: سیف الاعظم

﴿جواب﴾ گھر میں بندوق رکھنا استعمال کی غرض سے چاہے اپنی حفاظت کے لئے ہو یا شکار کرنے کے لئے ہو دونوں صورتوں میں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں خواہ ان کی مالیت بقدر نصاب ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر تجارت کی غرض سے لی ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لما فی الهداية: (۲۰۲/۱ طبع رحمانيه)

وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوٰة لأنها مشغولة بالحاجة الاصلية وليست بنامية أيضاً.

ولما في الهندية: (۱۷۲/۱ طبع رشيديه)

فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوٰة.

ولما في التنوير مع الدر: (۱۷۸/۲ طبع امداديه)

فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۴ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۸

## ﴿اناج میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے پاس گندم کا غلہ موجود ہے جس کی قیمت نصاب زکوٰۃ سے کہیں زیادہ ہے تو کیا سال پورا ہونے پر اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ جبکہ اس نے اس غلہ کا عشر بھی دیا ہو؟ مستفتی: نظام الدین

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ زکوٰۃ سونے، چاندی، نقد روپے اور سامان تجارت پر واجب ہوتی ہے، زمین سے حاصل شدہ غلہ کو

فقہاء کرام نے مال نامی قرار نہیں دیا ہے، البتہ اگر تجارت کی غرض سے غلہ خرید اگیا ہو تو اس وقت زکوۃ واجب ہے۔

لمافی البحر: (۲/۲۰۹، طبع سعید)

وخرج ایضاً ما اذا دخل من أرضه حنطة تبلغ قیمتها قیمة نصاب ونوى أن يمسكها ويبيعها فأمسكها حولاً لا تجب فيها الزكوٰة كما في الميراث.

ولمافی الشامی: (۳/۱۸۶، طبع امدادیه)

ولذا قال في البحر: وخرج: أي بقيد العقد ما اذا دخل من ارضه حنطة تبلغ قيمتها نصاباً ونوى أن يمسكها ويبيعها فأمسكها حولاً: لا تجب فيها الزكوٰة كما في الميراث.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۳۶۱

## ﴿مال مضاربت سے حاصل شدہ منافع پر زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مضاربت پر کسی کو پانچ لاکھ روپے دیدیئے ایک سال بعد وہ پانچ لاکھ روپے سے آٹھ لاکھ روپے بن گئے، پوچھنا یہ ہے کہ زکوۃ پانچ لاکھ روپے پر آئے گی یا آٹھ لاکھ روپے پر؟ (۲) نیز زکوۃ مضارب ادا کریگا یا رب المال؟

مستفتی: ضیاء الرحمٰن زیدہ صوابی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں یہ شخص چاند کے حساب سے جس تاریخ کو صاحب نصاب ہوا، سال گذرنے کے بعد چاند کی اسی تاریخ میں اس شخص کی ملکیت میں جتنی رقم موجود ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے اسکی ملکیت میں آئی ہو، اس پر زکوۃ واجب ہے اگر چہ وہ تمام رقم یا اسکا کچھ حصہ مذکورہ تاریخ سے ایک ہی دن قبل اسکی ملکیت میں آیا ہو، چنانچہ صورت مسئولہ میں پورے آٹھ لاکھ پر زکوۃ ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۲/۲۸۸، طبع سعید)

(والمستفاد) ولو بهبة اوارث (وسط الحول يضم الى نصاب من جنسه) فيزكيه بحول الاصل.

وفي الشامية: قوله ولو بهبة اوارث ادخل فيه المفاد بشراء اوميراث او وصية وما كان حاصلا من الاصل كالاولاد والربح كما في النهر.

ولمافی الهندية: (۱/۱۷۵، طبع رشيديه)

ومن كان له نصاب فاستفاد في اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الى ماله وزكاه سواء

كان المستفادمن نمائه اولا وباى وجه استفادضمه سواء كان بميراث اوهبةاوغير ذلك.

ولما فی مراقی الفلاح علی الطحطاوی:(ص۷۱۴-۷۱۵،طبع قدیمی)

وشرط وجوب ادائهاحولان الحول على النصاب الاصلي،واماالمستفادفي اثناء الحول فيضم الى مجانسه ويزكى بتمام الحول الاصلي سواء استفيدبتجارةاوميراث اوغيره.

زکوٰۃ مضارب پرنہیں بلکہ رب المال پر فرض ہے جسکی ادائیگی کیلئے رب المال (مالک) ہی کی نیت شرط ہے، اس لئے رب المال کی اجازت کے بغیر مضارب کے ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، البتہ حاصل شدہ نفع میں چونکہ دونوں شریک ہیں اس لئے مضارب کا حصہ بھی اگر بقدر نصاب ہے یا پہلے سے وہ صاحب نصاب ہے تو اس کے اپنے حصہ کی زکوٰۃ بھی اسی پر واجب ہے۔

ولما فی الدر المختار:(۲/۲۶۸،طبع سعید)

وشرط صحة ادائها نية مقارنة له:اى للاداء.

ولما فی الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص ۷۱۵،طبع قدیمی)

وشرط صحة ادائها نية مقارنة لادائها للفقير او وكيله او لعزل ما وجب.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۵ربیع الاول ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر:۲۳۹۹

## ﴿مقروض فقیر کو مالک بنائے بغیر زکوٰۃ کی رقم سے قرضے کی ادائیگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام کہ ایک شخص ہے جو مقروض ہے دوسرا ایک آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا قرض ادا کرے تو یہ شخص زکوٰۃ کی رقم لیجا کر اس کے قرض خواہ کو دے دیتا ہے مقروض شخص کے ہاتھ میں دیئے بغیر، کیا اس صورت میں زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟

(۲) ایک غریب بیمار شخص جو کہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ ہسپتال کے مختلف بل اس کے ذمہ واجب الادا ہیں، مثلاً ٹیسٹ ایکسرے، الٹراساؤنڈ، دیگر ادویات وغیرہ۔ دوسرا شخص اس کی طرف سے یہ بل زکاۃ کی رقم سے مذکورہ شعبوں کے کاؤنٹر پر ادا کرتا ہے تو کیا ایسی صورت میں زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟ مستفتی: حاجی محمد مظہر صاحب ابوبکر مسجد ڈیفنس فیز۲

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک یعنی فقیر کو مالک بنانا شرط ہے، زکوٰۃ کی رقم کا جب تک کسی فقیر کو مالک نہ بنادیا جائے اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

سوال میں مذکورہ دونوں صورتوں میں چونکہ مستحقِ زکوٰۃ کی ملکیت میں رقم نہیں آتی، لہٰذا اس طرح زکوٰۃ ادا کرنے سے ادا نہیں ہوگی۔

اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے مستحقِ زکوٰۃ کے ہاتھ میں یا اس کے وکیل کے ہاتھ میں مذکورہ رقم دی جائے پھر اس کی اجازت یا ان کے وکیل کی اجازت سے مذکورہ امور انجام دیئے جائیں، یہ صورت درست ہوگی اور زکوٰۃ بھی ادا ہو جائیگی۔

لمافی التنویر: (۲/۱۷۳، طبع امدادیہ)

وهي تمليك جزء مال عينه الشارع من مسلم فقير غير هاشمي ولا مولاه مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه.

ولمافی الهندية: (۱/۱۹۰، طبع رشيديه)

ولو قضى دين الفقير بزكوة ماله ان كان بامره يجوز وان كان بغير امره لا يجوز وسقط الدين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۳۴

## ﴿نشے کے عادی کو زکوٰۃ دینے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا پڑوسی نہایت غریب اور مسکین ہے لیکن ہیروئن وغیرہ نشے کا عادی ہے نماز بالکل نہیں پڑھتا، اس کو زکوٰۃ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ زکوٰۃ فقراء و مساکین کے لئے ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں غریب اور مسکین پڑوسی کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اگرچہ وہ فاسق و فاجر ہیروئن وغیرہ نشے کا عادی ہو، البتہ اگر یہ یقین ہو کہ وہ ہیروئن وغیرہ نشے پر یہ رقم خرچ کرے گا تو اسے نہیں دینی چاہیے بلکہ نیک صالح فقیر کو زکوٰۃ و صدقات دینا جاہل فقیر کی بنسبت زیادہ بہتر ہے۔

لمافی الدر المختار: (۲/۳۳۹، طبع سعید)

باب المصرف: اى مصرف الزكوة والعشر......(هو فقير وهو من له ادنى شئ) اى دون نصاب اوقدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة (ومسكين من لا شئ له) على المذهب.

ولما فيه ايضا: (۲/۲۵۴، طبع سعيد) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير افضل.

(قوله افضل: اى من الجاهل الفقير قهستاني. ومثله في الهندية: (۱/۱۸۷، طبع رشيديه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۴۵۱

## ﴿زیورات کے ساتھ نگینوں کی زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ اگر کسی کے پاس بارہ تولہ زیورات ہوں اور اس پر تقریباً تین تولہ قیمتی پتھر لگا ہوا ہو جو کہ بطور نگینہ کے زیورات میں استعمال ہوتا ہے تو کیا اس صورت میں کل بارہ تولہ پر زکوٰۃ آئے گی یا نگینہ منہا کر کے بقیہ زیورات 9 تولہ کی زکوٰۃ دینی ہوگی؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ زکوٰۃ سونا، چاندی یا اموال تجارت میں واجب ہے اسی طرح ان جانوروں میں جو اکثر سال باہر چرتے ہوں ان کے علاوہ دیگر اشیاء میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں نگینہ خواہ قیمتی پتھر کا ہو یا موتی کا ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، سونے سے اس کو منہا کر کے اصل سونے یعنی نو تولہ سونے کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

لمافي التنوير مع الدر والرد:(۱۹۲/۲ ، طبع امدادیہ)

(لا زكاة في اللآلي والجواهر) وان ساوت الفاً في نسخة الوفاً اتفاقاً (الا ان تكون للتجارة)

وفي الشامية: والاصل ان ماعدا الحجرين والسوائم انمايزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المؤدى الى الثنيى. ومثله في الهندية:(۱/ ۱۷۲، طبع رشیدیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۸۱

## ﴿سودی مقروض کا قرضہ زکوٰۃ کی رقم سے ادا کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بینک کے بہت بڑے سودی قرض تلے دبا ہوا ہے اگر اس شخص کا سارا قرض بعض مخلص حضرات اپنی زکوٰۃ کی رقم سے ادا کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائیگی یا نہیں؟ اور اس شخص پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سود لینا اور دینا حرام اور سخت ترین گناہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کیساتھ اعلان جنگ ہے، اس شخص پر لازم ہے کہ سچے دل سے پختہ توبہ کرے اور اب چونکہ مقروض ہے اس لئے زکوٰۃ اس پر واجب نہیں لیکن سودی قرضہ ادا کرنے کی غرض سے زکوٰۃ دیکر اس کی مدد کرنا سودی معاملہ میں تعاون کا اندیشہ ہے بلکہ سودی قرضہ لینے والوں کی ایک گونہ حوصلہ افزائی ہے، اس لئے اس کی سفارش نہیں کرتے، تاہم ضابطہ کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا ہو جائیگی۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة آیت ۲۷۵)

احل الله البیع وحرم الربوٰ......الی قوله تعالی......فاذنوا بحرب من الله ورسوله......الایة.

ولمافی تکمله فتح الملهم:(۱/۶۱۸،طبع دارالعلوم کراچی)

لعن رسول الله ﷺ آکل الربا وموکله......الخ.

ولمافی تنویرالابصار:(۲/۲۶۳،طبع سعید)فلا زکوٰة علی مکاتب ومدیون للعبدبقدر دینه الخ.

ولمافیه ایضا:(۲/۳۴۳،طبع سعید)(فیعطی)ومدیون لایملک نصابافاضلاعن دینه......الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۱۰ صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۱۸

## ﴿اپنے ولدالزنا کوزکوۃ دینا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے ایک عورت سے ناجائز تعلقات قائم ہوئے جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، زید اپنی زکوۃ اس ولدالزنا کوجسکی عمر ۱۶ سال ہے دینا چاہتا ہے، ایک مولوی صاحب نے زید کے پوچھنے پر بتایا کہ تم اس کوزکوۃ نہیں دے سکتے حالانکہ وہ مستحق زکوۃ ہے از روئے شرع رہنمائی فرماکرممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ مولوی صاحب نے صحیح بتایا ہے کہ زید کیلئے اپنے ولدالزنا کوزکوۃ دینا جائز نہیں ہے اگر اسکی مدد مقصود ہے توزکوۃ کے علاوہ مد سے اسکی مدد کرے۔

لمافی التنویرمع الدر:(۲/۳۵۴،طبع سعید)

(ولایجوز صرفهالاهل البدع)کالکرامیة(کمالایجوزدفع زکاةالزانی لولده منه)ای من الزنی.

وفی الشامیة:(قوله کمالایجوزدفع الزکاةالخ)مثل الزکاة کل صدقةواجبةالاخمس الرکاز.

ولمافی البحرالرائق:(۲/۲۴۳،طبع سعید)

فلایدفع الی المخلوق من مائه بالزنا ولا الی ولد ام ولده الذی نفاه الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفااللہ عنہ

۱۶ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۰۴

## ﴿مشینری پرزکوۃ کاحکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری ایک کرش مشین ہے جسکی قیمت چالیس لاکھ روپے ہے اوراس کی ماہانہ آمدنی ساٹھ ہزار سے اسی ہزار تک ہے کیا

اس کرش مشین یا اس کی آمدنی پر زکوٰۃ آتی ہے؟ اگر پورا سال آمدنی مختلف رہے تو کیا حکم ہے؟
اور اگر سال کے اختتام پر آمدنی میں سے کچھ بھی نہ بچا ہو تو کیا حکم ہے؟ مستفتی: سجاد حسین

﴿جواب﴾ کسی بھی مشنری پر زکوٰۃ نہیں آتی اس سے حاصل ہونے والے نفع پر زکوٰۃ آتی ہے، اس نفع کا الگ حساب رکھنا کوئی ضروری نہیں دیگر منافع کیساتھ شامل ہونے کے بعد اس شخص کو زکوٰۃ کی تاریخ میں دیکھنا چاہیے کہ اس تاریخ میں اسکی ملکیت میں کل کتنی رقم نقد یا تجارتی سامان کی صورت میں باقی ہے پس اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کرے، خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲/۲۶۴ طبع سعید)

(ولا فی ثیاب البدن)......وکذلک آلات المحترفین الآ ما یبقی اثر عینه.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته: (۳/۱۷۹۹ طبع رشیدیه)

فلا زکاة فی الجواهر......وآلات الصناعة وکتب العلم الا ان تکون لتجارة.

ولما فی الهدایة: (۱/۲۱۲ طبع رحمانیه)

واذا کان النصاب کاملا فی طرفی الحول فنقصانه فیما بین ذلک لا یسقط الزکاة......
بخلاف ما لو هلک الکل حیث یبطل حکم الحول.

ولما فی التنویر مع الدر: (۲/۳۰۲ طبع سعید)

(وشرط کمال النصاب فی طرفی الحول) فی الابتداء للانعقاد وفی الانتهاء للوجوب (فلا یضر نقصانه بینهما) فلو هلک کله بطل الحول.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ ولولدیہ

۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر:

## ﴿زر ضمانت رقم پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ میں نے ایک فلیٹ کرایہ پر لیا ہے اور مالک مکان کے پاس 50000 روپے ایڈوانس رکھے ہیں یہ رقم کرایہ میں شمار نہیں ہوتی بلکہ انکے پاس بطور ضمانت ہوتی ہے جو مکان چھوڑنے پر واپس کرتے ہیں، اب اسکا سال پورا ہونے والا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس رقم کی زکوٰۃ میں ادا کرونگا یا مالک مکان؟ مستفتی عبداللہ پنجاب کالونی

﴿جواب﴾ مذکورہ رقم بطور ضمانت کرایہ دار جمع کرتا ہے۔ مالک مکان کے پاس یہ امانت

ہوتی ہے لیکن عرفا اس رقم میں مالک مکان تصرف کرتا ہے اور تصرف کے بعد یہ رقم مالک مکان کے ذمہ قرض بن جاتی ہے، اب چاہے امانت ہو یا قرض ان دونوں صورتوں میں اسکی زکوۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی، البتہ زکوۃ کی ادائیگی اس وقت ہوگی جب یہ رقم ہاتھ میں آجائے۔

لمافی الشامی:(۲/۲۶۱،طبع سعید)

قلت:ینبغی لزومها علی المشتری فقط علی القول الذی علیه العمل الآن من ان بیع الوفاء منزل منزلة الرهن وعلیه فیکون الثمن دینا علی البائع.

ولمافی الدرالمختار:(۲/۳۰۵،طبع سعید)

ف(تجب)زکاتها اذاتم نصابا وحال الحول لکن لا فورا بل(عند قبض اربعین درهما من الدین) القوی کقرض (وبدل مال تجارة)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۸۷۷

## ﴿ایڈوانس دی ہوئی رقم پر زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے زید سے ایک مکان کرایہ پر لیا ہے مالک مکان کو ایڈوانس میں (۱۰۰۰۰۰) روپے دیئے ہیں، ڈیڑھ سال ہو چکا ہے کیا اس (۱۰۰۰۰۰) پر زکوۃ واجب ہوگی؟　　　　مستفتی: محمد سلمان

﴿جواب﴾ ایڈوانس کی شرعی حیثیت قرض کی ہے اور آپ کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ جب چاہے مالک مکان سے اپنی رقم واپس لے لے، لہٰذا ایسی صورت میں آپ پر سال گزرنے سے زکوۃ تو واجب ہوگئی ہے مگر ادائیگی اس وقت کریگا جب وہ رقم آپ کے ہاتھ میں آجائے اور اس وقت اس رقم پر گذرے ہوئے تمام سالوں کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۳۰۵،طبع سعید)

واعلم ان الدیون عند الامام ثلاثة قوی ومتوسط وضعیف فتجب زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول ،لکن لا فورا بل(عند قبض اربعین درهما من الدین )القوی کقرض (وبدل مال التجارة)فکلما قبض اربعین درهما یلزمه درهم

وفی الشامیة:(قوله کقرض )قلت الظاهر ان منه مال المرصد المشهور فی دیارنا،لانه اذا انفق المستاجر لدار الوقف علی عمارتها الضروریة بامر القاضی للضرورة الداعیة الیه یکون بمنزلة استقراض المتولی من المستاجر فاذا قبض ذلک کله او اربعین

درهما منه ولو باقتطاع ذلك من اجرة الدار تجب زكاته لمامضى السنين والناس عنه غافلون (قوله فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم) هو معنى قول الفتح والبحر ويتراخى الاداء الى ان يقبض اربعين درهما ففيها درهم وكذا فيما زاد فبحسابه اه اى فيما زاد على الاربعين من اربعين ثانية و ثالثة الى ان يبلغ مائتين ففيها خمسة دراهم الخ وفي البحر الرائق:(۲/۲۰۷، طبع سعيد)

الجواب صحيح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ      واللہ اعلم بالصواب :نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ      فتویٰ نمبر:۲۶۶۵

## ﴿نصابِ زکوۃ سونے کے تابع ہے یا چاندی کے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) اگر کسی شخص کے پاس کچھ سونا اور کچھ نقد رقم مثلاً نو (۹) ماشے سونا اور پچاس (۵۰) روپے نقد سال کے شروع اور آخر میں موجود ہوں، کیا ایسا شخص صاحب نصاب ہوگا؟ اور اگر کسی کے پاس سونا سونے کے نصاب سے کم ہو اور کچھ نقد رقم اسکے پاس آئے اور فوراً گھریلو ضرورت میں استعمال ہو جائے یا کسی کے پاس چاندی کے نصاب سے زائد رقم مثلاً پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) روپے کسی ضرورت کے لئے رکھے ہوں اور ان پر سال گزر جائے، کیا ایسے لوگ صاحب نصاب ہوں گے یا نہیں؟ کیا ان پر قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر قربانی واجب ہو اور قربانی کے جانور کی مالیت اگر اس کے کل مال کا احاطہ کرلے تو شرعاً اس کے لئے کیا حکم ہے؟

(۲) احناف کے نزدیک زکوۃ کا وہی نصاب معتبر ہے جس میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہو اور وہ چاندی کا نصاب ہے اگر ہم چاندی کے نصاب کا اعتبار کریں تو اس میں لوگوں کا نقصان ہے کیونکہ مذکورہ نصاب کی صورت میں وہ شخص بھی صاحب نصاب بن جائے گا جس کا اتنی رقم میں مہینہ بھر گزارا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

احناف کا یہ کہنا کہ اس نصاب کا اعتبار ہوگا جس میں فقراء کا فائدہ ہے، کیا یہ دلیل قطعی سے ثابت ہے یا اس میں فقراء کا لحاظ رکھا گیا ہے؟ نیز نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ساڑھے سات تولے سونے اور ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت برابر تھی یا کم زیادہ تھی؟

(۳) نوٹ کی پشت پر کیا ہے سونا ہے یا چاندی؟ اگر سونا ہے تو سونے کے نصاب میں ضم کرنا

چاہیے اور اگر چاندی ہے تو چاندی کے نصاب میں ضم کرنا چاہیے اور اگر کچھ نہ ہو نہ سونا اور نہ چاندی تو پھر اس نصاب کو اختیار کرنا چاہیے جس میں لوگ گناہ سے بچیں اور وہ نصاب کونسا ہے؟

﴿جواب﴾ اصلی اور خلقی ثمن صرف سونا اور چاندی ہے، احادیث صحیحہ سے دو سو درہم چاندی اور بیس مثقال (دینار) سونا شرعی نصاب مقرر ہونا ثابت ہے، دو سو درہم پاک و ہند میں رائج وزن کے مطابق ساڑھے باون تولہ چاندی (۶۱۲.۳۶ گرام) کے برابر ہے اور بیس مثقال (دینار) ساڑھے سات تولہ سونا (۸۷.۴۸ گرام) کے برابر ہے، لہٰذا کسی کی ملکیت میں مذکورہ وزن سے کم صرف سونا یا صرف چاندی ہو تو وہ صاحب نصاب شمار نہ ہوگا۔

لمافی اعلاء السنن:(۹/۵۷،طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

عن عاصم بن ضمرة والحارث الاعور عن علیؓ عن النبی ﷺ ببعض اول الحدیث قال: فاذا کانت لک مائتا درهم وحال علیها الحول، فلیها خمسة دراهم، ولیس علیک شیء یعنی فی الذهب حتی یکون لک عشرون دینار أفاذا کانت لک عشرون دینار أوحال علیها الحول فلیها نصف دینار.

ولمافی التنویر مع الرد:(۲/۲۹۵،طبع سعید)

نصاب الذهب عشرون مثقالاً والفضة مائتا درهم.

وفی الشامیة: قوله: عشرون مثقالاً فمادون ذلک لازکاة فیه.

البتہ کچھ سونا اور کچھ چاندی ملکیت میں ہو تو دونوں کی مجموعی قیمت کسی ایک ثمن کے نصاب تک پہنچے تب بھی وہ شخص صاحب نصاب شمار ہوگا، اسلئے کہ ثمن بذات خود غنا کے لئے کافی نہیں ہے اس کی قیمت اور مانگ سے حوائج پورا کرنا ممکن ہے، اس لئے مالیت کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۳۰۳،طبع سعید)

(و)یضم(الذهب الی الفضة)وعکسه بجامع الثمنیة(قیمة)

وفی الشامیة: ای عند الاجتماع اما عند انفراد احدهما فلا تعتبر القیمة اجماعا بدائع، لان المعتبر وزنه اداء ووجوباً کمامر. فی البدائع ایضا ان ماذکر من وجوب الضم اذالم یکن کل واحد منهما نصابا بان کان اقل، فلوکان کل منهما نصابا تاما بدون زیادة لایجب الضم بل ینبغی ان یؤدی من کل واحد زکاته.

ولمافی الهندیة:(۱/۱۷۹،طبع رشیدیه)

وتضم قیمة العروض الی الثمنین والذهب الی الفضة قیمة کذافی الکنز حتی لو ملک مائة درهم وخمسة دنانیر قیمتها مائة درهم تجب الزکاة عنده خلافا لهما ولو ملک

مائة درهم عشرة دنانير او مائة وخمسين درهما وخمسة دنانير او خمسة عشر دينار او خمسين درهما تضم اجماعا.

موجودہ دور میں ثمن عرفی یعنی ہر ملک کی کرنسی اور نوٹ کو بھی چونکہ یہی مقام حاصل ہے اس لئے اتنی مالیت کے نوٹ جس کے پاس ہوں جس سے ثمن خلقی یعنی سونے یا چاندی میں سے کسی ایک کا بھی نصاب پورا ہو سکے تو اس سے بھی وہ شخص صاحب نصاب شمار ہوگا، اس میں فقیر اور غنی دونوں کا فائدہ ہے اور زکوۃ جو کہ فرض حکم ہے اور دین اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اس کی اہمیت بھی مضمر ہے اور احتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے۔

نوٹ کی پشت پر کسی وقت سونا یا چاندی ہوتا تھا، لیکن اب نہیں رہا اس دور میں نوٹ کو سونے اور چاندی کی طرح عرف عام نے مالیت کا مقام دیا ہے، اس لئے اس کی حیثیت اب صرف رسید کی نہ رہی بلکہ یہ ثمن عرفی ہے اور تمام تر معاملات اسی سے ہو رہے ہیں، اس لئے سونا، چاندی کچھ بھی کوئی نہ رکھے تو صرف نوٹ سے بھی انسان غنی ہو جاتا ہے لیکن کتنی مالیت کے نوٹ ہوں جس سے انسان غنی صاحب نصاب شمار ہو؟ ظاہر ہے ثمن خلقی یعنی سونے چاندی کی مالیت کے ساتھ موازنہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے اور سونا اور چاندی دونوں ثمن خلقی ہیں لیکن ہر ایک دوسرے سے ممتاز مختلف اوصاف کا حامل ہے اسلئے ہر ایک سے متعلق چاہتیں اور ضروریات بھی مختلف ہیں، لازمی طور پر ان دونوں کی مالیت اور قیمت میں فرق رہتا ہے، آپ ﷺ کے دور میں بیس دینار سونے کی مالیت شاید دو سو درہم چاندی کی مالیت کے برابر تھی جسکی وجہ سے مذکورہ مقدار نصاب مقرر ہوا۔

جیسا کہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فقہی مقالات میں تحریر فرماتے ہیں:

''جب کرنسی نوٹ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائیں تو ان پر بالاتفاق زکوۃ واجب ہو جائیگی اور چونکہ اب یہ نوٹ قرض کی دستاویز کی حیثیت نہیں رکھتے، اسلئے ان نوٹوں پر قرض کی زکوۃ کے احکام بھی جاری نہیں ہوں گے بلکہ اس پر مروجہ سکوں کے احکام جاری ہوں گے، وجوب زکوۃ کے مسئلہ میں مروجہ سکوں کا حکم سامان تجارت کی طرح ہے یعنی جس طرح سامان تجارت کی مالیت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچ جائے تو ان پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے، بعینہ یہی حکم مروجہ سکوں اور موجودہ کرنسی نوٹوں کا ہے'' (۱/۳۱، طبع میمن اسلامک پبلشر)

اسلام اور جدید معیشت وتجارت میں فرماتے ہیں: (ص ۱۳۰، طبع معارف القرآن کراچی)

''صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں بلکہ خود مال ہیں، سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی ہیں (ایک سطر کے بعد فرماتے ہیں) نوٹ چونکہ خود مال ہیں، لہٰذا ان کے دینے سے زکوۃ ادا ہو جاتی ہے اور ان کا آپس میں تبادلہ بیع صرف نہ ہوگا''

آج کل سونا، چاندی دونوں کی مالیت میں اچھا خاصہ فرق ہے لیکن ثمن عرفی (نوٹ) کی مالیت کا موازنہ تو کسی ایک کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے، فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ جو انفع للفقراء ہو بالفاظ دیگر جس کی مالیت جلدی نصاب تک پہنچے اس کا اعتبار ہوگا، یہی احتیاط کا تقاضا ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی شرح جتنی زیادہ ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکتوں کا نزول بھی ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲/۲۹۹، طبع سعید)

(مقوما باحدهما) ان استویا، فلو احدهما اروج تعین التقویم به ولو بلغ باحدهما نصابا دون الأخر تعین ما یبلغ به، ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا وبالآخر اقل قومه بالانفع للفقیر.

یہاں پر بعض لوگوں کو اشکال رہتا ہے جس طرح سوال میں بھی ہوا ہے کہ اس طرح تو کم آمدنی والے لوگ بھی شرعا صاحب نصاب (غنی) قرار پاتے ہیں، بڑی مشکل سے ایک مہینہ کا خرچہ بھی پاس نہیں ہوتا ان کو بھی شرعی حکم متوجہ ہوتا ہے کہ وہ بھی زکوۃ ادا کریں، حالانکہ مہنگائی کے اس دور میں چاہیے تھا کہ ایسے لوگوں کو بھی زکوۃ دی جائے، قربانی کے موقع پر جانور خریدنے جائے تو پورا مال دیکر ہی جانور لا سکتا ہے چند لمحوں میں امیر (غنی) فقیر بن جاتا ہے۔

یہ اشکال واقعی ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اشکال فیصلہ کے صرف ایک جانب پر غور کرنے سے پیدا ہوا ہے فقہاء کرام نے جو فیصلہ کیا اس کے ہر پہلو پر غور کیا جائے تو یہ اشکال پیدا نہ ہو، سائل نے مبالغہ کے ساتھ مشکل کو ظاہر کیا ہے۔ اول تو یہ تسلیم نہیں ہے کہ ثمن عرفی نوٹ سے چاندی کا نصاب پورا کیا جائے تو کم آمدنی والے لوگ مشکل میں پڑ جاتے ہیں کیونکہ صاحب نصاب (غنی) کا لقب باعث افتخار ہے، اس کے علاوہ اس کے پاس موجود مال زکوۃ سے زکوۃ اڑھائی فیصد ادا کرنا کوئی باعث بوجھ نہیں ہے مال کم ہے تو زکوۃ بھی اسی نسبت سے ادا کرنے کا حکم ہے، قربانی کے لئے بھی ضروری نہیں ہے کہ مستقل جانور خریدے حصہ بھی خرید سکتا ہے

اور مناسب دام کی بکری بھی بآسانی مل جاتی ہے۔

بالفرض ثمن عرفی نوٹ وغیرہ اگر سونے کے تابع کرلیں کہ ساڑھے سات تولہ سونے کی مالیت کے برابر کسی کے پاس نوٹ ہوں گے تو صاحب نصاب ہوگا ورنہ نہیں، اتفاق ہے آج کل سونا فی تولہ (۳۵۰۰۰) پینتیس ہزار کا ہے، لہٰذا نوٹ وغیرہ کو سونے کے تابع کرنے کی صورت میں جس شخص کے پاس کم از کم دولاکھ باسٹھ ہزار پانچ سوروپے ہوں تو وہ صاحب نصاب غنی شمار ہوگا ورنہ نہیں، مذکورہ مقدار سے کم روپوں کا مالک فقیر ہوگا اور زکوٰۃ لینے کا حقدار ہوگا اگرچہ ضرورت کیلئے اس کے پاس گاڑی بھی ہو، لہویات کیلئے اس کے گھر میں ٹی وی، وی سی آر اور کیبل کی لعنت بھی چلتی ہو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہوگا اسلئے کہ وہ فقیر شمار ہوگا پھر ان غریبوں کا کیا بنے گا جو دووقت کی روٹی کے لئے پریشان ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ سونے کے نصاب کے برابر مالیت کو معیار نصاب بنانے سے زکوٰۃ کی شرح کم ہوجائیگی جس میں غریبوں کا دنیوی نقصان ہے اور امیروں کا دنیوی، اخروی دونوں نقصان ہیں، آپ ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ میں قسم کھا کر بتاتا ہوں کہ صدقہ سے مال گھٹتا نہیں ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے سائل کے اشکالات کے علاوہ مطلوبہ مسائل کے جوابات بھی واضح ہیں، لہٰذا اب نمبروار جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) جس کے پاس نوماشے سونا جس کی مالیت تقریباً ۲۷۰۰۰ روپے بنتی ہے اور پچاس روپے بھی سال کے شروع اور آخر میں موجود ہوں تو وہ شخص غنی شمار ہوگا زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی، سونا چاندی اور نقد روپے زکوٰۃ کی تاریخ سے پہلے خرچ ہوجائیں تو زکوٰۃ واجب نہیں، قربانی کی تاریخ سے پہلے خرچ ہوجائیں تو قربانی واجب نہیں، تاریخ آجائے اور خرچ نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے اور قربانی بھی، مستقبل کی ضرورت کا اعتبار نہیں ہے اور قربانی کے لئے جانور ۲۷۰۰۰ روپے کا کیوں خرید لیتا ہے، تین ہزار میں بھی واجب حکم پر عمل ہوجاتا ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲/۲۶۷، طبع سعید)

(والثمنیۃ المال کالدراھم والدنانیر) لتعینھما للتجارۃ باصل الخلقۃ فتلزم الزکاۃ کیفما امسکھما ولو للنفقۃ.

ولمافی الشامی:(۲/۲۶۲،طبع سعید)

اذاامسکہ لینفق منہ کل ما یحتاجہ فحال الحول وقدبقی معہ منہ نصاب فانہ یزکی ذلک الباقی وان کان قصدہ الانفاق منہ ایضا فی المستقبل لعدم استحقاق صرفہ الی حوائجہ الاصلیہ وقت حولان الحول۔

(۲)اور(۳) کا جواب مذکورہ بالا تفصیلی بیان میں گزرا، واضح رہے کہ ہر حکم شرعی کیلئے دلیل کا قطعی الثبوت ہونا ضروری نہیں ہے۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عدنان خدابخش

۱۰صفرالخیر۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۳۲۵

## ﴿سونے اور چاندی میں مقدارزکوۃ کاثبوت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ سونے اور چاندی میں زکوۃ کی مقدار اڑھائی فیصد کا ثبوت اگر احادیث سے ہے تو مدلل جواب دیجئے۔

﴿جواب﴾ سونے اور چاندی میں زکوۃ کی مقدار اڑھائی فیصد کا ثبوت احادیث میں ہے، چنانچہ درج ذیل احادیث اس پر شاہد ہیں۔

لمافی صحیح للبخاری:(۱/۱۹۶،طبع قدیمی کراچی)

عن ابی سعید الخدریؓ ان رسول اللہﷺقال لیس فی ما دون خمسة اوسق من التمر صدقة ولیس فیما دون خمسة اواق من الورق صدقة ولیس فی مادون خمس ذودمن الابل صدقة۔

ولمافی سنن الترمذی:(۱/۲۲۲،طبع فاروقی ملتان)

عن علیؓ قال قال رسول اللہ ﷺقدعفوت عن صدقةالخیل والرقیق فهاتوا صدقة الرقةمن کل اربعین درهما درهم ولیس لی فی تسعین ومائةشئ فاذابلغت مأتین ففیها خمسةدراهم۔

ولمافی سنن ابی داؤد:(۱/۲۲۲،طبع امدادیہ ملتان)

عن عمرو بن یحی المازنی عن ابیہ قال سمعت ابا سعید الخدریؓ یقول قال رسول اللہﷺلیس فیما دون خمس ذود صدقة ولیس فیما دون خمس اواق صدقة ولیس فیما دون خمسةاوسق صدقة۔

ولمافی سنن الکبری للبیهقی بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ:(۲/۷۶۱،دارالفکر)

عن علیؓ عن النبیﷺ قال اذاکانت لک مائتا درهم وحال علیه الحول ففیها خمسة دراهم ولیس علیک شئی یعنی فی الذهب حتی یکون لک عشرون دینارا فاذا کانت لک عشرون دینارا وحال علیها الحول ففیها نصف دینار۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:بلال احمد

۲۱ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶۸۸

## ﴿ادائیگی زکوٰۃ کے وقت بتانا ضروری نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جسکو زکوٰۃ کی رقم دینی ہو اسکو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے؟

﴿جواب﴾ جسکو زکوٰۃ کی رقم دینی ہو اسکو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، دل میں زکوٰۃ کی نیت کا ہونا ضروری ہے زبان سے کچھ کہے بغیر یا ہدیہ یا تحفہ کا نام دیکر بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے بشرطیکہ لینے والا مستحق زکوٰۃ ہو۔

لما فی مراقی الفلاح:(ص۲۶۲،طبع قدیمی)
ولا يشترط علم الفقير انها زكاة على الاصح حتى لو اعطاه شيئا وسماه هبة او قرضا ونوى به الزكاة صحت.

ولما فی الهندية:(۱/۱۷۱،طبع رشيديه كوئٹه)
ومن اعطى مسكينا دراهم وسماها هبة او قرضا ونوى الزكاة فانها تجزيه وهو الأصح.

ولما فی الشامی:(۲/۲۶۸،طبع سعيد)
(نية)اشار الى انه لااعتبار للتسمية فلو سماها هبة او قرضا تجزيه فی الاصح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۷۵

## ﴿نصاب سے کم سونے کی زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاتون کے پاس چار تولہ سونا ہے، اس خاتون کے پاس درمیان سال کبھی پانچ سو روپے کبھی کم یا زیادہ اور کبھی پیسے بالکل نہیں ہوتے کیا ان پر زکوٰۃ واجب ہے، نیز مذکورہ خاتون زکوٰۃ لے سکتی ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اگر خاتون کے پاس صرف چار تولے سونا ہے اور اسکے ساتھ نقد رقم، چاندی یا سامان تجارت بالکل نہیں ہے تو صاحب نصاب نہ ہونے کیوجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر چار تولے سونے کے ساتھ تھوڑی سی بھی نقد رقم، چاندی یا سامان تجارت آجائے تو چار تولے سونے اور دوسرے زائد سامان کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جانے کیوجہ سے نصاب پورا ہو جائیگا، لہٰذا جس دن خاتون کے پاس چار تولے سونے کے ساتھ نقد رقم

چاندی یا سامان تجارت آیا اسی دن یہ خاتون صاحب نصاب بن جائیں گی۔

اب اگلے سال جب یہ تاریخ آئے گی تو دیکھا جائیگا کہ خاتون کے پاس 4 تولے سونے کے ساتھ نقد رقم، چاندی یا سامان تجارت میں سے کچھ ہے؟ اگر کچھ ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور درمیان سال نقد رقم، چاندی یا سامان تجارت کے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا، نیز اگر خاتون صاحب نصاب نہیں ہے تو ان کو زکوٰۃ دینے کی گنجائش ہے۔

لما فی بدائع الصنائع:(۱۸/۲،طبع سعید)

روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لعلی رضی اللہ عنہ لیس علیک فی الذھب زکوٰۃ مالم یبلغ عشرین مثقالا فاذا بلغ عشرین مثقالا ففیہ نصف مثقال۔

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :محمد ضیاء الدین

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ فتوی نمبر :۸۷۰

## ﴿گھر کی تعمیر کے لئے رکھی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس تین لاکھ روپے ہیں اس پر سال بھی گزر چکا ہے واضح رہے کہ رقم میں نے اپنے گھر کی تعمیر کے لئے رکھی ہے عرض یہ ہے کہ اس رقم پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ مستفتی: سمیع اللہ جمیل صاحب

﴿جواب﴾ نقد روپے، سونا، چاندی اگر بقدر نصاب ہے خواہ جس مقصد اور غرض کیلئے ہو سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا آپکی رقم اگر چہ مکان بنانے کے لئے ہے اب اس میں سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے ہاں آپ سال گزرنے سے پہلے پہلے اس رقم سے تعمیر کے لئے سامان وغیرہ خریدتے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوتی۔

لما فی البدائع :(۱۱/۲ مطبع سعید)

الا ان الاعداد للتجارۃ فی الأثمان المطلقۃ من الذھب والفضۃ ثابت بأصل الخلقۃ لانھا لاتصلح للانتفاع باعیانھا فی دفع الحوائج الاصلیۃ فلا حاجۃ الی الاعداد من العبد للتجارۃ بالنیۃ اذ النیۃ للتعیین وھی متعینۃ للتجارۃ باصل الخلقۃ فلا حاجۃ الی التعیین بالنیۃ فتجب الزکاۃ فیھا نوی التجارۃ او لم ینو اصلا او نوی النفقۃ۔

ولما فی رد المحتار:(۱۶۸/۲-۱۶۹ مطبع امدادیہ)

ماقررہ ابن ملک من ان المراد بالاول النصاب من احد النقدین المستحق الصرف

الیها ، فیکون التقیید بالنماء احترازا عن اعیانها والتقیید بالحوائج الاصلیه احترازا عن اثمانها فاذا کان معه دراهم امسکها بنیة صرفها الی حاجته الاصلیة لا تجب الزکاة فیها اذا حال الحول وهی عنده لکن اعترضه فی البحر بقوله :ویخالفه ما فی المعراج فی فصل زکاة العروض ان الزکاة تجب فی النقد کیفما امسکه للنماء او للنفقة وکذا فی البدائع فی بحث النماء التقدیری قلت واقره فی النهر والشرنبلالیة وشرح المقدسی وسیصرح به الشارح ایضا ونحوه قوله فی السراج:سواء امسکه للتجارة او غیرها وکذاقوله فی التاترخانیة:نوی التجارة اولا.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :عبداللہ عفا اللہ عنہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۶۰

## ﴿زکوٰۃ میں سونا چاندی کی موجودہ قیمت کا اعتبار ہوتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ذمہ گزشتہ چار سال کی زکوٰۃ ہے اب میں ادا کرنا چاہتا ہوں، عرض یہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں سے ہر سال جو سونا چاندی کی قیمت تھی اس اعتبار سے زکوٰۃ ادا کروں یا فی الحال جو اس کی قیمت ہے اس اعتبار سے؟

﴿جواب﴾ فقہاء کرام سے دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں راجح یہ ہے کہ ادا کرنے کے وقت کی قیمت کا اعتبار کیا جائے کیونکہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے اور مالدار کے لئے حساب کرنے میں آسانی ہے۔

لما فی بدائع الصنائع:(۲/۲۲،طبع سعید)

وانما له ولایة النقل الی القیمة یوم الاداء فیعتبر قیمتها یوم الاداء والصحیح ان هذا مذهب جمیع اصحابنا.

ولما فی الدر المختار:(۲/۲۱۱،طبع امدادیه)

وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعا وهو الاصح.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصوب :عبداللہ چارسدوی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۶۶

## ﴿دَین کی زکوٰۃ مالک پر ہے یا مقروض پر؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا کسی پر قرضہ ہے تین

سال گزر گئے، غرض یہ ہے کہ اس رقم کی تین سالہ زکوٰۃ میں ادا کرونگا یا میرا مقروض؟

﴿جواب﴾ تینوں سالوں کی زکوٰۃ آپکے ذمہ ہے مقروض کے ذمہ نہیں ہے، البتہ ایسی صورت میں آپ کو جب رقم ملے تو زکوٰۃ ادا کردیں یعنی تاخیر کی گنجائش ہے۔

لمافی الهداية:(۲۰۳/۱،طبع رحمانيه)

ولوكان الدين على مقر ملئ اومعسر تجب الزكاة لامكان الوصول اليه ابتداء اوبواسطة التحصيل.

ولمافی الهندية:(۱۷۵/۱،طبع رشيديه)

وفی مقر به تجب مطلقا سواء كان مليئا اومعسرا اومفلسا كذافی الكافی.

ولمافی التنويرمع الدر:(۲۶۶/۲-۲۶۷،طبع سعيد)

(ولوكان الدين على مقر ملئ او)على(معسراومفلس)......(او)على(جاحد عليه بينة) ......اوعلم به قاض)......(فوصل الى ملكه لزم الزكاة ما مضى)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر: ۷۸۹

## ﴿نابالغ بچیوں کے زیورات میں زکوٰۃ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ والدین نابالغ بچیوں کو سونے کے زیورات پہناتے ہیں، اب ایک صاحب کی توجہ دلانے سے معلوم ہوا کہ اگر بچیوں کو زیورات کا مالک نہ بنایا گیا ہو بلکہ صرف پہنانے کیلئے دیئے ہوں تو اسکی زکوٰۃ بھی والدین پر واجب ہوتی ہے، لہٰذا یہ بات درست ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد ہارون صاحب

﴿جواب﴾ نابالغ کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے یعنی وہ مال واقعی انکی ملکیت میں ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے، صرف پہننے کی غرض سے زیورات بچوں کو دینے سے وہ مالک قرار نہیں پاتے بلکہ یہ زیورات ابھی تک اصل مالک پہنانے والے کی ملکیت میں ہیں والد ہو خواہ والدہ ہو اور زکوٰۃ بھی اسی پر فرض ہے۔

لمافی الدرالمختار:(۲۵۸/۲،طبع سعيد)وشرط افتراضها عقل وبلوغ واسلام وحرية.

وفی الشامية(قوله عقل وبلوغ) فلاتجب على مجنون وصبی لانها عبادة محضة وليسا مخاطبين بها.

ولما في البحر:(۲/۲۰۲،طبع سعید)

(وشرط وجوبها العقل والبلوغ والاسلام والحرية):اى شرط افتراضها لانها فريضة محكمة قطعية.

ولما في الهندية:(۱/۱۷۲-۱۷۱،طبع رشیدیه)

(واما شروط وجوبها ومنها)الحرية حتى لاتجب الزكوة على العبد ..... (ومنها الاسلام) حتى لاتجب على الكافر كذا في البدائع.ثم الاسلام كما هو شرط الوجوب شرط لبقاء الزكوة عندنا ..... (ومنها العقل والبلوغ )فليس الزكوة على الصبي ومجنون.....وكذا الصبي اذا بلغ يعتبر ابتداء الحول من وقت بلوغه هكذا في التبيين.

واللہ اعلم بالصواب: محمد ادریس غفرلہ الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۷۰۳ ۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ

## ﴿مشترکہ کمائی پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ چند بھائیوں کی مجموعی کمائی نصاب زکوٰۃ کو پہنچتی ہے، اگر تقسیم کیا جائے تو ہر ایک بھائی کی علیحدہ ملکیت زکوٰۃ کے نصاب کو نہیں پہنچتی، ایسی حالت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد شعیب صاحب

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کے واجب ہونے کیلئے صاحب نصاب بننے میں ہر شخص کی انفرادی ملکیت کا اعتبار ہوتا ہے اور بھائیوں کی ملکیت شرعاً الگ الگ شمار ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر واقعتاً ہر بھائی کا حصہ الگ الگ زکوٰۃ کے نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت تک نہیں پہنچتا تو ایسی صورت میں کسی بھی بھائی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لما في التنوير مع الدر:(۲/۳۰۲،طبع سعید)

(ولاتجب)الزكوة عندنا(في نصاب)مشترك(من سائمة)ومال تجارة..... وان تعدد النصاب تجب اجماعا.

وفي الشامية:(قوله في نصاب مشترك ) المراد ان يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم أحد المالين الى الآخر بحيث لايبلغ مال كل منهما بانفراده نصابا.

ولما في التاتارخانية:(۲/۲۲۲،طبع قديمی)

(شرح الطحاوی )فان كان نصيب كل واحد منهما على الانفراد يبلغ نصابا كاملا تجب الزكاة والافلا سواء كانت شركتهما شركة عنان او شركة مفاوضة أوشركة بالارث وغيره

من اسباب الملک، وسواء كانت في مرعى واحد أو في مراعي مختلفة.

ولما في الهندية:(۱/۱۷۲ طبع رشيديه)

ومنها كون المال نصابا فلا تجب في اقل منه هكذا في العيني.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد ادریس چارسدوی

۲ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۷۰۶

## ﴿مہر کی زکوٰۃ بیوی کے ذمہ ہے یا شوہر کے ذمہ؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں مہر کی رقم عام طور پر موجل عند الطلب ہوتی ہے جو کہ اکثر کئی سالوں تک ادا نہیں کی جاتی ہے، لہٰذا مہر کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز شوہر پر واجب ہوگی یا بیوی پر؟

﴿جواب﴾ بقدر نصاب مہر کی رقم بیوی کے قبضہ میں آجائے اور سال گزر جانے کے بعد بھی بقدر نصاب باقی رہے، تو اب بیوی پر زکوٰۃ واجب ہوگی، شوہر اگر صاحب نصاب ہے اور زکوٰۃ اس پر واجب ہے تو پورے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہوگا، البتہ اسی سال یا قریب میں بیوی کا مہر ادا کرنے کا ارادہ ہے تو اتنی مقدار کی رقم اپنے مال سے منہا کر سکتا ہے، اب اگر باقی ماندہ مال نصاب تک پہنچتا ہے تو باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا ورنہ نہیں۔

لما في الشامي:(۲/۳۰۶ طبع سعيد)

قلت:ولعل وجه الاول كون دين المهر دينا ضعيفا لانه ليس بدل مال ولهذا لاتجب زكاته حتي يقبض ويحول عليه حول جديد لمهر قبل القبض لم ينعقد نصابا في حق الوجوب.

لما في البحر:(۲/۲۰۷ طبع سعيد)

فنقول قسم ابوحنيفة الدين على ثلاثة أقسام قوى.....ومتوسط.....وضعيف وهو بدل ماليس بمال كالمهر والوصية...... وفي الضعيف لا تجب مالم يقبض نصابا ويحول الحول بعد القبض عليه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: محمد ادریس چارسدوی عفا اللہ عنہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۷۰۴

## ﴿بیوی اپنی زکوٰۃ شوہر کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر ادا نہیں کر سکتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس آٹھ تولہ

سونا ہے جو مجھے مہر میں ملا تھا میرے شوہر دبئی میں کام کرتے ہیں انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم اپنی چھوٹی بیٹی کو دو تولہ سونا ہبہ کردیں گے، تو اس سے ہم پر زکوۃ لازم نہ ہوگی، میں نے حکم کی تعمیل کی لیکن بچی نو سال کی عمر کی ہے اس لئے ہم نے اس کو سونا نہیں دیا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح کرنا جائز ہے؟ اس صورت میں مجھ سے زکوۃ ساقط ہو جائیگی؟ اگر زکوۃ ساقط نہیں ہوئی ہے تو میں اپنے شوہر کے مال سے خفیہ طور پر زکوۃ ادا کرسکتی ہوں؟ جبکہ وہ اجازت نہیں دیتے اس صورت میں گناہ کس پر ہوگا؟ مستفتیہ: ایک رشتہ دار

﴿جواب﴾ سونا آپ کی ملکیت ہے تو زکوۃ بھی آپ ہی پر واجب ہے۔ زکوۃ ادا کرنے کیلئے آپ کے پاس ذاتی روپے نہیں ہیں تو کچھ سونا بیچ کر زکوۃ ادا کریں یا شوہر آپ کو پیسے ہبہ کر کے دیں۔ بہر حال زکوۃ ادا کرنا آپ کے شوہر کی ذمہ داری نہیں ہے آپ کی ذمہ داری ہے۔ اور شوہر کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے دو تولہ سونا اپنی بیٹی کو آپ نے ہبہ کر کے اگر دیدیا تو آئندہ آپ پر سونے کی وجہ سے زکوۃ واجب نہ ہوگی۔ البتہ گزشتہ واجب شدہ زکوۃ اگر ذمہ باقی ہے تو وہ ساقط نہ ہوگی وہ ادا کرلیں۔ لیکن ہبہ میں بیٹی کو باقاعدہ مالک وقابض بنانا ضروری ہے چونکہ لڑکی نو سال کی ہے تو کم از کم ایک بار اس کے ہاتھ میں دیکر بتادیں کہ یہ آپکی اپنی چیز ہے بعد میں حفاظت کی غرض سے بیشک اپنے پاس رکھیں۔ لیکن یہ سونا پھر بچی کا ہی ہوگا آپ کیلئے استعمال کرنا یا بیچنا جائز نہ ہوگا۔ ہاں وہ بالغ ہو جائے تو اسکی اجازت سے فروخت کرنا بھی جائز ہوگا۔

لمافی الهداية:(١٨٥/١،طبع رحمانيه)

الزكوة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم اذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول

ولما في الدر المختار:(٣٠٨/٢،طبع سعيد)

لازكاة على الواهب اتفاقا لعدم الملك وهي من الحيل ومنها أن يهبه لطفله قبل التمام بيوم

ولما في الهنديه:(٥٥٧/١،طبع رشيديه،كوئته)

وليس لها ان تعطى شيأ من بيته بغير اذنه ولاتصوم غير فرض.كذافي فتاوى قاضي خان

ولما في الجوهره:(٣٢٢،طبع مير محمد)

(واذا قبض الصبى الهبة لنفسه جاز) يعني اذا كان يعقل لانه نفع في حقه

ولما في الهندية:(٣٧٤/٤،طبع رشيديه)

ومنها أن يكون الموهوب مقبوضا حتى لايثبت الملك للموهوب له قبل القبض

ولمافی التنویر:(۶۹۴/۵_۶۹۵ طبع سعید کراچی)

وھبۃ من لہ ولایۃ علی الطفل فی الجملۃ تتم بالعقد وان وھب لہ اجنبی یتم بقبض ولیہ لوفی حجرھاوبقبضہ لومیزاای یعقل التحصیل.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق غفرلہ ولولدیہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۲۵ھ — فتویٰ نمبر:۳۹۰۹

## ﴿ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادانہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل حکومت کی جانب سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں اور انسان ان کی ادائیگی پر مجبور ہو جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہوئی ہو، ان ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا شمار ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ فرض حکم ہے یعنی عبادت ہے اور ٹیکس حکومت کی طرف سے عائد ہوتا ہے کوئی مستقل شرعی حکم نہیں ہے، اسلئے ٹیکس کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، مستقل طور پر ادا کرنا ضروری ہے۔

لمافی ردالمحتار:(۳۱۰/۲،طبع سعید)

واعلم ان بعض فسقۃ التجار یظنّ أن ما یوخذ من المکس یحسب عنہ اذانوی بہ الزکوٰۃ وھذا ظن باطل قال فی البزازیۃ اذا نوی أن یکون المکس زکاۃ فالصحیح أنہ لا یقع علی الزکاۃ کذا قال الامام السرخی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۹۶

## ﴿جسکا مال حرام ہو اس سے زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس شخص کا سارا مال یا بعض مال حرام ہو تو ایسے شخص سے زکوٰۃ، صدقات، ہدیہ، وغیرہ قبول کرنا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ کسی شخص کا پورا مال یا آدھے سے زیادہ مال حرام ہو تو اسکا ہدیہ، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ وصول کرنا مناسب نہیں ہے لیکن اگر وصول شدہ مال معلوم ہو کہ حلال کا ہے تو پھر

کوئی حرج نہیں ہے اور کم مال حرام ہو اور زیادہ حلال ہو تو پھر صدقات زکوٰۃ ہدیہ وغیرہ وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ولما فی الهندية :(۳۴۲/۵،طبع رشيديه)

أهدى الى رجل شيئا أو أضافه ان كان غالب ماله من الحلال فلابأس الاأن يعلم بانه حرام فان كان الغالب هوالحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولاياكل الطعام الاان يخبره بانه حلال ورثته أو استقرضته من رجل كذافي الينابيع.وفي الرد:(۲۱۹/۲،امداديه)

ولما في الولوالجية:(۳۳۶/۲،طبع فاروقي پشاور)

رجل اهدى الى انسان أوأضافه فان كان غالبا،قال المهدى حراما لا ينبغي ان يقبل ولاياكل من طعامه مالم يخبره ان ذالك المال حلال اوورثه اواستقرضه وان كان غالب ماله حلالا لابأس بذلك مالم يتبين عنده انه حرام لان اموال الناس لاتخلو عن قليل حرام وتخلو عن كثيره فكان العبرة للغالب.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب :خلیل اللہ دیروی عفااللہ عنہ

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۲۱۳

## ﴿اپنے مال سے کسی کو بتائے بغیر اسکی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی شخص کا بھائی یا والد، صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، یہ شخص انہیں زکوٰۃ ادا کرنے کو کہتا ہے لیکن وہ اسکی بات پر عمل نہیں کرتے، یہ شخص ان کو بتائے بغیر انکی طرف سے زکوٰۃ کی نیت کرکے اپنے مال سے کچھ رقم مستحقین زکوٰۃ کو دیتا ہے تو انکی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نماز کے بعد زکوٰۃ دین اسلام کا دوسرا بڑا حکم ہے،اسکی ادائیگی کیلئے اصل ذمہ دار کی نیت شرط ہے، لہٰذا صرف اسی کے ادا کرنے سے یا اسکی اجازت سے اسکے وکیل کے ادا کرنے سے ہی ادا ہو سکتی ہے،اسکے بغیر فرض ذمہ سے ساقط نہیں ہوگا۔

مذکورہ صورت میں ادا کرنے والے کو والد یا بھائی نے جس پر زکوٰۃ فرض ہے اگر اجازت نہ دی ہے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

لما في البحر:(۲۱۰/۲،طبع سعيد)

ولوادى زكوة غيره بغير أمره فبلغه فاجاز لم يجز لانها وجدت نفاذا على

المتصدق لانها ملكه ولم يصر نائباعن غيره فنفذت عليه ولوتصدق عنه بأمره جاز.

ولمافی التاتارخانية:(۲/۲۱۴،طبع قديمى)

من أدى زكاة مال غيره من مال نفسه بامرمن عليه الزكاة جاز بخلاف مااذاأدى بغيرامره ثم اجازشرح الطحاوى ولوتصدق عن غيره بغيرامره جازت الصدقة عن نفسه ولاتجوز عمانوى عنه وان اجازه ورضى به .وهذااذاكان المال الذى تصدق به مال نفسه ،فامااذاكان المال مال المتصدق عنه فان اجازه جازان كان المال قائما،وان كان هالكاجازعن التطوع.

ولمافی الولوالجية:(۱/۱۸۱،طبع فاروقی پشاور)

رجل ادى عن رجل زكاة ماله بغير امره فبلغه فاجازلم تسقط عنه الاأنه بأمره قبل ذلك ؛لان الصدقة وقعت عن المتصدق،لانها وجدت نفاذاعليه،فلاتتوقف على الاجازة ، فان امره قبل ذالك جاز،لانه امره بتمليك المال عنه ثم يدفع زكاته عنه، فاذادفع الى الفقير ناب قبضه مناب قبض الآمر،ثم صح قبض الزكاة عن ملكه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:خلیل اللہ دیروی عفا اللہ عنہ

۲۹جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۵۹۵

## ﴿اپنے کاروبار کی مشینری اور درمیان سال خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرے پاس کچھ رقم تھی جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچ رہی تھی ،اس رقم پر سال گزرنے سے ایک ماہ پہلے میں نے اپنے کاروبار کیلئے ایک مشینری خریدی، پوچھنا یہ ہے کہ سال پورا ہونے پر اس رقم یا مشینری پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صاحب نصاب بننے کے بعد حولان حول (سال کا گزرنا) زکوٰۃ کے وجوب کیلئے شرط ہے، مذکورہ صورت میں چونکہ سال گزرنے سے پہلے رقم خرچ ہوئی ہے، لہٰذا اس رقم میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور مشینری بھی اگر تجارت کی نیت سے نہیں بلکہ اپنے کاروبار کیلئے خریدی ہو تو اسپر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لمافی الهداية:(۱/۲۰۱-۲۰۲،طبع رحمانيه)

ولا بد من الحول لانه لابدمن مدة يتحقق فيهاالنماء،وقدرها الشرع بالحول لقوله صلى الله عليه وسلم لازكوٰة فى مال حتىٰ يحول عليه الحول ولانه الممكن به من الاستنماء لاشتماله على الفصول المختلفة والغالب تفاوت الاسعارفيهافادير الحكم عليه..... وليس فى دورالسكنىٰ وثياب البدن زكوٰة والات المحترفين لماقلنا.

ولما فی الدر:(۲/۱۸۳،طبع امدادیه)
وكذلك آلات المحترفين الا مايبقى أثرعينه كالعصفر لدبغ الجلدففيه الزكوٰة،بخلاف
مالايبقى كصابون يساوى نصبا وان حال الحول.
وفي الشامية:قوله:(وكذلك آلات المحترفين )أى سواء كانت ممالاتستهلك عينه
في الانتفاع كالقدوم والمبرد أوتستهلك ،لكن هذامنه مالايبقى أثرعينه كصابون
وجرض الغسال ، ومنه مايبقى كعصفروزعفران لصباغ ودهن وعفص لدباغ فلازكوٰة
في الاوليين ،لان مايأخذه من الاجرة بمقابلة العمل.وفي الاخيرالزكوٰة اذاحال عليه
الحول ،لأن المأخوذبمقابلة العين كمافي الفتح.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:خلیل اللہ دیروی عفااللہ عنہ

۱۳رجب المرجب۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۶۵۲

## ﴿گھوڑوں میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ماذايقول العلماء الكرام والفضلاء العظام(دام اقبالهم)في الاختلاف بين اصحاب الترجيح في زكاةالخيل رجح البعض قول الامام ابي يوسف ومحمدؒ وقالوالازكاةفي الخيل كما جزم به في الكنز ورجح البعض قول الامام ابي حنيفةؒ وقالوابوجوب الزكاة في الخيل السائمةالمختلطةمن الذكور والاناث فاى القولين أصح؟وايهماالمختار للفتوى؟ مستفتی:قیام الدین التاجکستانی

﴿جواب﴾من القواعدفي اصول الافتاء اذاوجدقولان معارضان وقدرجح كل منهماوكان الترجيحان من الرجلين المختلفين لابدمن رعايةالمرجحات المذكورةفي كتب هذاالفن منهااذاكان احدالتصحيحين صريحاوالآخرالتزاما يعمل بالصريح وايضا ان كان احد التصحيحين بلفظ الاقوى بالنسبة الى تصحيح الآخريرجح مالفظه اقوى وهذه المرجحات وقعت في قول الصاحبين ولهذا قولهما راجح وان كان الاحتياط في قول الامام،وان كانت الخيل للتجارة فحكمهاحكم عروض التجارة يعتبر ان تبلغ قيمتها نصابا سواء كانت سائمة اوعلوفة.

لمافي الفتاوى الهندية:(۱/۱۷۸،طبع رشيديه)
لاشيء في الخيل وهذاعندهماوهوالمختارللفتوى الا ان تكون للتجارة كذافي الكافي.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۲۸۲،طبع سعید)

(ولا شیء فی خیل)سائمة عندهما وعلیه الفتوی خانیة وغیرها.

وفی الشامیة:(قوله علیه الفتوی)قال الطحاویؒ هذا احب القولین الینا ورجحه القاضی ابو زید فی الاسرار وفی الینابیع وعلیه الفتوی وفی الجواهر والفتوی علی قولهما وفی الکافی هو المختار للفتوی وتبعه الزیلعیؒ و البزازیؒ تبعاللخلاصة وفی الخانیة قالوا الفتوی علی قولهما تصحیح العلامة قاسم

قلت :وبه جزم فی الکنز لکن رجح قول الامام فی الفتح واجاب عن دلیلهما السار تبعا للبدایة بان المراد فیه فرس الغازی وحقق ذلک بما لا مزید علیه واستدل للامام بالادلة الواضحة ولذا قال تلمیذه العلامة قاسم وفی التحفة الصحیح قوله ورجحه الامام السرخسیؒ فی المبسوط والقدوریؒ فی التجرید واجاب عما عساه یورد علی دلیله وصاحب البدائع وصاحب البدایة وهذا القول اقوی حجة علی ماشیدبه التجرید والمبسوط.

ولما فی التاتا رخانیة:(۲/۱۹۰،طبع قدیمی)

قال ابو یوسف ومحمد لا صدقة فی الخیل اصلا وهو قول الشافعیؒ و فی الخانیة قالوا والفتوی علی قولهما

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۱/۲۳۰،طبع رشیدیه)

وعندهما وعند الشافعیؒ لا زکاة فی الخیل والفتوی علی قولهما(فلما راجعنا الخانیة لمنیها ) و علی قول ابی یوسف ومحمد والشافعیؒ لا زکاة فی الخیل وقالوا الفتوی علی قولهما واجمعوا علی ان الامام لایأخذ منهم صدقة الخیل جبرا.

ولما فی اعلاء السنن:(۹/۳۸،طبع دار الکتب العلمیة)

قال الشیخؒ والانصاف أن فی کلا الجانبین اتساعا للکلام لکن الاحتیاط فی قول الامام والعلم لله الملک العلام

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب :معراج الدین

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۹ | فتویٰ نمبر :۱۲۰۸

## ﴿زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے وقت کی تعیین ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ماذا یقول العلماء الکرام فی تعیین الیوم فی الزکاة هل لازم ام لا ؟ وهل العبرة للحول بالاهلة لازم ؟زدنا ایضاحا زادکم الله صلاحا.

﴿جواب﴾تعیین الیوم الذی حصل فیه النصاب لازم لیعرف المقدار الواجب من ماله فلو اهمل ذلک الیوم الذی ملک النصاب فیه لاشکل علیه المقدار الواجب علیه من ماله...

لان المال غادورائح ولان الحول الذی به یجب الزکاة لا یتحقق الا بتعیین ذلک الیوم واعتبار آخره والعبرة فی الزکاة للحول القمری لا الشمسی.

لما فی الهدایة:(۲۰۱/۱،طبع رحمانیه)

ولابد من الحول لانه لا بد من مدة یتحقق فیها النماء، وقدرها الشرع بالحول لقوله علیه السلام (لازکاة فی مال حتی یحول علیه الحول)

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۵۹۴-۲۹۵،طبع سعید)

(وحولها):ای الزکاة (قمری) بحر عن القنیة (لا شمسی) وسیجی الفرق فی العنین.

وفی الشامیة:واجل سنة قمریة بالاهلة علی المذهب وهی ثلث مائة واربع وخمسون وبعض یوم وقیل شمسیة بالایام وهی أزید باحد عشر یوما.

ولما فی الجوهرة النیرة:(۱۴۷/۱،طبع میر محمد)

(وقوله وحال علیه الحول)انما شرط ذلک لیتمکن فیه من التنمیة وهل تمام الحول من شرائط الوجوب او من شرائط الاداء فعندهما من شرائط الاداء وهو الصحیح یؤیده جواز تعجیل الزکاة وعند محمدؒ من شرائط الوجوب.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:معراج الدین غفرلہ

۴صفرالخیر۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۱۵۲

## ﴿المهر المؤجل لایکون مانعا عن الزکاة﴾

## ﴿مہر موجل زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے مانع نہیں﴾

﴿سوال﴾الناس یضعون المهر المؤجل فی النکاح و الاکثر انهم لایریدون اداله والمرأة ایضالا تطالبه فی العادة ،فمن کان علیه المهر المؤجل وعنده نصاب من الزکاة فهل تجب علیه الزکاة او دین المهر مانع عن ذالک ؟

﴿جواب﴾المهر المؤجل لا یکون مانعا عن وجوب الزکاة اذا کان الزوج لا یرید أداله لانه لایعد دینا لعدم المطالبة فی العادة.

لما فی رد المحتار:(۱۷۷/۲،طبع امدادیه)

قوله(أو مؤجلا الخ)عزاه فی المعراج الی شرح الطحاوی وقال:وعن ابی حنیفةؒ لا یمنع وقال الصدر الشهید لاروایة فیه ولکل من المنع وعدمه وجه.زادالقهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع.

ولما فی الفتاوی الهندیة:(۱/۱۷۳ طبع رشیدیه)

وکذلک المهر یمنع مؤجلا کان او معجلا لانه مطالب به کذا فی محیط السرخسیؒ وهو الصحیح علی ظاهر المذهب وذکر البزدویؒ فی شرح الجامع الکبیر قال مشائخنا فی رجل علیه مهر مؤجل لامرأته وهو لا یرید ادائه لا یجعل مانعامن الزکاة لعدم المطالبة فی العادة وانه حسن ایضاهکذافی جواهر الفتاوی.

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص۱۶۹،طبع قدیمی)

دین العباد مانع من وجوبها الا المهر المؤجل اذاکان الزوج لایرید أداء ه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: معراج الدین غفرلہ

۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۴۲

## ﴿ورثاء کے دینے سے میت کی طرف سے زکوۃ ادا ہو جائیگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چچا جان کا انتقال ہو گیا، ورثاء میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے دونوں شادی شدہ ہیں، مرحوم صاحب نصاب تھے مگر زکوۃ ادا نہیں کی تھی اور اسکی کوئی وصیت بھی نہیں کی، ورثاء چاہتے ہیں کہ زکوۃ ادا کریں کیا ورثاء کے ادا کرنے سے زکوۃ ادا ہو جائیگی۔ مستفتی: محمد قاسم

﴿جواب﴾ مرحوم نے زکوۃ ادا کرنے کی وصیت نہیں کی تھی اور ورثاء تبرعا ادا کرنا چاہیں تو گنجائش معلوم ہورہی ہے بشرطیکہ سب ورثاء بالغ ہوں اور بخوشی ادا کریں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۶۸ طبع سعید)

(وشرط صحة ادائها نیة مقارنة له) ای للاداء (ولو)کانت المقارنة (حکما)

وفی الشامیة:(قوله نیة)اشار الی انه لا اعتبار للتسمیة ......والی انها لا توخذ من ترکته لفقد النیة الا اذا اوصی فتعتبر من الثلث ’وتمامه فی البحر :زاد فی الجوهرة :او تبرع ورثته .قلت : ولعل وجهه انهم قائمون مقامه فتکفی نیتهم.

لمافی الجوهرة النیرة:(ص۱۲۳ طبع میرمحمد)

واذا مات من علیه زکاة او فطرة اوکفارة اونذراوحج اوصیام او صلوات ولم یوص بذالک لم یوخذ من ترکته عندنا الا ان یتبرع ورثته بذلک وهم من اهل التبرع فان امتنعوا لم یجبروا علیه وان اوصی بذلک یجوز وینفذ من ثلث ماله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفااللہ عنہ

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۰۱

## زکوٰۃ کی توکیل کا طریقہ

**سوال** (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اقرا ادارے کا مالک ہوں پڑھنے والوں سے ادارہ چلانے کے لئے فیس وصول کرتا ہوں ہمارے پاس پڑھنے والے بعض طلباء فیس برداشت نہیں کر سکتے، ہم زکوٰۃ کی مد سے ادارے میں ان کی فیس جمع کر لیتے ہیں، یہ زکوٰۃ کی رقم میرے خاص رشتہ دار اور دوست احباب اسی غرض سے مجھے دیتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ اسطرح سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(۲) بعض شرکاء زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوتے لیکن دیگر ضروریات کی وجہ سے فیس برداشت کرنا انکے لئے کافی مشکل ہوتا ہے، اسی طرح بعض پڑھنے والے زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں لیکن زکوٰۃ کی رقم سے اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا پسند نہیں کرتے ایسی صورت میں جبکہ ایک طرف ہمارے ادارے کی بھی مجبوری ہے ان لوگوں کی مدد اگر زکوٰۃ سے کرنا چاہیں تو اسکا کوئی طریقہ ہے یا نہیں؟

**جواب** (۱) مذکورہ صورت میں آپ زکوٰۃ دینے والوں کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے پر وکیل ہیں لیکن زکوٰۃ لینے والوں کی طرف سے قبول کرنے اور پھر فیس کی مد میں ادارہ کو دینے پر وکیل نہیں ہیں، سو آپ رقم زکوٰۃ کے اکاؤنٹ سے فیس کی مد میں ادارہ کے اکاؤنٹ میں منتقل کرتے ہیں تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے مستحقین کی ملکیت میں باقاعدہ قبضہ کے ساتھ آنا شرط کے درجہ میں ضروری ہوتا ہے، آسان صورت یہ ہے کہ آپ مستحق طلباء یا ان کے ولی سرپرست سے زکوٰۃ وصول کرنے اور پھر فیس کی مد میں ادارہ کو دینے کی بھی باقاعدہ اجازت لے لیں تو اس صورت میں آپ کا قبضہ مستحقین کا قبضہ شمار ہوگا۔

(۲) جو طلباء زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہیں یا زکوٰۃ کی مد سے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا پسند نہیں کرتے تو ان کی مدد نفلی صدقات عطیات سے کی جاسکتی ہے اور مستحقین زکوٰۃ اگر اسکی بھی اجازت دیدیں کہ ہمارے لئے جو زکوٰۃ آپ وصول کرتے ہیں، اس سے جس کے لئے چاہیں آپ تعلیمی اخراجات ادا کر سکتے ہیں تو اسکی گنجائش ہے۔

لما فی الدر المختار: (۲/۲۹۳-۲۹۱ طبع امدادیه)

ویشترط ان یکون الصرف تملیکا لا اباحة کما مر...... وقدمنا ان الحیلة ان یتصدق علی

الفقیر ثم یامرہ بفعل ھذہ الاشیاء.

ولمافی البحر:(۲/۲۴۳،طبع سعید)

والحیلۃ فی الجواز فی ھذہ الاربعۃ ان یتصدق بمقدار زکوتہ علی فقیر ثم یامرہ بعد ذلک بالصرف الی ھذہ الوجوہ فیکون لصاحب المال ثواب الزکوۃ وللفقیر ثواب ھذہ القرب.

ولمافی الفقہ الاسلامی:(۳/۱۹۷۵،طبع رشیدیہ)

اتفق الفقھاء علی انہ یجوز التوکیل فی اداء الزکوۃ بشرط النیۃ من الموکل او المؤدی فلو نوی عند الاداء او الدفع للوکیل عند الحنفیۃ والشافعیۃ .....ثم اداھا الوکیل الی الفقیر بلا نیۃ جاز.....ولو نوی الوکیل ولم ینو الموکل لم یجز.

ولمافی الدر المختار:(۵/۵۱۲،طبع سعید)

(وفی کل عقد لا بد من اضافتہ الی موکلہ) یعنی لا یستغنی عن الاضافۃ الی موکلہ حتی لو اضافہ الی نفسہ لا یصح (کنکاح وخلع.....وھبۃ وتصدق وأعارۃ وایداع ورھن واقراض) وشرکۃ ومضاربۃ (تتعلق بموکلہ) لا بہ لکونہ فیھا سفیرا محضاً.

ولمافیہ ایضاً:(۲/۳۵۶،طبع سعید)

دفع الزکوۃ الی صبیان اقاربہ برسم عید او الی مبشر او مھدی الباکورۃ جاز: قولہ (الی صبیان اقاربہ) ای العقلاء والا فلا یصح الا بالدفع الی ولی الصغیر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری عفااللہ عنہ

۷ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۴۶۵

## ﴿مال حرام کی زکوٰۃ اور صدقہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس سارا مال حرام کا ہے، اس پر صاحب نصاب ہونے کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اگر سارا مال حرام کا نہ ہو بلکہ حرام کے ساتھ حلال ذرائع آمدنی بھی ہوں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز اگر کسی کے پاس حرام مال ہو اور وہ اسے اپنی ملکیت سے نکالنا چاہتا ہو تو اسکو کہاں خرچ کرے؟ مستفتی:عبدالعزیز آزاد

﴿جواب﴾ (۱) حرام مال کے ذرائع آمدنی اگر مختلف ہوں جیسے (رشوت، چوری، غصب اور سود وغیرہ سے حاصل ہونے والی کمائی) اور حلال وحرام اس طور پر مخلوط ہوں کہ تمیز مشکل ہو جیسا کہ عموماً دیکھنے میں آتا ہے تو ایسے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا، البتہ اگر کسی کا سارا مال

حرام کا ہو یا مذکورہ حلال وحرام اس طور پر مخلوط ہوں کہ تمیز ممکن ہو تو حرام مال کا صدقہ کرنا واجب ہے، زکوٰۃ حلال مال پر واجب ہوگی بشرطیکہ بقدر نصاب ہو۔

واضح رہے کہ ایسا حرام مال جو لوگوں سے ظلماً حاصل کیا ہو اور اصل مالک کا بھی علم ہو تو بجائے صدقہ کے مال اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔

(۲) حرام آمدنی کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے یعنی ایسے شخص کو تملیکاً دیدے جو زکوٰۃ کا مستحق ہو، البتہ اتنا فرق ہے کہ حرام مال کو ثواب کی نیت کئے بغیر صدقہ کرنا ضروری ہے۔

لما فی الدر المختار:(۲/۲۱۷،طبع امدادیه)

ولوخلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكوٰة فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تمييزه عندابي حنيفة ،وقوله أرفق اذ قلّمايخلوا مال عن غصب وهذا اذاكان له مال غير مااستهلكه بالخلط منتصل عنه يوفي دينه والافلازكوٰة كمالوكان الكلّ خبيثا.

ولما في التاتارخانية:(۲/۲۱۸،طبع قديمي)

من ملك اموالا غيرطيبةاوغصب اموالا وخلطهاملكهابالخلط ويصيرضامنا وان لم يكن له نصاب سواهافلازكوٰة عليه في تلك الاموال وان بلغت نصابالانه مديون ومال المديون لاينعقدسببألوجوب الزكوٰة عندنا.

ولما في الفقه الاسلامي:(۲/۲۰۵۸،طبع رشيديه)

قال الحنفية: اذا تصدق بالمال الحرام القطعي او بني من الحرام بعينه مسجداونحوه مما يرجو به التقرب مع رجاء الثواب الناشي عن استحلاله له كفر لان استحلال المعصية كفروالحرام لا ثواب فيه ...... والخلاصة أن شرط الكفر شيئان قطعية الدليل وكونه حرام لعينه مثل لحم الميتة واما مال الغير فهو حرام لغيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم غفرلہ

یکم ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۳۹۲

## ﴿بینک میں موجود ترکہ پر زکوٰۃ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدین گھر سے باہر رہتے تھے اور ان کی کمائی کا ذریعہ بھی ان کی ہسپتال میں بحیثیت ڈاکٹر کی نوکری تھی انہوں نے کچھ بینک اکاونٹ باہر ملک میں کھولے جن کی تفاصیل ہمارے علم میں نہیں ہے میرے والد کا

انتقال ۱۹۸۹ء میں ہوا اس کے بعد وہ سارے معاملے والدہ کے ہاتھ میں رہے۔

واضح رہے کہ ان کے اکاونٹ میں پیسے دونوں کے تھے کیونکہ میری والدہ رحمہا اللہ بھی ڈاکٹر تھی اور سعودیہ میں کام کرتی تھی جس اکاونٹ کی میں بات کرتا ہوں یہ سودی کھاتا ہے میری والدہ کا انتقال سن ۲۰۰۲ء میں ہوا۔

(۱) میری وراثت کہاں سے شمار ہوگی والد کے انتقال سے یا والدہ کے انتقال سے؟

(۲) اس اکاونٹ کا رأس المال پتہ کرنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے کیونکہ یہ بیرون ملک میں ہے اور ہمیں ابھی تک اس کے استعمال کی اجارہ داری حاصل نہیں ہے تو زکوٰۃ کس مال پر دوں؟ (۳) اس وقت اس کھاتے میں میں اور میرا بھائی شریک ہیں مندرجہ بالا مشکلات کیوجہ سے ہم اس سے پیسے نہیں نکال سکتے تو کیا فی الوقت اسکی زکوٰۃ دینا ضروری ہے جبکہ ہمارے پاس اور اسباب کافی نہیں ہے۔ (۴) مجھے معلوم نہیں کہ میرے والدین نے اس پر زکوٰۃ دی ہے یا نہیں؟ اگر انہوں نے نہیں دی تو میرے ذمہ واجب تو نہیں۔ (۵) ہمیں ابھی تک اس کے استعمال کی اجارہ داری حاصل نہیں ہے اس دوران اگر میری موت واقع ہو جائے تو زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا وبال ہم پر ہوگا؟ (۶) ملک کو درپیش مسائل کے پیش نظر اگر میں اس اکاونٹ کو برطانیہ میں رہنے دوں تو کیا حکم ہے؟ (۷) جب سے مجھے وراثت میں ملا ہے اس پر لگنے والے سود کی رقم مجھے معلوم ہے تو اسکا کیا حکم ہے؟

سائل: ڈاکٹر محمد حازم صاحب

**﴿جواب﴾** (۱) والد مرحوم کے انتقال کے بعد انکے ترکہ میں سے جتنا حصہ آپکا بنتا تھا اس وقت سے آپ اپنے حصہ کے مالک قرار پائے ہیں اگر چہ آپ کسی وجہ سے اس میں تصرف نہیں کر سکتے تھے اور آج تک نہیں کر سکتے، اسی طرح والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اس کے ترکے میں سے آپ اپنے حصے کی بقدر اسی وقت مالک قرار پا گئے ہیں۔

(۲) آپ اس مال کے مالک اگر چہ والدین کے انتقال کے بعد قرار پا گئے ہیں لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس پر آپ کا مالکانہ اختیار اور تصرف چونکہ نہیں ہے اس لئے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ آپکے ذمہ واجب نہیں ہے، ہاں اگر آپ پہلے سے صاحب نصاب ہیں تو قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ کی مقررہ تاریخ میں اس مال کی زکوٰۃ واجب الاداہوگی۔

مجبوریوں سے متعلق اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مشکلات نظر آنے کیوجہ سے اگر آپ اس مال کے حاصل کرنے میں کوئی کوشش نہیں کرتے یعنی آسانی سے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے اس درجہ میں بھی آپ کوشش نہیں کرتے تو ایسی صورت میں آپکی غفلت شمار ہوگی اسکو مجبوری یا مشکلات سے تعبیر کرنا صحیح نہ ہوگا۔

(۳) اس کا جواب نمبر ۲ میں ہوگیا (۴) آپکے ذمہ واجب نہیں ہے۔

(۵) زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا وبال آپ پر نہیں ہوگا اور آپکا مال چونکہ سودی اکاونٹ میں ہے اس سے نکالنا آپکی ذمہ داری ہے آسانی سے قانونی چارہ جوئی جو ہو سکے وہ ضرور کریں ورنہ غفلت شمار ہوگی جس پر گرفت کا اندیشہ ہے اللہ تعالیٰ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے آمین۔

(٦) کرنٹ اکاونٹ میں رکھنے کی گنجائش ہے (۷) سودی رقم پاک رقم سے اگر الگ وممتاز ہے تو اس کو صدقہ کردے۔

لما فی البحر الرائق: (۲/۲۰۷، طبع سعید)

قسم ابو حنيفةؒ الدين على ثلاثة اقسام قوى وهو بدل القرض ومال التجارة و متوسط وهو بدل ماليس للتجارة كثمن ثياب البذلة و عبدالخدمة و دارالسكنى وضعيف وهو بدل ماليس بمال كالمهر والوصية الى ان قال وفى الضعيف لاتجب مالم يقبض نصاباً ويحول الحول بعد القبض عليه.

ولما فى التنوير مع الدر: (۲/۳۰۵-۳۰٦، طبع سعید)

وعند قبض مائتين مع حولان الحول بعده أى بعد القبض من دين ضعيف وهو (بدل غير مال) كمهر ودية وبدل كتابة وخلع الا اذا كان عنده بضم الى الدين الضعيف كمامر ..... ويعتبر ما مضى من الحول قبل القبض فى الاصح.

وفى الشامية: والحاصل انه اذا قبض منه شيئاً وعنده نصاب يضم المقبوض الى النصاب ويزكيه بحوله ولا يشترط له حول بعد القبض.

وفى الشامية: قلت لكن قال فى البدائع ان رواية ابن سماعةؒ انه لا زكوٰة فيه حتى يقبض المائتين ويحول الحول من وقت القبض هى الاصح من الروايتين عن ابى حنيفةؒ ومثله فى غاية البيان وعليه فحكمه حكم الدين الضعيف الآتى ومثله مالوورث دينا على رجل اى مثل الدين المتوسط فى مامر.

ولما فى الهندية: (۱/۱۷۵، طبع رشیدیه)

ومن كان له نصاب فاستفادفى اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الى ماله وزكاه سواء كان

المستفاد من نمائه أولاد بأی وجه استفادضمه سواء كان من ميراث أوهبة أو غير ذلك.

ولمافی الشامی:(۹۹/۵،طبع سعید)

والحاصل انه ان علم ارباب الاموال وجب رده عليهم والافان علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد دیروی

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۷۱

## ﴿مال تجارت کے قرضوں پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک دکان ہے جس میں بقدر نصاب مال تجارت موجود ہے بعض لوگ نقد خریداری کرتے ہیں اور بعض جن میں اکثر ملازمین ہوتے ہیں ادھار پر سودا لے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ تو وقفے وقفے سے رقم دیتے رہتے ہیں جبکہ دوسرے بعض لوگوں سے رقم کافی کوشش کے بعد وصول ہوتی ہے۔

اسی طرح بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے رقم کی وصولی ناممکن نظر آتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس رقم پر جو کھاتہ داروں کے پاس ہوتی ہے مال تجارت کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو وصول ہونے کے بعد یا اس سے پہلے ہی ادا کرنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ جن قرضوں کے وصول ہونے کی امید ہو مال تجارت کے ساتھ انکی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور زکوٰۃ کی ادائیگی قرضوں کی وصولی کے بعد بھی کرسکتا ہے لیکن آسان طریقہ یہ ہے کہ مال تجارت کے ساتھ ہی ایسے قرضوں کی زکوٰۃ ادا کرے، البتہ ایسے قرضے جن کے وصول ہونے کی بالکل امید نہ ہو جب تک وصول نہ ہوں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

لمافی الدرالمختار:(۲۶۶/۲،طبع سعید)

ولو كان الدين على مقرّملئي اوعلى معسراومفلس اى محكوم بافلاسه اوعلى جاحد عليه بينة وعن محمدلا زكوة وهوالصحيح.

ولمافی التاتار خانية:(۲۲۶/۲،طبع قديمی)

فما وجب بدلا عما هو مال التجارة فحكمه عندابی حنيفة ان يكون نصاباقبل القبض تجب فيه الزكوة ولكن لا يجب الاداء مالم يقبض منه اربعين درهما.

ولما في الدر المختار:(۲۲۶/۲،طبع امدادیه)

فتجب زكوتها اذا تم نصابا وحال الحول،ولكن لا فورا بل عند قبض اربعين درهما من الدين القوي كقرض وبدل مال التجارة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

یکم ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۱۳۹۱

## ﴿میراث کے مشترکہ مال سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے انتقال کے بعد اس کی میراث تقسیم نہیں ہوئی، مرحوم کی بیوہ اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے، مرحوم کی ایک بیوہ بیٹی بھی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ مرحوم کے بیٹے اس مشترک مال سے اپنی بیوہ بہن کو یا اس کے بیٹوں کو جو مستحق زکوٰۃ بھی ہیں زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: صفی اللہ چترال

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ورثاء کو چاہیے کہ پہلے میراث تقسیم کریں، اس کے بعد بھائی چاہیں تو اپنے مال کی زکوٰۃ بیوہ بہن کو دے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو، تقسیم سے پہلے چونکہ مال مشترک ہے اور اس میں ماں کا بھی حصہ ہے بلکہ خود ان کی بیوہ بہن بھی اس مال مشترک میں شریک ہے، لہٰذا تقسیم سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، ہاں بیوہ کے بھائیوں کا میراث کے علاوہ بھی اگر مال ہو تو بہن کو اس مال کی زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

لما في الدر المختار:(۲۲۶/۲،طبع سعید)ولا الى(من بينهما ولاد)

وفي الشامية:اي بينه وبين المدفوع اليه لان منافع الاملاك بينهم متصلة فلا يتحقق التمليك على الكمال والولاداي اصله وان علا كابويه واجداده وجداته وفرعه وان سفل.

ولما في التاتارخانية:(۲۰۲/۲،طبع قديمي)

ولا يعطى من الزكاة والداوان علا ولا ولداوان سفل وفي الخانية:من قبل الذكور والاناث

ولما فيه ايضا:(۲۱۰/۲،طبع قديمي)

اذا دفع زكاة ماله الى اخته وهي تحت زوج ان كان مهرها اقل من مائتي درهم او اكثر من مائتي درهم الا ان المعجل اقل من المائتين او اكثر الا ان الزوج معسر جاز الدفع اليها وفي الحجة:وهو اعظم للاجر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۱۳/رجب ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۶۴۷

﴿زکوۃ کی نیت سے قرضہ معاف کردینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چھوٹے بھائی نے اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں مجھ سے قرضہ لیا اور ناداری کی وجہ سے قرضہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور میں صاحب نصاب ہوں اب آپ سے مندرجہ مسائل معلوم کرنا ہے۔

(۱) کیا اپنے سگے بھائی کو زکوۃ دینا جائز ہے؟ (۲) بصورت جواز اگر میں زکوۃ کی نیت سے اسکا قرضہ معاف کردوں تو کیا اس طرح زکوۃ ادا ہوجائیگی؟ مستفتی: طارق حسین

﴿جواب﴾ (۱) بھائی کو زکوۃ دینا جائز ہے بلکہ اپنے اقرباء مثلاً بھائی، بہن اور ماموں وغیرہ کو زکوۃ دینے میں زیادہ ثواب ہے اسلئے کہ اس میں صدقہ کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کا ثواب بھی ہے۔

لمافی الشامی:(۲/۲۹۳، طبع امدادیہ)

وقيد بالولاد لجوازه لبقية الاقارب كالاخوة والاعمام والاخوال الفقراء بل هم اولىٰ لانه صلة وصدقة وفي الظهيرية: ويبدأ في الصدقات بالاقارب.

(۲) زکوۃ کی نیت سے مقروض کا قرضہ معاف کردینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی، ہاں اگر آپ زکوۃ کی رقم بھائی کے حوالہ کردیں پھر وہ قرضہ کی ادائیگی کے سلسلے میں آپ کو وہی رقم واپس کردیں تو اسطرح آپ کی زکوۃ ادا ہوجائیگی اور بھائی کا قرضہ ادا ہوجائیگا۔

لما في الدر المختار:(۲/۱۹۰، طبع امدادیہ)

واعلم ان اداء الدين عن الدين والعين عن العين وعن الدين يجوز واداء الدين عن العين وعن دين سيقبض لا يجوز وحيلة الجواز ان يعطى مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه.

ولمافی حاشية الطحطاوی:(ص۳۹۰، طبع قدیمی)

واعلم ان اداء الدين عن المال الذى عنده لا يصح ، والحيلة ان يعطى المديون زكاته ثم يأخذها عن دينه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

ا ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۷۵

﴿زکوۃ کی مد میں کرایہ معاف کردینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی صاحب نصاب شخص کسی مستحق زکوۃ کو اپنے

مکان میں سکونت دیدے اور اس سے کرایہ وصول نہ کرے اور ہر سال کے اخیر میں کرایہ کی مد میں واجب الاداز کوٰۃ کی نیت کرے تو کیا اس طرح اسکی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی؟ مستفتی جنید خان

﴿جواب﴾ اسطرح اس شخص کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے کہ مذکورہ صورت میں مستحق مکان میں رہائش اختیار کرنے سے مال زکوٰۃ کا باقاعدہ مالک قرار نہیں پایا جبکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے مال زکوٰۃ پر باقاعدہ مالکانہ قبضہ شرط ہے، ہاں اگر وہ زکوٰۃ کی رقم مستحق کے حوالہ کردے اور پھر کرایہ کے مد میں مستحق اسکو واپس کردے تو اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۵۷،طبع سعید)

(جزء مال)خرج المنفعة فلواسكن فقيرا داره سنة ناويالايجزيه.

وفي الشامية:(قوله فلواسكن الخ)عزاه في البحر الى الكشف الكبير وقال قبله والمال كما صرح به اهل الاصول مايتمول ويدخر للحاجة وهو خاص بالاعيان فخرج به تمليك المنافع.

ولما فيها ايضا:(۲/۲۷۱،طبع سعيد)

وحيلة الجواز ان يعطي مديونه الفقير زكوته ثم ياخذها عن دينه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ      واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۱۳ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ      فتویٰ نمبر:۱۶۷۷

## ﴿دوسرے شہر میں اقرباء کیلئے زکوٰۃ بھیجنا بلا کراہت جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گاؤں میں میرے دو بھائی انتہائی غریب اور مستحق زکوٰۃ ہیں اور میں ہر سال اپنی زکوٰۃ کی رقم ان کیلئے بھیجتا ہوں لیکن چند دنوں پہلے میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ کراچی سے باہر زکوٰۃ منتقل کرنا مکروہ ہے اس لئے کہ یہاں مفلس اور مستحق زکوٰۃ لوگ موجود ہیں، پس افضل یہ ہے کہ آپ ان میں زکوٰۃ کی رقم تقسیم کریں، سوال یہ ہے کہ میرے لئے ایسی صورت میں افضل کیا ہے؟

﴿جواب﴾ بھائی خواہ دوسرے شہر میں ہوں اگر زکوٰۃ کے مستحق ہیں تو ان کو زکوٰۃ دینے میں زیادہ ثواب ہے زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب تو ملے گا اور صلہ رحمی کا ثواب الگ ملے گا۔

ایک شہر سے دوسرے شہر زکوٰۃ منتقل کرنے کو بیشک مکروہ لکھا ہے لیکن یہ اس صورت میں جب

دوسرے شہر میں اپنے رشتہ دار یا زیادہ محتاج نہ ہوں ورنہ تو مکروہ نہیں ہے خصوصاً کراچی میں مدارس میں پڑھنے والوں کے علاوہ عوام میں صحیح مصرف تلاش کرنا بڑا دشوار کام ہے۔

لمافی الدر المختار:(۳۰۴/۲،طبع امدادیه)

وکره نقلها الا الیٰ قرابة وفی الظهيرية:لاتقبل صدقة الرجل وقرابته محاويج حتیٰ يبدأ بهم فيسد حاجتهم.

وفی الشامية:مرفوعاالی النبی ﷺ انه قال يامة محمد:والذی بعثنی بالحق لايقبل الله صدقة من رجل وله قرابة محتاجون الی صلته ويصرفهاالی غيرهم والذی نفسی بيده لاينظرالله اليه يوم القيامة وفی القريب جمع بين الصلة والصدقة

وکذافی الهندية: (۱۹۰/۱،طبع رشيديه)والبحر: (۲۵۰/۲،طبع سعيد)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب :عبدالرزاق عفااللہ عنہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر:۱۴۳۲

## ﴿زکوٰۃ کی رقم ضائع ہونے سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ میں نے زکوٰۃ کی رقم الگ کر کے رکھی تھی دوران سفر جیب کتروں کے ہاتھوں ضائع ہوگئی، پوچھنا یہ ہے کہ میرے ذمہ سے زکوٰۃ ساقط ہوگئی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی نیت سے مستحق زکوٰۃ کو مالک بنا کردی جائے ،لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے ذمہ سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوئی کیونکہ جیب کترا مستحق زکوٰۃ نہیں اور نہ آپ نے نیت کی۔

لمافی الدرمع الرد:(۲۷۰/۲،طبع سعيد)

ولايخرج عن العهدة بالعزل بل با لآداء للفقراء

وفی الشامية:"قوله ولا يخرج عن العهدة بالعزل"فلوضاعت لا تسقط عنه الزكاة الخ.

ولمافی التاتارخانية:(۲۲۳/۲،طبع قديمی)

"الظهيرية"رجل وجبت عليه زكاة المائتين فافرزخمسة من مال ثم ضاعت تلك الخمسة لا تسقط عنه الزكاة......

وهکذافی الهندية:(۱۸۲/۱،طبع رشيديه)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب :ظہور احمد شمس

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر:۱۲۸۱

﴿قرضہ حسنہ پر زکوٰۃ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک آدمی نے کسی کو قرضہ حسنہ دیا کہ جب بھی تمھارے پاس پیسے ہو گئے تو واپس کر دینا اب اگر اس قرض کو ملایا جائے تو یہ آدمی صاحب نصاب بنتا ہے ورنہ نہیں بنتا تو کیا سال گزرنے پر اس آدمی پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اس قرض کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا یا نہیں؟ مستفتی: ملک شوکت

﴿جواب﴾ قرضہ اگر وصول ہوسکتا ہے تو یہ قوی قرضہ ہے جسکا حکم اپنے پاس نقد موجود رقم کا ہے، لہٰذا اسکی زکوٰۃ بھی واجب ہے، البتہ اس قرضہ کی وصولی کی امید نہ ہو یا قریب میں موصول ہونا مشکل ہو تو ایسی صورت میں جب تک وصول نہ ہو زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور وصولی کی صورت میں گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی واجب الاداء ہوگی۔

لما في التنوير مع الدر:(۲/۲۳۶-۲۳۷،طبع امدادیه)

اعلم أن الديون عند الامام ثلاثة:قوي:ومتوسط:وضعيف ف(تجب)زكاتها اذا تم نصابا وحال الحول لكن لا فورا بل(عند قبض اربعين درهما من الدين)القوي كقرض—و يعتبر ما مضى من الحول قبل القبض في الاصح.

وفي الشامية:أما القوي فلا خلاف فيه لما في المحيط من أنه تجب الزكوٰة فيه بحول الاصل لكن لا يلزمه الأداء حتى يقبض منه اربعين درهما.

ولما في الهندية:(۱/۱۷۵،طبع رشيديه)

وان كان الدين على مفلس فلسه القاضي فوصل اليه بعد سنين كان عليه زكوٰة ما مضى في قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ كذا في الجامع الصغير لقاضي خان.—وقال ايضا:ووسط وهو ما يجب بدلا عن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة و ثياب البذلة اذا قبض مائتين زكى لما مضى في رواية الاصل وقوي وهو ما يجب بدلا عن سلع التجارة اذا قبض اربعين زكى لما مضى كذا في الزاهدي.

الجواب صحيح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ۰ اللہ اعلم بالصواب:شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۳۷۲

﴿رقم وصول ہونے پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام کہ میں اور میرا چچازاد بھائی ایک ساتھ کاروبار میں ۱۹۸۶ء میں شریک ہوئے، اس وقت طے ہوا کہ میں نفع اور نقصان میں شامل ہونگا

اور میرا چچازاد بھائی محنتانہ (مزدوری) کے عوض کام کرے گا اندازاً ۷-۵ سال بعد جو کاروبار میں شریک تھے انہوں نے فیصلہ کیا کہ جتنے شراکت دار اور غیر شراکت دار (ان کے بچے) جو کمپنی میں کام کرتے ہیں ان سب کو ۱۹۸۶ء سے محنتانہ (مزدوری) دیا جائے۔

مزدوری زیادہ ہونے کی وجہ سے نہ دیجا سکی اور فیصلہ واپس لے لیا گیا، تقریباً ۲۳ سال بعد دوبارہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف مجھے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۷ء تک محنتانہ (مزدوری) دیا جائے، اب یہ بتایئے کہ اس محنتانہ (مزدوری) پر پچھلے سالوں کی زکوۃ دیجائیگی یا نہیں؟ مستفتی: فیصل جنید فیز ۲

﴿جواب﴾ آپکے اضافی وقت اور محنت کی وجہ سے کمپنی کے شرکاء نے متفقہ طور پر آپ کیلئے محنتانہ (مزدوری) کا فیصلہ ابھی کیا ہے اگر چہ اس کی نسبت گذشتہ عرصہ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۷ء تک کیلئے کی ہے، لہٰذا یہ رقم ابتک اگر موصول نہیں ہوئی تو اس رقم کی گذشتہ سالوں کی کوئی زکوۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے اور اگر موصول ہوگئی ہے تو زکوۃ ادا کرنے کی قمری تاریخ پہلے سے آپکی جو مقرر ہے، اسی تاریخ میں اس رقم کو بھی دیگر اموال زکوۃ میں شمار کرنا ضروری ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۱۷۲،طبع رشيديه)

ومنها(:اى شرط وجوب الزكوة)الملك التام وهوما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض اووجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكواة الخ.

ولمافيها ايضا:(۱/۱۷۵،طبع رشيديه)

ومن كان له نصاب فاستفاد فى اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الى ماله وزكواه، سواء كان المستفاد من نمائه اولا وباى وجه استفاد ضمه سواء كان بميراث او هبة او غير ذلك ....فان استفاد بعد حولان الحول فانه لا يضم ويستانف له حول آخر بالاتفاق هكذافى شرح الطحاوى......الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب غفرلہ

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۵۹۱

## ﴿حج کے لیے جمع کردہ رقم پر زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے حج کے

لئے ایک لاکھ روپے جمع کیے تھے جو کہ نقدی کی صورت میں میرے پاس موجود تھے، اس پر سال گزرنے سے پہلے حج کے داخلے کے لئے بنک میں جمع کرادیے، پوچھنا یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد اس رقم پر زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سال بھر میں چاند کے حساب سے ایک خاص تاریخ کے بعد صاحب نصاب شخص پر زکوۃ فرض ہوجاتی ہے، اس تاریخ کے آنے سے پہلے آپ نے اگر چہ داخلہ کے لئے بینک میں رقم جمع کردی ہے لیکن وہ آپ کی ملکیت سے نہیں نکلی بلکہ بینک والوں کے پاس امانت یا قرض ہے، اب اگر آپ کا داخلہ منظور ہوگیا تو اس رقم پر زکوۃ نہیں آئے گی اور اگر داخلہ منظور نہیں ہوا یا اس تاریخ کی آمد کے بعد منظور ہوا تو دونوں صورتوں میں آپ پر اس رقم کی زکوۃ واجب ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۵۹/۲-۲۶۰،طبع سعید)

(وسببه)ای سبب افتراضها(ملک نصاب حولی)......(فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد)

ولما فی رد المحتار:(۲۵۹/۲-۲۶۲،طبع سعید)

(قوله نسبة الحول)ای الحول القمری لا الشمسی......اذا امسکه لینفق منه کل مایحتاجه فحال الحول وقد بقی معه منه نصاب فانه یزکی ذلک الباقی وان کان قصده الانفاق منه ایضافی المستقبل لعدم استحقاق صرفه الی حوائجه الاصلیة وقت حولان الحول.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۹۴/۲-۲۹۵،طبع سعید)

(حولها)الزکاة(قمری)بحر عن القنیة(لا الشمسی)

ولما فی الفتاوی تنقیح الحامدیة:(۸/۱،طبع حقانیه)

افرز مالا یحج به تلزمه زکوة الفاضل سئل فی رجل خرج من بلدته یرید الحج واصطحب معه من المال نصبا کثیرة لم یخرج زکاتها ویزعم انه لاتلزم زکاتها اذا حال علیها الحول لکونه یرید الحج،فهل تلزمه زکاتها؟الجواب:نعم تلزمه زکاة الفاضل معه حیث حال علیها الحول ولم یخرج زکاته ولا عبرة بزعمه المذکور لان مالیس له مطالب من جهة العباد لایمنع وجوب الزکاة کدین النذر والکفارة ووجوب الحج وصدقة الفطر وهدی متعة واضحیة ولقطة بعد التعریف......کذا فی شرح الملتقی للباقانی وکذا فی البحر والنهر وغیرهما......والافراز المال المذکور لاجل الحج لایخرجه عن ملکه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:سید مزمل شاہ لکی مروت

۷ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۱۹۱۵

## ﴿کرائے کے مکان پر زکوٰۃ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک آدمی پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے بعض زمینوں کو لے کر آگے بیچ دیتا ہے اور بعض پر اس نے مکان تعمیر کر کے کرائے پر لگا دیئے ہیں آیا کرائے والے مکانوں میں پورے مکان کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی یا کرائے پر؟

﴿جواب﴾ جو زمین خرید و فروخت کیلئے اس نے لی ہے اس کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی اور جو مکان تعمیر کر کے کرائے پر لگا دیئے ہیں اس میں زکوٰۃ کا حکم نہیں ہے۔

لمافی الدر:(۲/۲۶۴،طبع سعید)

ولا فی ثیاب البدن وأثاث المنزل ودور السکنی ونحوھا.

ولمافی قاضی خان:(۱/۲۵۳،طبع قدیمی)

اذا آجر دارا أو عبدا بمائتی درھم لاتجب الزکوٰۃ مالم یحل الحول بعد القبض فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۳۷۲

## ﴿قرض مال سے زکوٰۃ دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس کچھ رقم موجود ہے جسکی زکوٰۃ وہ خود ادا کرتا ہے لیکن کچھ رقم اس سے اسکے ساتھیوں نے قرض لی ہے، آیا اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جبکہ واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے اور قرض لینے والے قرض کا اقرار کرتے ہیں لیکن غربت کی وجہ سے واپس نہیں کر سکتے؟

مستفتی: شاکر اللہ چالیار سواتی

﴿جواب﴾ قرضدار قرض کا اقرار کرتے ہیں لیکن ناداری کیوجہ سے ادا نہیں کر سکتے اور واپسی کے قریب میں کوئی آثار نظر نہیں آرہے اس قسم کے قرضہ کا حکم یہ ہے کہ جب قرض خواہ کو مل جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور گذشتہ سالوں کی زکوۃ بھی واجب الذمہ ہوگی۔

لمافی الھندیۃ:(۱/۱۷۵،طبع رشیدیه)

واما سائر الدیون المقر بھا فھی علی ثلاث مراتب عند ابی حنیفة ضعیف..... وقوی وھو مایجب بدلا عن سلع التجارة اذا قبض اربعین زکی لمامضی کذا فی الزاھدی.

ولمافی الشامی:(۳۰۵/۲طبع سعید)

واعلم ان الدین عند الامام ثلاثة قوی ومتوسط و ضعیف فتجب زکوتها اذا تم نصابا وحال الحول لکن لافورا بل(عندقبض اربعین درهما من الدین)القوی کقرض(وبدل مال تجارة .قوله کقرض..... فاذاقبض ذلک کله اواربعین درهما منه ولوباقتطاع ذلک من أجرةالدارتجب زکاته لمامضی من السنین والناس عنه غافلون.

ولمافی مراقی الفلاح:(ص۲۶۲طبع قدیمی)

وزکاة الدین علی اقسام فانه قوی ووسط وضعیف فا لقوی وهو بدل القرض ومال التجارة اذا قبضه وکان علی المقرولومفلسااوعلی جاحد علیه بینةزکاه لما مضی ویتراخی وجوب الاداء الی ان یقبض أربعین درهما ففیهادرهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۱۵

## ﴿سات تولہ سے کم سونا اور کچھ نقدی پر زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس دو یا تین تولہ سونا ہو اور اسکے علاوہ پانچ سو (۵۰۰) روپے نقد یا چاندی موجود ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں سونے چاندی دونوں کی مجموعی قیمت اگر چاندی کے نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہے، اسی طرح نقد پانچ سو روپے (۵۰۰) اور صرف سونا دونوں کی مالیت بھی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک اگر پہنچے تو یہ شخص صاحب نصاب ہے اور سال گذرنے کے بعد بھی چاند کی اسی تاریخ میں صاحب نصاب رہا تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

لمافی الهداية:(۱۹۶/۱طبع رحمانیه)

وتضم قیمة العروض الی الذهب والفضة حتی یتم النصاب ویضم الذهب الی الفضة للمجانسة من حیث الثمنیة.... حتی ان من کان له مائة درهم وخمسة مثاقیل ذهب و تبلغ قیمتها مائة درهم فعلیه الزکوٰة عنده هکذافی الهندیة:(۱۷۹/۱طبع رشیدیه)

لمافی الدر:(۲۲۹/۲طبع امدادیه ملتان)

ولوبلغ باحدهما نصابا دون الاخر تعین مایبلغ به ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا و

بالآخر اقل قومه بالأنفع للفقير سراج.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: حبیب الوہاب سواتی

۵ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۷۳

## ﴿ادائیگی زکوٰۃ میں شک ہوتو غالب گمان کا اعتبار ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ماہِ رمضان میں زکوٰۃ ادا کرتا ہوں اس دفعہ کچھ حالات کی بناء پر زکوٰۃ کی ادائیگی کے بارے میں شک میں ہوں کہ پورے مال کی زکوٰۃ ادا کی ہے یا کچھ کی رہ رہی ہے، پوچھنا یہ کہ اس صورت میں میرے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ اس مال کی زکوٰۃ دوبارہ ادا کردوں یا شک کی وجہ سے چھوڑ دوں؟

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کی ادائیگی اور عدمِ ادائیگی کے بارے میں شک ہوتو غالب گمان پر عمل کیا جاتا ہے اور اگر کسی طرف بھی گمان غالب نہ ہو تو پورے مال کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔

چونکہ آپکو غالب گمان ادا کرنے کا ہے لیکن شک اس میں ہے کہ پوری ادا کی ہے یا کچھ رہ گئی ہے ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرنا چاہیے اور اتنی زکوٰۃ مزید ادا کرنی چاہیے کہ زکوٰۃ کی پوری ادائیگی کا غالب گمان ہو جائے۔

لما فی ردالمحتار: (۲۹۵/۲ طبع سعید)

"قلت: وحاصله أنه يتحرى فى مقدار المؤدى: كما لو شك فى عدد الركعات، فما غلب على ظنه انه اداه سقط عنه وادى الباقى، وان لم يغلب على ظنه شئ أدى الكل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

۲۳ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۸۸

## ﴿مقدارِ فرض سے زیادہ زکوٰۃ ادا کی تو اگلے سال کی زکوٰۃ میں حساب کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی آدمی مقدارِ فرض سے زیادہ زکوٰۃ دیدے تو زیادتی اگلے سال کی زکوٰۃ میں حساب کرسکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زائد مقدار زکوٰۃ کی نیت سے ہی دی ہو تو اگلے سال کی زکوٰۃ میں شمار کرسکتا ہے، البتہ زکوٰۃ کی نیت سے ادا نہ کی ہو مثلاً یہ کہ زائد رقم پر کم از کم صدقہ کا ثواب ملیگا تو اس نیت سے

صدقہ کا ثواب ملیگا، اگلے سال کی زکوۃ میں شمار نہ ہوگا۔

لمافی الشامی:(۲۲۱/۲،طبع امدادیہ)

لو کان عندہ أربعمائة درهم فادی زکاۃ خمسمائة ظانا أنها کذلک کان له أن یحسب الزیادۃ للسنة الثانیة.

ولمافی الھندیة:(۱۹۲/۱،طبع قدیمی)

رجل له أربع مائة فظن أن عندہ خمسمائة فادی زکوۃ خمسمائة ثم علم فله أن یحسب الزیادۃ للسنة الثانیة.

ولمافی الخلاصة:(۲۲۱/۱،طبع رشیدیہ)

رجل ظن أن عندہ خمسمائة ولیس له الا أربعمائة فادی زکوۃ خمسمائة له أن یحسب الزیادۃ عن السنة الثانیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد احمد عفا اللہ عنہ

۱۱ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۳۵۳

## ﴿مال مستفاد میں زکوۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک صاحب نصاب زمیندار سال پورا ہونے سے ایک ماہ قبل اپنی زمین سے حاصل شدہ پیداوار کا عشر ادا کرنے کے بعد فصل بیچ کر حاصل شدہ رقم پہلے سے موجود پیسوں کے ساتھ ملادے تو سال پورا ہونے کے بعد ملائی ہوئی رقم کی زکوۃ ادا کریگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زمین سے حاصل شدہ پیداوار سے عشر ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے بعد غلے کی صورت میں اگر کئی سالوں تک پڑا رہے زکوۃ اسمیں واجب نہیں ہوتی لیکن بیچنے کی صورت میں نقد روپے کو دیگر قابل زکوۃ اموال میں شمار کرنا ضروری ہے اور اسکی زکوۃ ادا کرنا بھی ضروری ہے خواہ تاریخ زکوۃ سے ایک روز بھی پہلے یہ پیسے ملکیت میں آجائے۔

لمافی الھدایة:(ص ۱۹۳ طبع رحمانیہ)

ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول من جنسه ضمه الیه وزکاہ به.

وفی حاشیتها.لان المستفاد ...... خصوصا اذا کان النصاب دراهم وهو صاحب غلة یستفید کل یوم درهما أو درهمین.

ولمافی الھندیة:(۱۷۵/۱ طبع رشیدیہ)

ومن کان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول مالا من جنسه ضمه الی ماله وزکاہ سواء کان

المستفاد من نمائه أولادوبأی وجه استفادضمه سواء كان من ميراث أوهبة أوغيرذلك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفااللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۳۵۹

## ﴿جواہرات میں زکوٰۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جواہرات مثلاً لعل، یاقوت، زمرداور موتی وغیرہ اگر تجارت کی نیت سے نہ ہو تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ جواہرات مثلاً لعل، یاقوت، زمرداور موتی وغیرہ اگر تجارت کی نیت سے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

لمافی التنویرمع الدر:(۲/۲۷۳ طبع سعید)

(لازكوة فى اللآلى والجواهر)وان ساوت ألفا اتفاقا(الاان تكون للتجارة)(قوله والجواهر)كاللؤلؤ والياقوت والزمرد وامثالها در عن الكافى(قوله وان ساوت الفا وفى نسخة الوفا.

ولمافی الهندية:(۱/۱۸۰ طبع رشيديه)

واما اليواقيت واللآلى والجواهر فلازكوة فيهاوان كانت حليا الاان تكون للتجارة كذافى الجوهرة النيرة.

ولمافی الجوهرة النيرة:(ص۱۵۹ طبع ميرمحمد)

واما اليواقيت واللآلى والجواهر فلازكوة فيهاوان كانت حليا الا ان تكون للتجارة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان سواتی

۲۴ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۷۱

## ﴿زکوٰۃ کے وجوب کا تعلق سال کے شروع وآخر میں صاحب نصاب بننے سے ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم مشترکہ کاروبار کرتے ہیں سال کے متعین مہینہ میں اسکی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، گذشتہ سال آٹھ مہینے گزرنے کے بعد موجودہ کاروبار سے کچھ رقم نکال کر دوسرے کاروبار میں لگادی، پوچھنا یہ ہے کہ جو رقم دوسرے کاروبار میں لگی ہے، اس کی زکوٰۃ کیسے ادا کی جائے سابقہ کاروبار کے حساب سے یا نئے کاروبار

کے اعتبار سے؟ جبکہ نئے کاروبار میں بھی اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کے اہتمام کا ارادہ ہے۔

﴿جواب﴾ زکوٰۃ کے وجوب کا تعلق کاروبار سے نہیں ہے بلکہ جس روز آپ صاحب نصاب بنے ہیں اس اسلامی تاریخ سے ہے صاحب نصاب بننے کے بعد سال بھر آپکے پاس کچھ مال باقی رہا دوران سال کبھی بھی آپکا بیلنس صفر تک نیچے نہیں آیا اور سال گزرنے کے بعد اسی تاریخ میں آپکے پاس بقدر نصاب یا اس سے زیادہ مال موجود تھا۔ ایک کاروبار میں لگایا تھا یا مختلف کئی کاروباروں میں یا ویسے ہی نقد صورت میں مال آپکے پاس پڑا رہا ہر صورت میں اب موجود کل مال سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۳۰۲،طبع سعید)

(وشرط كمال النصاب)ولوسائمة(فى طرفى الحول)فى الابتداء للانعقادوفى الانتهاء للوجوب (فلايضرنقصانه بينهما)فلوهلك كله بطل الحول.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۶۷،طبع سعید)

(وشرطه)أى شرط افتراض ادائها(حولان الحول)وهوفى ملكه(وثمنية المال كالدراهم والدنانير)لتعينهما للتجارة باصل الخلقة فتلزم الزكوة كيفما امسكهما ولو للنفقة اوالسوم بقيدها الآتى(أونية التجارة)

وفى الشامية:(قوله وهوفى ملكه)أى والحال أن نصاب المال فى ملكه التام كما مر،والشرط تمام النصاب فى طرفى الحول.

ولمافی التنویر وشرحه:(۲/۲۹۴-۲۹۵،طبع سعید)

(وحولها)أى الزكوة(قمرى)بحر عن القنية(لا شمسى)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد حسن غفرلہ

۳؍رجب ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۶۱۸

## ﴿زیورات میں ہر سال زکوٰۃ فرض ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کے سونا چاندی کا حساب کرلیا اور پہلے سال اسکی زکوٰۃ دے دی پھر ہر سال زکوٰۃ نہیں دے رہا آیا یہ صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ زید کی بیوی کی ملکیت میں سونا، چاندی اگر بقدر نصاب ہے یا اس سے زیادہ ہے تو ہر سال اسکی زکوٰۃ ادا کرنا خود بیوی پر فرض ہے، شوہر پر فرض نہیں ہے، ہاں بیوی کی اجازت

سے وہ ادا کردے تو بیوی کی زکوٰۃ ادا ہو جائیگی۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۹۸،طبع سعید)

(واللازم)......(فی مضروب کل)منهما(ومعموله ولوتبرا أوحليا مطلقا)مباح الاستعمال اولا ولو للتجمل والنفقة لانهما خلقا أثمانا فيزكيهما كيف كانا.

لمافی الهداية:(۲/۱۵۲،طبع رحمانيه)وفی تبر الذهب والفضة و حليهما و اوانيهما الزكوة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد حسن پورنوی

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۴۶۶

## ﴿وصیت نہ کی ہو تو ورثاء پر مورث کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب نصاب شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہوگئی تھی زکوٰۃ کی ادائیگی سے پہلے دنیا سے چل بسا، اب اس کے ورثاء پر اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ایسا شخص جس پر زکوٰۃ، صدقہ، کفارہ یا نذر واجب تھی اور ادائیگی سے پہلے انتقال کر گیا اگر اس نے مذکورہ واجبات کی ادائیگی کی وصیت نہ کی ہو تو اس صورت میں ورثاء پر اسکی طرف سے ادا کرنا لازم نہیں ہے۔

ہاں وصیت کرنے کی صورت میں اس کے ترکہ کے ثلث مال (ایک تہائی) کی حد تک وصیت نافذ کرنا ضروری ہے، لہٰذا مرحوم نے وصیت نہیں کی ہے تو اس کے ورثاء پر اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں ہے، البتہ اگر ورثاء میں سے کسی نے ادا کی تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی اور انشاء اللہ باعث اجر و برکت ہوگا۔

لما فی ردالمحتار:(۲/۲۵۹،طبع سعید)

(قوله جاز)فی الجوهرة:اذا مات من عليه زكاة اوفطرة اوكفارة اونذر لم تؤخذ من تركته ......وان اوصى تنفذ من الثلث اه.

ولمافی التاتارخانية:(۲/۲۲۳،طبع قديمی)

قال اصحابنا:اذامات من عليه زكاة سقطت الزكاة عنه بموته......وفی "التفريد" ولو اوصى بأدائها لا تسقط بالاتفاق اه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ظہور احمد شمس

۶ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۲۹۵

## ﴿قرض محیط للمال ہوتو زکوۃ ساقط ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے پاس اتنا مال موجود ہے (جو کسی کو بطور قرض دیا ہے) جو نصاب کو پہنچتا ہے لیکن اسکے ذمہ جو دین اور قرض ہے وہ اس مال سے بڑھ کر ہے جو اسکے پاس موجود ہے اب پوچھنا یہ ہے کہ اس آدمی کے ذمہ زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں جبکہ دین تو اسکے پورے مال کو محیط ہے؟ بینوا توجروا واجرکم علی اللہ تعالی۔

مستفتی: محمد اقبال العین امارات

﴿جواب﴾ مدیون (مقروض) کی ملکیت میں مال نامی اتنا ہو کہ دین (قرضہ) ادا کرنے کے بعد بھی بقدر نصاب اسکے پاس مال بچے اور اس پر سال گذرا ہو تو زکوۃ اسکے ذمہ واجب ہے اور دین ادا کرنے کے بعد اسکے پاس مال نامی نہ رہے یا نصاب سے کم رہے اگر چہ اس نے ابھی کسی وجہ سے دین ادا نہیں کیا ہے تو اسکے ذمہ زکوۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے اسلئے کہ دین کی مقدار میں مال محض اس کے قبضہ میں ہے ملکیت میں نہیں ہے اس مال کا مالک تو قرض خواہ ہے۔

(لما فی بدائع الصنائع: ۲/۳۸۱ طبع دار الکتب العلمیة)

ومنها ان لا یکون علیه دین مطالب به من جهة العباد عندنا فان کان فانه یمنع وجوب الزکاة بقدره حالا کان او مؤجلا.

(ولما فی المحیط البرهانی: ۳/۲۲۸ طبع، ادارة القرآن)

۲۸۲۷. فنقول: مما یمنع وجوب الزکاة انواع: منها الدین قال اصحابنا رحمهم الله تعالی: کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکاة سواء کان الدین للعباد او لله تعالی کدین الزکاة اما الکلام فی دین العباد فنقول: انما یمنع وجوب الزکاة لان ملک المدیون فی القدر المشغول بالدین ناقص الا تری انه یستحق اخذه من غیر قضاء ولا رضاء کانه فی یده غصب او ودیعة ولهذا حلت له الصدقة ولا یجب علیه الحج والملک الناقص لا یصلح سببا لوجوب الزکاة.

(ولما فی تنویر: ۲/۲۵۸-۲۶۲ طبع ایچ ایم سعید)

وسبب افتراضها عقل وبلوغ واسلام وحریة وسببه ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد وعن حاجته الاصلیة.

(ولما فی الرد: ۲/۲۶۰ طبع ایچ ایم سعید)

قوله فارغ عن دین بالجر صفة نصاب واطلقه فشمل الدین العارض کما یذکره الشارح ویاتی بیانه وهذا اذا کان الدین فی ذمته قبل وجوب الزکاة فلو لحقه بعده لم تسقط

الزکاۃ لانها ثبتت فی ذمته فلا یسقطها ما لحق من الدین بعد ثبوتها جوهره

(ولما فی حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار: ۱/۳۹۰ طبع رشیدیه)

قوله عن دین ولو حادثا فی الحول قال فی المحیط واما الدین المعترض خلال الحول فانه یمنع وجوب الزکاۃ بمنزلة هلاکه عند محمدؒ فلو ابراء صاحبه منه یستانف حولا جدیدا واما الحادث بعد الحول فلا یسقط الزکاۃ اتفاقا.

(ولما فی العالمگیریة المعروف بالهندیه: ۱/۱۷۲ طبع رشیدیه)

ومنها الفراغ عن الدین قال اصحابنا رحمهم الله تعالی کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکاۃ سواء کان الدین کالقرض وثمن المبیع وضمان المتلفات وارش الجراحة الخ.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر ۳۸۸۵

## ﴿کتاب بطور زکوۃ دینے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے کسی کو چھوٹی کتاب دی ہے اب ایک بڑی کتاب مانگ رہا ہے تو میں نے اس سے کہا کہ میری چھوٹی کتاب واپس کردو بڑی کتاب میں بطور زکوۃ دونگا اب پوچھنا یہ ہے کہ اس بڑی کتاب میں میری زکوۃ کی نیت صحیح ہے یا نہیں؟ یا یہ مبادلۃ المال بالمال ہے؟ مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ آپ نے چونکہ صراحت کی کہ بڑی کتاب بطور زکوۃ دوں گا، اس لئے یہ معاملہ کوئی بیع نہیں ہے زکوۃ کی نیت صحیح ہے بشرطیکہ وہ شخص مستحق زکوۃ ہو.

لما فی بدائع الصنائع ج۶/۵۲۷ طبع دار الکتب العلمیة

البیع لغة: مقابلة شئی بشئی علی وجه المعاوضة .الخ وفیه ایضا ج۶/۵۳۹

واما الذی یرجع الی نفس العقد فهو ان یکون القبول موافقا للایجاب بان یقبل المشتری ما اوجبه البائع ولما اوجبه فان خالفه بان قبل غیر ما اوجبه او بعض ما اوجبه او بغیر ما اوجبه او ببعض ما اوجبه الخ

ولما فی العالمگیریة ۳/۳ طبع مکتبة رشیدیة

واما شرطه فانواع اربعة..... وفیها ما فی العقد وهو موافقة القبول للایجاب بان قبل المشتری ما اوجبه البائع وبما اوجبها الخ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شفقت اللہ

۱۵ صفر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۷۱

## ﴿اندازے سے زکواۃ ادا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری دوکان میں جو سامان ہے اسے گننا بڑا مشکل ہو رہا ہے، کیا اندازے سے زکواۃ ادا کر سکتے ہیں یا پورا سامان گن کر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔
مستفتی گلنواز خان

﴿جواب﴾ زکوٰۃ فرض حکم ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ مال شمار کرنے کی زحمت کو گوارہ کریں پوری طرح شمار کر کے اور حساب کر کے زکوٰۃ ادا کریں اور واجب مقدار سے کچھ بڑھا کر ادا کریں تاہم اندازہ کر کے غالب گمان پر فیصلہ کرنے کی بھی گنجائش ہے پھر احتیاطاً کچھ بڑھا کر دیں۔

(لما فی الشامی: ج ۲/۲۱۲ امدادیہ ملتان)

فان وجد منه شيئا قبل الحول ولو بيوم ضمه وزكى الكل

(ولما فی الهندية ج ۱/۱۷۹ رشيدية كتاب الزكاة)

الزكاة واجبة فی عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب ..وتعتبر القيمة عند حولان الحول بعد ان تكون قيمتها فی ابتداء الحول مائتی درهم من الدراهم الغالب عليها الفضة

(ولما فی الهداية مع الفتح ج ۲/۱۴۸ رشيدية)

ومن كان له نصاب فاستفاد فی اثناء الحول من جنسه ضمه وزكاه به

(ولما فی مراقی الفلاح ص ۷۱۵ قديمی)

اما المستفاد فی اثناء الحول فيضم الى مجانسه ويزكى بتمام الحول الاصلی سواء استفيد بتجارة اوميراث او غيره

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر ۳۱۸۵

## ﴿فیکٹری کے خام مال اور تیار شدہ مال دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک صابن کی فیکٹری چلاتا ہوں، فیکٹری میں خام مال بھی ہوتا ہے، اور تیار شدہ بھی۔ اب زکوٰۃ کس مال پہ ادا کرنی ہوگی، خام مال پہ یا تیار شدہ پہ یا دونوں پہ؟ نیز فیکٹری کی زمین، اس کی عمارت، اسکی مشین واوزار

اور گاڑی جو کہ فیکٹری کیلئے استعمال ہوتی ہے کیا ان تمام چیزوں پر بھی زکوۃ لاگو ہوگی؟ نیز فیکٹری کے ملازم اگر غریب ہے تو کیا میں انہیں زکوۃ دے سکتا ہوں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ فیکٹری میں دو طرح کا مال ہوتا ہے، ایک خام مال اور ایک تیار شدہ مال، زکوۃ دونوں مال کی ادا کرنا ضروری ہے۔ چاہے خام مال ہو یا تیار شدہ مال ہر ایک کی موجودہ مارکیٹ ویلیو پر زکوۃ آئیگی۔ اور فیکٹری کی زمین، اس کی عمارت، اس کی مشینری، اوزار و آلات اور گاڑی جو کہ فیکٹری کیلئے استعمال ہوتی ہے وغیرہ، ان کے اوپر زکوۃ نہیں ہے۔ فیکٹری کے ملازم اگر غریب ہیں۔ اور صاحب نصاب نہیں ہیں تو ان کو زکوۃ دے سکتے ہے۔

لما فی العالمگیریة: (۱/۱۹۷/قدیمی)

الزکوۃ واجبة فی عروض التجارة کائنة ما کانت اذا بلغت قیمتها نصابا من الورق والذهب.

ولما فیه ایضا: (۱/۱۹۰/قدیمی)

ومنها فراغ المال عن حاجته الاصلیة فلیس فی دور السکنی واثاث المنزل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال ــوالات المحترفین زکوة.

ولما فی الشامیة: (۲/۲۶۲/سعید)

ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنزل ودواب الرکوب وعبید الخدمة وسلاح الاستعمال زکوة، لانها مشغولة بحاجته الاصلیة ولیست بنامیة.

ولما فی العالمگیریة: (۱/۲۰۸/قدیمی)

ویجوز دفعها الی من یملک اقل من النصاب وان کان صحیحا مکتسبا.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محتشم خان غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۲۰۰

## ﴿ایڈوانس ادا کی گئی رقم آئندہ سال زکوۃ شمار ہوگی یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے سال پورا ہونے سے پہلے زکوۃ کی مد میں کچھ رقم ادا کردی کہ جب سال پورا ہوگا تو کل واجب زکوۃ سے اس کو منہا کرلے گا، لیکن جب سال پورا ہوا تو یہ شخص صاحب نصاب نہ رہا۔ غرض مسئلہ یہ ہے کہ کیا جب وہ آئندہ صاحب نصاب ہو تو اس اداشدہ رقم کو زکوۃ شمار کرسکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زکوۃ کی نیت سے جو رقم آپ نے ایڈوانس ادا کی ہے چونکہ سال کے آخر میں آپ

صاحب نصاب نہ رہے اس لئے یہ زکوۃ شمار نہیں ہوگی نفلی صدقہ شمار ہوگا۔

لمافی الفتاوی التاتارخانیه :(۲/۱۹۱ مطبع:قدیمی)

ولوكانت له مائتادرهم اوعروض التجارة قيمتهامائتادرهم فتصدق بخمسة على الفقراء عن الزكوة فانتقص النصاب بمقدار ماعجل ولم يستفد شيئا حتى حال عليه الحول والنصاب غير كامل فيكون ما عجل تطوعا ــــ ولو استفاد ما يكمل به النصاب بعد الحول ثم حال الحول ووجبت فيه الزكاة فيما عجل لاينوب عنها لان التعجيل حصل للحول الاول ولم تجب الزكوة حول الاول.

ولمافی البدائع الصنائع:(۲/۲۸۷ مطبع:دار الكتب،بيروت)

وكذالوعجل والنصاب كامل ثم هلك نصفه مثلا،فتم الحول والنصاب غيركامل لم يجز التعجيل وانماكان كذالك لان المعتبر كمال النصاب في طرفي الحول ــــ ولانه اذا هلك النصاب الاول كله فقد انقطع حكم الحول فلايمكن ابقاء المعجل زكاة فيقع تطوعاً.

ولمافی الهندیه :(۱/۱۷۶ مطبع:رشيديه كوئٹه)

وانمايجوز التعجيل بثلاثة شروط احدها: ان يكون الحول منعقداعليه وقت التعجيل، والثاني: ان يكون النصاب الذى ادى عنه كاملافى آخر الحول، والثالث:ان لايفوت اصله فيمابين ذالك ــــ كانت له مائتادرهم اوعروض التجارة قيمتها مائتادرهم فتصدق بالخمسة عن الزكوة وانتقص النصاب حتى حال عليه الحول والنصاب ناقص ــــ صار ماعجل به تطوعاهكذفى شرح الطحاوى .

ولمافی البدائع :(۲/۲۸۸ مطبع:دار الكتب بيروت)

واما حكم المعجل اذا لم يقع زكوة ،انه ان وصل الى يدالفقير يكون تطوعا سواء وصل الى يده من يدرب المال او من يد الامام اونائبه وهوالساعى لانه حصل اصل القربة.

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمن حفظہ اللہ تعالی  واللہ اعلم بالصواب :محمد اویس غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ ذی القعدہ ۱۴۳۳ھ  فتوی نمبر :۴۲۶۵

## ﴿افیون میں عشر کے وجوب کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے کہ میں سرکاری ملازم ہوں تو کسی سلسلہ میں خیبر پختونخوا کے ایک علاقہ میں گیا تو وہاں کے لوگ، اور فصلوں جیسے افیون کی کاشت کرتے ہیں اور یہاں کے مقامی زمیندار کہتے ہیں کہ ہم کو علماء فرماتے ہیں کہ اسکی فصل میں عشر واجب ہے اور ہم اسمیں عشر یا نصف عشر دیتے بھی ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ افیون تو نشہ آور

چیزوں کا مادہ ہے تو اسمیں عشر یا نصف عشر کیسے واجب ہے۔ یہ سمجھ سے بالاتر ہے آپ حضرات ہماری رہنمائی فرمائیں کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اسکا کیا حل ہے۔

﴿جواب﴾ افیون کسی پودے کا پھل نہیں ہے کہ براہ راست کاشت سے حاصل ہو بلکہ یہ تو خشخاش بوٹی کے خول (ڈوڈے) کے رس سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بوٹی کی کاشت سے صرف افیون حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ خشخاش اس کا اصل غلہ ہے اور خشخاش بڑی قیمتی چیز ہے اسی کا عشر اداء کرنا واجب ہے۔ افیون اس پودے کے رس کو کئی مراحل سے گزارنے کے بعد بنتی ہے اور کئی بیماریوں کیلئے بطور علاج استعمال ہوتی ہے تو فی نفسہ بڑی مفید چیز ہے ہاں کوئی نشہ کے طور پر اس کو اگر استعمال کرتا ہے تو یہ اسکی غلطی اور جرم ہے اسطرح تو انگور سے بھی شراب بنائی جاسکتی ہے انگور کو تو کوئی بھی شراب کی حیثیت نہیں دیتا حالانکہ شراب افیون سے زیادہ خطرناک اور گندی چیز ہے دراصل ہم لوگ پروپیگنڈوں سے متاثر ہورہے ہیں شراب کے خلاف کوئی پروپیگنڈا نہیں ہے۔

(لمافی الهندية :ج ١ /١٨٦ رشيدية باب السادس فی زكوة الزرع والثمار)

ويجب العشر عند ابى حينفة فی كل ماتخرجه من الحنطة ـــ واشباه ذلك مماله ثمرة باقية اوغيرباقية قل اوكثر

(لمافی هداية:ج ١ /٢٠١ باب زكوة الزرع والثمار)

قال ابو حنيفه فی قليل مااخرجته الارض وكثيره العشر سواء سقى سيحا اوسقته السماء الاالقصب والحطب والحشيش.

(شرح مختصر الطحطاوی :٢ /٢٨٨،٢٨٧ كتاب الزكاة)

قال ابو جعفر :كان ابو حنيفه يقول فی قليل الثمار والزرع ،وفی سقى الصدقة فان كانت مما سقته السماء، او سقى فتحا فالعشر وان سقى بدالية اوسانية : فنصف العشر ـــ والحجة لابی حنيفه فی ايجاب الحق فی جميع الاصناف خلاماذكرنا قول الله تعالى :يايها الذين امنوا انفقوا من طيب ماكسبتم ومما اخرجنا لكم من الارض وعمومه يوجب الحق فی كل خارج الامام قام دليله ويدل عليه ايضاً قول الله تعالى والنخل والزرع مختلفا اكله والزيتون اولرمان متشبها وغير متشابه كلوا من ثمرة اذا اثمر واتوا حقه يوم حصاده ،وذلک عام فی كل ثمرة فی جميع مايقع فيه الحصاده

(لمافی الشامی ج٢ /٣٢٦ باب لعشر)

ان ملک الارض ليس بشرط لوجوب العشر وانما الشرط ملک الخارج لانه يجب فی

الخارج لا في الارض فكان ملكه لها وعدمه سوآء بدائع ـ الخ

(وايضا في الشامي: ج ۲/ ۳۲۸)

(قوله بلا رفع مؤن) اى يجب العشر في الاول ونصفه في الثاني بلا رفع اجرة العمال ونفقة البقر وكرى الانصار واجرة الحافظ ونحو ذلك ـ بل يجب العشر في الكل ـ الخ

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ والوالدیہ

۲ جمادی الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۱۱۰